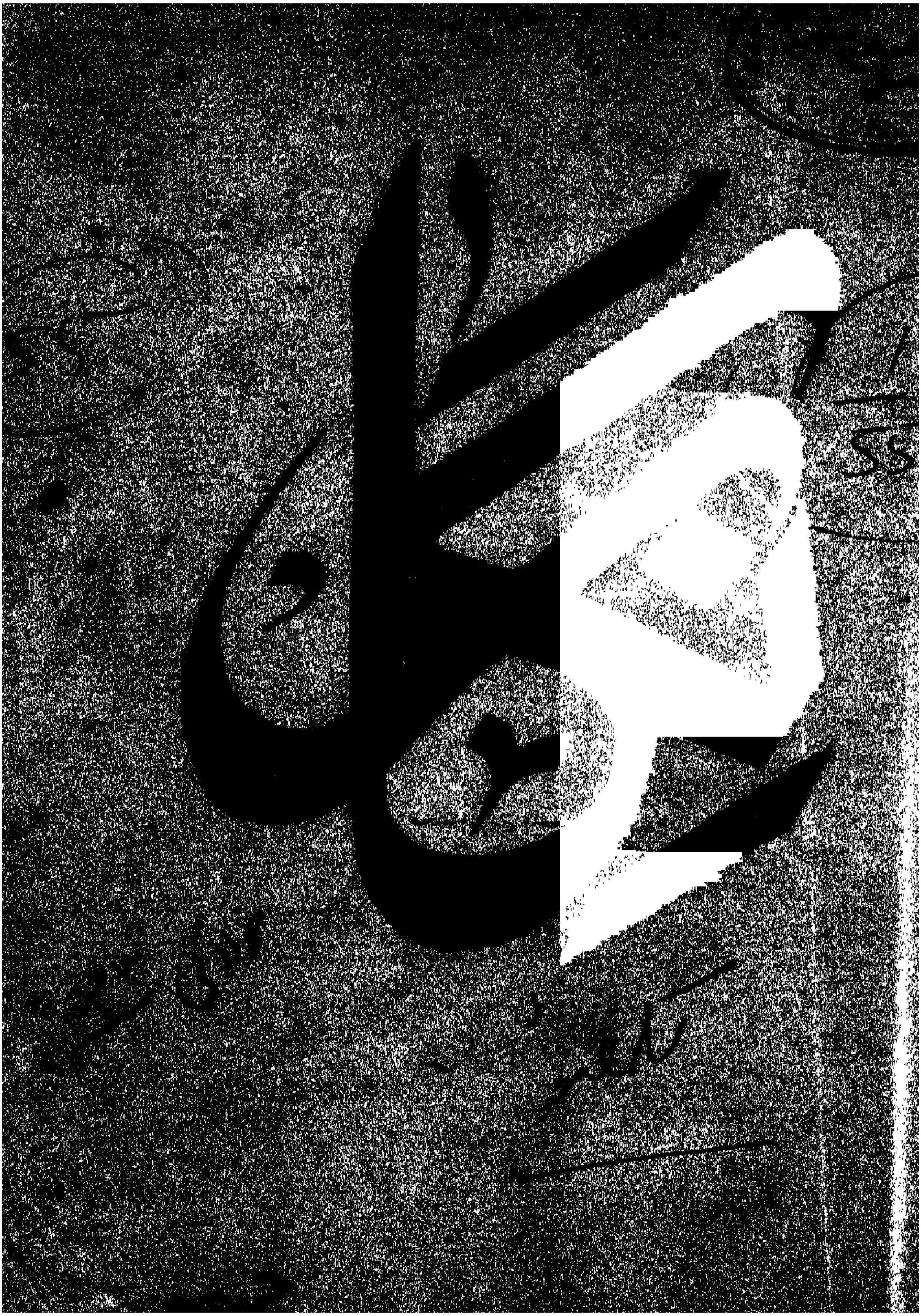


تصانیف حضرت بابا

نگار

رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ تک شائع ہوتا ہے
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا۔
سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (سعہ)
بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۴	فہرست مضامین جولائی ۱۹۳۳ء	شمارہ ۱

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۲۴	جولائی سنہ ۱۹۳۳ء	شمار ۱

ملاحظات

نوع انسانی کی تفریق دنیا میں جن جن صورتوں سے پیدا ہوئی، ان کی تفصیل تو خیر مشکل ہے لیکن چند کھلی کھلی صورتیں ایسی ہیں جن کو آسانی سے بتایا جاسکتا ہے اور آسانی سے ہر شخص سمجھ بھی سکتا ہے

عہد ظلمت وجہل کو چھوڑئیے جب انسان کی حالت ایک جانور سے زیادہ نہ تھی اور وہ انسان کے "مفہوم اجتماعی" سے بالکل بے خبر تھا۔ وہ دوسرے انسان پر حملہ کرتا تھا اور اُسے کھا جاتا تھا۔ وہ اپنے ہی خاندان کے افراد پر غصہ کرتا تھا، اور انھیں ہلاک کر ڈالتا تھا۔ بلکہ اس زمانہ کو لیجئے جب انسان نے اجتماعی زندگی شروع کی اور "من وتو" کی تفریق مٹانے کے لئے "مذہب" کی ضرورت کو محسوس کیا گیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مذہب کو اپنے اس مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی؟ کیا وہ دنیا سے خود غرضی وحُبِ ذات کے جذبہ کو مٹا سکا؟ —— اس کے جواب میں تاریخ کی ورق گردانی کرو اور دیکھو کہ اس کے جتنے صفحات خون سے رنگین نظر آتے ہیں۔ ان میں کیا سوائے مذہبی جنگوں کے کوئی اور چیز پائی جاتی ہے —— پھر تماشہ یہ کہ جس مذہب نے اپنے آپ کو جتنا زبردست علمبردار امن وسکون کا بتایا، اتنا ہی زیادہ وہ "غارتگر امن وسکون" ثابت ہوا۔ اور جس مذہبی قائد نے خونریزی کو جتنا زیادہ برا ظاہر کیا اتنی ہی زیادہ خونریزی اسنے کی —— لیکن خیر اس کو بھی

چھوڑئیے کہ یہ افسانہ بھی بہت پرانا ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ دورِ مذاہب چونکہ انسان کے عہدِ وحشت سے قریب تر تھا اس لئے یہ سب کچھ ظاہر ہونا مستبعد نہ تھا ——— آئیے، اس دور کو دیکھئے جسے دورِ عقل و حکمت کہتے ہیں، عہدِ اخلاق و انسانیت سے تعبیر کرتے ہیں اور جو علوم و فنون، اور گوش و ہوش کا زمانہ کہلاتا ہے ——— ہاں، تو سوچئے کیا اس عہد میں انسان زیادہ صلح جو و امن پسند ہو گیا ہے، کیا اس کی خونریزیاں و خوں آشامیاں کم ہو گئی ہیں، کیا اب وہ آپس میں مل جل کر زندگی بسر کرنے کے لئے آمادہ ہو گیا اس کی خود غرضی و نفس پرستی مٹ گئی ہے؟ یقیناً نہیں ——— اگر پہلے ایک وحشی انسان صرف اپنا پیٹ بھرنے کے لئے دوسرے انسان کو ہلاک کر ڈالتا تھا تو اس عہد کا متمدن انسان اپنی اجتماعی گرسنگی دور کرنے کے لئے قوم کی قوم کو کھا جانے کے لئے آمادہ ہے اور اگر پہلے صرف اس بات پر لڑائی ہوتی تھی کہ فلاں اہرمن پرست ہے اور فلاں یزداں پرست، تو اب اس بات پر ہوتی ہے کہ فلاں کا رنگ سیاہ ہے اور فلاں کا سپید، پہلے انسان کی خواہشیں محدود تھیں اور تمنائیں مختصر اس لئے لڑائی بھی جلد ختم ہو جاتی تھی، لیکن اب حرصِ انسانی کی کوئی حد و پایاں نہیں اس لئے جنگ کے ختم ہونے کی بھی کوئی توقع نہیں ——— پہلے انسان لڑتا تھا صرف زندہ رہنے کے لئے اور اب لڑتا ہے عیش کرنے کے لئے، پہلے جنگ ہوتی تھی بقاءِ حیات کے لئے اور اب ہوتی ہے "توفیقِ معصیت" کے لئے، یعنی اگر پہلے سوال ضرورت کا تھا تو اب لذت کا ہے

یہ استعماری مظالم، جو صنعت و تجارت کی ترقی کے بہانہ سے کئے جاتے ہیں، یہ مستبدانہ حکمرانیاں جو تہذیب و شائستگی کے نام سے روا رکھی جاتی ہیں، یقیناً نہ بقاءِ حیات کے لئے ہیں نہ "سدِ رمق" کے لئے بلکہ اس جذبۂ حرص و خود غرضی کی تسکین کے لئے ہیں، جو آتشکدۂ جہنم کی طرح ہر وقت صدائے ہل من مزید بلند کر رہا ہے

پھر چونکہ اجتماعی معاصی و جرائم کے لئے اجتماعی تدابیر کی بھی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے ظالم جماعتوں نے مظلوم جماعتوں کے خلاف اپنے اندر اتحادِ عمل پیدا کرنے کے لئے مختلف تدابیر پر غور کیا اور آخر کار انھوں نے ایک ایسا بہانہ تلاش کر ہی لیا جو کافی نمایاں اور بہ اندازۂ حرص و طمع کافی وسیع تھا۔ یعنی انھوں نے بنی نوعِ انسان میں تفریق پیدا کرنے کے لئے اب مذہب و مذہبیت کو سامنے نہیں رکھا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ وسیع ذریعہ نسل و رنگ کے امتیاز کا پیدا کیا۔ یہاں تک کہ آج یوروپ و ایشیا کا افتراق نہ جغرافی اصول پر قائم ہے نہ تاریخی حقیقت پر، بلکہ صرف اس نظریہ پر کہ یوروپ کا انسان گورا ہے اور ایشیا کا کالا۔ ایک کا رنگ سفید ہے اور دوسرے کا سیاہ ——— پھر جنھوں نے استعمارِ مغربی کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اُن سے یہ حقیقت مخفی نہیں کہ یہ امتیاز کب سے مشرق کو پامال کر رہا ہے اور کس کس طرح اس تفریق سے ناجائز فائدہ اٹھایا گیا

لیکن چونکہ ہر چیز کی انتہا ہوتی ہے اور ہر انسانی تدبیر کی ایک عمر، اس لئے یہ ضرور تھا کہ مشرق کسی نہ کسی وقت اس ذلت کو محسوس کرتا، اس لعنت سے بیزار ہو جاتا اور اگر کسی کے پاس چشمِ بینا موجود ہے تو وہ معلوم کر سکتا ہے کہ اس

اس احساس و بیداری کے کیا اسباب ہیں؟ ـــ اس میں شک نہیں کہ انحطاط و زوال خود اپنے اندر عروج و ترقی کے اسباب پنہاں رکھتے ہیں، لیکن ان اسباب کو بروئے کار لانے کے لئے کوئی نہ کوئی تحریک ضروری ہے۔ پھر جنھوں نے بیسویں صدی کی ابتدا سے سیاسیات عالم کا مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس تحریک کا باعث صرف وہی امتیاز نسل و رنگ کی دیوار تھی۔ جو مغرب نے اپنے اور مشرق کے درمیان حائل کر رکھی ہے اور جسے جنگ عظیم نے نمایاں طور پر ظاہر کر کے اہل مشرق کو خواب گراں سے جگا دیا

تیس سال اس طرف کی بات ہے کہ جاپان سوائے اپنے جزیرہ کے ایشیا میں کسی ایک جزیرہ کا بھی مالک نہ تھا، لیکن اب کیا ونشا اس کے قبضہ میں ہے، منچوریا میں اس کی حکومت ہے، خط استوا تک تمام جزائر جنوبی اس کی ملکیت میں ہیں، دول عظمیٰ میں اس کا شمار ہوتا ہے اور بحری قوت میں تیسرا درجہ اس کا سمجھا جاتا ہے

سنہ ۱۹۰۰ء میں چین کی حالت ایک ایسی لاش کی تھی جسے مختلف کتے نوچنے کے لئے گھیرے ہوئے تھے لیکن جب وہاں ملوکیت ختم ہو کر جمہوریت پیدا ہوئی، اور ملک میں بیداری کے آثار ظاہر ہوئے تو اس کی تمام املاک جو دول یورپ کے اجارہ میں تھی واگزاشت ہوئیں اور اس کا حق استقلال تسلیم کر کے وہ امتیازات اٹھانے پڑے جو اہل مغرب کو وہاں حاصل تھے

افغانستان کی جو حالت تیس سال قبل تھی وہ بھی کسی سے مخفی نہیں کہ اس کا وجود صرف اغراض برطانیہ کی تکمیل کے لئے تھا اور حکومت ہند کا تابع اس کو سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح ایران کا یہ عالم تھا کہ ایک طرف روس اس کو دباتا چلا جاتا تھا اور دوسری طرف برطانیہ ـــ بلاد عرب دولت عثمانیہ نہیں بلکہ حقیقتاً دول یورپ کی سیادت میں تھے، لیکن اب یہ تمام ممالک خود مختار ہیں، آزاد ہیں اور استقلال تام کے مالک کہلائے جاتے ہیں۔ ہر چند ہندوستان اس وقت تک حصول آزادی میں کامیاب نہیں ہوا، لیکن جو تحریک ملک میں پیدا ہو گئی ہے اور جس نے "نظم نیابت" کے حقوق حاصل کر کے ایک خوشگوار مستقبل کی بنیاد ڈال دی ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں ـــ اس لئے اب سوال یہ ہے کہ مشرق کی اس عام بیداری کا سبب کیا تھا یعنی کیا کوئی اندرونی تحریک از خود بروئے کار آئی یا کسی خارجی محرک نے یہ احساس پیدا کیا ـــ اس کا جواب وہی ہے جو اس سے قبل ہم دے چکے ہیں اور پھر اس کا اعادہ کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ نتیجہ ہے اہل مغرب کی نخوت و کبریائی کا، عُجب و غرور کا جس نے مشرق کے انسان کو انسان نہ سمجھ کر جانوروں کا سا سلوک اس کے ساتھ کیا اور اس کو سنگ جا مد جان کر ہمیشہ ٹھکرایا ـــ پھر چونکہ انسان ہمیشہ ٹھوکر کھانے کے بعد ہی سنبھلتا ہے اس لئے اہل مشرق کو بہر حال احساس ذلت ہونا چاہئے تھا۔ اور جب ایک بار یہ احساس کی لہر اب مشرق کے ہر ہر گوشہ میں پائی جاتی ہے

احساس پیدا ہوگیا ہے تو کسی نتیجہ تک پہونچنا ضروری ہے، خواہ اس کے لئے کتنی ہی قربانیاں کیوں نہ کرنا پڑیں یہ تو ایک عمومی تبصرہ ہوا ایشیاء کے تمام ممالک پر لیکن انھیں میں ایک مخصوص ملک ایسا بھی ہے جو اپنی نوعیت آبادی کے لحاظ سے جداگانہ تنقید کا محتاج ہے اور وہ ہندوستان ہے

تمام ایشیاء میں یہی ایک ملک ایسا ہے جہاں دو متضاد خیال و اعتقاد کے انسان بستے ہیں اور اس لئے اگر حصول آزادی میں یہ دوسرے ملکوں سے پیچھے رہ جائے تو حیرت کی بات نہیں، کیونکہ جب تک کوئی ایک غرض مشترک کسی ملک کی آبادی میں نہ پیدا ہو، حصولِ مدعا آسان نہیں، اور یہاں یہی امر ازبس دشوار نظر آتا ہے

یقیناً اس باب میں ہندو مسلمان دونوں قابل الزام ہیں، لیکن میں مسلمانوں کو زیادہ قصور وار ٹھیراتا ہوں کیونکہ باوجود اس امر کے کہ وہ یہیں کے قدیم باشندے ہیں، یہیں کی آب و ہوا میں پیدا ہوئے، پلے اور بڑھے، لیکن وہ محض اختلاف مذہب کی وجہ سے اپنے آپ کو ہندوؤں سے بالکل الگ تھلگ رکھتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ اختلاف مذہب انسان کی قومیت کو نہیں بدل سکتا۔ اور وطنیت کا رشتہ ایسا مضبوط رشتہ ہے جو کسی طرح ٹوٹ ہی نہیں سکتا ——— یہ ہو سکتا ہے کہ آج ایک ہندو مسلمان ہو کر ہندوؤں کی برادری سے خارج ہو جائے۔ یہ ممکن ہے کہ ایک مسلمان آریہ یا عیسائی ہو کر، مسلمانوں کی جماعت سے نکل جائے، لیکن یہ بالکل ناممکن ہے کہ وہ بجائے ہندوستان کے فرانس یا امریکہ کا باشندہ کہلائے اور اس کی وطنیت بدل جائے۔ پھر مسلمانوں نے حجاز و عرب، ترکی و ایران سے تو ہمیشہ دلچسپی لی کیونکہ سوال ہم مذہب ہونے کا تھا، لیکن خود ہندوستان کے حالات سے کبھی اعتناء نہ کیا جہاں خود انھیں اپنی زندگی بسر کرنا ہے۔ اگر اسلام کسی انسان کے قومیت کو بدل دینے کا مدعی ہو کر رونما ہوا ہے، تو نتیجہ معلوم اور اگر اس کا مقصد و ادعا یہ نہیں ہے تو پھر یہ ذہنیت کیسی؟

میں اس کا خطا وار اپنے یہاں کی مولوی جماعت کو قرار دیتا ہوں، جن کو آج تک مذہبیت و وطنیت کے تمیز کا سلیقہ پیدا نہیں ہوا اور جو ملک و قوم کے مسائل میں بھی مذہبی تقشف کو چھوڑنا گوارا نہیں کرتے

آجکل بعض اہل نظر مسلمان بھی یہ شکایت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ ہندوؤں کی جماعت ہندوستان میں ہندو حکومت قائم کرنا چاہتی ہے اور مسلمانوں کے جذبات کے ساتھ کسی رواداری کے لئے آمادہ نہیں۔ درانحالیکہ انھیں غور کرنا چاہئے کہ کیا وہ خود باشندۂ ہندوستان ہونے کی حیثیت سے ہندو نہیں ہیں اور کیا ان کا یہ کہنا در پردہ اس خواہش کا اظہار نہیں کہ وہ مسلم حکومت چاہتے ہیں۔ پھر جب وہ خود ہندوستان سے کوئی رشتۂ وطنیت قائم رکھنا نہیں چاہتے تو ہندوؤں سے شکایت کیوں؟ وہ تو بہرحال ہندو ہیں، ہندو رہیں گے۔ اور ان کا قومی فرض ہے کہ وہ اپنی حکومت قائم کریں خواہ مسلمانوں کو گوارا ہو یا ناگوار

یہ بات اب ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکی ہے کہ ایک بار جنگ اور ہوگی، اور ایسی شدید کہ شاید دنیا پھر کبھی سر اٹھا سکے ـــــ اسلحہ سازی کے خلاف جلسے پر جلسے ہو رہے ہیں، صلح و امن کی ہر طرف سے پکار ہو رہی ہے، لیکن حقیقت کے لحاظ سے امن و سکون، غالب کے اس مصرعہ کی تفسیر سے زاید نہیں کہ

آستیں میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں نشتر کھلا

ٹھیک اسی وقت جبکہ فرانس، جرمنی کی اسلحہ سازی کو ناقابل معافی جرم قرار دیکر اس کا انسداد کلی چاہتا ہے، وہ خود اپنے ملک کے محاصل کا بڑا حصہ فراہمی اسلحہ میں صرف کر رہا ہے، اور عین اسی لمحہ میں جب جرمنی صدائے امن و سکون پر لبیک کہتا ہوتا ہے، روہر کے کارخانے اس کے لئے لاکھوں کوہ شکن توپیں ڈھالنے میں سرگرم کار نظر آتے ہیں ـــــ بالکل یہی حال اٹلی و برطانیہ کا ہے اور روس و امریکہ کا

اس لئے اس سلسلہ میں ایک سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ در پردہ جنگ کی طیاریاں کرتے ہوئے، جنگ سے احتراز کرنے کی تبلیغ کرنا کیا معنی رکھتا ہے اور دوسرے یہ کہ اگر واقعی جنگ ہوئی تو کیوں ہوگی اور کہاں سے یہ شعلہ بلند ہوگا ـــــ امر اوّل کا جواب زیادہ مشکل نہیں، کیونکہ وسائس سیاسی کی یہ پہلی مثال نہیں ہے جس پر تعجب کیا جائے اور تجارتی حرص و طمع کا عفریت جب تک سر پر سوار ہے، باہمی مسابقت یقیناً قائم رہے گی اور اس طرح جو بے اعتمادی و خود غرضی قدرتاً پیدا ہونا چاہئے، وہ ہمیشہ ایک کو دوسرے سے اسی طرح برسر پرخاش رکھے گی، یہیں سے "کیوں" کا جواب بھی مل سکتا ہے ـــــ رہ گیا سوال جگہ و مقام کا سو اس کے متعلق لوگوں کی مختلف رائیں ہیں بعض کہتے ہیں کہ جنگ مستقبل کی آگ مشرق اقصیٰ سے بلند ہوگی، بعض اس کا وسط الیشیا سے بھڑکنا ظاہر کرتے ہیں اور بعض کو یقین ہے کہ وہ پھر جرمنی ہی سے رونما ہوگی ـــــ لیکن ایک بالغ نظر جماعت ایسی بھی ہے جس کی نگاہ جنوب یوروپ پر جاتی ہے اور جسے یقین ہے کہ جہاں سے یہ شعلہ اوّل بار بھڑکا تھا وہیں سے دوبارہ بھی بھڑکے گا

گزشتہ جنگ سے بڑی بڑی قوتوں کو فائدہ پہونچا ہو یا نقصان، لیکن یہ واقعہ ہے کہ یوروپ کی بعض چھوٹی چھوٹی قوتیں ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئیں ـــــ جزیرہ نمائے بلقان میں ہنگاری، سلوون، کروٹ، مقدونی، البانی اور مانٹی نگرن بہت سی قومیں آباد تھیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے آپ کو ترقی و آزادی کا مستحق جانتی تھی لیکن جنگ عظیم نے حکومت سرویا کو محو کر کے ان تمام قوموں کو اُن کے فطری حقوق سے محروم کر دیا اور جگوسلیویا کی حکومت قائم کر کے ایک ایسے کوہ آتش فشاں کی بنیاد ڈالدی جس کا بھڑک اٹھنا کسی نہ کسی دن بالکل یقینی ہے

اس وقت جگوسلیویا مالی حالت کے لحاظ سے تقریباً دیوالیہ ہو چکا ہے اور اشتراکی انقلاب کی لہر وہاں نہایت تیزی کے ساتھ دوڑ چکی ہے، کروٹ جماعت جو حکومت ہنگری ہی سے جدا کر دی گئی ہے کھلی ہوئی بغاوت پر آمادہ ہے اور مقدونی لوگ جنھیں حکومت جگوسلیویا حد درجہ بیدردی سے قتل کر رہی ہے، لاکھوں کی تعداد میں بلغاریا بھاگ

گئے ہیں اور ایک عام برہمی ان میں پیدا ہے۔ اسی طرح ۵ لاکھ البانیوں کی جماعت ہر وقت آمادہ ہے کہ ذرا سا موقع آئے اور جگوسلیویا کی غلامی سے آزاد ہو۔ الغرض سیاسیات یوروپ کی یہ نوزائیدہ سلطنت جس کو دُول مغرب نے ایک (Buffer State) قرار دے کر ہنگری، سربیا اور مانٹی نگرو وغیرہ کی قوت کو توڑنا چاہا ہے، حد درجہ خطرناک چیز ہے اور کسی نہ کسی دن اس کو تمام دنیا میں تباہی پھیلانا ہے

مانٹی نگرو کی داستان بہت زیادہ دردناک ہے، کیونکہ گزشتہ جنگ میں اتحادیین کا ساتھ دینے کے باوجود اس کی مٹی پلید ہوگئی اور اس کے قومی اجتماع کو بالکل درہم برہم کر دیا گیا —— ہر چند عہدنامۂ لندن کی رُو سے خدا جانے کیا کیا اس کو دئے جانے کا وعدہ کیا گیا تھا، لیکن عملاً سوائے اس کے کچھ نہ ہوا کہ اس کی رہی سہی قوت کو بھی ختم کر دیا گیا اور اسوقت تقریباً ایک لاکھ اہل مانٹی نگرو جو بالکل مسلح ہیں۔ سربیا سے باہر جلا وطنی کی حالت میں لطیفۂ غیبی کے منتظر بیٹھے ہوئے ہیں۔ جسوقت ۱۹۱۴ء میں جنگ شروع ہوئی تو مانٹی نگرو کسی کا مقروض نہ تھا اور جنگ کے بعد ۲۰ کرور ۳۰ لاکھ طلائی مارک بطور معاوضہ اس کو دیا جانا طے پا گیا تھا، لیکن غریب کو معاوضہ تو کیا ملتا، جو کچھ اس کے پاس تھا وہ بھی چھین لیا گیا اور جگوسلیویا کی لعنت اس پر اور اضافہ کر دی گئی

الغرض اس وقت یوروپ میں سب سے زیادہ بے چینی جس جگہ پائی جاتی ہے وہ جزیرہ نمائے بلقان ہے اور یہ ممکن نہیں کہ اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلے، یقیناً کسی نہ کسی دن یہاں فساد شروع ہوگا اور اس آگ میں ایک ایک کرکے تمام دُول یوروپ کو پھر کودنا پڑے گا۔ خواہ اس کا نتیجہ دنیا کے لئے قیامت کبریٰ ہی کی صورت میں کیوں نہ ظاہر ہو

یہ سال ارباب ادب و انشار کے لئے بہت خون آشام ثابت ہوا۔ مرزا رسوا کی موت، طباطبائی کا انتقال، ناصر نذیر فراق کی رحلت اور پھر اخیر میں میر ناصر علی کا اٹھ جانا، ایسے معمولی واقعات نہیں جنھیں دنیائے علم و ادب فراموش کر سکے

یہ سب، بزم اُردو کے اُس دَور کی یادگار تھے جس کو دنیا بھلا چکی ہے اور جو متقدمین و متاخرین کے درمیان "عقدۃ الوسطیٰ" کی حیثیت رکھتے تھے،

مرزا رسوا پر لکھنؤ کی زباندانی ختم ہوگئی، اور فراق پر دہلی کی، طباطبائی کے ساتھ لکھنؤ کے عہد آخریں کا فضل و کمال ختم ہوگیا اور ناصر علی ادب و انشار کو اس رنگ کے اپنے ساتھ لے گئے جو ان کی زندگی میں بھی کسی دوسرے کا حصہ نہ ہو سکا، اب مرنے کے بعد کیا ہوگا

میر ناصر علی کی ساری زندگی اُردو زبان کی خدمت میں گزری اور ہر چند وہ خدمت صلائے عام کے اجراء سے آگے نہ بڑھ سکی، لیکن جنھوں نے صلائے عام کا مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس کی جلدوں میں کیسے کیسے

جواہر ادب پوشیدہ ہیں اور وہ کونسی خدمت زبان تھی جو اسی رسالہ کے ذریعہ سے میر ناصر علی نے تقریباً ایک ثلث صدی تک انجام نہیں دی

وہ ان کا سہل ممتنع انداز تحریر، وہ ہلکے ہلکے مزاحیہ فقروں کے ساتھ مابعد الطبیعیات کے خشک و بے آب و رنگ نظریوں کو ہمارے لئے گوارا بنا دینا - میر ناصر علی کی وہ خصوصیت تھی جس سے اُن کی تحریر کا کوئی فقرہ خالی نہ ہوتا تھا۔ پنشن لینے سے قبل بھی ان کا محبوب مشغلہ کتابوں کے مطالعہ کے سوا اور کچھ نہ تھا لیکن پنشن کے بعد تو ان کی زندگی کا کوئی لمحہ لکھنے پڑھنے کے علاوہ کسی اور شغل میں بسر ہی نہیں ہوا —— جب دیکھئے وہ ہیں اور خاک آلودہ کتابوں کا ڈھیر، کتابوں کا ڈھیر ہے اور اُن کی جھکی ہوئی گردن - پڑھ نہیں رہے ہیں تو لکھ رہے ہیں، اور لکھتے لکھتے تھک گئے تو پھر پڑھنے میں مصروف ہیں - الغرض ان کی زندگی ایسی قابل رشک زندگی تھی جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہو سکتی ہے اور جس پر حقیقتاً ایک انسان کو فخر کرنا چاہئے

مجھے معلوم ہے کہ جناب انصار ناصری (بی - اے) مرحوم کے صاحبزادہ ان کے مضامین کا مجموعہ شایع کرنا چاہتے ہیں، خدا کرے یہ خبر صحیح ہو کیونکہ اس طرح مرحوم کے ادبی خدمات سے ملک کو مستفید ہونے کا موقع حاصل ہو جائے گا — لیکن میں یہ مشورہ ضرور دوں گا کہ انتخاب مضامین کا کام کسی کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے - اور تنہا ایک شخص اس اہم ذمہ داری کو اپنے سر نہ لے

نگارستان کے دوسرے حصہ کی کتابت شروع ہوگئی ہے اور غالباً ۳، ۴ ماہ میں شایع ہو جائے گا اس کے صفحات کا اندازہ کم از کم ۵۰۰ صفحات کیا گیا ہے لیکن اس سے بھی زیادہ ہو جانا ممکن ہے

نگارستان حصۂ اول میں ۱۹۲۰ء تک کے ادبی مضامین و افسانے درج کئے گئے تھے - اور اس حصہ میں ۱۹۲۰ء کے بعد سے لے کر اس وقت تک کے ادبی مقالات اور افسانوں کا انتخاب درج ہوگا - جو حضرات اشاعت سے قبل مدد فرمائیں گے اُن کا شکریہ ادا کرنا میرا فرض ہوگا

مغربی زبانوں کے ادب لطیف پر سرسری تبصرہ

"ادبیات یونان"

یونان کے ادبیات قدیم تین دور میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں (۱) ابتدائی دور (۲) دور عتیق (Attic Period) (۳) دور انحطاط

ابتدائی دور یونانیوں نے اپنی تہذیب کے کسی دور میں بھی غیر قوم کا تتبع نہیں کیا۔ نثر و نظم دونوں کے اسالیب انھوں نے خود اختراع کئے اور ان کو ترقی دے کر دنیائے ادب کے لئے بے مثل یادگاریں چھوڑ گئے

آیونیوں نے جو یونانیوں کی ایک خاص قوم تھی اور جو ایشیائے کوچک کے سواحل کی رہنے والی تھی یونان میں رزمیہ شاعری کی بنیاد ڈالی اور اسی قوم نے مرثیہ کی بھی ابتدا کی۔ ایولیوں (Aeolians) نے جو جزیرہ لسبس (Lesbos) کے رہنے والے تھے عشقیہ نظم (Lyric poetry) یا غزل ایجاد کی جس میں شخصی اور ذاتی جذبات کا اظہار کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد ڈوریوں (Dorians) نے جو پلوپونیس (Peloponessus) اور صقلیہ کے رہنے والے تھے "سنگتی غزل" (Choral lyrics) نکالی جو پوجا پاٹ اور تیوہاروں کے موقعوں پر گائی جانے لگی۔ اور سب سے آخر میں عتیقیوں (Attics) نے ڈرامہ کی ابتدا کی اور اسی کے ساتھ نثر میں تواریخ۔ فلسفہ اور خطبات کو رواج دے کر نثر کو خاص ترقی دی ان سب قوموں نے اپنی اپنی مقامی زبان میں شاعری کی۔ لیکن ان سب زبانوں میں ایک مشترک عنصر پایا جاتا تھا اور ایک زبان کو دوسری زبان سے بیگانگی نہ تھی

آجکل ادبیات یونان کے جو نمونے موجود ہیں انکی ابتدا ہومر سے ہوتی ہے۔ دور ماقبل ہومر کی شاعری کے نمونے اب باقی نہیں ہیں۔ مگر جس دور کے نمونے اس وقت موجود ہیں ان کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب تک اس سے پیشتر شاعری کو عروج حاصل کرنے کے لئے ایک طویل مدت نہ ملی ہو اس وقت تک کسی قوم کی شاعری میں یہ تہذیب یہ توازن اور یہ شاعرانہ کمال نہیں پیدا ہو سکتا۔ جہاں تک معلوم ہو سکا ہے یونان کی قدیم ترین شاعری قدرت اور

اس کے عناصر سے متعلق تھی۔ اسی دور میں یونان کے مشہور بھاٹوں کے بھجن بھی شامل ہیں پرانے زمانے میں یونانیوں کو «جنگی گیت» (War - Ballads) سے خاص دلچسپی تھی۔ انھیں جنگی گیتوں نے بعد کو رزمیہ شاعری کی صورت اختیار کر لی۔ سب سے قدیم رزمیہ نظمیں جو اب تک محفوظ ہیں ہومر کی «الیڈ» (Iliad) اور «اوڈیسی» (Odyssey) اور ہیسیاڈ (Hesiod) ہیں «الیڈ» اور «اوڈیسی» کا موضوع جنگ پلوپونیسس ہے لیکن بعد کو ایونیہ والوں نے ٹرائے (Troy) کی لڑائی کو منظوم کرنا شروع کیا اور اس وقت کے سورماؤں کے کارناموں کو ایک خاص جلال بخشا۔ ان میں سے ایجیاس (Agias) یوگیمن (Eugammon) اور آرکٹینس (Arctinus) بہت مشہور ہیں آیونیہ سے الگ ہٹ کر یونان خاص میں ایک دوسری قسم کی رزمیہ شاعری رائج تھی جس کا موضوع مذہبی روایات اور اخلاقی پند و نصیحت تھا۔ اس گروہ کی روح رواں ہیسیاڈ (Hesiod) ہے۔ «دیومالا» (Theogony) اور «محنت اور دن» (Works and days) اس کی مشہور تصنیفیں ہیں۔ ہیسیاڈ اور اس کے جانشینوں نے جو کچھ لکھا وہ ہمیشہ ایک مذہبی غرض و غایت کو لیکر لکھا۔ اسی سلسلہ میں ہومری بھجنوں کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ بھجن تیوہار کے موقعوں پر گائی جاتی تھیں اور تیوہار کے مربی دیوتا سے ان میں خطاب کیا جاتا تھا۔ بھجن کا اسلوب رزمیہ تھا اور ان میں ہسیاڈ کی شاعری کا بڑا اثر موجود ہے۔ خاص خاص بھجنوں میں اپالو (Appollo) ہرمیز (Hermes) افرودیتہ (Aphrodita) اور دیمتر (Demeter) سے خطاب کیا گیا ہے

رفتہ رفتہ عوام میں یہ تحریک پھیلی کہ قومی شاعری سے برطرف ہو کر کبھی کبھی ذاتی جذبات بھی شعر کے ذریعہ سے ظاہر کرنا چاہیئے۔ اس تحریک کا نتیجہ اس صنف شاعری کی صورت میں نمودار ہوا جس کو (Elegy) کہتے ہیں یہ لفظ آجکل عموماً مرثیہ کا مرادف سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس وقت (Elegy) کا میدان بہت وسیع تھا اور اس میں مراثی۔ عاشقانہ رنج و ملال یا شکوے شکایت یا اور کوئی ایسا موضوع جس میں خاص سوز و گداز ہو شامل تھی (Elegy) کے ساتھ ساتھ ایک اور صنف وجود میں آئی جو (Iambic) کہلاتی ہے۔ پہلے تو اس قسم کی شاعری صرف ہجو نگاری کے لئے مخصوص تھی مگر بعد میں ہر نئے اور دلچسپ خیال کے اظہار کے لئے اس کو کام میں لانے لگے (Elegy) اور (Iambic) کو رزمیہ (Epic) اور «غزلیہ» (Lyric) شاعری کے درمیان میں ارتقائی منازل سمجھنا چاہیئے

غزلیات (Lyrics) انفرادی جذبات کے اظہار کی مکمل ترین صورتیں ہیں جن میں سوز و گداز بہت پایا جاتا ہے۔ اور چونکہ غزلیات ہمیشہ موسیقی کے ساتھ ہوتی تھیں اس لئے ان میں اور بھی اثر پیدا ہو جاتا تھا۔ غزلیہ

کے ساتھ یونانیوں نے اپنے ساز موسیقی کو بھی ترقی دی انھوں نے ایک نیا باجا ایجاد کیا جس کو رباب (Lyre) کہتے ہیں - غزلیات ہمیشہ اسی باجے کے ساتھ گائے جاتے تھے اسی لئے ان کو (Lyric) یعنے " ربابی نظمیں " کہتے ہیں - غزلیہ شاعری نے بعد کو دو مختلف اسالیب اختیار کر لئے - ایک تو " مدرسہ ایولیہ " (Aeolian School) کی غزلیہ کہلائی اور دوسرے " مدرسہ دوریہ " (Dorian School) کے نام سے موسوم ہوئی

ایولیوں کی غزلیات صرف ذاتی محاکات کے لئے وقف تھے اور ان کو ایک ہی شخص گاتا تھا - اور " سنگت " (Chorus) کے لئے اس کو ناموزوں سمجھا جاتا تھا - غزلیات میں جزیرۂ لسبس (Lesbos) کو ایک خاص امتیاز حاصل تھا - غزلیات کا موضوع محاربات کی صعوبتیں ، زندگی کی تلخیاں اور محبت کی ناکامیاں تھیں - سب سے زبردست غزل گو لسبس کی مشہور و معروف شاعرہ سافو (Sappho) ہوئی ہے - یونان میں یہی ایک عورت ہوئی ہے جس میں شاعرانہ قوتیں بحد اتم موجود تھیں - اس کے جو اشعار ہم تک پہونچے ہیں ان میں موسیقیت اور جذبات کی شدت درجۂ کمال کو پہونچی ہوئی ہے - جذبات کو ایسے دلآویز پیرایہ کے ساتھ بیان کرنے میں کسی شاعر کو سافو پر سبقت نہیں دی جا سکتی - سافو کے علاوہ آلکیس (Alcaeus) اور اناکریون (Anacreon) مشہور غزل گو ہوئے ہیں

ڈوریوں کی غزلیات ایولیوں کے برخلاف اسقدر انفرادی نہیں تھے بلکہ زیادہ تر وہ عوام الناس کی زندگی سے متعلق ہوتے تھے اور سنگت میں زیادہ گائے جاتے تھے - ان کا تعلق زیادہ تر پوجا پاٹ سے تھا - ڈوریوں کو اپنے گذشتہ تمدن پر ناز تھا - اور اس ناز کی جھلک ان کے غزلیات میں بہت نمایاں ہے - الکمان (Alcman) ہیمیرا (Himera) اور متمنا (Mnethymna) اس مدرسے کے ممتاز ترین غزل گو ہیں لیکن غزل کو دو شاعروں نے منتہائے کمال کو پہونچایا - ایک تو سائمونائڈیز (Simonides) دوسرا پنڈار (Pindar) - اول الذکر ڈوری (Doric) قسم کی غزلیں لکھتا تھا - لیکن وہ پہلا شاعر ہے جس میں مقامی خصوصیتوں کے بجائے یونان کی قومی خصوصیتیں زیادہ نمایاں ہیں - پنڈار نے ایولی (Aeolian) اور ڈوری اسالیب کو ملاکر ایک نیا اسلوب پیدا کیا - اس کی غزلوں میں ایک جوش و جلال پایا جاتا ہے

عتیقی دور

عتیقی دور ڈرامہ کا دور ہے یعنی جب مختلف اصناف شاعری کمال حاصل کر چکے تھے تو اس میں ڈرامہ کا اضافہ کیا گیا - ڈرامہ کی ابتدا ٹریجڈی سے ہوئی - ٹریجڈی در اصل اس بھجن کو کہتے تھے جو تیوہار کے موقعوں پر گائے جاتے تھے - یہ تیوہار شراب کے دیوتا باخوس (Bacchus) یا دیونیوس (Dionysus) کے تیوہار ہوتے تھے اور ان میں ایک خاص رسم یہ تھی کہ لوگ دیوتا پر بکریاں قربانی چڑھاتے تھے - قربانیاں چڑھانے سے پہلے یہ گیت گائے جاتے تھے - اسی لئے ان کو ٹریجڈی کہتے تھے جس کے لغوی معنے

"بکری کا گیت" ہے

سب سے پہلے جس نے ٹریجڈی کو ایک منضبط صورت دی وہ اسکائلوس (Aeschylus)
تھا۔ اس نے ٹریجڈی میں چند اصلاحیں کرنے کے علاوہ ایک خاص عمق ایک خاص تخیل پیدا کیا۔ اس کے "مثلث"
(Trilogy) اور "مربع" (Tetralogy) مشہور ہیں۔ اول الذکر ایک مسلسل افسانہ
ہوتا تھا جو تین ڈراموں میں ختم ہوتا تھا۔ اور مؤخر الذکر چار ڈراموں پر مشتمل ہوتا تھا۔ اسکائلوس میں غور و تامل۔ قیاس
واستدلال اور ایک خاص جذبۂ وطنیت پایا جاتا ہے

سفوقلز (Sophocles) نے جو بادشاہ فرقلیز (Pericles) کا دوست تھا
ٹریجڈی کو انتہائے کمال تک پہونچایا۔ اس کے المناموں کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو الوہیت کے
مقابلہ میں انسانیت سے زیادہ دلچسپی پیدا ہو چلی ہے۔ سفوقلیز نے انسانیت کی دنیا میں ایک روحانیت پیدا کرنے
کی کوشش کی

اس کے بعد یوری پیڈیز نے ٹریجڈی کو ایک بالکل نئی چیز بنا دیا۔ اس نے ٹریجڈی کے ذریعہ سے ایک
فلسفیانہ اور غائر تشکیک پھیلا دی۔ اس نے تمام اساطیر و روایات تمام رسوم و قیود کو مشککانہ نظر سے دیکھنا شروع
کیا، اسلوب بیان اور کردار نگاری میں اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ یوری پڈیز کے بعد یونان میں ٹریجڈی کا
انحطاط شروع ہو گیا

یونان میں ٹریجڈی کا تعلق زندگی کے سنجیدہ اور عمیق پہلو سے تھا۔ لیکن چونکہ زندگی میں ایک مضحکہ انگیز
اور تمسخر خیز پہلو بھی موجود ہے۔ اس لئے جب اس کے اظہار کی ضرورت محسوس ہوئی تو "کمیڈی" (ضحکیہ) وجود میں
آئی۔ اس کا تعلق بھی یونان میں ابتداءً شراب کے دیوتا دایونیوس کی پرستش سے تھا۔ یہ تیوہار جاڑے کے آغاز سے
لے کر گرمی کے آخر تک متعدد بار منایا جاتا تھا۔ خزاں میں جو تیوہار پڑتے تھے وہ دلوں میں ایک افسردگی اور اضمحلال
پیدا کرتے تھے اس لئے ایسے اوقات کی بھجنوں میں بھی ایک خستگی اور افسردگی کا پایا جانا ضروری تھا۔ لیکن جب
یہی تیوہار بہار کے موسم میں ہوتے تھے تو ہر طرف چہل پہل، شگفتگی اور نشاط محسوس ہونے لگتا تھا اور اسوقت
کی بھجنوں میں بھی ہنسی کا عنصر غالب رہتا تھا، رفتہ رفتہ اس فروقتی نے استہزا اور تمسخر کی صورت اختیار کر لی۔ کمیڈی کا
عروج بھی دور عتیقی (Attica) میں ہوا۔ قدیم ترین مشاہیر اس صنف کے ابیقارموس (Epicharmus) قراطینوس (Cratinus) اور یوپولیس (Eupolis)
ہیں۔ ان کے بعد اور بھی چند نامور تمثیل نگار ہوئے۔ لیکن کمیڈی میں مشہور ترین نام ارسطو فانیس (Aristophanes) کا ہے۔ اس کے ڈراموں میں نہایت لطیف اور پاکیزہ تمسخر کے ساتھ ساتھ ایک

عجیب ناقدانہ قوت اور حس لطیف بھی پائی جاتی ہے۔ اس کے بعد کمیڈی میں ایک نئی طرز نکلی اور اس طرز کا مشہور ماہر مینانڈر (Menander) ہے۔ اس دور کی کمیڈی زیادہ تر معاشرت اور ہیئت اجتماعی سے متعلق ہوتی تھی۔ جن میں فلیمون (Philemon) اور اپالودورس (Appollodoras) زیادہ ممتاز نظر آتے ہیں

نثر میں ہر دودتس (Herodotus) سے پہلے کا حال ہم کو کما حقہ نہیں معلوم ہے اتنا یقینی ہے کہ اس سے بہت پہلے یونان میں نثر نگاری کا کوئی رچا ہوا مذاق موجود نہ تھا کیونکہ یونانی تمدن و عمرانیت کی ساری بنیاد شاعری پر تھی۔ اب تک فلسفہ۔ تواریخ۔ الٰہیات اور خطابات وغیرہ کا جو کچھ ذخیرہ تھا وہ نظم کی صورت میں تھا۔ ہر دودتس سے پہلے جن نثر نگاروں کا نام لیا جا سکتا ہے وہ فریکیدیز (Pherecydes) انکسیمانس (Anaximenes) اور انکسیماندر (Anaximander) ہیں موخر الذکر دو بڑے مشہور فلسفی ہوئے ہیں

ہر دودتس ایک شہرۂ آفاق ہستی ہے۔ وہ ایک مستند مورخ کی حیثیت سے مشہور ہے۔ اس نے اپنی تاریخ نگاری کا موضوع قدیم یونان اور ایشیا کے محاربات کو بنایا۔ اور آخری یونانی فتحیابی تک واقعات قلمبند کئے۔ واقعات بیان کرنے کے سلسلے میں وہ مختلف ممالک کے جغرافی آثار اور ان کے رسم و رواج کو بڑی دلفریبی اور پوری وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے

ہر دودتس کے بعد تھیوکیدیدیز (Thucydides) اور زینوفون (Xenophon) کا دور آتا ہے۔ اوّل الذکر اپنے تعمق اور بالغ نظری کے لئے مشہور ہے وہ دیوی دیوتاؤں سے الگ ہو کر دنیاوی واقعات پر انسانی نقطۂ نظر سے غور کرتا ہے۔ تھیوکیدیدیز کا مبحث پلوپنیسی جنگ ہے۔ اس نے جس حسن اسلوب سے اس جنگ کو بیان کیا ہے وہ اس کو ایک تمثیل نگار ثابت کرتے ہیں۔ اس کی عبارت میں ایک عجیب کیف ہے

زینوفون میں نہ ہر دودتس کی خصوصیت ہے نہ تھیوکیدیدیز کی۔ اس میں سب سے بڑی جو بات قابل قدر ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایک عملی زندگی کا آدمی ہوتے ہوئے بھی ادیب رہا۔ وہ خود میدان کارزار میں رہ چکا تھا اور بڑے بڑے کارناموں میں حصہ لے چکا تھا اور پھر ان کارناموں کو افسانوں کی طرح بیان کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی ان دو مورخوں کے علاوہ ٹیسیاس (Clesias) بھی ایک حد تک شہرت رکھتا ہے۔ اس نے فارس کی بھی تاریخ لکھی

عہد عتیق (Attica) میں نثر کے عروج کا سب سے بڑا سبب فن تقریر یا خطابت تھا۔ ایتھنہ کا ہر

باشندہ جس کو عوام کی خدمت کرنا ہوتی یا ملک کی صلاح و بہبود میں کوئی حصہ لینے کی اُمنگ ہوتی، سب سے پہلے اپنے کو فن خطابت کا ماہر بنا تا تھا۔ یوں تو انٹیفون (Antiphon) لیساس (Lysias) اور ایسقراطیس (Socrates) اور اور بہت سے خطیب یونان میں اس وقت تک گزر چکے ہیں لیکن جس خطیب نے غیر معمولی شہرت حاصل کی وہ دیماسطینز (Demosthenes) ہے۔ اس کے خطبات کی زبان میں نہ صرف زور ہوتا تھا بلکہ ایک قابل رشک تنوع ہوتا تھا۔ اس کے خطبات کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو زبان پر کتنی قدرت حاصل تھی۔ اس کے بیان میں جو تازگی ہوتی تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آج بھی اس کی تقریریں لذت کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں

اس دَور کی تاریخ نامکمل رہ جائے گی اگر اس زمانہ کے فلسفیوں کا ذکر نہ کر دیا جائے۔ افلاطون اور ارسطو جیسی مشہور عالم ہستیاں اسی دَور کی پیداوار ہیں۔ افلاطون اپنے حسن اسلوب اور سلاست بیان کی وجہ سے نہ صرف تاریخ فلسفہ میں بلکہ تاریخ ادبیات یونان میں نمایاں جگہ پانے کا مستحق ہے۔ اس کے اندر تمثیل نگاری کی خداداد قوت تھی۔ اس نے فلسفہ کو تمثیل بنا دیا۔ ارسطو کو یہ امتیاز نہ حاصل ہو سکا۔ اس میں شک نہیں کہ ارسطو نے دنیائے فکر و تعمق پر بڑا احسان کیا۔ اس نے استدلال و تحلیل کی صلاحیت لوگوں میں پیدا کی۔ لیکن اس کی تصنیفوں میں کوئی خاص ادبیت نہیں ہے

دَور انحطاط — یونان میں ادبی و علمی انحطاط اس وقت سے شروع ہوتا ہے جبکہ یونانیوں نے اپنی آزادی کھوئی۔ جب تک ہر شہر بجائے خود ایک ریاست تھا، شہر کے لوگ بازاروں میں تماشا گاہوں میں اور مختلف جگہوں میں مل کر تبادلۂ خیال کر لیا کرتے تھے۔ اور اس طرح نہ صرف سیاسی اور قومی قوت کو فروغ حاصل ہوتا تھا۔ بلکہ علم و ادب کی بھی پوری اشاعت ہو جایا کرتی تھی۔ شاعر ہو یا سنگ تراش۔ مطرب ہو یا مؤرخ ہر شخص عوام سے تبادلۂ خیال ضروری سمجھتا تھا اور اس طرح اپنے زمانہ کے واقعات اور حالات سے پوری ہمدردی کے ساتھ واقف رہتا تھا۔ لیکن جب یہ آزادی مفقود ہوئی تو ادبی انحطاط بھی شروع ہو گیا

فیلقوس مقدونی نے نہ صرف یونان کی شہری ریاستوں کو برباد کیا بلکہ یونان کی قدیم سیاسی زندگی کو بھی غارت کر ڈالا۔ شاعر شاعری کرتے۔ مؤرخ تواریخ لکھتے۔ مطرب نغمے سناتے مگر ان میں وہ اثر وہ خلوص اور وہ واقعیت مفقود تھی۔ پہلے تو وہ عوام کی زندگی میں شریک ہوتے تھے تب جا کر کہیں وہ زندگی کے واقعات قلم بند کرتے تھے یا ان کو منظوم کرتے تھے۔ لیکن اب نہ وہ آزادروی تھی نہ کسی بات میں وہ اثر۔ اس کے بعد سکندر کے فتوحات شروع ہوئے۔ تمام ایشیا میں یونانی نو آبادیاں قائم ہو گئیں اور وہاں یونانی عمرانیت پھیل گئی لیکن اس عمرانیت میں وہ زور کہاں سے آتا اور پھر شامت یہ ہوئی کہ سکندر کی وفات کے بعد اس کی سلطنت مختلف خود مختار ریاستو

میں بٹ گئی

سکندر کے عہد سے آغطوس (Augustus) تک اسکندریہ یونانی علمی زندگی کا مرکز بنا رہا یہاں کا عجائب خانہ اور یہاں کی لائبریری جسکو بطلیموس اول نے قائم کیا تھا علم کے شیدائیوں کے لئے ایک جاذب نظر چیز بن گئی - اس حیثیت سے کوئی دوسرا شہر اسکندریہ کے سامنے نہ ٹھیرتا تھا - دور انحطاط میں اس دور کو "اسکندری دور" کہا جاتا ہے جس میں علمی تحقیقات اسکندریہ کی درسگاہ تک محدود رہی - اس دور کے ادبیات میں تکلف اور تصنع کے آثار نمایاں ہو چلے - یہاں تک کہ شاعری بھی ان تکلفات سے معرا نہ رہ سکی - چنانچہ کالیماخوس (Callimachus) کے ہجوں - لطیفوں اور نوحوں میں یہ زیادتیاں افراط سے پائی جاتی ہیں لیکن اس دور کی سب سے بڑی یادگار علم و حکمت اور فن تنقید ہے - یونان نے جتنی متبحر اور جامع العلوم ہستیاں اسکندری دور میں پیدا کیں اس سے پہلے کبھی نہیں پیدا کی تھیں - ان ہستیوں میں سب سے زیادہ نامور ارسطارخوس (Aristarchus) ہے - اس نے پرانی کتابوں کی نئی تفسیریں کیں اور فلسفیانہ تنقید کی بنیاد ڈالی - یہی تنقید آگے چل کر علم صرف و نحو میں تبدیل ہو گئی

اس کے بعد "یونانی رومی دور" (Graeco-Roman-Period) آتا ہے - اس دور کی ابتدا اس وقت سے ہوتی ہے جبکہ یونان اہل روم کے زیر حکومت آگیا - سیاسی حیثیت سے تو یونان محکوم تھا لیکن دماغی حیثیت سے روم پر وہ غالب تھا - علم و ادب تمدن اور معاشرت میں یونان روم کا استاد رہا لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ اتینہ (Athens) اب بھی علم و ادب کا مرکز رہا - دار العلوم اب اتینہ سے منتقل ہو کر روم میں چلا گیا - روم بتدریج اسکندریہ سے سبقت لیگیا - قیاصرہ نے اس کی پوری کوشش کی کہ یونانی ادبیات روم میں بغیر کسی قسم کی اجنبیت محسوس کئے ہوئے پرورش پاتی رہیں - اس نیت سے کتبخانے قائم ہوئے اور ہر قیصر اس میں اضافہ کرتا رہا - سسرو (Cicero) جیسا زبردست ادیب و مقرر اسی زمانہ میں گذرا ہے

"یونانی رومی دور" کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے - پہلا دور تو وہ ہے جس کی ابتدا ۱۴۶ سنہ ق - م سے ہوتی ہے اور جمہوریۂ رومہ کے اختتام تک جاری رہتا ہے - اس دور میں ایک زبردست ادیب فولیبیوس (Polybius) تھا جو فن واقعہ نگاری کا ماہر تھا - لیکن اس کا اسلوب بیان خالص ادبی تھا - اس میں آزاد نگاری - سادگی اور سہولت نمایاں طور پر پائی جاتی ہے - اس کے بعد ایک اور مؤرخ بھی مقبول ہوا جسکا نام دیودورس (Diodorus) تھا - یہ طرز جدید کا پیرو تھا

دوسرا دور آغطوس سے جسٹینیان (Justinian) تک ہے - اس دور میں یونانی ادبیات وسعت و مقدار کے لحاظ سے شاید ہر دور سے آگے بڑھ گئے تھے - تقریباً سلطنت کے ہر گوشہ میں یونانی زبان بولی

جاتی تھی - ادبیات کا ایک ذخیرہ پہلے سے موجود تھا جس کو سامنے رکھ کر ناقدین اور مفسرین کو اپنی اپنی جولانی قلم دکھانے کا پورا میدان تھا - لیکن اس دور میں جو سب سے بڑی کمی ہم کو نظر آتی ہے وہ اختراع اور طباعی کی کمی ہے نہ خیالات میں کہیں ندرت ہے نہ اسلوب میں - اس کلیہ سے دو ہستیوں کو مستثنیٰ کرنا پڑتا ہے - ایک تو لوشین (Lucian) دوسرا پلوٹارک (plutarch)

اس دور کی نثر کو چار شعبوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے - (۱) تواریخ و سوانح - اور جغرافیہ اور اس سلسلہ میں پلوٹارک ڈیونی سیس (Dionysius) جوسیفس (Josephus) ہیرودین (Herodian) وغیرہ کے نام یادگار ہیں - علم و حکمت کے تحت میں جولیس پولکس (Julius pollux) کے لغات جالینوس (Galen) کا تحشیہ و توضیح جو اس نے بقراط و افلاطون پر کیں قابل ذکر کارنامے ہیں

علم بلاغت (Rhetoric) پر سب سے بڑے مصنف ہرماغورس (Hermogoras) ہرماجینز (Hermagenes) اور کاسیوس لانجینوس (Cassius Longinus) ہیں - فلسفہ میں اپکٹیٹوس (Epictetus) اور مارکس اریلیس (Marcus Aurelius) جو رواقیت (Stoicism) کے علمبردار تھے اور فلاطینوس (Plotinus) فورفیرس (porphyrus) جمبلیخوس (Jamblichus) جو اشراقیت کے مبلغ تھے ہر ملک اور ہر زمانے کے لئے یادگار ہیں

اس دور کی شاعری کوئی ایسی بات نہیں جو قابل توجہ ہو - چند صوفیانہ نظموں اور چند اخلاقی منظومات کے علاوہ اور کوئی گراں قدر شاعری ہم کو نہیں نظر آتی

دورِ بازنطینی

بازنطینی ادبیات سے وہ ادبی کارنامے مراد ہیں جو بازنطینی دور حکومت میں یونانی زبان میں لکھے گئے - اس دور کا خاتمہ فتح قسطنطنیہ کے ساتھ ۱۴۵۳ء میں ہوا - یہ وہ زمانہ تھا جب مسیحیت برسر اقتدار ہو چکی تھی، قدیم روایت یونان کا قلع قمع ہو چکا تھا اور جو کچھ یونانی زبان میں لکھا جاتا تھا وہ مسیحیت سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور رکھتا تھا - نتیجہ یہ ہوا کہ یونانی زبان میں نہ وہ ترنم رہا نہ وہ شاعری، صرف روزمرہ کے محاورے رہ گئے تھے - لیکن چونکہ روایات قدیمہ کا کچھ نہ کچھ اب تک اثر باقی تھا - اور بازنطینی دور میں بھی ملک کی زبان یونانی ہی تھی اس لئے (بازنطینی) عمرانیت بھی باوجود اپنی مسیحیت کے بڑی حد تک یونانی ہی رہی

بازنطینی تمدن میں رومی عنصر بھی پایا جاتا ہے اور یہ عنصر بھی ایک زبردست اہمیت رکھتا ہے - یہ ظاہر

اگرچہ بائزنطینی حکومت یونانی ہی تھی لیکن دراصل نظام حکومت - آئین و قوانین - فوجی اور بحری انتظامات میں رومیوں کی تقلید صاف نمایاں تھی۔ یہی نہیں بلکہ یونانی زبان میں بھی رومی عنصر داخل ہوگیا تھا گو ادبیات میں اس کا سخت لحاظ رکھا گیا کہ رومیت نہ آنے پائے

لیکن جس چیز نے قدیم یونانی عمرانیت پر سب سے زیادہ گہرا اثر کیا وہ مسیحیت تھی۔ جس کے تسلط کے لئے پہلے ہی سے "رواقیت" (Stoicism) اور اشراقیت نے زمین تیار کر چھوڑی تھی۔ لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ قدیم یونانیت (Hellenism) سرے سے نابود ہوگئی تھی۔ نہیں بلکہ اس نے ارتقا کر کے ایک نئی صورت اختیار کر لی تھی اور کم از کم نظام تعلیم تو دور مسیحیت میں بھی بہت بڑی حد تک خالص یونانی رہا

اس کے بعد مشرقیت کا دور آتا ہے جس نے بائزنطینی تمدن کی تہذیب و تکمیل میں بہت بڑا حصہ لیا۔ اس سے بہت پہلے خود مشرقی ممالک میں سکندر کے فتوحات کے ساتھ یونانی عمرانیت پھیل چکی تھی۔ اور اب یہ ممالک خود ترقی کر کے اس قابل ہوگئے تھے کہ یونانی ممالک پر اپنا اثر ڈالیں۔ چنانچہ ان ممالک میں مصر سب سے آگے رہا خانقاہی زندگی جو بائزنطینی حکومت کی ایک خاص چیز ہے مصر ہی سے شروع ہوئی

شام اور فلسطین میں یونانی تمدن کا اثر بہت بعد میں شروع ہوا یعنے تیسری صدی عیسوی سے لے کر آٹھویں صدی تک جن مقامات نے اس سلسلہ میں نمود حاصل کی وہ انطاکیہ غزا (Gaza) اور بریطوس (Berytus) ہیں

بائزنطینی دور کی علمی و ادبی زندگی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں غالب عنصر مذہبیت کا ہے مذہب کے بعد جس چیز کو اہمیت دی گئی وہ تاریخ ہے۔ سب سے زیادہ جس زمانہ میں مذہب اور دینیات کا چرچا رہا وہ چوتھی صدی عیسوی ہے۔ مذہب اور دینیات ہی کے سلسلہ میں شہدا اور اولیاء کے تذکروں کو بھی شامل کر لینا چاہیئے۔ ان تذکروں میں ایک خاص بات یہ ہے کہ مصنف اپنے کو عوام کے سامنے پیش نہیں کرتا۔ بیشتر تذکرے گمنام چھپے ہیں۔ اس دور کی شاعری کا تعلق زیادہ تر مذہبیات سے رہا۔ اور اس شعبہ میں شعراء نے پورا کمال دکھایا لیکن اس کا کیا علاج کہ اس قسم کی شاعری قدرتاً شاعری نہیں ہوتی اور "جریدۂ عالم" پر ہمیشہ کے لئے ثبت نہیں ہو سکتی

بائزنطینی دور میں دو خاص فرقے فلسفیوں کے تھے۔ ایک تو "فیثا غوریت جدید" (Neo Pythagoreanism) اور دوسرا "فلاطونیت جدید" یا حکمت الاشراق (Neo Platonism) موخرالذکر نے مسیحیت کی تبلیغ میں بڑی مدد دی۔ اس فلسفہ کا آخری

علمبردار پراقلس (Proclus) تھا
شاعری میں مذہبیات سے ہٹ کر اگرچہ غیر مذہبی شعرا بھی موجود تھے - لیکن ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی - غیر مذہبی شاعری میں کچھ اخلاقی شاعری البتہ قابل توجہ ہے
اسی سلسلہ میں ان منظوم رومان (Romances) کا ذکر بھی ضرور ہے جو متقدمین کی تقلید میں لکھے گئے - ان کی ابتدا بارھویں صدی عیسوی سے ہوتی ہے لیکن ان میں وہ لذت نہیں ہے جو رومان میں ہونا چاہیے
بائزنطینی دور کا مطمح نظر کچھ اسقدر خارجی اور غیر ذاتی تھا کہ اس میں غزل (Lyric) کی تلاش بیکار ہے - چند بے کیف غزلیں موجود ہیں - جنکو صرف یادگار اسلاف سمجھ کر پڑھا جا سکتا ہے - اسی طرح ڈرامہ کو اس دور میں ابھرنے کا موقع نہیں ملا - چند ڈرامے لکھے گئے جن کو صرف تاریخی حیثیت سے سروکار تھا

دورِ جدید - فتح قسطنطنیہ کے بعد یونان کی قومی زندگی معرض زوال میں آگئی اور اس کے ساتھ ہی علم و ادب کو بھی زوال شروع ہو گیا - طلبہ اور علما اپنے وطن چھوڑ کر ہجرت پر مجبور ہوئے
آل عثمان نے مسیحیوں کو زیر کر لیا تھا لیکن پہاڑی ممالک میں اب بھی آزادی کا پورا جوش موجود تھا چنانچہ کلیفتھ (Klephth) اور ہائیڈک (Haiduk) قوموں نے اپنی حریت کو غیر قوموں کے غلبہ سے محفوظ رکھا - یہ لوگ جیسی پرخطر اور بہادرانہ زندگی بسر کر رہے تھے اور جیسے جیسے مہمات سر کر رہے تھے ان کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں رجزی قسم کے ادبیات پیدا ہو گئے جو صرف منظومات کی صورت میں تھے وہ اپنے بہادر سورماؤں کے جنگی کارناموں کو منظوم کر کر کے گاتے تھے اور خوش ہوتے تھے - ان منظومات میں کوہستانی اور چراگاہی زندگی کی بو باس کافی موجود ہے
اسی طرح کریٹ (Crete) میں جو فتح قسطنطنیہ کے بعد اہل وینس کے قبضہ میں رہا ایک خاص طبقہ شعرا کا پیدا ہو گیا جو اپنی مقامی زبان میں اطالوی اسلوب کے زیر اثر شاعری کرتا تھا۔
فتح قسطنطنیہ کے بعد چند حامیان قوم نے یونانی علوم کو یورپ میں پھیلانے کی کوشش کی - لیکن ان لوگوں کے ادبی کارنامے کوئی اختراعی حیثیت نہیں رکھتے - ان کو صرف تبلیغی اہمیت حاصل ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ بہت بڑی اہمیت ہے - چنانچہ سینٹ مارک (St Mark) ویٹکن (Vetican) اور پیرس کے کتبخانے انھیں کے مساعی جمیلہ کی یادگار ہیں - ان لوگوں نے سب سے زیادہ جس بات کی کوشش کی وہ افلاطون اور ارسطو کے فلسفہ کو زندہ کرنا تھا - لیکن اب یہ فلسفہ فلسفہ نہیں رہا تھا - بلکہ مذہب سے ملا دیا گیا تھا جس نے کچھ دنوں بعد علم کلام (Scholastic philosophy) کی صورت پکڑ لی

سولھویں صدی عیسوی کے نثر نگاروں میں چند مورخ اور واقعات نگار ہیں جن کو خاصی اہمیت حاصل ہے - انھوں نے قسطنطنیہ - قبرس اور کریٹ وغیرہ کی تاریخ مرتب کی

اٹھارہویں صدی میں ایک نئی ادبی تحریک شروع ہوئی - یہ تحریک اس قومی شورش کا پیش خیمہ تھی جس نے آخر میں یونان کو آزادی کی دولت سے مالا مال کر دیا - اس تحریک میں قدیم شاہی خاندان نے لوگ اور امرا و اعیان شامل تھے - اور ان کا سب سے بڑا مقصد قوم میں تعلیم و تربیت پھیلانا تھا - جگہ جگہ مدرسے قائم ہونے لگے - یورپ کے مختلف زبانوں سے ترجمے کرکے شائع کئے جانے لگے - نوجوان اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر دوسرے ممالک میں تعلیم حاصل کرنے کی نیت سے جانے لگے اور جب وہ فارغ التحصیل ہو کر آتے تو ترقی کا نعرہ ان کی زبان پر ہوتا

اس تحریک میں جن شاعروں نے حصہ لیا ان میں قسطنطنوس ریگا س (Constantinos Rhigas) سب سے آگے تھا - اس نے اپنے قومی ترانوں سے قوم میں ایک آگ لگا دی اس کے قدم بقدم چند اور نامور شعرا بھی چلے اور اپنے ہم قوموں کو ابھارنے میں انھوں نے زبردست حصہ لیا اس دور کی شاعری اگرچہ موسمی اور وقتی تھی - لیکن اسلوب کی دلکشی اور حسن ادا میں وہ کسی دور کی شاعری سے پیچھے نہ تھی - نثر میں بھی وہی قومیت کا جذبہ غالب تھا جو شاعری میں تھا - مؤرخوں نے یونان کی تاریخیں لکھیں اور نہایت دلکش اور برانگیختہ کرنے والے پیرایہ میں لکھیں - لیکن جس مصنف نے اس قومی تحریک پر سب سے زیادہ اثر ڈالا اور جس نے ادبیات یونان کے مستقبل کو سنبھال لیا وہ ادامنطیوس قورائیس (Adamantios Coraes) ہے یہ شخص لسانیات کا ماہر تھا - اس میں وطنیت کا جذبہ موجود تھا - اس نے مستند یونانی مصنفوں کو مع تحشیہ و تبصرہ شائع کر کرکے اپنے ہم قوموں میں ایک ادبی ذوق کے ساتھ ساتھ ناز و پندار بھی پیدا کر دیا - لیکن قورائیس کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ وہ جدید زبان کا موجد ہے

موجودہ زمانہ میں دو قسم کی یونانی زبانیں ہیں ایک تو روزمرہ بول چال کی اور دوسری ادبی زبان روزمرہ کی زبان پڑھائی نہیں جاتی بلکہ تمام یونانی ممالک میں چند مقامی محاوروں کے امتزاج کے ساتھ بولی جاتی ہے - یہ زبان دراصل قدیم ترین زبان کی ایک ارتقائی صورت ہے - قورائیس نے جو زبردست کام کیا وہ یہ تھا کہ عوام کی زبان اور خواص کی پرتکلف زبان کو ملا کر ایک نئی طرح ڈالی - یہی زبان اب تک رائج ہے - لیکن شاعروں نے زیادہ تر ادبی زبان کا استعمال جاری رکھا لیکن بعض ایسے بھی شعرا ہوئے ہیں جنھوں نے عوام کی زبان اختیار کی - مجموعی حیثیت سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ باوجود اس کے کہ ایتھنز کا دار العلوم شاعری کی حوصلہ

افزائی کرتا رہتا ہے۔ اور باوجود اس کے کہ سالانہ مشاعرے ہوا کرتے ہیں تاہم شاعری کو کوئی خاص مرتبہ وہاں حاصل نہ ہوسکا

حال میں ڈرامے کثرت سے لکھے گئے ہیں۔ غیر زبانوں سے متعدد ڈرامے ترجمہ ہوکر یونانی زبان میں آگئے ہیں لیکن جس ندرت اور اختراع کے لئے یونان دنیا میں مشہور تھا اس کا کہیں پتہ نہیں ہے

شاعروں کی طرح نثر نگاروں نے بھی ادبی زبان کو اختیار کیا۔ تواریخ نگاری کا سلسلہ اب تک جاری ہے لیکن اب تک کوئی شاہکار ایسا نہیں پیدا ہوسکا جو اس دور کی یادگار بن سکے۔ یونان میں کوئی بڑا ناول نگار بھی نہیں پیدا ہوا ہے۔ آزادئ یونان کے بعد شروع شروع میں جو افسانے لکھے گئے وہ غیر زبانوں سے ماخوذ تھے۔ اور اب بھی طبع زاد افسانے یا ناول وہاں بہت کم نظر آتے ہیں

چند نثر نگار ایسے بھی ہیں جو عوام کی زبان میں لکھنا پسند کرتے ہیں ان میں جان پکاری (John Psichari) بہت مقبول ہے۔ یہ شخص پیرس میں پروفیسر ہے

جوش کی شاعرانہ لغزشیں

جس وقت میں نے یہ سلسلہ شروع کیا۔ مجھے یقین تھا کہ جناب جوش کی طرف سے جواب تنقید ضرور شائع ہوگا اور اگر مجھ سے ان کا کلام سمجھنے میں کسی جگہ غلطی ہو گئی ہے تو اس پر مجھ کو متنبہ کیا جائے گا، لیکن اس وقت تک کہ سات ماہ اس سلسلہ کو جاری ہوئے ہو چکے ہیں، کوئی جواب میری نگاہ سے نہیں گزرا

علی گڈھ اور لاہور کے بعض رسائل میں دو چار مضمون ضرور ایسے شائع ہوئے ہیں جن میں مجھ سے خطاب کرکے میرے معائب و نقائص، میری نااہلی و تنگ نظری، میری کم ظرفی و خباثت پر روشنی ڈالی گئی ہے، لیکن میری تنقید کا جواب اب تک کسی نے نہیں دیا ——— ان مضامین میں جوش کی حمایت تو کی گئی ہے، لیکن جوش کی شاعری کی نہیں۔ یعنی یہ تو ضرور ظاہر کیا گیا ہے کہ میں یہ تنقید صرف اس لئے کر رہا ہوں کہ جوش کی جگہ مجھے مل جائے، لیکن جو معائب و نقائص میں بتا رہا ہوں اس کا جواب کسی نے نہیں دیا ——— ظاہر ہے کہ ایسے مضامین کا جواب میرے پاس کوئی نہیں ہو سکتا اور نہ آیندہ مجھ سے ان کا جواب دینے کی توقع رکھی جائے، البتہ اگر اصل تنقید کے متعلق کوئی مضمون شائع ہوا تو میں اس پر غور کروں گا۔ اور دیکھوں گا کہ مجیب نے کس حد تک انصاف سے کام لیا ہے

یہ چند سطریں میں نے اس لئے لکھ دیں تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ اگر واقعی جوش کی حمایت کرنا ہے تو میری ذاتیات سے بحث کرنا کسی طرح مفید نہیں ہو سکتا، بلکہ انھیں صرف ان اعتراضات کے رفع کرنے کی کوشش کرنا چاہئے جو میری طرف سے پیش کئے جاتے ہیں

میں فی الحال اس امر کی صراحت مناسب نہیں سمجھتا کہ یہ سلسلہ کس قدر پسند کیا جا رہا ہے اور کتنے آدمی ایسے ہیں جنھوں نے مجھے لکھا کہ ——— جوش کی حقیقت تو انھیں آج ہی اس تنقید کے بعد معلوم ہوئی۔ بہر حال میں اس سلسلہ کو چند دن اور جاری رکھنا چاہتا ہوں تاکہ لوگ "تنقید عالیہ" کے مفہوم کو سمجھ سکیں اور شاعری کو اس قدر آسان نہ سمجھیں جتنی بظاہر وہ معلوم ہوتی ہے

جوش صاحب کی ایک بڑی معرکۃ الآرا نظم وہ ہے جو "ہم لوگ" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے

اور جسے میں نے خود اُن کی زبان سے بھی ایک خاص صحبت میں سنا ہے ــــــ اس نظم کا مقصود شاعر کی بلند حقیقت کو ظاہر کرنا ہے، کیونکہ "ہم لوگ" سے جوشؔ کی مراد صرف شاعر ہی ہو سکتی ہے جو عالمِ اخلاق و تمدن میں چاہے کچھ ہو لیکن "لاف و گزاف" کی دنیا میں تو واقعتاً اس کا جواب نہیں

جوشؔ نے اس نظم کو جس شعر سے شروع کیا ہے اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہوتی ہے کہ براہِ راست شاعر کی عظمت کو برسرِ کار لانا ان کا مقصود نہیں ہے بلکہ مدعا صرف یہ کہنا ہے کہ ہم لوگ جو اس طرح پریشان روزگار و خستہ حال نظر آتے ہیں، یہ زمانہ کی ناقدری و نااہلی ہے، ورنہ آج ہم بھی صاحبِ عروج و اقتدار ہوتے پہلا شعر ملاحظہ ہو:۔

خزاں کے جور سے ہرچند خوار ہیں ہم لوگ   مگر امانتِ فصلِ بہار ہیں ہم لوگ

اس شعر میں شاعر نے اپنی خواری کو تسلیم کر لیا ہے، لیکن اس کے بعد کا شعر ملاحظہ ہو:۔

اجل سے اور بھی بڑھ جائیگا جلال اپنا   خدا گواہ کہ وہ تاجدار ہیں ہم لوگ

اس میں اپنے کو تاجدار مان کر یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ (ہرچند اب بھی ہم صاحبِ جلال ہیں لیکن) اجل سے یہ جلال اور بڑھ جائے گا، علاوہ اس نقص کے کہ معناً یہ شعر پہلے شعر کے منافی ہے (کیونکہ جس کیفیت و حالت کو پہلے شعر میں جورِ خزاں سے ظاہر کیا ہے اسی کو دوسرے شعر میں اجل سے تعبیر کیا ہے، لیکن وہاں خواری کا اقرار ہے اور یہاں جلال بڑھ جانے کا ادعا) دوسرا نقص یہ ہے کہ اجل سے جلال بڑھنے کے لئے تاجدار کی تخصیص بالکل بیکار ہے۔ چونکہ اجل کے معنی موت کے ہیں اس لئے بجائے جلال اور تاجدار کے ایسے الفاظ استعمال کرنا چاہئے تھے جو مفہوم موت کے ضد واقع ہوتے یعنی اگر اس مفہوم کو اسطرح ادا کیا جاتا کہ "ہم وہ کہ جن کی زندگی وہ زندگی ہے جو موت سے اور زیادہ پائدار ہو جاتی ہے" تو حسنِ توازن بھی پیدا ہو جاتا اور پہلے شعر کے مفہوم سے بھی متعلق ہو جاتا۔ تیسرا شعر ہے:۔

ہر ایک سانس ہے گو صد ہزار حشر بدوش   مگر پیامِ ثبات و قرار ہیں ہم لوگ

اس شعر میں لفظ حشر بالکل بے محل استعمال کیا گیا ہے۔ حشر کے معنے قیامت کے ہیں اور مجازاً ہنگامہ کے مفہوم میں بھی مستعمل ہوتا ہے لیکن یہاں دونوں میں سے کسی کا محل نہیں۔ شاعر کا مقصود صرف یہ کہنا ہے کہ ہرچند ہماری زندگی کا ہر لمحہ اضطراب و پریشانی میں بسر ہوتا ہے، لیکن حقیقتاً ہم ثبات و قرار کے پیامبر ہیں ــــ لیکن لفظ حشر سے یہ مفہوم پیدا نہیں ہوتا۔ بجائے اس کے کوئی ایسا لفظ استعمال کرنا چاہئے تھا جو ثبات و قرار کا ضد ہوتا۔ مثلاً اگر یوں کہتے کہ

ہر ایک سانس ہے گو اضطراب کی تصویر

تو یہ عیب دور ہو جاتا

چوتھا شعر:-

جلال چھو نہیں سکتا ہے باد و باراں کا وہ دستِ غیب کے نقش و نگار ہیں ہم لوگ

اس شعر کو دو لفظوں نے غارت کر دیا: جلال اور دستِ غیب۔ لفظ جلال ہمیشہ اس وقت استعمال کرتے ہیں جب کسی کی عظمت ظاہر کرنا ہوتی ہے، لیکن یہاں باد و باراں کے لئے یہ لفظ صرف تباہکاری کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ رہا دستِ غیب سو اس کا یہاں کوئی محل ہی نہیں تھا۔ شعر کا مفہوم یہ ہے کہ ہم دہر کے وہ نقش و نگار ہیں جن کو طوفان حوادث کبھی تباہ کر ہی نہیں سکتے۔ اس لئے بجائے دستِ غیب کے کوئی ایسا لفظ لانا چاہیے تھا جو تعمیر کے معنے پیدا کرتا مثلاً ایوان یا قصر وغیرہ اور جلال کی جگہ غارت و بربادی کا مفہوم ظاہر کرنے والا لفظ لانا چاہیے تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ دستِ غیب سے مراد دستِ خدا ہے اور دستِ غیب کے نقش و نگار سے مراد (دستِ خدا کا بنایا ہوا نقش و نگار) ہے تو شعر سے متبادر نہیں اور دستِ خدا ظاہر کرنے کے لئے دستِ غیب استعمال کرنا جبکہ اردو میں یہ عام طور پر کسی اور معنے کے لئے استعمال ہوتا ہے، کسی طرح موزوں و مناسب نہیں ہو سکتا

پانچواں شعر:-

رہِ جنوں میں ہمارا غرور ارے توبہ بساطِ عقل پہ گو خاکسار ہیں ہم لوگ

یہ شعر مفہوم کے لحاظ سے رکیک ہے کیونکہ اس سے یہ مطلب پیدا ہوتا ہے کہ "گو ہم عقل و دانش سے بے بہرہ ہیں لیکن ہمیں اپنی جنون و دیوانگی ہی پر ناز ہے" ——— میں نہیں سمجھ سکتا کہ وہ شخص جو اپنے آپ کو "دستِ غیب کا نقش و نگار" کہے اسے فہم و عقل سے بیزاری پر اسقدر ناز کرنا چاہیے۔ اگر لفظ عقل کے ساتھ کوئی صفت ایسی بڑھا دی جاتی جو اس کی اہمیت کو گھٹا دینے والی ہے (مثلاً ہرزہ کار) تو یہ نقص دور ہو جاتا یا پھر مصرعہ کا مصرعہ طنزیاتی رنگ میں یا بصورت استفہام انکاری لایا جاتا اور پہلے مصرعہ میں اسی کی تصدیق ہوتی تو یہ عیب پیدا نہ ہوتا۔ علاوہ اس معنوی نقص کے، پہلے مصرعہ میں ارے توبہ کا استعمال بالکل بے محل کیا گیا ہے۔ ارے توبہ حیرت و استعجاب کے محل پر استعمال کیا جاتا ہے جس میں ہلکی سی تعریض بھی شامل ہوتی ہے، اسی لئے اس کو ہمیشہ دوسرے کے لئے استعمال کرتے ہیں، یعنی اگر کسی اور میں کوئی ایسی صفت پائی جائے جس پر تعریضی یا تنقیدی استعجاب ظاہر کرنا مقصود ہو تو ارے توبہ استعمال کریں گے، لیکن خود اپنی ہی کسی صفت یا حالت کے لئے کبھی اس کا استعمال موزوں نہ ہوگا ——— یہاں شاعر نے خود اپنے ہی لئے اس کو استعمال کیا ہے جو درست نہیں۔ اسی کے ساتھ ارے توبہ میں جو کیفیتِ نسائیت پائی جاتی ہے وہ بھی اس کی مقتضی نہیں کہ اس کا استعمال ایک تاجدار

اور دستِ عیب کے نقش و نگار کی طرف سے کیا جاتا۔ پہلا مصرعہ یوں ہوتا تو بہتر تھا
روجنوں میں ہمارا غرور تو دیکھو

چھٹا شعر:-

زمیں سے کرتے ہیں ناز اور آسماں سے غرور   فروتنی میں بھی وہ باوقار ہیں ہم لوگ

دوسرے مصرعہ میں باوقار ہلکا لفظ ہے۔ زمین و آسمان پر ناز و غرور کرنے کے لیئے اس سے زیادہ وزنی صفت ڈھونڈھنی چاہئے تھی ـــــ علاوہ اس کے پہلے مصرعہ میں زمین سے ناز کرنے کا مطلب واضح نہیں ہوتا فروتنی کے مقابلہ میں آسمان سے غرور کرنا تو کہہ سکتے ہیں لیکن زمین سے ناز کرنا۔ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اگر یوں کہا جاتا کہ زمین ہم پر ناز کرتی ہے تو ایک بات بھی تھی

ساتواں شعر:-

عیاں ہیں جن پہ تہیدستیاں سلاطیں کی   لباسِ فقر میں وہ شہریار ہیں ہملوگ

ایک شہریار کا دوسرے شہریار یا ایک سلطان کا دوسرے سلطان کے مقابلہ میں تہیدست ہونا کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں۔ اگر شہریار کے بجائے کوئی ایسا لفظ استعمال کیا جاتا جو لفظ سلطان کا ضد ہوتا اور فقیر و نادار کے معنے پیدا کرتا تو تقابل درست ہو سکتا تھا

آٹھواں شعر:-

جہاں میں ہیں مگر اہلِ جہاں سے کام نہیں   وطن میں رہ کے غریب الدیار ہیں ہملوگ

غریب الدیار اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی دوسری جگہ وطن سے دور جا پڑا ہو اور وہاں وہ کس مپرسی کی حالت میں پڑا ہو۔ لیکن پہلے مصرعہ سے جو مفہوم پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ شاعر خود ہی اہل جہان سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتا اس لیئے اس کو بجائے غریب الدیار کہنے کے کوئی ایسی صفت لانی چاہیئے تھی۔ جس سے اس کا استغنا ظاہر ہو، اس کی بے نیازی مستنبط ہو سکتی ـــــ لفظ غریب الدیار میں ایک کیفیت ہے استرحام کی، طلب رحم کی جو نہ صرف پہلے مصرعہ بلکہ پوری نظم کے مفہوم کے لحاظ سے بالکل ناموزوں ہے

دسواں شعر:-

جوانیوں کو ہمیں سے ملی ہے نعمتِ ناز   کہ رازِ طرۂ گیسوئے یار ہیں ہم لوگ

شعر سے جو مفہوم پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ طرۂ گیسوئے یار کا باعث ہم لوگ ہیں اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ جوانیوں میں کیفیت فخر و ناز ہمیں سے پیدا ہوئی ہے

"طرۂ گیسوئے یار" اور جوانی میں باہمدگر کوئی نسبت لزومی نہیں پائی جاتی، لیعنی یہ ضرور نہیں کہ ہر

صاحب گیسو جوان ہو یا ہر جوان صاحب گیسوے دراز ہو گیسو کا تعلق فی الجملہ حسن و جمال سے ضرور ہے، اس لئے بجائے جوانی کے انھیں کوئی لفظ حسن و جمال کا مفہوم پیدا کرنے والا استعمال کرنا چاہیئے تھا

گیارہواں شعر:-

فشردۂ غم ہستی سے کھینچتے ہیں شراب بساطِ عیش پہ وہ بادہ خوار ہیں ہم لوگ

دوسرے مصرعہ میں لفظ عیش بالکل بے محل استعمال ہوا ہے کیونکہ پہلے مصرعہ میں غم ہستی اس کے منافی لایا گیا ہے۔ بجائے عیش کے لفظ (عجز) یا (خاک) استعمال کرنا چاہیئے تھا!

بساطِ عجز پہ وہ بادہ خوار ہیں ہم لوگ

بارہواں شعر:-

چمن میں سنتے ہیں ہر صبح نغمۂ الہام امینِ زمزمۂ شاخسار ہیں ہم لوگ

"امین زمزمۂ شاخسار" یعنی چمن سے جو زمزمۂ طیور پیدا ہوتا ہے اس کے سننے اور سمجھنے والے — اسی زمزمۂ شاخسار کی پہلے مصرعہ میں نغمۂ الہام سے تعبیر کی گئی ہے۔ اس لئے شعر کا مفہوم یہ ہوا کہ ہم لوگ ہر صبح طیور کی نغمہ سرائی سے کیفیت الہام حاصل کرتے ہیں —— بہتر ہے حاصل کیجئے، لیکن اس سے معارضہ کی صورت کیا پیدا ہوتی ہے، یعنی جب تک فریق ثانی کے متعلق کوئی خبر نہ دی جائے۔ اور مقابلتاً یہ نہ بتایا جائے کہ وہ زمزمۂ طیور سے کیا کیفیت حاصل کرتا ہے، اس وقت تک اس دعوے سے کوئی نتیجہ پیدا نہیں ہوتا

تیرہواں شعر:-

جگر ہے وقت کا اپنی جناب میں صد چاک وہ فاتح غم لیل و نہار ہیں ہم لوگ

وقت کا جگر کیا چیز ہے اور اس کا چاک ہونا کیا معنی۔ جگر کا چاک ہونا اس وقت بولتے ہیں جب انتہائی غم والم کی کیفیت ظاہر کی جائے۔ ۔۔ ۔ لیکن تاویل رکیک کے بعد بھی اس مصرعہ کا مفہوم اگر کوئی پیدا ہو سکتا ہے تو صرف یہ کہ "وقت و زمانہ ہمارا ماتم زدہ ہے، ہمارا سوگوار ہے، ہمارے لئے سر دھنتا ہے وغیرہ وغیرہ" لیکن پہلے مصرعہ میں لفظ جناب کا استعمال اور دوسرا مصرعہ پورے کا پورا جس میں غم لیل و نہار کو مغلوب کر لینے کا ادعا کیا گیا ہے۔ اس مفہوم کو پیدا ہونے نہیں دیتا، اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جوش نے جگر چاک ہونا بمعنی تذلیل استعمال کیا ہے اور یہ مفہوم ظاہر کرنا چاہا ہے کہ "وقت و زمانہ ہمارے حضور میں اظہار عجز و بیچارگی اور اعتراف شکست و مغلوبی کر رہا ہے" درانحالیکہ اس مفہوم میں کبھی جگر چاکی استعمال ہی نہیں کی جاتی۔ یہ شعر اس نظم کے مہمل ترین اشعار میں سے ہے

اسی پایہ کا بے معنی شعر ایک اور یہ ہے:-

وہ جبر دوست جسے اختیار کہتے ہیں اس اختیار سے بے اختیار ہیں ہملوگ

اگر اس شعر میں مسئلۂ جبر و اختیار سے بحث کی گئی ہے جیسا کہ بظاہر معلوم ہوتا ہے تو اس شعر کا کوئی مفہوم نہیں کیونکہ جبر کو کوئی اختیار نہیں کہتا اور اگر کسی عاشقانہ کیفیت کا اظہار کیا گیا ہے تو اور زیادہ مہمل ہے۔ بہر حال یہ شعر بالکل بے معنی ہے جسکا تعلق نہ نظم کے مفہوم سے ہے، نہ کسی اور جذبہ سے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اہمال اسی جبر دوست کے زیر اثر پیدا ہو گیا ہے جس کا نام اختیار رکھنے کے بعد وہ بے اختیارانہ طور پر بہک گئے ہیں

اٹھارواں شعر:-

حیاتِ دہر کہ ہے مستقل شبِ تاریک اسی کے عابدِ شب زندہ دار ہیں ہملوگ

چونکہ پہلے مصرعہ میں لفظ شب آگیا ہے اس لئے دوسرے مصرعہ میں اس کی تکرار مخل فصاحت ہے اگر پہلا مصرعہ یوں ادا کیا جاتا کہ

حیاتِ دہر کہ ہے اک طویل تاریکی

تو یہ عیب نہ پیدا ہوتا

انیسواں شعر:-

بجھے پڑے ہیں زمانہ کے ہاتھ سے ہر چند مگر بہمبر برق و شرار ہیں ہم لوگ

یہ شعر اور شعروں کے مفہوم سے متناقض واقع ہوا ہے۔ وہ شخص جو اس سے پہلے اپنے آپ کو فاتح غم لیل و نہار کہہ چکا ہو، جو دستِ غیب کا نقش و نگار ہونے کی حیثیت سے اپنے آپ کو طوفان حوادث سے محفوظ ثابت کر چکا ہو۔ اس کا یہ کہنا کہ زمانہ کے ہاتھ سے بجھے پڑے ہیں، کسی طرح موزوں نہیں ہو سکتا

اکیسواں شعر:-

نگاہ روبرو، اے روح نعمتِ دارین ہوش باش کہ یزداں شکار ہیں ہملوگ

جناب جوش کو اپنے اس شعر پر بہت ناز ہے اور غالباً ایک اسی شعر کے لئے ساری نظم لکھنے کی زحمت گوارا کی گئی ہے، اگر واقعی ان کا یہ پندار صحیح ہو تو بھی اس کا امتیاز انھیں حاصل نہیں ہوتا کیونکہ اقبال اس خیال کو پہلے اس طرح ظاہر کر چکا ہے کہ

یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ

اور جوش نے اسی خیال سے اپنے اس شعر کو بنایا ہے۔ لیکن اقبال و جوش یا ایک عالم و عامی شاعر میں جو فرق ہو سکتا ہے وہ اس جگہ کھل کر رہ گیا اور باوجود ایک نفیس خیال ہاتھ آجانے کے بھی جوش نہ صرف یہ کہ اپنے شعر

اس مرتبہ تک نہ پہونچا سکے جو اقبال کے مصرعہ کو حاصل ہے، بلکہ چند در چند غلطیوں میں مبتلا ہو گئے

سب سے بڑی غلطی جوش نے "یزدان شکار" کی ترکیب استعمال کرنے میں کی ہے ـــ انھوں نے اس ترکیب سے وہی مفہوم پیدا کرنا چاہا ہے جو اقبال کے مصرعہ سے پیدا ہوتا ہے، لیکن یہاں معنی بالکل اُلٹے ہوگئے۔ جوش سمجھتے ہیں کہ یزداں شکار کے معنے ہیں "یزداں کو شکار کرنے والے" کے، درانحالیکہ اس کے معنی ہوئے "شکارِ یزداں" کے یعنی "وہ جسے یزداں نے شکار کیا ہے"

لفظ شکار فارسی میں ہمیشہ "شکار کردہ شدہ" کے معنی میں آتا ہے یا اس جانور کے لئے اس کا استعمال کرتے ہیں جسکا شکار کرنا مقصود ہو۔ اس لئے مجازاً مطیع و مغلوب کے معنے میں بھی مستعمل ہوتا ہے

سنجر کاشی لکھتا ہے

جز گہ مژگاں او چو دیدم گفتم   در ہمہ دشت یک شکار ندارد

خان آرزو کا شعر ہے:۔

اے غزالانِ حرم جان من و جان شما   کاں جفا پیشہ صنم بہر شکار آمدہ است

سالک یزدی، مطیع و مغلوب کے معنی میں لکھتا ہے:۔

نو بہار آمد کہ عالم را شکار خود کند   از طراوت موج سنبل دام بر صحرا کشد

یہ لفظ جب مصدری معنی میں آتا ہے تو فارسی میں ہمیشہ زدن، کردن، شدن وغیرہ کے ساتھ اور اردو میں کرنا کے ساتھ۔ اسی لئے فاعلی معنی میں شکار افگن، شکار انداز، شکار گر وغیرہ آتا ہے۔ چنانچہ مرزا صائب کا شعر ہے:۔

چشم بد دور ز مژگان شکار اندازت   کہ بر آہوئے حرم حق طپیدن داری
دلے پرخوں از آں زلف شکار انداز میخواہم   چہ گستاخم کہ خوں کبک از شہباز میخواہم

ابو طالب کلیم لکھتا ہے:۔

خدنگِ آہ شکار افگن ست لیک چہ سود   کہ از ہزار یکے بر نشاں نمی آید

چونکہ لفظ شکار کسی مصدر سے مشتق نہیں ہے اور نہ وہ اسم فاعل کے معنے میں مستعمل ہوتا ہے اس لئے اس کے معنے شکار کرنے والے کے کبھی نہیں آتے اور (یزداں شکار) اس معنی میں استعمال کرنا، جس میں جوش نے استعمال کیا ہے بالکل غلط ہے

شکار کے اسم ہونے کی دلیل یہ بھی ہے کہ اس میں الفاظ نسبت کا اضافہ کرکے شکارگاہ اور شکارستان بناتے ہیں، جیسا کہ ابو طالب کلیم لکھتا ہے:۔

قسمت ما زیں شکارستاں بجز افسوس نیست   دانہ اشک تلخ میگردد بہ چشم دام ما

شکارگاہ معانی ست کنج خلوت من دہ کمان شکارم کمند وحدت من

پھر چونکہ شکار اسم ہے اس لئے دوسرے اسم کے ساتھ اس کی نسبت دو ہی صورتوں سے ہو سکتی ہے یعنی صفت و موصوف کی حالت میں یا مضاف و مضاف الیہ کی۔ ظاہر ہے کہ یہاں نسبت صفت و موصوف کی نہیں ہو سکتی اس لئے لامحالہ مضاف و مضاف الیہ کی نسبت ماننا پڑے گی اور وہ بھی مقلوب جب فک اضافت ہو کر مضاف کا کسرہ غائب ہو جاتا ہے ۔ جیسے بادشاہِ جہاں کو جہان بادشاہ کہنا۔ اور اس صورت میں (یزداں شکار) کے کوئی معنی سوائے (شکارِ یزداں) کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتے جو جوش کے مفہوم و مدعا کا بالکل ضد ہے

دوسری غلطی (نگاہ روبرو) کے استعمال میں کی گئی ہے ۔ سلاطین و امراء کے درباروں میں قاعدہ ہے کہ جب کوئی شخص سامنے آتا ہے اور بادشاہ کو اس کی حاضری کی طرف متوجہ کرنا ہوتا ہے تو نقیب (نگاہ روبرو) کی آواز بلند کرتا ہے گویا وہ بادشاہ سے خطاب کرتا ہے۔ اور سامنے دیکھنے کی التجا کرتا ہے۔ پھر چونکہ اس مصرعہ میں " روح نعمت دارین " کو نگاہ روبرو کہکر خطاب کیا گیا ہے اس لئے اس کی عظمت و برتری ، شاعر نے تسلیم کرلی ہے ، درانحالیکہ وہ شخص جو یزداں کو شکار کرنے والا ہو اس کا کسی دربار میں اس انداز سے حاضر ہونا کہ نقیب کو نگاہ روبرو کہنے کی ضرورت لاحق ہو۔ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس شعر میں تو نعمت دارین سے اس طرح خطاب کرنا چاہئے تھا گویا کہ وہ نہایت معمولی چیز ہے اور اس کو جھک جانے یا پارکاب ہونے کا حکم دیا جاتا ہے

اس پر طرہ یہ ہے کہ دوسرے مصرعہ میں اسی سے (ہوش باش) کہکر خطاب کیا گیا ہے ۔ حیرت ہے کہ جوش صاحب حیدرآباد میں عمر کا کافی حصہ بسر کرنے کے بعد بھی نگاہ روبرو کے صحیح مفہوم سے واقف نہیں ہوئے اور وہ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ (نگاہ روبرو) اور (ہوش باش) دونوں میں تضاد پایا جاتا ہے

دُنیا کو اب مذہب کی ضرورت نہیں ہے

دنیا کا امن و سکون صرف لامذہبیت میں پنہاں ہے

ابتدائے آفرینش سے انسان کسی نہ کسی مذہب کا پیرو چلا آرہا ہے اور اگر صورت حال یہی رہی تو نہ جانے کب تک یہی سلسلہ جاری رہے گا۔ انسان دنیا میں کب آیا، کیونکر آیا؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کے جواب میں عقل تھک تو جاتی ہے مگر ان باتوں کو ماننا نہیں چاہتی جن سے سادہ لوح انسان اپنی نکتہ چیں طبیعت کی پیاس کبھی کبھی بجھاتا رہا ہے۔

تاریخ کے اوراق اس بات کے شاہد ہیں کہ انسان شروع شروع میں ایسا نہ تھا جیسا کہ موجودہ دَور میں ہے بہائم صفتی، وحشت اور جاہلیت سے خدا کے اشرف المخلوقات کا دور حیات شروع ہوتا ہے۔ انسان کی عقل ایام طفولیت میں بہت سی ان باتوں کے سمجھنے سے قاصر تھی جن کو اب معمولی عقل و فراست کا انسان بہت آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ بنی آدم جس وقت کچھ سمجھ کی باتیں کرنے لگا ہوگا تو غالباً اس کا سب سے پہلا سوال یہی ہوا ہوگا کہ ہم کہاں سے آئے اور ہمیں کس نے بنایا؟ ضعیف العقل ہستی کے لئے یہ سوال بڑا پریشان کن ہوا ہوگا۔ اس وقت کے سب سے زیادہ عقلمند انسان نے اپنی ٹوٹی پھوٹی سمجھ سے اس معمہ کو یوں حل کیا ہوگا کہ ہمارا بنانے والا ہم سے زیادہ طاقتور ہے جسے ہم نے اب تک نہیں دیکھا ہے۔ ہم اسی کے بنائے ہوئے بندے ہیں۔ اس جواب پر بڑی خوشیاں منائی گئی ہوں گی اور ہر شخص نے اپنی بساط بھر اس جواب سے اپنی تشفی کرلی ہوگی۔ کچھ دنوں کے بعد جب انسان کی دماغی قابلیت اور بڑھی اور لوگوں نے سوال کرنا شروع کیا کہ "خدا" کیسا ہے اور کہاں رہتا ہے؟ تو اس زمانہ کے بہترین عقل و دماغ کے انسان نے اپنی سمجھ کے موافق پتھر کا ایک بُت بنا کر کہا ہوگا کہ "خدا ایسا ہے" "بت ساز کو یہ فکر ہوئی ہوگی کہ خدا انسان جیسا نہیں ہے۔ وہ ضرور کوئی انوکھی شکل کی ہستی ہوگی جس کی قوت ہماری قوت سے بہت زیادہ ہے اور جس کی عقل ہماری عقل سے بالاتر ہے۔ اس خیال کو بت ساز نے یوں پیش کیا کہ بُت کے متعدد ہات، پاؤں اور سر بنا ڈالے یعنی خدا کی عقل و قوت انسانی عقل و قوت سے زیادہ ہے۔ الغرض اس قسم کے سینکڑوں ہزاروں بت انسان کے معبود ہوگئے۔ رفتہ رفتہ ان بتوں کی اصلی غایت تو مفقود ہوگئی اور انسان

ان بے جان بتوں ہی کو اپنا اصلی خالق تصور کرکے ان کی پوجا کرنے لگا - یہ زمانہ انسانی حیات کا وہ دور تھا جب ہر انسان آپ اپنا مختار تھا - وہ جنگلوں میں رہتا، وہاں کے پھل کھاتا، جنگلی جانوروں سے لڑتا اور پہاڑ کے غاروں میں اپنی زندگی کے دن گذارتا - زمانہ کروٹیں بدلتا رہا، انسان کی تمدنی و معاشرتی حالت بھی بدلتی رہی، اب انسان چھوٹی بڑی بنا کر گاؤں میں رہنے لگا مختلف جگہوں میں اس کی ٹولیاں آباد ہوگئیں - مگر ابھی تک اس کی کوئی باضابطہ سوسائٹی قائم نہ ہوئی تھی - کچھ دنوں کے بعد انسان نے محسوس کیا کہ اس کے باہمی تعلقات بڑھتے جاتے ہیں، ایک انسان کو دوسرے انسان سے دوچار ہونا پڑتا ہے، مضبوط کمزور کو دباتا ہے، کمزور کے درخت کے پھلوں کو توڑ لیتا ہے، اس کی مویشی کا دودھ دوہ لیتا ہے - علیٰ ہذا القیاس اسی طرح ہر چیز میں اپنی قوت کے بل پر کمزور کا حصہ چھین لیتا ہے - جب ایک طاقتور انسان دوسرے طاقتور کی حق تلفی کرنا چاہتا تو یہ حالت جنگ و جدال سے بدل جاتی - جب انسان کی یہ حالت ہوئی اور کسی فرد کی جان محفوظ نظر نہ آنے لگی تو یہ خدا کی مہربانی کہو یا اس زمانہ کے ذی فہم انسان کے دماغ کی اُپج سمجھو کہ اس نے انسان کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھایا جو وہ بتوں کے پوجنے میں دکھلاتا تھا - اس انسان نے کہا " بھائیو! تمھارا بنانے والا تمھاری اس لڑائی سے بہت غصہ ہے - وہ نہیں چاہتا کہ تم آپس میں لڑو اور ایک دوسرے کا گلا گھونٹو - دیکھو وہ تم کو سزا دے گا - اور جب تم مرو گے تو تمھارے جسم کو دہکتی ہوئی آگ میں ڈال کر جلادے گا" انسان جو اس وقت تک بہت سرکش، اور خودمختار تھا - اس سمجھدار انسان کی بات پر چونک اٹھا اور فوراً اپنے معبود کا خیال کرکے سہم گیا - اس عقلمند انسان نے موت کے بعد آگ میں جلانے کی دھمکی دی تھی لیکن موت کے بعد کیا ہوتا ہے، یہ بھی تاہنوز ایک معمہ تھا - مرنے کے بعد کیا مجبوری ہوتی ہے اس کو ہر انسان اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا - اس تقریر نے ایک سناٹے کا عالم پیدا کردیا - ہر شخص سراپا گوش ہوکر سننے لگا - وہ انسان جو اب تک کسی کے دبائے نہ دبتا تھا ایک اندیکھی ہستی کی خفگی اور ایک لامعلوم حصۂ "حیات" کی اذیتوں کے خیال سے رام ہوگیا - یہ موقعہ غنیمت تھا، مقرر نے کہنا شروع کیا " دیکھو خدا چاہتا ہے کہ تم ایک دوسرے سے نہ لڑو، آپس میں ہمدردی کرو اور جو کمزور ہو اس کو بھی برابر کا حصہ دو" یہ بات لوگوں کے دل میں گھر کرگئی - اور اس طرح دنیا میں پہلے مذہب کی بنیاد رکھی گئی جو دیکھا جائے تو صرف سوسائٹی کو قائم رکھنے اور بنی آدم کی زیست کو دنیا میں باقی رکھنے کے لئے پہلا قانون تھا - ابتدائے عالم میں مذہب و حکومت دو چیزیں نہ تھیں بلکہ جو مذہب کا قانون تھا وہی حکومت کا - حکومت کا سردار مذہب کا بھی پیشوا ہوتا تھا

دنیا ترقی کرتی گئی - لوگوں میں عقل کا مادہ بڑھتا گیا - ہر زمانہ میں کوئی نہ کوئی سمجھدار انسان سوسائٹی کی ترقی کے مطابق مذہب میں یا بالفاظ دیگر سوسائٹی کے آداب میں تغیر و تبدل کرتا گیا - اب اس انقلاب کو کسی نے پسند کیا اور کسی نے اپنے پرانے قاعدہ پر قائم رہنا چاہا - اس طرح دنیا میں مختلف مذاہب کی پیدایش ہوئی - اب تک جو انسان

اپنے کھانے، پینے اور اپنے جائز حقوق کے لئے آپس میں لڑتا رہتا تھا - اب مذہب کی وجہ سے لڑنے لگا - یہ انسانی طبیعت کا فطری تقاضا ہے کہ ہر کام کو جس کو وہ کرتا ہے یا ہر بات کو جس کو وہ سوچتا ہے اس کو افضل سمجھتا ہے - اسی خیال کی بنا پر ایک مذہب کا پیرو دوسرے مذہب کے پیرو کو بیوقوف اور غلط راستے کا چلنے والا سمجھنے لگا - وہی قانون جس کا منشا آپس میں اتحاد قائم کرنا اور سوسائٹی کو شر و فساد سے محفوظ رکھنا تھا اب وجہ جنگ و جدال بن گیا - دنیا کا ہر گوشہ معصوم انسان کے مقدس خون سے رنگ گیا لاکھوں جوان رعنا، کروروں قابل ستائش ہستیاں تلوار سونت کر ایک دوسرے پر پل پڑیں - قرون وسطیٰ کی تاریخ کیا ہے؟ اسی جنون مذہب کی خونی کہانی ہے - ایشیا یورپ پر پل پڑا - یورپ ایشیا پر ٹوٹ پڑا - شمال جنوب سے اور مشرق مغرب سے اُلجھ پڑا - تلواریں چلیں، برچھے اور بھالے چلے نہ معلوم کتنی عورتیں بیوہ ہوگئیں اور کتنی ماؤں کے بچے ان کی ماتا بھری گود سے چھین چھین کر مذہب کے دیوتا پر بھینٹ چڑھا دئے گئے - ان لڑائیوں کا نتیجہ کیا ہوا؟ کیا ایک مذہب دوسرے پر سبقت لے گیا؟ کیا ان لڑائیوں سے اسلام دنیا کا سب سے اچھا مذہب ثابت ہوگیا یا یہودی عیسائی سے برتر ہوگئے یا زرتشت بودھ سے؟ کوئی بھی کسی سے افضل نہ ہوا جو اپنی جگہ پر تھا - اور بھی زیادہ جم کر کھڑا ہوگیا - تلوار نے ملک فتح کر لیا مگر دلوں پر قبضہ نہ کرسکی - اگر ایسا ہوتا تو آج ایک مسلمان نہ ہوتا یا ایک عیسائی نہ ہوتا یا ایک یہودی نہ ہوتا

اب دنیا کے مشہور مذاہب پر ایک سرسری نظر ڈالیئے - سب کے پاس ایک مقدس کتاب ہے جس کو وہ آسمانی کتاب سے تعبیر کرتا ہے اور جس کے بل پر وہ اپنی گردن کی رگیں پھلا کر اور منہ میں جھاگ بھر کر بحث کرتا ہے، مجلس مباحثہ قائم کرتا ہے، ایک کہتا ہے "میری کتاب سچی اور تمھاری جھوٹی ہے" دوسرا کہتا ہے "نہیں میری سچی تمھاری جھوٹی ہے" تیسرا کہتا ہے "نہیں تم دونوں جھوٹے اور میں سچا" اسی مضمون پر مہینوں، برسوں بلکہ صدیوں تک بحث کرتا ہے - آخر میں ہر شخص اپنی تشفی یوں کرتا ہے کہ میں جیت گیا اور وہ ہار گیا - ایسی مجالس میں برابر عقل و حواس خمسہ رکھنے والے انسان بیٹھے ہیں اور ایک دوسرے کو جھٹلاتے ہیں ان کی باتوں کا تصفیہ کون کرے - تصفیہ کرنے والا جب ہوگا - کوئی بشر ہی ہوگا جو کسی نہ کسی مذہب کا ماننے والا ضرور ہوگا، وہ یقیناً فیصلہ اپنے مذہب اور خیال کے موافق کرے گا - اب کوئی فرشتہ آئے تو کہے کہ وہ سچا اور یہ جھوٹا ہے - بدقسمتی سے اب تک کوئی فرشتہ نہیں آیا کہ ہر شخص اس کی بات مانے اور نہ امید ہے کہ کبھی کوئی فرشتہ ہماری نظروں کے سامنے آئے گا اور ہماری گتھیوں کو سلجھائے گا - لہٰذا اس بحث سے کوئی حاصل نہیں اور نہ اس سے مذہب کی برتری و بزرگی مانی جاسکتی ہے - اس معمہ کا حل صرف یہی ہے کہ یا تو سب سچے ہیں یا سب جھوٹے

اب ذرا ان مذاہب کی تعلیم کو دیکھو :-

ایک سرخ و سفید انسان لمبا چغہ پہنے، گردن میں صلیب لٹکائے ہوئے کھڑا ہوتا ہے اور کہتا ہے "ہمارا یسوع مسیح

دنیا کا سب سے اچھا نبی ہے، آؤ، اس کے پیغام کو سنو اور اس کا کہا مانو۔ جو کوئی اس کو مانے گا وہ جنت میں جائے گا اور باقی جو ہیں وہ کافر ہیں، ان کو جہنم میں جگہ ملے گی۔ اس لئے ہمارا دین قبول کرو۔ دیکھو یہ ہماری آسمانی کتاب ہے "

ایک لحیم و شحیم ریشمی صافہ باندھے ہوئے، بڑی داڑھی والے مولوی کھڑے ہوتے ہیں اور کہتے ہیں " ہمارے رسول صلعم کو مانو قرآن پاک کو مانو، اس کے احکام کی پیروی کرو۔ اسلام دنیا کا بہترین مذہب ہے۔ اس کے پیرو ہو جاؤ تو جنت میں جاؤگے نہیں تو کافر ہونگے اور جہنم میں جاؤ گے "

ایک نحیف الجثہ، قشقہ و زنار والا نیم برہنہ پنڈت کھڑا ہوتا ہے اور یوں کہتا ہے " بھائیو، ہندو جاتی جیسا کوئی دھرم نہیں۔ یہ دیوتاؤں کا دھرم اور رشیوں کا مذہب ہے۔ سری رام لکشمن جی اور سری منو ہرجی کا یہی مذہب تھا۔ جو ہندو دھرم کی پیروی کو نہیں مانے گا وہ ملکش ہے، اس کے لئے بیکنٹھ نہیں بلکہ نرکھ کی اگنی ہے " وغیرہ وغیرہ

ہر مذہب کی تعلیم کم و بیش یہی ہے کہ صرف اسی مذہب کا پیرو قابل تعظیم ہے ورنہ دیگر مذاہب کا ہر فرد دنیا میں قابل دار اور آخرت میں سزاوار دوزخ ہے۔ ایک ذی روح اگر کرۂ مریخ سے ہماری دنیا میں آئے اور دیکھے کہ ایک انسان جس کی دو آنکھیں ایک ناک، دو کان، ایک منہ اور ایک زبان ہے، دوسرے انسان کو (جو ہو بہو اسی کی طرح ہے اور اس سے کسی بات میں کم نہیں) ایک لایعنی سی بات پر جھوٹا بنا رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ " وہ بیوقوف ہے، غلط راستہ پر ہے، اس کی نہ سنو، میری سنو " تو وہ کس قدر ہنسیگا اور دنیا والوں کو کتنی نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوا آسمان کی طرف پرواز کر جائے گا

تھوڑی دیر کے لئے اپنے دلوں کو تعصب سے پاک کر کے مجھے بے لوث جواب دیجئے:—

میں مسلمان ہوں یعنی خدا، رسول قرآن وغیرہ کا قائل ہوں، بفضلہ، میری آمدنی معقول ہے اور میں نہایت آرام سے زندگی بسر کرتا ہوں۔ مجھے اپنے پڑوسی کا خیال نہیں اور نہ والدین کو قابل تعلیم سمجھتا ہوں۔ میری تمام حرکتوں سے میری بیوی اور بچے نالاں ہیں۔ میرے یہاں ایک مزدور ہے بہت غریب اور صاحب اولاد۔ وہ جیٹھ بیساکھ کے مہینوں میں بھی میرے غسل کے لئے پانی بھرتا ہے۔ دن کے بارہ بجے تک بھوکا رہتا ہے۔ اس کی روزانہ آمدنی چار آنہ پیسے سے زیادہ نہیں۔ انھیں پیسوں سے وہ اپنی بیوی، بچے، بوڑھے والدین کی پرورش کرتا ہے۔ پاس ہی ایک بیوہ رہتی ہے، اس کی بھی وہ امداد کرتا ہے۔ اس نے کبھی آج تک کسی کو سخت بات نہیں کہی۔ وہ ہمیشہ سچ بولتا ہے اور بے ایمانی کبھی نہیں کرتا۔ صبح اٹھکر صاف ستھرے خیال کو دل میں لئے ہوئے گنگا جی میں اشنان کرتا ہے اور نزدیک والے مندر میں جاکر بڑے خشوع و خضوع سے اس ہستی کی عبادت کرتا ہے جس نے اس کے جسم میں جان ڈالی ہے، جس نے گنگا جیسا فیض رساں دریا بنایا، جس نے پیپل اور برگد جیسے سایہ دار درخت بنائے۔ وہ جب مندر سے واپس آتا ہے تو راستہ کے [illegible] کے لوٹے میں پانی بھر دیتا ہے اور جب اس کے یہاں روٹی پکتی ہے تو

اپنے حصّہ کا ایک ٹکڑا اس کو لا دیتا ہے۔ اس مزدور سے میں نے اکثر کہا کہ "دیکھو گنیش، تم ہندو ہو، تم ہرگز جنت میں نہ جاؤ گے، مسلمان ہو جاؤ اور ہمارا مذہب اختیار کرو تو دین و دنیا دونوں میں بھلے رہو گے، وہ کہتا ہے "سرکار، اب تو جس دھرم میں رہ کر اتنی گذاری ہے وہاں اتنی سی رہ گئی ہے اسے بھی گذر جانے دیجئے۔ اب رہا یہ سوال کہ چونکہ ہم ہندو ہیں اس لئے جہنم میں جائیں گے۔ ہم نے ہندو ہو کر ایشور کا کونسا قصور کر لیا ہے کہ وہ مجھے جہنم میں ڈال دے گا کیا سرکار کا خدا ایسا قہار ہے کہ وہ سوائے مسلمان کے ہر شخص کو بری نظروں سے دیکھتا ہے حضور میں نے کبھی جھوٹ نہیں کہا، کسی کی دل آزاری نہیں کی، ہمیشہ خلق خدا کی خدمت کی، والدین کی عزت کی، پڑوسیوں پر مہربان رہا، اولاد کی پرورش کی اور صبح و شام گنگا اشنان کر کے اس بھگوان کی پوجا کرتا ہوں جس نے میرے شریر میں آتما کی شکتی دی۔ جو ہر حال میں مجھ پر دیا کی نظر رکھتا ہے اور ہمیشہ میرے بُرے سمے میں میرے کام آتا ہے۔ میرا جہاں تک خیال ہے حضور کا مذہب بھی یہی کہتا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ صرف نام بدل کر میں وہی چیز لے لوں جو میرے پاس موجود ہے۔ سرکار کا مذہب کیا ان باتوں سے اور بھی کچھ زیادہ بتاتا ہے؟" میں اس کی اس بات سے جھینپ ہو جاتا ہوں اور دل کی تسکین یوں کر لیتا ہوں کہ بلا سے میں نے اسلام کا پیغام تو اُس تک پہونچا دیا، اب وہ مانے یا نہ مانے۔ مانے گا تو جنت پائے گا نہیں تو جہنم۔ اب میں یہ پوچھتا ہوں کہ لائق انعام وہ شخص ہے یا میں یا مجھ جیسے ہزاروں لاکھوں مسلمان؟ کیا وہ واقعی جہنم میں چلا جائیگا چونکہ وہ ہندو ہے؟" اسی طرح یہ بات پلٹ کر ہندو، عیسائی وغیرہ سے بھی پوچھی جا سکتی ہے

اسی مذہب کے جھگڑے نے اور اسی مذہب کی وجہ سے "میں" اور "وہ" میں تمیز کی جاتی ہے جس نے ہندوستان کی مٹی پلید کر رکھی ہے۔ اگر آج ہندوستان میں کوئی اپنے کو ہندو یا مسلمان یا عیسائی یا سکھ کہنے والا نہ ہوتا تو یہاں کے تیس کروڑ باشندے جن کے سروں پر کبھی تاج جہانبانی تھا اور جنکی تہذیب صنعت و حرفت نے ایک عالم کو حیرت میں ڈال رکھا تھا کوڑی کوڑی کو محتاج نہ ہوتے اور یوں ایک غیر قوم کے مٹھی بھر لوگ ہم پر لطف لے لے کر سلطنت نہ کرتے۔ آہ! یہ تاریخ عالم کا کتنا عبرت خیز واقعہ ہوگا کہ دنیا کی ایک زبردست اور حد درجہ مہذب قوم اپنی آزادی و خودمختاری صرف اس لئے حاصل نہ کر سکی کہ اس قوم کا ہر فرد یا ہندو یا مسلمان تھا۔ جنکا خدا اور جنکا مذہب یہی کہتا تھا کہ تم اپنے پڑوسیوں کو آگے بڑھنے نہ دو! اس تباہی کی وجہ انسان نہیں بلکہ وہ تفرقہ پرداز شئے ہے جسے مقدس لفظ میں دھرم یا مذہب کہتے ہیں مذہب بھائی بھائی میں، باپ بیٹے میں اور ماں بیٹی میں خط امتیاز کھینچ دیتا ہے اور ان کے دلوں میں دشمنی کے بیج بو دیتا ہے ——— ہر روز ایک نیا مذہب ایک نئی شانِ مہدویت لئے ہوئے پیدا ہوتا ہے جو ڈنکے کی چوٹ کہتا ہے کہ وہ عالم میں امن اور شانتی پھیلانے اور آدمی کو آپس کے نفاق سے بچانے کے لئے آیا ہے۔ مگر

نگاہ ادا شناس اچھی طرح پہچانتی ہے کہ اس کا نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ میدان کارزار میں ایک اور تلوار
کا اضافہ ہوا
دنیا میں اب تک کوئی مذہب ایسا نہیں ہوا جو فی الواقع تمام دنیا کی واحد آواز رہا ہو۔ مذہب اسی وقت
ہماری مصیبت زدہ دنیا کے لئے امن و سکون کا سبب ہو سکتا ہے، جب دنیا کا ہر شخص ایک ہی رشتہ سے وابستہ
ہو جائے۔ لیکن اس خیال کا وجود میں آنا اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ انسان کے دماغ میں تعصب
کا مادہ ہے اور یہ مادہ انسان کے دماغ میں اس وقت تک باقی رہے گا جب تک کہ آدم کی اولاد آدمی کہلائیگی
میں نے شروع میں لکھ دیا ہے کہ مذہب کی پیدائش دنیا میں انند اور شانتی کے لئے ہوئی۔ مذہب نے
سوسائٹی کے قوانین بنائے گویا موجودہ نظام تمدن و تہذیب کی سنگ بنیاد کو مذہب کے مقدس ہاتھوں نے رکھا
یہ مذہب ہی تھا جس نے ہمیں خدا کے وجود کا قایل کیا، جس نے ہمیں راز زندگی اور موت و حیات کے نکتہ کو
بری طرح یا بھلی طرح سمجھایا۔ مذہب کا خیال جیسا پہلے مقدس تھا اب بھی ہے۔ چنانچہ مذاہب عالم پر نظر ڈالیے
تو آپ کو یہ بات آفتاب کی طرح چمکتی ہوئی دکھائی دے گی کہ مذہب اوّل کی وہ تمام باتیں جو سچائی اور بھلائی پر مبنی
تھیں۔ اب تک دنیا کے ہر مذہب میں موجود ہیں مثلاً خدا ہمارا بنانے والا اور ہمارے سیاہ و سفید کا مالک ہے۔ وہ
ایک ایسی قوت ہے جو تمام قوتوں پر حاوی ہے۔ جھوٹ مت بولو۔ چوری نہ کرو۔ بے ایمانی سے دور رہو۔ کسی کا
دل نہ دکھاؤ۔ ماں باپ کی عزت کرو۔ پڑوسیوں کے دکھ درد کے شریک رہو۔ بوڑھے، کمزور، ناتوان، اپاہج ا
اندھوں پر رحم کرو۔ اپنی اولاد پر مہربانی کرو۔ وغیرہ، یہ باتیں جن کو ہر انسان کی عقل سلیم مانتی ہے دنیا کی "عالمگ
سچائی" ہے۔ اس سے کوئی مذہب علیحدہ نہیں۔ اور نہ اس کے ماننے سے کوئی شخص انکار کرے گا۔ ان باتوں
کو مسلمان، بودھ، عیسائی الغرض کوئی شخص بھی کسی دوسرے مذہب کا انسان برضا و رغبت ماننے کو تیا
ہے —— اگر مذاہب عالم ایک دوسرے سے بلا چون و چرا کہیں ملتے ہیں تو صرف اس "عالمگیر سچائی" پر او
اگر نگاہ حق بیں سے دیکھئے تو مذہب بنی آدم کو فائدہ پہونچا سکتا ہے تو صرف انھیں باتوں سے ورنہ گائے کھانے، چا
نکاح کرنے یا ٹیکا لگانے یا گئو رکھشا کرنے سے انسانیت کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر دنیا کا کوئی مذہب ہو سکتا ہے ا
صرف یہی ایک ہو سکتا ہے ورنہ اور باتیں تو کچھ بھی نہیں صرف بھائی کو بھائی سے لڑانے کی ہیں۔ میرے سمجھ میں
بات نہیں آتی کہ ایک انسان کو کیا حق ہے کہ دوسرے انسان کو اپنے سے ذلیل اور رسوا سمجھے اور اپنے خیال کو دو
پر فوقیت دینے کیلئے دقیانوسی اور کرم خوردہ کتابوں کا حوالہ دے اور وہ بھی اس حال میں کہ سننے والا اس کتاب کو شر
ہی سے غلط سمجھتا ہو۔ اس وقت دنیا کے ہر مذہب کے ماننے والے کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ اگر ایک مذ
کے پیرو ایک کروڑ ہیں تو دوسرے کے بھی اسی قدر بلکہ اس سے زیادہ۔ ان مذاہب کا ہر فرد اپنی جان دے

لو تیار ہے مگر اپنا مذہب کسی دوسرے مذہب سے تبدیل کرنے کو ہرگز تیار نہیں ہر شخص اپنے خیال میں درست، راسخ الاعتقاد اور جنت کا واحد اجارہ دار ہے - جہاں تک ان کا یہ خیال ہے بالکل درست اور بے ضرر ہے مگر جونہی ان کی فیاضی اور دریا دلی کا تعلق دوسرے بھائیوں سے ہو جاتا ہے - مذہب دنیا کا شدید اور مہلک مرض ہو جاتا ہے - یہ ایک انسان کو دوسرے انسان کی طرف محبت اور مساویانہ سلوک کرنے سے روک دیتا ہے - یہ ہندوستان میں کانپور اور شاہ آباد کو محشرستان بنا دیتا ہے - اندلس میں غرناطہ اور قرطبہ کو خاک میں ملا دیتا ہے، بیت المقدس کی گلیوں کو خون سے رنگ دیتا ہے، یہ افریقہ کے جنگلوں میں، چین کی دیوار کے نیچے، روس میں، جرمنی میں، فرانس میں الغرض دنیا کے ہر کونے میں دنیا کی خاک کے ہر ذرہ کو معصوم انسان کے مقدس خون سے رنگین بنا دیتا ہے - یہ انسان کو تنگ نظری، تعصب اور خود غرضی کی تعلیم دیتا ہے - یہ دوست کے لباس میں دشمنی کرتا ہے - یہ مخلوق کو اپنے خالق سے دور رکھتا ہے اور انسانی عقل و تدبیر کی راہ میں روڑے اٹکاتا ہے

مذہب بقول خود دنیا میں عقل کی روشنی اور ضیاء ایمانی پھیلانے آیا - بحمد اللہ اس کی یہ غایت پوری ہو گئی - آج دنیا کے گوشے گوشے میں علم کی روشنی چمک رہی ہے - دنیا کی ہر قوم جاگ اٹھی ہے - عقل و ہوش کے کرشموں نے دنیا کو ایک کوٹھری جیسی تنگ جگہ بنا ڈالا ہے - ہم چند دن کے اندر دنیا کے ہر حصہ میں جا سکتے ہیں - ہم ہزاروں میل کے آدمیوں سے گھر بیٹھے تبادلۂ خیالات کر سکتے ہیں الغرض ایک عالمگیر اخوت سے ہماری دنیا بندھتی جاتی ہے - ہماری سوسائٹی مستحکم اور ہمارے قوانین راستی پسند ہیں - اب کوئی چوری کرے تو سزا پائے، کسی کی جان لے تو پھانسی پر لٹکایا جائے - الغرض ہر وہ کام جو کبھی مذہب کے ذمہ تھا اب ملکی حکومت کے زیر نگرانی ہے - انسان نے علم کی روشنی میں اپنی مجبوری کو پہچانا جوں جوں اس کو اپنی مجبوریوں کا احساس ہوتا گیا وہ خدائی قوتوں کا قائل ہوتا گیا - قصہ مختصر مذہب جو کچھ کرنے آیا تھا وہ ایک حد تک کسی طرح بھی ہو، پورا ہو گیا - اب دنیا میں شر و فساد علی الخصوص ہمارے بد قسمت ملک میں ہماری روز روز کی پریشانیوں کا باعث ہمارا نام نہاد مذہب ہے - اگر آج اس ملک سے مذہب کا نام چلا جائے تو دنیا دیکھ لیگی کہ ہمالہ پربت کے زیر سایہ رہنے والے اقوام عالم میں اسی طرح ممتاز ہو جائیں گے جس طرح سے ان کا پاسبان اور ممالک کے پاسبانوں سے بلند و ارفع ہے - اے کاش! کوئی ایسی قوت پیدا ہوتی جو ہمارے دلوں سے اس بوسیدہ خیال کو نکال کر پھینک دیتی جس نے ہماری آنکھوں پر پٹی باندہ رکھی ہے اور ہمیں یہ عبرت خیز نتائج نہ دیکھنے پڑتے جو اس "ہندو مسلم" سوال سے ہمارے بہتر بھارت ورش میں پیدا ہو رہے ہیں

محمد نصیر الدین - ایم بی - بی اس (آنرز)
گولڈ میڈلسٹ - بھاگلپور

(نگار) کہنے کو تو یہ مضمون صرف شخص واحد کے دماغ کی پیداوار ہے جو بھاگلپور میں رہتا ہے، لیکن اس کے اندر اکناف ہند

کے ان لاکھوں تعلیمیافتہ انسانوں کی آوازیں چھپی ہوئی ہیں جو اعتقاداً تو کبھی کے لامذہب ہو چکے ہیں، لیکن مقالاً اظہار خیال کی جرات اب تک انھیں نہیں ہوئی

علماء مذہب نے اس کو تو یقیناً محسوس کر لیا ہے کہ دنیا میں الحاد و لامذہبیت کی رو نہایت تیزی سے دوڑتی جا رہی ہے جس کی شکایت بھی وہ اکثر کرتے رہتے ہیں، لیکن اس کی توفیق کبھی نہیں ہوئی کہ وہ اس کے اسباب و حالات پر غور کرتے لوگوں کے تشویش ذہنی کو دور کرنے کی تدبیریں سوچتے اور آخرکار کوئی ایسی راہ عمل پیدا کرتے جو اس بیدینی کو مٹا دیتی اور خدا کے سچے مذہب کا آوازہ ایک بار پھر دنیا میں بلند ہو جاتا

وہ زمانہ جب انسان جاہل تھا، کم فہم و نا سمجھ تھا آہستہ آہستہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ آج اگر آپ کسی بچے کے سامنے بھی کوئی بات ایسی کہیں جو اس کی سمجھ میں نہیں آتی تو وہ اسکو ماننے سے پہلے خدا معلوم کتنے سوال آپ سے کریگا انسان کا بچہ ہمیشہ سے ایسا ہی ذہین پیدا ہوا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ پہلے اس قسم کے سوالات کرنے پر زبردستی اس کا منہ بند کر دیا جاتا تھا اور اب ایسا نہیں ہوتا بلکہ جدید اصول تعلیم کے لحاظ سے یہ ضروری ہے کہ اس کی تمام کیفیات مستفسرہ کی تشفی کر دی جائے اصول ارتقاء نے مذہبی کتابوں کے اصول آفرینش . . . کی طرف سے لوگوں کو منحرف کر رکھا ہے، طبقات الارض کے علم نے ان تمام روایتوں کی تکذیب کر دی ہے جو کہ زمین ارض اور انسان کی عمر کے متعلق بیان کی جاتی ہیں، فلکیات نے معراج اور شق القمر کی قسم کے معجزوں کو ناقابل قبول بنا دیا ہے، طبیعیات نے خوارق عادات کی حیثیت معمولی شعبدوں سے زیادہ نہیں رہنے دی، ریاضیات نے حشر اجساد و معاد کے اعتقاد کو درہم برہم کر رکھا ہے اور فلسفہ نے مفکرین کے دماغوں کو خود خدا کی ہستی کی طرف سے ریب و شک میں ڈال دیا ہے، الغرض چاروں طرف سے مذہب پر حملے ہو رہے ہیں اور حامیان مذہب کا یہ عالم ہے کہ وہ سوائے کافر و ملحد کہدینے کے اور کوئی ذریعہ دفاع اپنے پاس رکھتے ہی نہیں۔ یقیناً ان کے بس کی بات نہیں کہ وہ علوم جدیدہ کے حقائق کو محو کر دیں، ان کے لئے محال ہے کہ جو علمی ترقیاں اس وقت نظر آ رہی ہیں ان کی اہمیت کا خیال لوگوں کے دلوں سے مٹا دیں، اس لئے وہ غریب سوائے گالیاں دینے اور برا بھلا کہنے کے کر ہی کیا سکتے ہیں

چاروں طرف سے اب یہ آواز آ رہی ہے کہ دنیا کو مذہب کی ضرورت نہیں بلکہ اس سے زیادہ یہ کہ دنیا میں حقیقی امن و سکون اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب "مذہبیت" فنا ہو جائے۔ یہ مطالبہ اپنی جگہ صحیح ہے یا غلط، دنیا کی یہ خواہش درست ہے یا نادرست اس پر جس جماعت کو توجہ کرنے کی ضرورت ہے وہ علماء کی جماعت ہے جو مذہب کی ضرورت کے مؤید ہیں اور جن کے نزدیک درستی اخلاق کا انحصار ہی صرف مذہبیت پر ہے، لیکن اگر وہ اس طرف توجہ نہیں کرتے تو دنیا کو کیا غرض پڑی ہے کہ وہ اس گتھی کے سلجھانے میں مصروف ہو، کیونکہ وہ تو اپنی گردن سے مذہب کے جوئے کو اتار کر پھینک ہی چکی ہے اور اس آزادی پر از بس مسرور ہے

پھر اگر علماء یہ چاہتے ہیں کہ وہ اس سیلاب کا مقابلہ کریں تو اس کی صورت یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے یہاں کی روایات،

اپنے اسلاف کی تصانیف اور اپنی کتب مقدسہ کی داستان جزا و سزا دُہرانے بیٹھ جائیں، بلکہ اس کی تدبیر صرف یہ ہے کہ عقل کا مقابلہ عقل سے کریں، علم کو علم سے شکست دیں، کیونکہ اب نہ عذاب خداوندی دلوں میں خوف پیدا کر سکتا ہے اور نہ رحمت ربانی پر لوگوں کو اعتقاد رہ گیا ہے

یوروپ و امریکہ تو تقریباً نصف سے زیادہ ایک زمانہ ہوا کافر و ملحد ہو چکا ہے، ایشیا اب تک محفوظ تھا، سو وہ بھی نہ بچ سکا۔ یہاں تک کہ ہندوستان میں بھی جو سب سے زیادہ جاہل ملک ہے، ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں، عیسائیوں وغیرہ کی متعدد انجمنیں قائم ہو چکی ہیں جنکا مقصود ہی مذہبیت کو ختم کر دینا ہے۔ پھر ان حالات میں پرستاران مذہب کا کیا فرض ہونا چاہیئے اور علماء کو کیا تدابیر عمل میں لانا چاہیئے؟

میرے نزدیک اس کی بہترین تدبیر یہ ہے کہ پہلے تمام مذاہب رائجہ کے علماء علیحدہ علیحدہ جمع ہو کر اس ذہنیت کے اسباب و نتائج پر غور کریں اور پھر سب یکجا ہو کر کوئی ایسی صورت نکالیں جو مؤثر و کارگر ہو، ورنہ محض غصہ کرنا، گالیاں دینا، کافر و ملحد کہہ دینا یا توہین مذہب کا مقدمہ چلانا مفید نہیں ہو سکتا

تھوڑی دیر کے لئے مان لیجئے کہ زور دے کر حکومت سے کفر و الحاد کے خلاف کوئی قانون بھی پاس کرا لیا، تو اس سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے، کیا لوگوں کی یہ ذہنیت بدل جائے گی، ہرگز نہیں، کیونکہ اعتقاد کا تعلق اطمینان نفس سے ہے اور سخت سے سخت سزا بھی ایک انسان کے ضمیر کو بدلنے پر قادر نہیں، میرا یہ خطاب صرف مسلمانوں ہی کے علماء مذہب سے نہیں، بلکہ ہندوؤں، سکھوں، عیسائیوں اور زردشتیوں وغیرہ سب جماعتوں کی عالموں سے ہے کہ آزاد خیال لوگوں سے ملیں۔ اور اُن کے معتقدات معلوم کرکے غور کریں کہ اُن میں کسی حد تک واقعیت پائی جاتی ہے یا نہیں، اگر نہیں تو غلط بات کا رد کر دینا کیا مشکل ہے، ورنہ وہ خود اپنے مذہب میں اتنی وسعت نظر پیدا کریں کہ لوگوں کو اس کے قبول کرنے سے وحشت نہ ہو

مقدس روس

(انقلاب روس کا عہد طفولیت)

ڈرامہ کے افراد

میریا: ایک دہقانی — ایلکسے: اون کا دوست
انیا: ایک اور دہقانی عورت — زرشن: کسان
اون:- میریا کا بھتیجا — خمر: سپاہی

منظر

ایک روسی جھونپڑے کے باہر میز اور چند کرسیاں پڑی ہوئی ہیں - میریا مکان کو صاف کر رہی ہے

زمانہ

روس سنہ ۱۹۱۲ء میں

(میریا کی ہمسائی انیا داخل ہوتی ہے)

میریا - انیا تمھاری بڑی عمر ہے - میں ابھی ابھی تمھیں یاد کر رہی تھی

انیا - میں تم سے کچھ باتیں کرنے آئی ہوں

میریا - سچ پوچھو - تو میرا دل بھی تم سے باتیں کرنے کو چاہتا تھا

انیا - جب میرا دل کسی سے باتیں کرنے کو چاہتا ہے - تو میں ضرور کسی نہ کسی سے باتیں کرتی ہوں، اگر کوئی نہ ملے تو پھر اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتی ہوں

میریا - مگر اس طرح کرنا تو نہیں چاہیئے

انیا - کیوں ؟

میریا - کیونکہ اس طرح باتیں کرنے سے شیطان سمجھتا ہے کہ تم اس سے باتیں کر رہی ہو

انیا - اچھا !

میریا - بلکہ وہ تمھاری باتوں کا جواب بھی دیتا ہے

انیا - یہ تو بہت بڑی بات ہے پھر تو ہم دونوں ایک دوسرے سے باتیں کر سکتے ہیں

میریا - مگر مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے - اسلئے جلدی کرنی چاہیئے - کیونکہ میرا بھتیجا اون ابھی یہاں ایلکسے اور زرشن کو لے کر آ جائیگا - انھیں بھی کچھ مشورہ کرنا ہے - تمھیں معلوم ہے وہ کس معاملہ پر بحث کیا کرتے ہیں ؟

انیا - نہیں

میریا۔ وہ سیاسیات پر بحث کرتے ہیں
اینا۔ سیاسیات!
میریا۔ ہاں۔ وہ عجیب باتیں کرتے ہیں۔ ان کی گفتگو ایک خوشنما خواب کی طرح ہوتی ہے۔ جسے سنکر میری دل کی حرکت تیز ہو جاتی ہے
اینا۔ وہ کیا کہتے ہیں
میریا۔ مجھے تو اچھی طرح معلوم نہیں۔ کچھ عجیب سے الفاظ ہوتے ہیں۔ عجیب سی باتیں ہوتی ہیں۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں۔ کہ ان کا مدعا کیا ہوتا ہے۔ صرف یہ جانتی ہوں۔ کہ ان کو سیاسیات کہا جاتا ہے۔ وہ کچھ اور طرح کی باتیں ہوتی ہیں
اینا۔ کیا وہ کسی انقلاب کا ذکر کرتے ہیں؟
میریا۔ ہاں۔ بالکل مختلف چیزوں کا
اینا۔ مگر خدا کو یہ پسند نہیں
میریا۔ خدا کیا خود زار کو بھی پسند نہیں۔ مگر اُن کی گفتگو سے جوش آجاتا ہے۔ وہ نئے نئے الفاظ بولتے ہیں۔ اور گو میں ان کو سمجھ نہیں سکتی۔ پھر بھی نئی چیزوں کا خیال دل میں آنے لگتا ہے۔ تم بھی سُن لینا
اینا۔ مگر یہاں نہیں۔ سیاسیات پر سڑک پر بحث کرنا ٹھیک نہیں
میریا۔ ہاں۔ مگر وہ تو اتنے چالاک ہیں۔ کوئی ان کی بات سمجھ ہی نہیں سکتا
اینا۔ مگر تین آدمیوں کو اکٹھا دیکھ کر تو شبہ کیا جاسکتا ہے

میریا۔ نہیں۔ کیونکہ وہ بہت چالاک ہیں۔ ایلکسے ٹوبولسک میں رہ کر آیا ہے۔ اور بڑا جہاندیدہ انسان ہے اسے ان باتوں کا علم ہے۔ جن کا ہمیں ٹوبولسک میں خواب بھی نہیں آسکتا۔ اس کے پاس بتوں کا ایک ڈبہ ہے۔ وہ ان بتوں کو میز پر چن دیتے ہیں۔ اور بچوں کی طرح کھیلنا شروع کر دیتے ہیں اگر سپاہی آجائے۔ تو وہ یہ سمجھتا ہے۔ کہ کوئی کھیل کھیلا جارہا ہے
اینا۔ کھیل؟ لیکن میریا پولیس اتنی بیوقوف نہیں۔ کہ تمہارے بھتیجے جیسی عمر کے آدمی کو بچوں کی طرح کھیلتے ہوئے دیکھ کر دھوکا کھا جائے
میریا۔ ہاں ہے تو عجیب بات۔ مگر ہوتا ایسا ہی ہے ایلکسے نے یہ کھیل ٹوبولسک میں سیکھا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ بڑی عمر کے آدمی ان بتوں پر دماغ ضائع کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ وہ تمام دن ان کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ اور کبھی کبھی ماتھے پر ہاتھ مارتے ہیں، یہ بہت عجیب کھیل ہے۔ مگر دنیا میں عجیب عجیب طرح کے رسم و رواج ہیں
اینا۔ واقعی عجیب کھیل ہے۔ ٹوبولسک کی پولیس بھی اس سے واقف ہے؟
میریا۔ ہاں انھیں اس کا علم تو ہے۔ لیکن وہ ان بتوں سے کھیلنا نہیں جانتے۔ وہ صرف بتوں کو دیکھ کر مسکرا دیتے ہیں
اینا۔ مگر بتوں سے کھیلنا چنداں مستحسن نہیں
میریا۔ کیوں؟

اینا - یہ بدشگونی کے علامات ہیں
میریا - بدشگونی؟ کیاان سے ہم پر کوئی آفت آسکتی ہے؟
اینا - اس سال تو نہیں - کیونکہ یہ اچھا سال ہے - اور ہماری فصلیں خوب ہوئی ہیں
میریا - خدا کا شکر ہے، مگر تمھیں اس کا علم کیونکر ہوا؟
اینا - اس دفعہ درختوں میں پھل بہت زیادہ لگے ہیں
میریا - اچھا!
اینا - ہاں اور یہی نیک شگون ہے
میریا - وہ دیکھو وہ آگئے - میں ذرا ڈبہ لے آؤں

(جھونپڑے میں چلی جاتی ہے)

(اون کے پیچھے ایلکسے اور زرشن داخل ہوتے ہیں)

اون - کیوں بی ہمسائی خیریت ہے؟
اینا - شکریہ - اون - تم یہ سنکر خوش ہوگے - کہ امسال غلہ بہت ہوگا
اون - خوب
اینا - یہ صرف خدا کی مہربانی ہے - کیونکہ وہ ہر اک چیز پر قادر ہے
اون - واقعی

(میریا شطرنج کی بساط اور مہروں کے ایک ڈبہ کو لاکر میز پر رکھ دیتی ہے)

میریا - اون میں تمھارے بت لے آئی ہوں
اون - اچھی میریا - شکریہ
میریا - اب اور کوئی کام تو نہیں
اون - نہیں

(وہ اپنے خاموش دوستوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو مٹھیاں بھر بھر کر بے ترتیبی سے مہروں کو بساط پر چُن رہے ہیں - اون اور ایلکسے ایک دوسرے کے مقابل بساط پر بیٹھ جاتے ہیں)

اب ہم باتیں کرسکتے ہیں
ایلکسے - نہیں - ابھی نہیں - زرشن تم یہاں بیٹھ جاؤ - اب ٹھیک ہے کیونکہ دو آدمی کھیل رہے ہیں - اور ایک دیکھ رہا ہے اب ہم باتیں کرسکتے ہیں
اون - اب اُسے روس کے مستقبل کے متعلق بتاؤ اُسے اس کا علم نہیں
ایلکسے - (زرشن سے) تم روس کے لئے کام کرنے کیلئے تیار ہو؟
زرشن - میں مقدس روس کو آزاد دیکھنا چاہتا ہوں
ایلکسے - تو پہلا سبق یہ ہے - کہ روس کو "مقدس روس" کہنا چھوڑ دو - یہ صورت اس کی ماضی میں تھی - اور ماضی نہایت بُرا تھا - ہم صرف اس سے نجات پاکر آزاد ہوسکتے ہیں - ماضی تمھیں قدیم رسم و رواج کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے ہے - وہ تمھیں پابجولاں کئے ہوئے ہے - اور یہ تمام زنجیریں ہمیں توڑنی ہیں ماضی میں جو کچھ مقدس تھا - وہ اب معیوب ہوچکا ہے - اور اب صرف وہی باتیں مقدس ہیں - جن کا کوئی ذکر بھی نہیں کرسکتا - اب ہم صرف اپنی باتوں پر عمل کرنے سے آزاد ہوسکتے ہیں
زرشن - (اشتیاق سے) مجھے بتاؤ - کہ روس کس طرح آزاد ہوسکتا ہے
ایلکسے - ہر آدمی ہر ہفتہ دس آدمیوں کو سبق دیا کریگا - اور ان دس میں سے وہ ایک اور آدمی کو استا

بنائے گا۔ اس طرح سے اگر ایک پیر کو ایک استاد ہوگا۔ تو دوسرے پیر کو دو استاد ہوں گے۔ اور ہر ایک اُستاد دس مزید آدمیوں کو سبق دے رہا ہوگا

اون۔ نہیں۔ نہیں۔ اس طرح بہت دیر لگے گی۔ ہر روز ایک نیا استاد بننا چاہئے

زرشن۔ ہاں اسطرح ہم جلدی آزاد ہو جائیں گے

ایلکسے۔ نہیں اگر اب ہمارے پاس پچاس استاد ہو جائیں اور ہر ہفتہ میں وہ دگنے ہوتے رہیں تو چار مہینوں میں ساٹھ ستر لاکھ استاد ہو جائیں گے

زرشن۔ ساٹھ ستر لاکھ!

ایلکسے۔ ہاں کوئی ایک کرور کے قریب

زرشن۔ خوب

ایلکسے۔ ہم یقیناً کامیاب ہو جائیں گے

زرشن۔ اور پھر۔ چار ماہ کے بعد کیا ہوگا؟

ایلکسے۔ پھر ہم کچھ دیر اور انتظار کریں گے

زرشن۔ اور پھر؟

ایلکسے۔ پھر ہم تمام لوگوں کو تعلیم دے چکے ہوں گے۔ کہ عصائے حاکم کی حیثیت سونے کی چھڑی سے زیادہ نہیں۔ اور اس میں کوئی چیز بھی سکے سے بہتر نہیں اور یہ کہ زار اور اس کے عصا کا تقدس ایک خواب تھا۔ جس سے دوسرے خوابوں کی طرح عوام الناس بیدار ہو سکتے ہیں۔ ہم انھیں قریب مستقبل میں بیدار کر دیں گے۔ اس وقت خواب ختم ہو جائے گا۔ اور روس بالکل اسی طرح آزاد ہو جائے گا۔ جس طرح صبح کے چہچہانے والے پرندے

اون۔ کیا تمام لوگ بیدار ہو جائیں گے؟

زرشن۔ ہاں۔ یقیناً

ایلکسے۔ نہیں کچھ ایسے بھی ہوں گے۔ جو ہماری آواز نہیں سنیں گے۔ ایسے بے حس لوگ جو رقص و سرود کے وقت بھی سوتے رہتے ہیں۔ ان کے خلاف ہم قتل کی تعلیم دیں گے۔ یہ سب کچھ روس کے لئے کیا جائے گا۔ اور جب یہ سب کچھ ہو جائے گا۔ روس آزاد ہو جائے گا

زرشن۔ (متحیر ہوکر) روس آزاد ہو جائے گا!

ایلکسے۔ ہاں۔ کیونکہ اسوقت صرف وہی لوگ زندہ رہیں گے۔ جنھیں آزادی مرغوب ہے۔ وہ کسی پر جبر نہیں کریں گے۔ تمام پرانے مظالم نیست و نابود ہو جائیں گے۔ اُنھیں آزادی کی دیوی پر بھینٹ چڑھا دیا جائے گا

زرشن۔ اور ہم آزاد ہوں گے؟

ایلکسے۔ بالکل پرندوں کی طرح آزاد ہوں گے۔ پھر ہم اس حکومت کے ماتحت ہوں گے جس کی ہیئت ترکیبی کے عناصر معقول ہوں گے۔ اور جس میں زمانۂ جاہلیت کی بیہودگیاں اور نامعقول باتیں نہ ہوں گی۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔ اون اب تمھاری چال ہے

(وہ بساط پر جھک جاتے ہیں۔ موضع کا سپاہی داخل ہوتا ہے)

سپاہی۔ اخاہ۔ شطرنج کھیلی جا رہی ہے؟

(لیکن اون کھیل میں محو ہو جاتا ہے۔ اور جواب نہیں دیتا)

ایلکسے - ہاں

سپاہی - اس کھیل میں ہشیاری کی ضرورت ہے - بڑا مشکل کھیل ہے

(چلا جاتا ہے)

ایلکسے - ہمیں ایسے آدمیوں کی ضرورت نہیں ہوگی

اون - شائد کچھ آدمیوں کی ضرورت ہو - یہ ہمارے قوانین کے نفاذ میں مدد دیں گے

ایلکسے - نہیں - تمھیں معلوم ہے - روسی قوانین کے خلاف ورزی کیوں کرتے ہیں؟ اس لئے کہ وہ انکے اپنے قوانین نہیں - یہ آزاد آدمیوں کے قوانین نہیں - بلکہ جابر حکومت کے قوانین ہیں - جنھیں روسی نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جب یہ مجبوریاں نہ ہوں گی - اور قوانین لوگوں کے ساختہ ہوں گے - اس وقت ایسا کونسا روسی ہوگا - جو انکی خلاف ورزی کرے گا

اون - دیکھو زرشن تمھیں تعلیم دی جا رہی ہے - ابھی تمھیں نئے روس کا طرز حکومت بتایا جائے گا

زرشن - یہ بہت عجیب باتیں ہیں

ایلکسے - اور پھر کسی آدمی کے دل میں قوانین کے خلاف ورزی کرنے کی خواہش نہیں پیدا ہوگی - کیونکہ ہر ایک آدمی امیر ہونے کی وجہ سے اپنے حال پر قانع ہوگا

زرشن - توکیا ہم سب امیر ہو جائیں گے؟

اون - ہاں - سنو - تمھیں ابھی پتہ چل جائے گا

ایلکسے - ہاں - کیونکہ اس وقت روس کے شاہی محلات میں اتنا سونا اور جواہرات ہیں - کہ ان سے ایک سال تک روس کی تمام لوگوں کے اخراجات مہیا کئے جا سکتے ہیں - خواہ اس عرصہ کے لئے تمام لوگ بیکار ہی بیٹھے رہیں - مگر وہ کام کریں گے اور اپنے لئے کسی زمیندار کو پیداوار میں سے حصّہ نہ دیا جائے گا کسی قرضہ پر سود نہ ہوگا - کیونکہ ہم ساہوکاروں کو مٹا دیں گے - روس کی دولت روس کے لوگوں کے لئے ہوگی - اس کی کوئی انتہا نہیں - ہم نے اسکا اندازہ کیا ہے - اور اس نتیجہ پر پہونچے ہیں - کہ ہر ایک کسان تمام عمر اتنا ہی امیر رہیگا - جتنا کہ ایک وکیل - پادری یا ڈاکٹر ہو سکتا ہے - علاوہ بریں رعایا پر یا تو بالکل کوئی ٹیکس نہوگا اور یا بالکل معمولی

اون - اسلئے کہ اسوقت فوج کا کوئی خرچ نہوگا - کیوں ایلکسے یہی بات ہے نا؟

ایلکسے - نہیں اسوقت تک فوج رکھنی لازمی ہے - جب تک کہ دوسری اقوام ہم سے یہ سبق نہ لے لیں - کہ جنگ کی خواہش کرنا حماقت کے مترادف ہے

زرشن - اور اگر کوئی آدمی آزاد روس کے قوانین کی خلاف ورزی کرے تو پھر کیا ہوگا؟

ایلکسے - اگر کوئی کرے؟ ہاں اگر کوئی کرے - تو ہم اسے اصلاحی مکتب میں بھیجدیں گے - ان شاہی استعمار پرستوں کی طرح ہم مجرموں کو سائبریا کے زندان میں نہیں ڈال دیں گے - بلکہ اصلاحی مکاتب میں ہم انھیں اس وقت تک تعلیم دیں گے، جب تک کہ انھیں اپنی غلطی کا احساس نہ ہو جائے - پھر ہم انھیں آزاد کر دیں گے - اور وہ

دوسرے شہریوں کی نسبت بہتر شہری ہوں گے
کیونکہ ہم انھیں معاشرت کے تمام آداب میں
ماہر کرکے بھیجیں گے

زرشن - تو وہ بہت اچھے دن ہوں گے !

ایلکسے - یہ تم اس لئے کہ رہے ہو - کہ ہم امیر ہو جائیں گے؟

زرشن - (حیرت سے) نہیں تو - میں یہ اس لئے کہ رہا تھا کہ
روس آزاد ہو جائے گا

اون - آؤ - ہم اس دن کی یاد میں شراب پئیں چچی میریا

میریا - اون میں آئی

اون - چچی کیا تم ہمیں کچھ شراب دوگی ؟

میریا - شراب ! اس وقت ؟

اون - ہم ایک عظیم الشان دن کے تصور میں شراب
پینا چاہتے ہیں

میریا - اوہ توبہ - تمھاری سیاسیات دم نہیں لینے
دیتیں

اون - ہماری سیاسیات روس کو آزاد کرا دیں گی

میریا - میرا دل تو انھیں سنکر تیزی سے حرکت کرنے لگتا ہے

(مکان میں چلی جاتی ہے)

زرشن - روس آزاد ہو جائے گا

اون - ہاں آج ہم اس دن کی یاد میں خوب پئیں گے

زرشن - میں نہیں پیوں گا

اون - کیوں ؟

زرشن - میں ان عظیم الشان ایام کے متعلق سوچنا چاہتا
ہوں - اس حکومت کی معقولیت اور آزادی کی
شان کے خیال سے میرے دل میں اتنا جوش پیدا

ہو رہا ہے - کہ مجھے اب شراب کی ضرورت نہیں
رہی

ایلکسے - یہ کیا بیہودگی ہے ؟ ہمیں اس دن کی یاد میں
شراب پینی چاہئے - اسطرح وہ دن نزدیک تر معلوم ہوگا

زرشن - مجھے اس کی ضرورت نہیں

اون - لو وہ شراب لے آئی - ہم سب پئیں گے - اور
اس طرح بہتر کام کرسکیں گے

زرشن - نہیں

اون - صرف ایک جام

زرشن - اچھا صرف ایک جام - اور اس سے زیادہ نہیں

ایلکسے - ہاں ہمیں صرف ایک ہی جام کی ضرورت ہے
ہمیں اپنے ذہن کو بالکل صاف رکھنا چاہئے کیونکہ
اس کی مدد سے روس آزاد ہوگا

میریا - (ایناسے) یہ عجیب باتیں کرتے ہیں

اینا - ہاں خدا کرے کوئی آفت نہ آجائے

میریا - آفت ؟ میرے خیال میں ایسی تو کوئی بات نہیں

(میریا اور اینا دونوں چلی جاتی ہیں)

زرشن - بڑی اچھی شراب ہے

اون - ایک اور جام لے لو -

زرشن - ایک اور دے دو - مگر صرف ایک اور - پھر میں
چلا جاؤں گا - ورنہ بہت پی جاؤں گا - میں آزاد
روس اور اس کے متعلق سوچنا چاہتا ہوں

(اون شراب انڈیلتا ہے)

بس - بس - بس - تم نے تو بہت زیادہ
ڈال دی ہے

اون - تم سب نہ بیٹھنا

زرشن - میں وہاں بیٹھ کر سوچتا ہوں - اگر میں تمہارے پاس بیٹھا رہا - تو اس قابل ہی نہیں رہوں گا

(وہ جام اٹھا کر ایک گرے ہوئے درخت کی جڑوں پر جا بیٹھتا ہے) آہ عہد زریں!

(شراب کا ایک گھونٹ لیتا ہے - روشنی مدھم ہو جاتی ہے وہ ایک اور گھونٹ لیتا ہے - ایک لطیف اور سفید جالی کا پردہ اس کے سامنے آجاتا ہے - وہ پھر ایک گھونٹ لیتا ہے - اور ایک اور پردہ گرتا ہے - ایک دفعہ پھر اسی عمل کا اعادہ ہوتا ہے - حتیٰ کہ اس کے اور دوسرے آدمیوں کے درمیان ایک دھندلکی سی سفیدی آجاتی ہے - پھر ایک شوخ سی عورت نہایت بھڑکیلے اور چست لباس میں چھلانگ مار کر اس کے سامنے آجاتی ہے)

زرشن - تم کون ہو؟

نو وارد - خرم

زرشن - خرم کیا؟

خرم - خرم - ایک نہایت ہی قدیم تخلیق - دیکھو!

(وہ اپنا ہاتھ ہلاتی ہے - تو ایک پردہ کے سوا باقی تمام پردے اٹھ جاتے ہیں - اور روشنی بہت تیز ہو جاتی ہے - ایلکسے اس وقت تک جا چکا ہوتا ہے - اون اسی میز پر بیٹھا ہوا ہے - لیکن اس کا سر اور ہاتھ میز پر پھیلے ہوئے ہیں - ایک چھوٹی سی چبائی ہوئی شاخ اس کے ایک ہاتھ میں ہے - میریا اور ایناز مین پر لیٹی ہوئی شاخوں کی چھال اور گھاس چبا رہی ہیں - سپاہی مایوسی کے انداز میں ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا ہے - منظر کی وحشت سے نمایاں ہے - کہ تمام افراد بھوک سے بیتاب ہیں مکان کی دیواروں کی مٹی جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی ہے)

زرشن - آہ! قحط اور فاقہ!

خرم - (مسرت سے) ہاں

زرشن - کیا! روس میں؟

خرم - ہاں یہاں روس میں

زرشن - اوہ!

(خرم زرشن کے پہلو والے درخت سے ٹیک لگا کر دوپٹہ کے آنچل سے کھیلنے لگتی ہے - اور فاقہ زدہ لوگوں کی طرف دیکھتی ہے)

نہیں - مگر یہ نہیں ہو سکتا - روس کے لوگ فاقہ سے نہیں مر سکتے - میں انھیں خوراک خریدنے کے لئے دولت دوں گا - میرے پاس سو روبل کا نوٹ ہے - اور میں اور بھی لا سکتا ہوں - روس کے لوگ فاقے نہیں کریں گے - یہ لو - اچھے لوگو

(وہ ہاتھ میں سو روبل کا نوٹ پھیلا کر ان کی طرف بڑھتا ہے)

یہ لو - (مگر پردہ کے سامنے آکر رک جاتا ہے - اس کے دونوں ہاتھ ٹٹولتے ہیں مگر وہ پردہ کو چھوتی نہیں - اور آگے نہیں بڑھ سکتی - دوسرے آدمی اسے نہیں دیکھ رہے ہیں)

خرم - یہ نہیں ہو سکتا - وہ وقت بہت دور ہے

زرشن - بہت دور؟

خرم - ہاں - یہ ۱۹۲۰ء کے روس میں ہوگا

زرشن - آہ مستقبل میں! مگر میں کیا کر سکتا ہوں؟

خرم - تم جو کچھ کر سکتے تھے - وہ کر چکے ہو

زرشن - میں؟

خرم - دیکھو!

زرشن - (بچوں کی طرح نوٹ کو آگے پھیلائے ہوئے حسرت بھرے لہجہ میں بولتا ہے) میں یہ روپیہ انھیں دینا چاہتا ہوں

خمر - دیکھو!

میریا - (اون کا شانہ جھنجھوڑتے ہوئے) اون - اون - اٹھو

اون - (سر کو اٹھانے کے بغیر پھراتے ہوئے) کیوں ؟

میریا - ہمیں خوراک تلاش کرنی چاہئے

اون - (حقارت آمیز لہجہ میں) خوراک ؟ کہاں سے ؟

میریا - سنو اور میں تمھیں بتاتی ہوں - اون سنو

اون - مجھے سونے دو

میریا - اون سنو - صرف سن لو - بنولسکا میں خوراک ہے

اون - بنولسکا میں خوراک ؟

میریا - آہستہ بولو - اون سنو

اون - اچھا

میریا - (رازداری کے انداز میں) کل سکوبلف نے مچھلی کا ڈبہ کھولا تھا - مجھے معلوم ہے - وہ انگلستان سے آیا تھا - اس نے دو تین کھائی تھیں - مگر ان میں سے بو آتی تھی - اس لئے انھیں اس نے رکھ چھوڑا تھا - اب بھی تو مچھلیاں پڑی ہوئی ہونگی جاؤ انھیں خرید لاؤ

اون - میرے پاس دام نہیں صرف یہ ہیں (چار نوٹ دکھاتا ہے)

میریا - کتنے ہیں

اون - چار ہزار رُوبل - مگر ان سے تمام مچھلیاں نہیں مل سکتیں

میریا - اُن میں سے بو آرہی تھی - شائد دیدے

(زرشن نوٹ کو گرا دیتا ہے - اور مایوس ہو کر منہ ہاتھوں سے ڈھانپ لیتا ہے - منظر پر تاریکی بڑھتی جاتی ہے - اور سوائے زرشن کے خاکہ کے اور کچھ نظر نہیں آتا - زرشن رو رہا ہے خمر آرام کرنے کے لئے لیٹ گئی ہے - کچھ عرصہ کے بعد زرشن کے گریہ سے زیادہ بلند اور مہیب آواز جمائی لینے کی آتی ہے - یہ خمر بیدار ہو رہی ہے - اب اس کا تمام لباس زرد ہو گیا ہے - وہ انگڑائیاں اور جمائیاں لیتے آہستہ آہستہ اٹھتی ہے - وہ اپنے آپ کو بمشکل سنبھال رہی ہے - جیسے بہت تھکی ہوئی ہو - اور درختوں سے ٹیک لگاتی ہوئی باہر نکل جاتی ہے - پہلا منظر پھر سامنے آجاتا ہے - ۱۹۱۲ء کے روس میں ایلکسے اور اون میز کے گرد بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں - میریا اور اینا کے درمیان خوش گپیاں ہو رہی ہیں)

زرشن - (روشنی کے تیز ہونے پر آنسو خشک کر رہا ہے) آہ ! میں انھیں بچاؤں گا (اٹھ کر ایلکسے اور اون کے پاس چلا جاتا ہے) دوستو - دوستو - فیصلہ کرنے سے پیشتر میری ایک عرض سن لو

ایلکسے - کہو

زرشن - اگر اس انقلاب نے ہماری تجارت اور مالیات کو خراب کر دیا - تو پھر ؟ ہو سکتا ہے کہ فوری انقلاب سے اُنھیں نقصان پہنچ جائے

ایلکسے - میں نے تمھیں بتایا ہے - کہ میں لوگوں کو امیر بنا دوں گا

زرشن - ہاں ایلکسے یہ تو صحیح ہے - لیکن اس سے اگر ہمارے اعتبار میں فرق آگیا - تو پھر کیا ہوگا - اگر

روبل اس قابل ہی نہ رہے۔ کہ ان سے خوراک خریدی جاسکے۔ تو پھر؟

میریا۔ توبہ ابھی تک سیاسیات پر ہی گفتگو ہو رہی ہے

اینا۔ تمھیں کیا۔ مردوں کا جس مضمون پر جی چاہے وہ گفتگو کرسکتے ہیں

(میریا ہنس دیتی ہے)

ایلکسے۔ میں ابھی تم پر سب کچھ واضح کردوں گا

اولن۔ ایلکسے نے اس کا خوب مطالعہ کیا ہے

زرشن۔ ہاں۔ اولن۔ مجھے معلوم ہے۔ لیکن ابھی.....

ایلکسے۔ میں ابھی اس کی توضیح کرتا ہوں۔ اگر ناخوشگوار اثر کی وجہ سے روبل اپنی قدر کھودے۔ جس کا اندیشہ نہیں۔ تو اس صورت میں مرکزی انقلا بنک انتظام کرے گا کہ......

پردہ

(ماخوذ)

نسیم رضوانی

نگارستان حصۂ دوم

یعنی حضرت نیاز فتحپوری کے ۳۰ بہترین افسانوں کا مجموعہ جو اس سے قبل کبھی کتابی صورت میں شایع نہیں ہوئے۔ زیر کتابت ہے۔ حجم ۵۰۰ صفحات سے زاید ہوگا۔ اور غالباً ستمبر ۳۳ء تک شایع ہو سکے گا۔ اس کی قیمت علاوہ محصول کل تین روپیہ سے کم نہ ہوگی لیکن جو حضرات دو روپیہ ذریعہ منی آرڈر بھیج کر ابھی سے اپنا نام درج رجسٹر کرالیں گے۔ اُن کو اسی دو روپیہ میں یہ نادر مجموعہ مل جائے گا

غالباً یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس وقت صحیح معنی میں انشاء عالیہ کا لکھنے والا اگر کوئی ہے تو وہ صرف حضرت نیاز ہیں اور اس لئے اس مجموعہ میں ایسے ایسے جواہر ادب آپ کو ملیں گے جو کسی دوسری جگہ میسر آ ہی نہیں سکتے

منیجر نگار لکھنؤ

مکتوبات نیاز

چلو ہٹو میں تم سے بات نہیں کرتا، اُن سے کہہ رہا ہوں جن کے متعلق تم یہ کہا کرتے ہو کہ
اُن کو کیا بات کرنی نہیں آتی

سنئے، اس شقی نے چار خط میرے پاس بھیجے ہیں اور ہر خط آپ کی شکایت سے لبریز۔ کچھ آپ سمجھیں کہ یہ شکایت کیوں اور کس بات کی ہے۔ تفصیل کی ضرورت نہیں کیونکہ میں تو آپ کی بیگناہی پر اور اس شخص کی نامعقولیت پر اسی دن ایمان لے آیا تھا جب باوجود آپ کی مخالفت کے یہ جمعہ کی نماز کا بہانہ کرکے گیا اور "خون آلودہ ہاتھ" سمیت جلسہ گرفتار کیا گیا —— یہ آپ کی شرافت تھی کہ اس کی توبہ پر یقین کر لیا اور باگ ڈھیلی چھوڑ دی، ورنہ یہ تو اسی قابل تھا کہ ایک پنجرہ میں "میاں مٹھو" بنا کر بٹھا دیا جاتا اور صبح شام دو پیالیوں میں دانہ پانی دے کر پھر اس کی خبر نہ لی جاتی —— وہ تو کہئے، اللہ نے آپ کو نیک دل، خدا ترس، پیدا کیا ہے، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اس کو تو میدان کربلا میں گھسیٹ گھسیٹ کر، مار ڈالنا چاہئے —— اس لئے آپ سمجھ سکتی ہیں کہ میں سفارش تو اس کی کبھی کر نہیں سکتا، لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ یہ روز روز کے جھگڑوں سے آپ اپنی زندگی کیوں تلخ کرتی ہیں۔ آپ لعنت بھیجئے تمام تعلقات کو اور میرے پاس چلی آئیے، ہر چند جسمانی راحت و آسائش کے وہ اسباب تو یہاں فراہم نہیں جو آپ کو وہاں میسر ہیں، لیکن اس کا ذمہ دار ضرور ہوں کہ نہ اختلاج قلب کا دورہ آپ پر ہوگا نہ ضیق نفس کا —— میں یہ لکھ رہا ہوں اور جانتا ہوں کہ آپ کبھی نہ آئیں گی کیونکہ باوجود ان تمام باتوں کے جتنی محبت آپ کو اس کافر سے ہے، اس کا اعتراف وہ بھی کرتا ہے، پھر خدا کے لئے آپ ہی ذرا صبر و ضبط سے کام لیجئے۔ اور کبھی کبھی "لڑکپن" کر لینے دیا کیجئے، چند دن کی بات اور ہے، ۳۰ سے متجاوز ہونے کے بعد اگر آپ دھکیلیں گی بھی تو یہ گھر سے باہر قدم نہ نکالے گا —— اتنی سختی بھی اچھی نہیں۔ خاص کر ایسے شخص کے ساتھ جو واقعی آپ کا غلام ہے، گو فی الحال وفادار نہیں

حضرت قبلہ،

یہ جو آپ نے خواہ مخواہ درد سر مول لے رکھا ہے، میں پوچھتا ہوں، اس سے فائدہ کیا ہے؟ مانا کہ یہ

سب کچھ فرض ہے اور فرض بھی کیسا؟ مذہبی، صدیقی چشتی، نظامی - لیکن اس کے کیا معنی کہ آپ خود اپنی زندگی کے فرائض بھول کر بیوی بچوں سے بھی بیزار ہو جائیں - خدا کے لئے بتائیے یہ کہاں کا مذہب ہے، یہ کیسا تصوف ہے، یہ دنیا میں درویشی و خدا ترسی کا کونسا نیا مسلک دریافت ہوا ہے. جو سب سے پہلے انسان کے دماغ ہی کو خراب کر ڈالتا ہے

صبح جائیے تو معلوم ہوگا کہ شاہ صاحب کے یہاں ختم خواجگاں میں شرکت کے لئے گئے ہوئے ہیں، دوپہر کو ڈھونڈھیے تو خبر ملے کہ ابھی تک نہیں آئے، پیر جی کے پاؤں داب رہے ہیں، شام کو تلاش کیجئے تو پتہ چلے مراقبہ میں ہیں توجہ لے رہے ہیں ——— رات کو تو خیر انوار ربانی کے حصول کے لئے پیر و مرشد کے ساتھ شب زندہ داری گویا فرض ہی ہے ——— میں پوچھتا ہوں کیا دماغ خراب ہو گیا ہے، یا تمھارے پیر نے کوئی افسوں پھونک دیا ہے جو اپنے بچوں کی محبت بھی تم کو باقی نہیں رہی ——— تم اپنے پیر کے ساتھ فاقہ کرو یا جو جی میں آئے جھک مارتے رہو، اپنے متعلقین کو کیوں بھوکا مارتے ہو - تیس روپیہ تو آپ کی تنخواہ ہے، اس پر یہ غیر حاضریاں پھر آپ ہی بتائیے کہ اس مہینے میں جو صرف دس روپیہ آپ کو ملے ہیں، اُن میں آپ کے بیوی بچوں کے کھانے کپڑے کا انتظام کیا جائے یا اس مہاجن کی قسط ادا کی جائے جس سے قرض لے لے کر آپ نے "خانقاہ شریف" کی مسجد کا کنواں کھدوایا ہے - لمبی داڑھیاں تو بہت دیکھنے میں آئی ہیں، لیکن تم ایسے بیوقوف شاذ و نادر ہی پیدا ہوتے ہیں

یاد رکھو کہ یہ جو جنت کی لالچ دلا دلا کر رات رات بھر تم سے پاؤں دبواتے رہتے ہیں اور دن بھر غلام کی طرح دوڑاتے ہیں، مذہب کے دشمن ہیں، انسانیت کے دشمن ہیں اور تمھاری عاقبت خراب کر رہے ہیں احمق، مذہب نام ہے صرف اُن حقوق کے ادا کرنے کا جو بہ حیثیت متمدن انسان ہونے کے تم پر عائد ہوتے ہیں اور سب سے پہلے جن کے حقوق تم کو ادا کرنا ہیں وہ تمھارے بال بچے ہیں ——— یہ تمھارا پیر، جیتے جی اس دنیا ہی میں تمھیں جہنم واصل نہ کر دے تو سہی ——— خیر چند دن اور دیکھتا ہوں - اس کے بعد تم سے تو خیر کچھ نہ کہوں گا، لیکن تمھارے پیر کو بتاؤں گا - جس نے ایک شریف عورت کو شوہر کے ہوتے ہوئے بیوہ اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو باپ کی زندگی ہی میں یتیم بنا دیا

یا ایہا السکاری!

آپ حضرات کی اسکیم پہونچی ——— کیا کہنا، کیسی کیسی جولانی طبع سے کام لیا گیا ہے، کیا کیا جو انیاں دکھائی گئی ہیں، لیکن سچ پوچھئے تو سوائے ایک کے مجھے کسی سے اتفاق نہیں ——— پہلے ایک لطیفہ سن لو:-

"ایک بڑھیا، ضعیف و کمزور راستہ سے گزر رہی تھی کہ ناگہاں ایک گاڑی سے تصادم ہوگیا۔ اور بیہوش ہوکر گر پڑی ——— یہ دیکھ کر چاروں طرف سے لوگ جمع ہو گئے اور مختلف رائیں دینے لگے۔ کسی نے کہا کہ اس کو فوراً اسپتال پہونچانا چاہئے کوئی بولا کہ ہلدی پیس کر تھوپنے کی ضرورت ہے، کسی نے رائے دی کہ اس کے مکان کا پتہ معلوم کرکے گھر پہونچا دینا چاہیئے۔ الغرض اسی طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ ایک صاحب نے کہا کہ " یہ تدبیریں تو بعد کو ہوتی رہیں گی، چوٹ زیادہ لگی ہے اس لئے سب سے پہلے گرم گرم دودھ پلانا چاہیئے۔ بڑھیا اس وقت تک تو بیہوش پڑی ہوئی تھی، لیکن یہ رائے سنکر فوراً پٹ سے آنکھیں کھول دیں اور نہایت ہی حزیں آواز میں بولی کہ " ارے کوئی ان کی بھی تو سنو، یہ کیا کہہ رہے ہیں "

سو بھائیو، نہ کشمیر جانے سے مجھے اتفاق ہے، نہ مسوری کے سفر سے بلکہ میں تو میر صاحب کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے وہی کہوں گا جو اس بڑھیا نے کہا تھا کہ " کوئی ان کی بھی تو سنو، یہ کیا کہہ رہے ہیں " ——— یعنی تم سب ملکر یہیں آجاؤ۔ میں اس میں صرف اتنا اضافہ کروں گا کہ جب آؤ تو اپنی اپنی حسب حیثیت میرے لئے تحائف بھی لیتے آؤ ——— مقصود صرف اجتماع ہے وہ اس طرح بھی پورا ہوسکتا ہے

ہرچند شادی کوئی اچھی چیز نہیں، مگر آپ ضرور کیجئے، کیونکہ اگر یہ حرکت آپ نے نہ کی تو کوئی اور اس سے زیادہ خراب کر بیٹھیں گے ——— مگر یہ خیال رہے کہ آپ شادی کر رہے ہیں، عیاشی نہیں ——— بیوی کا تعلق " جذبۂ شہوانی " سے اتنا نہیں ہے، جتنا " مصلحت عمرانی " سے ہے، اس کا صاحب حسن و جمال ہونا اتنا ضروری نہیں جتنا خوش خصال ہونا ——— لیکن مجھے معلوم ہے کہ آپ میری اس نصیحت کی مطلقاً پرواہ نہ کریں گے اور " ضرورت شادی " کا جو اشتہار دیں گے تو اس میں سب سے پہلی شرط " جمیل و طرحدار " ہونے کی درج ہوگی ——— حالانکہ آپ خود اس لحاظ سے ماشاء اللہ صفر ہی صفر ہیں ——— میری سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آئی کہ ایک معمولی صورت کا مرد کیوں یہ خواہش کرتا ہے کہ عورت اُسے بہت حسین ملے۔ پھر طرفہ تماشہ یہ ہے کہ اگر کوئی بدقسمت اُسے مل بھی گئی تو وہ یہ چاہتا ہے کہ وہ اس سے محبت بھی کرے ——— آؤ میں تمھیں ایک رازکی بات بتاؤں، مگر کسی مولوی سے نہ کہدینا ——— یہ جو مذہب اسلام میں کفو کے درمیان شادی کرنے کی ہدایت کی گئی ہے، اس کا مفہوم سب لوگ غلط سمجھے ہیں۔ کفو سے یہ لوگ خاندان یا برادری مراد لیتے ہیں، درانحالیکہ کفو کے معنے مماثل کے ہیں ——— مماثل کیا؟ یعنی جو لوگ تہذیب و شرافت، تعلیم و تربیت، سیرت و صورت میں باہمدگر مماثل ہیں ان میں ایک دوسرے کے ساتھ رشتۂ ازدواج قائم ہونا چاہیئے، پھر اس کے لئے خاندان یا برادری کی قید بیکار ہے۔ فرض کیجئے خاندان ہی میں ایک لڑکی ہے لیکن اپنے صفات کے لحاظ سے وہ ادنیٰ درجہ کی ہے تو یقیناً کفو میں داخل نہ ہوگی، لیکن اگر کسی دوسرے

خاندان کی ہے اور صورتاً و سیرتاً مماثل واقع ہوئی ہے تو کفو کہلائے گی۔۔۔ بہرحال کفو کا صحیح مفہوم انگریزی کے لفظ (Status) اور (Position) سے ظاہر ہوتا ہے۔۔۔ اس لئے اگر کوئی شخص بدصورت ہے تو وہ حسین عورت کا کفو نہیں ہو سکتا جس طرح ایک بدصورت عورت حسین مرد کے لئے کفو نہیں جنت میں حوریں بدصورت مردوں کی صحبت گوارا کرلیں تو کرلیں، لیکن اس دنیا میں یہ ظلم زیادہ نبھنے والا نہیں۔ اس لئے یوں بھی آپ کو "حسن و جمال" کی جستجو کا حق حاصل نہیں۔ یقیناً آپ بدصورت نہیں لیکن اتنے طرحدار بھی نہیں کہ جیو پیٹر کی بیٹی سے کم درجہ کی عورت آپ کو پسند نہ آئے۔۔۔ بہرحال اگر معمولی صورت کی مگر بے انتہا شریف سلیقہ مند لڑکی درکار ہو تو میری نگاہ میں دو چار جگہ ایسی ہیں جہاں یہ رشتہ کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر تمھیں صرف "حرمزدگی" کرنا ہے تو شادی کا خیال ترک کر دو اور جس طرح قربانی کے سانڈ بازاروں میں آزاد زندگی بسر کرتے ہیں تم بھی بسر کرو۔ ذمہ داری کچھ نہیں اور لذتیں وافر

نیاز نوازا، کرم گسترا

میں آپ کی عنایتوں کا شکریہ ادا کرنے کے لئے بہ اندازۂ احساس و تاثر، الفاظ سے کہاں سے لاؤں لیکن اگر "سکوت" کبھی کسی نوعیت سے "تکلم بلیغ" بن سکتا ہے تو خدارا میری اس خاموشی ہی کو اعتراف احسان سمجھئے گو میں جانتا ہوں کہ

سلطان نہ خواہد خراج از خراب

آپ پر جو خلوص و محبت صرف فرمارہے ہیں اور جس عالی حوصلگی سے ان کی اعانت فرمارہے ہیں، وہ آپ کی فطرت سہی، لیکن اس زمانہ میں تو اس کی نظیر مجھے کوئی نظر آتی نہیں۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بھی اپنی خدمت و نیازمندی سے ہمیشہ آپ کو خوش رکھیں گے اور آپ کو اس لطف و محبت کے رائگاں جانے کا افسوس نہ ہوگا

میں خود بھی سرِ عقیدت آستانِ گرامی پر جھکانے کے لئے اگلے ماہ حاضر ہوں گا

ایامِ دولت مستدام

کیا پوچھتے ہو، کس عالم میں ہوں۔۔ نہ "صحو و بیداری" نہ "سکر و خمول" بلکہ ایک اور کیفیت ہے ان کے بین بین، جسے بے حسی کے لحاظ سے جو چاہے کہہ لو، لیکن "احساس بے حسی" کے اعتبار سے میں تو اسے یکسر "گوش و ہوش" ہی کہوں گا

مولانا تشریف لائے اور چار دن قیام رہا، لیکن کس کمبخت کو یاد ہو کہ وہ کیوں آئے اور کسی طرح تشریف لے گئے، ظاہر ہے کہ اس حالت میں ان کی خاطر مدارات مجھ سے کیا ہوئی ہوگی، سخت شرمندہ ہوں

میں خود اس دوران میں ایک ہفتہ کے لئے اجین گیا تھا لیکن اب سوائے خواجہ صاحب کی الاپ کے (جو روزانہ ۵۰۰ ڈنڑ کے بعد، تنبورہ پر ایک گھنٹہ تک الاپتے رہتے ہیں) کچھ یاد نہیں، سیّد منور علی صاحب وکیل نے میرا جی بہلانے کے لئے وہ سب کچھ کیا جو اپنے بے تکے پن کے ساتھ کر سکتے تھے۔ لیکن "تبسم مضمحل" سے بھی لب آشنا نہ ہوئے —— شام کو اجین کی اُس کفر خیز و جاں نواز ندی کے ساحل پر بھی گیا جو بقول آپ کے ہزاروں افسانہائے عشق اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے، اور بارہا "بتان شوخ و طناز" سے تبادلۂ نگاہ بھی ہوا، لیکن دل کی یہ کیفیت ہے جیسے "برف کی قاش" جامد، بارد —— اس سے قبل بھی کئی بار یہ دورہ میرے اوپر پڑا، لیکن ایسا سخت و شدید نہیں کہ رات دن سوائے نمازیں پڑھنے کے اور کسی کام کا نہ رہوں تمھیں بتاؤ کیا کروں؟

کل شام کو حکیم حافظ......... صاحب تشریف لائے، کہنے لگے اجمیر چلو، خواجہ کے دربار میں حاضری دو یہ گرہ کھل جائے گی، بے اختیار ہنسی آگئی، پندرہ دن کے بعد یہ پہلی گدگدی تھی جو دل میں پیدا ہوئی، وہ تو خیر یتیم خانہ کا چندہ لے کر چل دئے، لیکن ایک مستقل خلش دل میں چھوڑ گئے کہ کیوں نہ اس کا تجربہ کیجئے غور کیجئے کہ کہاں میں اور کہاں یہ خیال —— خیر خدا خدا کرکے صبح تک اس سے نجات ملی تھی کہ آپ کا خط ملا اور وحشت دو چند ہو گئی، —— اگر اتنی باتیں کرکے دل ہلکا نہ کر لیتا تو خدا جانے اور کس خبط میں مبتلا ہو جاتا۔ بمبئی سے بھی میاں صاحب کا خط آیا ہے، بُلا رہے ہیں۔ ارادہ ہے کہ چلا جاؤں اور وہاں بھی چند دن

"سپر چھوڑ کے تقدیر کو رو آؤں"

رشک دشمن بہانہ تھا، سچ ہے
میں نے ہی تم سے بیوفائی کی

آپ نے بھی کس کا ذکر چھیڑ دیا —— میں تو اس وقت تک اس لئے خاموش تھا کہ دنیا کا ذوق آشنا ابھی نہیں ہوا کہ وہ مومن کو سمجھ سکے —— ایسے ایسے خدا جانے کتنے جواہر پارے اس کے کلام میں پائے جاتے ہیں خلاصہ یہ کہ مومن کنایہ و طنزیات کا بادشاہ تھا۔ اور اس وقت تک دنیائے شاعری اس کا جواب پیدا نہیں کر سکی —— ایک اسی شعر کو لے لیجئے جو آپ نے لکھا ہے۔ خدا جانے کتنے ٹکڑے لانے کے بعد یہ داستان پوری ہو سکتی ہے —— پھر لطف یہ ہے کہ تمام ٹکڑے خود شعر ہی سے پیدا ہو رہے ہیں —— پہلے یہ متعین کیجئے کہ ——

" رشک دشمن بہانہ تھا " کس نے کہا ـــــ ظاہر ہے کہ یہ فقرہ محبوب نے کہا ہوگا اور مومن سے کہا ہوگا ـــــ اس لئے یہ بات کھل گئی کہ مومن نے اپنی عدم حاضری کا سبب کبھی یہ بتایا ہوگا کہ " میرے آنے سے دشمن کو رشک پیدا ہوتا ہے اور یہ غالباً آپ کو گوارا نہ ہوگا " ـــــ محبوب نے یہ سنکر کہا ہوگا کہ " کیوں رشک دشمن کا بہانہ کرتے ہو، یہ کیوں نہیں کہتے کہ محبت اب نبھ نہیں سکتی " ـــــ اس کا جواب مومن نے اپنے اسی طنزیاتی انداز میں یوں دیا کہ

رشک دشمن بہانہ تھا سچ ہے
میں نے ہی تم سے بیوفائی کی

یعنی اگر تم یہ کہتے ہو تو یہی سہی ـــ مدعا یہ کہ تمہارا الزام بالکل غلط ہے اور مجھ سے بیوفائی کی شکایت کوئی معنی نہیں رکھتی

اگر آپ نے کوئی اور مفہوم پیدا کیا ہے تو اس سے مطلع کیجئے

آپ اس رنگ کے اور شعر چاہتے ہیں ـ مومن کا دیوان بھرا پڑا ہے ـ چند ملاحظہ ہوں :-

بے جرم پائمال عدو کو کیا کیا ــــ مجکو خیال بھی تری سر کی قسم نہیں
دھیان ہے غیر کے تحمل کا ــــ ہوش دیکھا ترے تغافل کا
کس دن بھی اسکے دل میں محبت جو آئی نہیں ــــ سچ ہے کہ تو عدو سے خفا ہے سبب ہوا
کیا گلے ہوتے جو اوروں پہ بھی کچھ جاتا ــــ شکر صد شکر کہ میرا سا ترا دل نہوا
عدو اس اوج پہ رضا کی ہر شائد غصہ آجائے ــــ ملادے خاک میں یہ بھی تو شکر آسماں کیجئے
خود بینی و بیخودی میں ہے فرق ــــ میں تم سے زیادہ کم نما ہوں

یاد رکھئے کہ دیوان غالب کی شرحیں لکھ لی جائیں گی، ذوق و سودا کے قصائد حل کر لئے جائیں گے لیکن مومن کو چھونے کی ہمت کسی میں نہیں ـــــ دیکھئے اگر کبھی فرصت ہوئی تو میں ہی اس خدمت کو انجام دوں گا سچ ہے :- کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق

اگر آپ آمادہ ہو جائیں تو کیا کہنا

کل ہانسی کے ایک خط سے مرزاجی کے حالات معلوم ہوئے، دل تڑپ کر رہ گیا ـ مجھ پر جتنے احسانات ان کے ہیں، وہ صرف میں جانتا ہوں ـــــ وہ پریشان ہوں اور میں ان تک نہ پہونچ سکوں! قیامت ہے خدا کے لئے سب سے پہلی فرصت میں ہانسی پہونچو اور خود تمام حالات معلوم کر کے مجھے اطلاع دو

مرزا جی سے مطلقاً اس کا ذکر نہ آئے کہ تم میرے اشارہ سے گئے ہو یا یہ کہ مجھے کسی اور ذریعہ سے ان کے حالات معلوم ہو چکے ہیں
ظاہر ہے کہ مجھ سا شکستہ ناخن شخص کسی کی کیا مدد کر سکتا ہے، لیکن جان دینا تو اختیار میں ہے، گو اس کے بعد بھی، اُن کے احسانات سے سبکدوش ہونا ممکن نہیں

جانعالم پیا، اپنے بعد کوئی اولاد چھوڑ گئے ہوں یا نہ چھوڑ گئے ہوں، لیکن تمھیں اپنا جانشین ضرور بنا گئے ہیں — ماشاء اللہ کیا کہنا، وہی تیور، وہی رنگ رلیاں، وہی آن بان، کیوں نہ ہو، جوانی ہے حسن ہے، باپ کی کمائی ہوئی مفت کی دولت ہاتھ آئی ہے — تم نہ ایسا کروگے تو کیا واجد علی شاہ کی سُنت ادا کرنے کے لئے کوئی فرشتہ آسمان سے آئے گا
میاں ہوش میں آؤ، عقل کے ناخن لو، آدمی کے گھر میں پیدا ہوئے ہو تو آدمی کی طرح رہو بھی — چار دن کے بعد جب سورج ڈھلنے لگے گا تو تمھارے تمام دوست احباب جو اس وقت جان چھڑکنے کے لئے طیار ہیں، بات کرنے کے بھی روادار نہ ہوں گے، اس وقت تمھیں ہوش آئے گا لیکن بیکار — مجھے آپ کی دولت کا حال معلوم ہے — نقد زیادہ سے زیادہ دس ہزار اور جایداد کم و بیش ۴۰ ہزار کی — یہ بھی کوئی اتنی بڑی چیز ہے جس پر انسان اپنے حواس کھو بیٹھے۔ شریفوں کی طرح چلو، اور اپنی بڑھیا ماں کا دل نہ دُکھاؤ — تمھیں شرم نہیں آتی کہ جس دیوان خانے کے اندر تمھارے باپ کے زمانہ میں کسی وقت صرف علماء و فضلا کا مجمع نظر آتا تھا، آج وہ صرف گالی گلوج اور مسخرہ پن کے لئے وقف ہے۔ بُرا تو ضرور معلوم ہو گا لیکن ہو، جب تک تمھاری والدہ زندہ ہیں، مجھے سب کچھ کہنے کا حق حاصل ہے اور کہے جاؤں گا۔ زیادہ سے زیادہ تم یہی کر سکتے ہو کہ مجھے اپنے مکان پر نہ آنے دوگے۔ مگر اس سے تو مجھے باز نہیں رکھ سکتے کہ تمھاری والدہ کو ہمیشہ کے لئے اپنے پاس بلالوں اور اُن کو اس تکلیف سے نجات دلاؤں

باب الاستفسار

برتھ کنٹرول - نماز - تناسخ

(جناب محمد ایوب صاحب بینہ - بھدرواہ، جموں)

میں اگرچہ احمدی خیالات کا ہوں مگر پرورش میری ایسے شفیق باپ کی آغوش میں ہوئی ہے، جو اگرچہ پرانے فیشن کے ہیں مگر آزادخیالی میں موجودہ زمانہ کے ساتھ ساتھ ہیں - آپ غالباً واقف بھی ہوں گے - مولانا محمد عبداللہ صاحب وکیل ہائی کورٹ سری نگر کشمیر - نگار کی خدمت میں دینی خدمت سمجھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ وہ ہر خواندہ مسلمان کے ہاتھ میں ہو

(۱) کیا اولاد کی زیادتی اسلام نے جائز قرار دی ہے - جبکہ پرورش کے سامان ہی موجود نہ ہوں - اور کیا یہ آیت قرآنی لاتقتلوا اولادکم خشیۃ املاق اس پر حاوی نہیں ہے - اور کیا یہ قوم کی تنزلی کی وجہ نہیں

(۲) نماز جو مقرر ہے - جو رکعتیں ادا کی جاتی ہیں - کیا تمام ضروری ہیں اور آپ کا ذاتی خیال نماز کے متعلق کیا ہے اور کیا یہ صحیح ہے کہ قبر میں جاتے ہی نماز کا سوال پیش ہوتا ہے

(۳) (Transmigration) اواگون - یا تناسخ کے متعلق اسلام کا زاویہ نگاہ کیا ہے - اور یہ کس حد تک صحیح ہے - آپ کی ذاتی رائے کیا ہے

(نگار) ۱- آپ کا پہلا سوال غالباً برتھ کنٹرول (Birth Control) سے متعلق ہے یعنی آپ زیادتی اولاد کے مخالف ہیں اور چاہتے ہیں کہ پیدائش کے سلسلہ کو کم کیا جائے کیونکہ مسلمانوں کی مالی حالت کا اقتضا یہ نہیں ہے لیکن آپ نے جس آیت سے استدلال کیا ہے وہ تو آپ کے مخالف واقع ہے

کلام مجید میں دو جگہ اسی مضمون کی آیتیں پائی جاتی ہیں - ایک سورۂ انعام میں اور دوسری جگہ سورۂ بنی اسرائیل میں ـــــ سورۂ انعام کی آیت کے الفاظ یہ ہیں :-

لاتقتلوا اولادکم من املاق نحن نرزقھم و ریاھم

سورۂ بنی اسرائیل میں یوں ارشاد ہوتا ہے :-

لاتقتلوا اولادکم خشیۃ املاق ۔ نحن نرزقھم و ریاھم

یعنی تم لوگ اپنی اولاد کو غربت و افلاس کے اندیشہ سے ہلاک نہ کرو۔ تمھیں اور اُن کو رزق پہونچانے والے تو ہم ہیں

عربوں میں یہ رسم چلی آرہی تھی کہ لڑکیوں کو مار ڈالتے تھے کیونکہ یہ جوان ہوکر لڑائی میں حصّہ نہ لے سکتی تھیں اور مال غنیمت انکو نہ ملتا تھا۔ اس سے باز رکھنے کے لئے یہ حکم نافذ کیا گیا تھا۔ اس لئے اگر انصاف سے کام لیجئے تو آج برتھ کنٹرول بھی اسی آیت کی رُو سے ناجائز قرار پاسکتا ہے، کیونکہ افلاس کے خوف سے اولاد کو مار ڈالنا یا اُن کو پیدا نہ ہونے دینا تقریباً ایک ہی حکم میں داخل ہے۔ اس لئے اس آیت سے تو آپ کے خیال کی تردید ہوتی ہے نہ کہ تائید ۔۔۔۔ لیکن برتھ کنٹرول کے معاملہ میں بڑی حد تک میں آپکا موافق ہوں، کیونکہ یہ مسئلہ بھی منجملہ ان مسائل کے ہے جن کا تعلق مذہب و شریعت سے کوئی نہیں ہے بلکہ ہمارے اقتصادی و معاشی معاملات سے ہے ۔۔۔ اگر واقعی کوئی شخص مفلس و نادار ہے تو اس کے لئے سب سے زیادہ عذاب دنیا میں یہی ہے کہ اولاد کی کثرت ہو، اس لئے اس کا انفرادی و ذاتی فرض یہ ہے کہ وہ قطعاً اس سلسلہ کو روک دے ۔ کیونکہ محض آبادی کی زیادتی کوئی چیز نہیں، جب تک اس میں اہلیت و انسانیت نہ پائی جائے اور یہ بغیر تعلیم و تربیت کے حاصل نہیں ہوسکتی ۔۔۔ پھر چونکہ اس زمانہ میں زندگی کی تمام ضروریات حد درجہ گراں ہوگئی ہیں اور اسی نسبت سے تعلیم کے مصارف بھی غیر معمولی ہوتے ہیں، اس لئے اگر کسی شخص کی مالی حالت اتنی کمزور ہے کہ وہ اپنی اولاد کی صحیح تربیت کا انتظام نہیں کرسکتا۔ اور پھر بھی اولاد پیدا کرتا جاتا ہے۔ تو میرے نزدیک ایسا شخص قوم کا مجرم ہے اور اس کو سخت سے سخت سزا دینا چاہئے۔ کیونکہ وہ سوسائٹی میں ناقابل و نااہل افراد کا اضافہ کررہا ہے جو قومی زندگی کے لئے سخت تباہ کن امر ہے ۔۔۔ لیکن اگر کوئی شخص تعلیم و تربیت کا پورا انتظام کرسکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اولاد سے گھبرائے اور قطع نسل کی طرف مایل ہو ۔۔۔۔ یہاں ایک اعتراض ضرور پیدا ہوتا ہے کہ یہ تو سوسائٹی کا فرض ہے کہ وہ قوم کے بچّوں کی پرورش کرے اور انھیں تباہ نہ ہونے دے اس لئے بجائے برتھ کنٹرول کے یہ کیوں نہ کیا جائے کہ سوسائٹی کی توجہ اس طرف مبذول کرائی جائے ۔ یقیناً یہ اعتراض بالکل درست ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر سوسائٹی ایسا نہ کرے یا کرنے کے قابل نہ ہو تو انفرادی فرض ہر شخص کا کیا ہونا چاہئے ؟ ۔۔۔ کیا خود اس کا فرض یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی حالت کا اندازہ کرے اور کیا دانشمندی کا اقتضا یہ نہیں ہے کہ وہ خود اپنی تدبیر سے سوسائٹی کے کسی بار کو ہلکا کرے۔

اس وقت مسلمانوں کی مالی حالت یقیناً نہایت خستہ ہورہی ہے اور منجملہ دیگر اصلاحی تدبیروں کے ایک تدبیر یہ بھی ہے جہاں تک ممکن ہو اولاد کم پیدا کی جائے

۲ ۔۔۔ نماز ایک طریق عبادت ہے اور طریق عبادت جیسا اور جس قوم کا بھی ہو کبھی بُرا نہیں ہوسکتا، کیونکہ اس سے مقصود اصلاح نفس ہے۔ لیکن نماز کو ان سب میں ایک وجہ امتیاز یہ ضرور حاصل ہے کہ اس میں خاص اجتماعی شان پائی جاتی ہے

جو جذبۂ قومیت کی جان ہے - پھر کسی کا یہ سوال کرنا کہ رکعت دو ہوں یا تین بیکار ہے کیونکہ ایک بار جو اصول مقرر کر دیا گیا ہے اس کی پابندی ضروری ہے ورنہ اصل مقصود اجتماعیت و عسکریت کا فوت ہو جائے گا۔ اسی لئے میں نماز کو ضروری سمجھتا ہوں بشرطیکہ اس کو جماعت کے ساتھ ادا کیا جائے، ورنہ یوں گھروں میں محض جانمازوں پر رکوع و سجود کوئی معنی نہیں رکھتا ـــ اسلام اپنی جس تعلیم پر ناز کر سکتا ہے وہ صرف اس کی جمہوریت و دستوریت ہے، اور یہ مقصود صرف باجماعت نماز ہی سے پورا ہو سکتا ہے

رہا قبر میں جاتے ہی نماز کا سوال پیش ہونا ـــ اس کے متعلق مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا ـــ والد مرحوم کے ایک دوست تھے نہایت آزاد خیال۔ مزاج میں ظرافت بھی بہت تھی ـــ ایک دن فرمانے لگے کہ نام حق میں جو یہ شعر لڑکوں کو یاد کرایا جاتا ہے کہ

روز محشر کہ جاں گداز بود   اولیں پرسش نماز بود

تو اس سے کیا لڑکوں کا گمراہ کرنا مقصود ہے ـــ والد نے پوچھا "یہ کیونکر" جواب دیا کہ اس شعر کا یہی مطلب ہے نا کہ محشر میں سب سے پہلے نماز کی پرسش ہوگی۔ اور پرسش ہمیشہ بُرے کام کی ہوا کرتی ہے نہ کہ اچھے کام کی اس لئے مطلب یہ ہوا کہ قیامت میں سب سے پہلے ہر شخص سے یہ سوال ہوگا کہ تم نے نماز کیوں پڑھی

تو حضرت، میں پرسش و پرستش کا تو قائل ہوں نہیں، لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ بُرے اعمال یہیں انسان کے حشر کو خراب کر دیتے ہیں اور یہیں اس کو سزا مل جاتی ہے، مرنے کے بعد سوال و جواب، نکیرین کی تشریف آوری، فشار قبر وغیرہ یہ سب اس لئے بیان کیا جاتا ہے کہ لوگ اسی ڈر سے اچھے کاموں کی طرف مائل ہوں

۳۔ تناسخ کا عقیدہ اسلام میں کہیں نہیں پایا جاتا، گو بعض اکابر کے اقوال سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ ان کا میلان اس طرف تھا ـــ حال ہی میں حیدرآباد سے کسی صاحب نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں قرآن مجید سے تناسخ کا ثبوت پیش کیا ہے، لیکن میں ان سب کو "تاویلات باردہ" کہتا ہوں

رہی میری ذاتی رائے تناسخ کے باب میں، سو وہ شخص جو روح کے بقا کو نہ مانتا ہو، جو مرنے کے بعد نسیاً منسیاً کا قائل ہو، جو حشر و نشر، عذاب و ثواب، جنت و دوزخ کا معتقد نہ ہو وہ تناسخ کو کیا مان سکتا ہے

ایک تاجر شراب اور پیشہ ور عورت کی کمائی کا فرق

(جناب چودھری نور محمد صاحب منہاس - کلکتہ)

از راہ عنایت ذیل کے دونوں سوالات کے جوابات بذریعۂ نگار مطلع فرمائیں

(۱) اگر ایک پیشہ ور مغنیہ، مسجد یا کسی اور کارِ خیر کے لئے جائداد یا نقد روپیہ پیش کرتی ہے تو ہمارے علماء اس روپیہ یا جائداد کو بکراہت مسترد فرما دیتے ہیں!

(۲) لیکن اگر ایک آرمی کنٹریکٹر جو علانیہ سور بھی بیچتا ہے اور شراب کا بھی کاروبار کرتا ہے اگر کسی کارِ خیر کے لئے روپیہ پیش کرے تو ہمارے علمائے کرام اسے نہایت شکریہ کے ساتھ قبول فرما لیتے ہیں اس کا کیا سبب ہے؟

(نگار) اس سبب کو تو انھیں سے پوچھنا چاہیے جنھوں نے یہ تفریق قائم کی ہے اور جن کے نزدیک شراب و خنزیر کی تجارت سے حاصل کیا ہوا روپیہ پاک اور فحاشی کے ذریعہ سے کمائی ہوئی دولت ناپاک ہے ـــــ یعنی اگر یوں پوچھئے تو وہ کہیں گے۔ کہ ایک پیشہ ور عورت کا روپیہ سور کی طرح نجس ہے، لیکن اگر خود سور کی مدد سے روپیہ حاصل کیا جائے تو وہ پاک و حلال ہے اس ذہنیت کی کوئی توجیہ، میں کیا خود وہ علماء کرام بھی نہیں کر سکتے جو ایسا کرتے ہیں

ظاہر ہے کہ ناجائز پیشہ کرنے والوں کی دولت کو ناپاک کہنا اس لحاظ سے تو ہے نہیں کہ واقعتاً ان کے روپیہ میں کوئی گندگی پائی جاتی ہے، بلکہ صرف اس لئے برا سمجھا جاتا ہے کہ لوگوں کو ایسے نامعقول طور پر روپیہ کمانے سے باز رکھا جائے اسلئے اگر ایک مولوی کسی پیشہ ور عورت کا روپیہ کسی کارِ خیر کے لئے قبول نہیں کر سکتا تو اصولاً شراب و خنزیر کے تاجر کا روپیہ بھی بھی اسے نہ لینا چاہیئے، کیونکہ مذہباً دونوں ایک ہی حیثیت کے گناہ ہیں اور ان کے درمیان خط امتیاز کھینچنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ اس طرف یو۔ پی میں ایک بار کسی بڑے جید عالم نے (جن کا اب انتقال ہو چکا ہے۔) ایک پیشہ ور عورت کا روپیہ تبلیغ یا شاید خلافت کے چندہ میں لے لیا تھا، لیکن اس پر سخت شورش ہوئی اور دوسرے مولویوں نے ان کے خلاف کفر کے فتوے صادر کئے

ایک مرتبہ مسجد کی تعمیر کے سلسلہ میں کسی بازاری عورت سے روپیہ لے لیا گیا اور اس کے متعلق کسی ذہین درم شناس مولوی نے یہ رائے دی کہ اس روپیہ سے اگر مسجد کا استنجا خانہ تعمیر کرا دیا جائے تو کوئی حرج نہیں ـــــ خوشا رعایت ذوق!

بہر حال مذہباً تو دونوں کمائیوں کو یکساں طور پر ناجائز قرار دینا چاہیئے، رہ گئی مصلحت و ضرورت، سو اس باب میں کوئی کیا کہہ سکتا ہے جبکہ مولوی کے پاس نہ حیلۂ شرعی کی کمی ہے اور نہ خود غرضی کی

کیا واقعہ شق القمر قابلِ یقین ہے؟
کیا نبوت واقعی ختم ہو گئی؟

(جناب ام۔ اے۔ صدیقی صاحب۔ کیمور)

نگار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایک Reformed Moulana ہیں۔ چونکہ میں خود

آزاد خیالات کا آدمی ہوں اور فرقہ عبا پوش کی ہوا سموم سے دُور ہی رہنا پسند کرتا ہوں۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ سے کچھ اپنے شکوک رفع کراؤں۔ جن کے لئے اب تک مجھے کوئی عقلی یا علمی ثبوت نہ مل سکا

(۱) آیا "شق القمر" کا واقعہ ٹھیک ہو سکتا ہے اس خرق عادت کے ماننے کے لئے عقل کی رسائی کہاں تک ممکن ہو سکتی ہے

(۲) "خاتم النبیین" سے آپ کیا مطلب لیتے ہیں۔ آیا محمد صلے اللہ آخری نبی تھے یا جیسا کہ "جماعت احمدیہ" مراد لیتی ہے کہ تلفظ خاتِم نہیں بلکہ خاتَم ہے جس کے معنی انگشتری کے ہوتے ہیں اور جس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ وہ دیگر انبیاء و رسل سے زیادہ ممتاز تھے مگر اس سے یہ بات تو ثابت نہیں ہوتی کہ ان کے بعد کوئی دیگر نبی مبعوث ہی نہ ہوگا" واقعی اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو اس دلیل سے رسول کی فضیلت و وقعت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ پھر آپ بتلائیے کہ ایسی حالت میں کونسا مستند علمی ثبوت مہیا کیا جا سکتا ہے۔ کہ وہ آخری نبی تھے۔ یا جماعت احمدیہ ہی کی یہ دلیل قرین قیاس معلوم ہوتی ہے

(نگار) واقعہ شق القمر کو میں کیا بہت سے اکابر علماء اسلام نہیں مانتے۔ اور سچ پوچھئے تو ماننے کی بات ہے بھی نہیں کیونکہ اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ لوگوں نے ایسا محسوس کیا ہو درانحالیکہ ایسا نہیں ہوا اور دوسرے یہ کہ واقعی چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے ہوں۔ اگر یہ معجزہ اول الذکر صورت میں ظاہر ہوا تو کسی رسول کی رسالت کو اس سے چار چاند نہیں لگ سکتے کیونکہ یہ صورت صرف فریب نظر کی ہوگی، جو ایک نبی کی شان کے منافی ہے اور اگر دوسری صورت باور کی جائے تو علماً و عقلاً محال ہے ——— فلکیات کی ترقی نے چاند کے متعلق جو تحقیق کی ہے اس سے انکار ممکن نہیں کیونکہ وہ مشاہدہ و عین الیقین کی حد تک پہونچتا ہے اور کسی کرہ کا ایسی تیز گردش کی حالت میں پھٹ جانا اور پھٹ کر دونوں ٹکڑوں کا باہم مل جانا بالکل خلاف عقل ہے۔ کلام مجید میں اقتربت الساعۃ وانشق القمر کہکر کرۂ زمین اور کرۂ قمر دونوں کی تباہی کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔ زمانۂ ماضی کے کسی واقعہ کا حال بیان نہیں کیا گیا۔ اور احادیث جتنی معجزۂ شق القمر کے متعلق بیان کی جاتی ہیں وہ سب کی سب موضوع ہیں اور ان میں سے ایک بھی درایتاً قابل قبول نہیں

(۲) خاتم النبیین میں خاتم میں (ت) کو زیر ہو یا زبر اور اس کے معنے ختم کرنے والے کے ہوں یا مہر و انگشتری کے، میں بہر صورت ختم نبوت کا قائل ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ اب کوئی نبی نہ پیدا ہوگا، کیونکہ علوم و فنون کی ترقی نے اس کی گنجائش ہی نہیں رکھی اور کسی نبی کی نبوت اب چل ہی نہیں سکتی

باب المراسلۃ والمناظرۃ

بقائے روح ومعاد کے متعلق مدیر نگار سے اختلاف

(مسٹر عبد المجید حیرت بی۔ اے۔ شملہ)

محترمی - السلام علیکم

حوالۂ نگار (جون ۱۹۳۳ء) - باب الاستفسار - حاشیہ از صاحب نگار

(۱) آپ یہ باور نہیں کرتے کہ خدا (فعال لمایرید) "عالم کی ایک ایک چیز اور اس کے ایک ایک ذرّے کی نگرانی کرتا ہے

(۲) آپ بقائے روح، حیات بعد الموت یا معاد کے قائل نہیں

بہر حال آپ اس کے تو قائل ہیں کہ اسلام دنیا کا آخری اور فطری مذہب ہے - پھر اگر یہ وہی اسلام ہے جسے قرآن مجید پیش کرتا ہے تو کیا آپ قرآن مجید سے نمبر (۱) و (۲) پر کوئی دلیل پیش کر سکیں گے

بقائے روح کے باب میں آپ غالباً مغرب کے تازہ انکشافات سے بے خبر نہ ہوں گے

میں آخرت کا قائل ہوں، اس لئے کہ

(۱) لفظ دنیا آخرت پر دلالت کرتا ہے

(۲) آخرت دنیا کے لئے انتہائے بے نفسی کے ساتھ نیکی کئے جانے کی تعلیم ہے - پھر جب یہ نہیں کہا جا سکتا، اور یقیناً نہیں کہا جا سکتا کہ ہر طاعت کا ثواب اور ہر گناہ کا عذاب —— یا آپ کے رنگ میں ہر طاعت کا واقعی عذاب اور ہر گناہ کا واقعی ثواب —— انسان کو اسی دنیا میں مل جاتا ہے، تو پھر کیا وجہ کہ اس شک کو یقین سے بدلنے کے لئے ایک یوم آخرت تسلیم نہ کر لیا جائے

(۳) بدرجۂ آخر آخرت پر جناب علی کرم اللہ وجہٗ کے اس منطقی استدلال کو دیکھئے جسے سن کر ایک یہودی حلقہ بگوش اسلام ہوا - یعنی اگر یہ دنیا ہی دنیا ہے اور بس تو نیک و بد کی جزا و سزا میں مسلم اور غیر مسلم دونوں برابر ہیں لیکن اگر آخرت ایک امر واقعی ہے تو پھر نقصان میں کون رہتا ہے اور نفع میں کون

چنانچہ میں اگر آخرت کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہوں تو اس میں کیا "حرج" ہے۔ میں حیران ہوں کہ اس عقیدے کے رکھنے والے پرنپچے اڑجانے کی دوراز کار مثال کیوں کر چسپاں ہو سکتی ہے

(نگار) ۱۔ میرا یہ کہنا کہ "خدا ایک ایک چیز، ایک ایک ذرہ کی نگرانی نہیں کرتا" صرف یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ انفرادی طور پر (Individually) کائنات کی ہر ہر چیز کے لئے اپنی قوت کو منقسم نہیں کرتا۔ بلکہ مجموعی طور پر تمام نظام عالم کے لئے چند اصول وضوابط مقرر کر دئے ہیں اور انھیں کے ماتحت یہ سب کچھ ہو رہا ہے

آپ کپڑا بننے کے کسی بڑے کارخانہ میں ضرور کبھی نہ کبھی تشریف لے گئے ہوں گے اور آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہاں ہزاروں "کرگھے" خود بخود چل رہے ہیں، کپڑا بنا جا رہا ہے۔ رولر اپنے آپ کپڑے کو لپیٹ رہے ہیں، درانحالیکہ وہاں کوئی انسانی ہاتھ موجود نہیں ——— پھر یہ تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ کارخانہ کا انجینیر بجلی یا بھاپ کی مدد سے مشین کو حرکت دے کر عمومی طور پر ہر ہر کام کی نگرانی کر رہا ہے، لیکن یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ مشین کے ہر ہر پرزے کی جنبش، کرگھے کے ہر ہر تار کا اوپر نیچے ہونا، ایک ایک بنولے کا روئی سے علیحدہ ہونا، ایک ایک پونی کا طیار ہونا، ان سب پر انجینیر کی نگاہ ہے

پھر چونکہ انجینیر کے ہاتھ میں بھاپ یا بجلی کی وہ قوت موجود ہے۔ جس سے تمام کام انجام پا رہے ہیں اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ تمام کارخانہ کا نگراں ہے، لیکن یہ کہنا کہ کارخانہ کے ہزاروں لاکھوں چھوٹے چھوٹے کاموں پر بھی علیحدہ علیحدہ اس کی نگاہ ہے، کسی طرح درست نہیں ہو سکتا

۲۔ بقاء روح اور معاد کے متعلق آپ کا مجھ سے مطالبہ ہے کہ اگر میں اسلام کو دنیا کا آخری فطری مذہب تسلیم کرتا ہوں تو مجھے قرآن مجید سے ثابت کرنا چاہئے کہ بقاء روح اور معاد دونوں خیال صحیح نہیں ہیں۔ اسی کے ساتھ آپ نے نمبر ا کا بھی ثبوت قرآن پاک سے طلب کیا ہے

میرے عزیز دوست، آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں تو ان باتوں کا منکر ہوں یعنی میں آپ کے اس دعوی کو نہیں مانتا کہ خدا ہر ہر ذرہ پر انفرادی طور سے نگرانی کرتا ہے اور اسے بھی تسلیم نہیں کرتا کہ روح باقی رہتی ہے اور حیات بعد الممات کوئی چیز ہے ——— اس لئے اصولاً پہلے آپ کو اس ایجاب پر دلیل پیش کرنا چاہئے نہ کہ مجھے ——— آپ جس سے پوچھیں گے وہ بتا دے گا کہ ثبوت پیش کرنا اس شخص کا کام ہے جو کسی بات کا اقرار کرتا ہو یا کرانا چاہتا ہو، منکر یا تو آپ کی دلیل سے قائل ہو کر آپ کا ہمنوا ہو جائے گا یا آپ کے دلائل کی کمزوری کو ثابت کر کے دوسرا ثبوت آپ سے چاہے گا ——— اس لئے براہ کرم پہلے آپ ہی کلام مجید سے یہ ثابت کیجئے کہ جو کچھ آپ فرما رہے ہیں وہ درست ہے، پھر میں بتاؤں گا کہ آپ کے دلائل ان وجوہ کی بنا پر ناقابل تسلیم ہیں

آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ روح کے باب میں مغرب کے تازہ اکتشافات سے غالباً میں بے خبر نہ ہوں گا ـــــ یقیناً میں بے خبر نہیں ہوں اور نہایت وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مکر و فریب کا اتنا بڑا جال شاید ہی دنیا میں کبھی پھیلایا گیا ہو ـــــ اگر سائنٹفک امریکن کی شائع کی ہوئی وہ رپورٹ آپ کے سامنے ہے جو ایک کمیشن نے تمام بلاد یوروپ کی سیاحت کرنے کے بعد مرتب کی تھی تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس وقت تک جتنے روحانیئں یوروپ میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ۹۰ فیصدی مکار و شعبدہ باز ہیں اور باقی دس فیصدی وہ ہیں جو اس فریب میں مبتلا ہونے کے بعد قصور فہم کی وجہ سے، فریب کو حقیقت باور کرنے لگے ہیں

۳ - آپ نے آخرت کے وجوب پر تین دلیلیں پیش کی ہیں اور معاف فرمائیے اگر میں یہ کہوں کہ ان میں سے ایک دلیل بھی ایسی نہیں جو فریق ثانی کو قائل کر سکے

پہلی دلیل یہ ہے کہ لفظ دنیا، آخرت پر دلالت کرتا ہے اس لئے آخرت کا ماننا ضروری ہے ـــــ لیکن کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ لفظ دنیا کا وہ مفہوم جو آخرت پر دلالت کرتا ہے کس کا متعین کیا ہوا ہے۔ کیا آپ ہی اس کے واضع اور آپ ہی اس کے مفسر نہیں ـــــ میرے سامنے اگر لاکھ مرتبہ لفظ دنیا بولا جائے تو کبھی ایک بار بھی اس کو سنکر آخرت کا یقین نہیں ہوتا۔ آپ دنیا کو آخرت کا نقیض بتاتے ہیں۔ میں اسے انعدام کا نقیض سمجھتا ہوں، یعنی جس طرح لفظ دنیا بول کر آپ کا خیال اس کے نقیض (آخرت) کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ یوں مُردے اٹھیں گے، اس طرح ان کا حساب کتاب ہوگا، یوں عذاب میں مبتلا کئے جائیں گے وغیرہ وغیرہ، اسی طرح لفظ دنیا بول کر میرا خیال اس کے نقیض انعدام محض کی طرف جاتا ہے کہ جب کوئی شخص مرجاتا ہے تو حالت عدم میں چلا جاتا ہے گویا کہ وہ کبھی پیدا ہی نہ ہوا تھا

آپ کی دوسری دلیل اس سے زیادہ عجیب و غریب ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ "آخرت انتہائی بے نفسی کے ساتھ نیکی کرنے کی تعلیم ہے" درانحالیکہ آخرت کا جو مفہوم پیش کیا جاتا ہے اس میں سوائے غرض و طمع کے کچھ اور ہی نہیں۔ کیا اچھے کاموں کے عوض میں سونے چاندی کے محلوں، دودھ شہد کی نہروں، حسین و جمیل دوشیزہ حوروں اور بے ریش و بروت لڑکوں کے دیے جانے کا وعدہ کرنا بے نفسی کے ساتھ نیکی کرنے کی تعلیم ہو سکتی ہے اور کیا بُرے کاموں کی پاداش میں شعلہ زار جہنم کا منظر پیش کرنا ایک شخص کو بے نفسی کے ساتھ نیکی کی طرف مائل کر سکتا ہے۔ جبکہ بے نفسی کا تعلق نہ لالچ سے ہونا چاہئے نہ خوف سے۔ ہم اگر کسی کے ساتھ کچھ احسان کرتے ہیں اس ڈر سے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہم کو قید و بند میں ڈال دیا جائے گا، یا اس لالچ سے کہ اس احسان کا معاوضہ زیادہ بہتر صورت میں ملے گا تو کیا دنیا میں کوئی شخص ہمارے اس فعل کو بے نفسی پر محمول کر سکتا ہے؟ اس نکتہ کو غالب نے اس طرح بیان کیا ہے

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

اگر آپ اس کے جواب میں یہ کہیں کہ جنت ودوزخ کا بیان صرف تشبیہی بیان ہے اور حقیقت کچھ اور ہے، تو بھی اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس بیان میں ترغیب و تخویف ضرور پائی جاتی ہے، جو بے نفسی کے بالکل منافی ہے میں کہتا ہوں کہ مطلق جزا و سزا کا خیال ہی بے نفسی کو محو کر دینے والا ہے۔ اور جب تک عذاب و ثواب کی تمام کارگاہ کو باطل ٹھیرا کر یہ اصول نہ قرار دیا جائے کہ "نیکی ایک فرض انسانی ہے جو بلا خیال مُزد یا بغیر اندیشۂ تعزیر ظاہر ہونی چاہیے"۔ بے نفسی کا خیال کبھی پیدا ہی نہیں ہو سکتا

اسی ضمن میں آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جب ہر طاعت کا ثواب اور ہر گناہ کا عذاب اس دُنیا میں نہیں ملتا تو کیا وجہ ہے کہ یوم آخرت نہ تسلیم کیا جائے۔

اس میں بھی آپ نے خود ہی ایک بات فرض کر لی ہے اور خود ہی اس کو دلیل بنا کر پیش کر دیا —— میں تو کہتا ہوں کہ کوئی طاعت ایسی نہیں جس کا ثواب یہاں نہ مل جاتا ہو اور کوئی گناہ ایسا نہیں جس کی سزا انسان کو یہاں نہ بھگتنا پڑتی ہو، بشرطیکہ آپ طاعت کا مفہوم "اچھا کام" قرار دیں اور گناہ کا مفہوم "بُرا کام" —— کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ فرض شناسی و ادائے فرض کے بعد ضمیر انسانی کو جو اطمینان و سکون حاصل ہوتا ہے اس سے زیادہ مسرت کسی اور چیز میں ہو سکتی ہے اور حق تلفی و ناحق کوشی کے بعد جو اضطراب نفس انسانی میں پیدا ہوتا ہے اس سے زیادہ عذاب کوئی اور ممکن ہے —— لیکن اگر کسی کا ضمیر بالکل مُردہ ہو چکا ہے اور حق و باطل کی تمیز کسی کو باقی نہیں رہی، تو تاریخ عالم اٹھا کر دیکھئے کہ اسی دنیا میں اس کا کیا انجام ہوا، افراد کو چھوڑیئے میں تو قومی و اجتماعی زندگی میں بھی اسی اصول کو کارفرما دیکھتا ہوں اور قرآن پاک کی اس آیت پر پوری طرح ایمان لاتا ہوں کہ

هل یهلك الا القوم الفاسقون

پھر بتائیے کہ کیا اس آیت میں جس ہلاکت قومی کا ذکر کیا گیا ہے وہ کسی اور دنیا سے متعلق ہے، اور کیا یہ عذاب آپ کی مفروضہ اخروی زندگی سے تعلق رکھتا ہے

ممکن ہے ابھی آپ کی تسکین نہ ہوئی ہو، لیکن اگر میں خود کلام مجید سے یہ ثابت کر دوں کہ عذاب و ثواب کا تعلق اسی دنیا سے ہے تو پھر آپ کیا کہیں گے —— اچھا تکلیف تو ہوگی کلام مجید اٹھائیے اور سورۂ ہود کی آیات ۱۰۶ و ۱۰۷ و ۱۰۸ ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے :-

فاما الذین شقوا ففی النار لهم فیها زفیر و شهیق ۝ خلدین فیها ما دامت السموات والارض واما الذین سعدوا ففی الجنة خلدین فیها ما دامت السموات والارض	جن لوگوں نے شقاوت کی وہ آگ میں پڑے کراہ رہے ہوں گے اور اسی حالت میں رہیں گے جب تک آسمان و زمین کا وجود ہے اور جن لوگوں نے اچھے کام کئے وہ جنت میں رہیں گے جب تک آسمان و زمین کا وجود ہے

کیا عذاب وثواب کو اس دنیا سے متعلق سمجھنے کے لئے اس سے زیادہ روشن و واضح الفاظ کی ضرورت ہے۔ کیا ما دامت السمٰوات والارض کے الفاظ اس بات کا ثبوت نہیں کہ جنت و دوزخ اس دنیا سے علاوہ کسی اور عالم سے متعلق نہیں ـــ کیونکہ اگر آپ عذاب وثواب کو عالم آخرت سے متعلق کریں گے تو پھر ما دامت السمٰوات والارض کہنا کوئی معنی نہ رکھے گا۔ کیونکہ عالم آخرت تو آپ کے نزدیک قیامت یا ماورا ء عالم دنیا سے واسطہ رکھتا ہے جب یہ زمین و آسمان کچھ نہ ہوں گے

۳- آپ کی تیسری دلیل جس میں آپ نے جناب امیر اور یہودی کی گفتگو کا حوالہ دیا ہے اس کے متعلق سوائے اس کے کیا عرض کروں کہ

برتمنا ہائے عرفی خندہ می آید مرا

اسی قسم کا ایک واقعہ جناب امام جعفر صادق کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ کسی ملحد نے آپ سے سوال کیا کہ مرنے کے بعد روح کہاں چلی جاتی ہے، آپ نے جواب دیا کہ چراغ گل ہونے کے بعد اس کی لو کہاں چلی جاتی ہے ـــ راوی کا بیان ہے کہ جواب سننے کے بعد وہ ایمان بھی لے آیا

درانحالیکہ نہ جناب امیر کے جواب پر یہودی کو آخرت پر ایمان لانے کی ضرورت تھی اور نہ ملحد کو جناب امام جعفر صادق کے استدلال پر مسلمان ہونے کی

میرے نزدیک یہ دونوں روایتیں نادرست ہیں اور میں کبھی باور نہیں کر سکتا کہ جناب امیر یا جناب امام جعفر صادق نے ایسی بچوں کی سی باتیں کی ہوں گی، کیونکہ اگر تھوڑی دیر کے لئے ہم مان بھی لیں کہ جناب امیر کا جواب واقعی مسکت تھا اور یہودی آخرت پر ایمان بھی لے آیا تو کیا اس کا آخرت کے وجود کو تسلیم کرنا حقیقتاً اطمینان قلب کے ساتھ تھا، یعنی اس دلیل سے کوئی اذعانی وایقانی کیفیت اس کے دل میں پیدا ہو سکی تھی - ہرگز نہیں، اس نے اگر مانا بھی تو صرف اس لئے کہ ایسا ماننے میں کوئی حرج نہیں اور مصلحت اسی میں ہے - پھر مصلحت ویقین میں جتنا فرق ہے وہ کسی سے مخفی نہیں

فرض کیجئے میں آپ کے پاس آؤں اور کہوں کہ مجھ میں اتنی قوت موجود ہے کہ چاہوں تو آپ کے کپڑوں میں آگ لگا دوں اور واقعی میں آگ لگا دوں گا اگر آپ نے میری اس قوت کا اعتراف نہ کیا، آپ کو اس کے ماننے میں تامل ہوتا ہے لیکن آپ کا ایک دوست آتا ہے اور کہتا ہے کہ " مان بھی لو تمھارا کیا حرج ہے - اگر اس میں ایسی قوت نہیں ہے تو مان لینے میں تمھارا کیا نقصان ہے، لیکن اگر واقعی وہ ایسا کر سکتا ہے تو پھر نقصان تمھارا ہی ہے " آپ اس دلیل کو سنکر میری اس قوت کا اعتراف کر لیتے ہیں، لیکن خدا کے لئے بتائیے کہ کیا آپ کا یہ اعتراف تصدیق قلب کے ساتھ ہوگا، ہرگز نہیں - پھر اگر جناب امیر کی اس دلیل پر وہ یہودی ایمان لے بھی آیا تو کیا واقعی وہ مسلمان

ہو گیا ہوگا۔ جبکہ اسلام و ایمان کے لئے تصدیق بالقلب ضروری ہے

یہی حال جناب امام جعفر صادق کی دلیل کا ہے ——— ایک ملحد جو روح کے بقا کا منکر ہے۔ آپ سے سوال کرتا ہے کہ مرنے کے بعد روح کہاں جاتی ہے، آپ چراغ کی لَو کا حوالہ دیکر خود اسی سے پوچھتے ہیں کہ بتاؤ وہ کہاں چلی جاتی ہے آپ ہی انصاف فرمائیے کہ اس میں بقاء روح کے لئے کونسی دلیل پیش کی گئی، بلکہ اس سے تو اور اسی ملحد کے خیال کی تائید ہوتی ہے کہ جس طرح چراغ گُل ہونے کے بعد اُس کی لَو فنا ہو جاتی ہے اسی طرح مرنے کے بعد روح بھی فنا ہو جاتی ہے۔ اکابر اسلام سے اس قسم کی روایتوں کو نسبت دینا حقیقتاً ان کی توہین کرنا ہے، اور یہ نتیجہ ہے صرف اُن ادنیٰ درجہ کی ذہنیتوں کا جو اپنی دماغی اُپج کو اہمیت دینے کے لئے خواہ مخواہ بڑے بڑے لوگوں سے اس کو منسوب کر دیتے ہیں۔ جناب امیر اور جناب امام جعفر صادق کا کیا ذکر ہے، احادیث اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ خود رسول اللہ کی ذات گرامی سے ایسے ایسے افعال و اقوال منسوب کئے جاتے ہیں کہ آج اُن کو دیکھ کر شرم آتی ہے اور عقل حیران رہ جاتی ہے کہ کیا ایک رسول کے اخلاق واقعی ایسے ہو سکتے ہیں۔ اور کیا ایک ملہم من اللہ ہستی سے ایسی باتوں کا ظاہر ہونا کسی طرح ممکن ہو سکتا ہے؟

اب رہا یہ سوال کہ میں آخرت کو کیوں نہیں مانتا، یعنی قیامت اور جزا و سزا کے نظریہ کو کیوں قابل قبول نہیں جانتا۔ اس کے متعلق آپ مجھ سے کوئی استفسار نہ کیجئے بلکہ خود اُن تمام روایات کا تفصیلی طور پر مطالعہ کیجئے جو اس باب میں بیان کی جاتی ہیں کہ مرنے کے بعد سے لے کر دوزخ یا جنت میں پہونچنے تک کیا کیا مراحل و منازل سامنے آتے ہیں اور پھر خود ہی اپنی عقل سے کام لے کر فیصلہ کیجئے کہ یہ باور کرنے کے لائق ہیں یا نہیں

ایک خاتون کا گمنام خط

۱۲ر جون کی ڈاک سے مجھے ایک لفافہ ملا جس پر (Solan) کی مُہر تھی اور ایک مضمون کے علاوہ حسب ذیل تحریر بھی اندر موجود تھی۔

مکرمی ———! آداب نیاز

یہ مضمون جو میرے جذبات کا مکمل آئینہ دار ہے، آپ کی خدمت میں ارسال ہے، نگار کے ایک دیرینہ خریدار ہونے کی حیثیت سے مجھے اس کا علم ہے کہ نگار میں عورتوں کے مضامین شائع نہیں ہوتے، لیکن پھر بھی اس جسارت کی مرتکب ہوتی ہوں، اشاعت و عدم اشاعت کا آپ کو اختیار ہے، اگر یہ اس لائق ہو کہ شرف قبولیت بخشا جائے تو نگار کے صفحات میں جگہ دے کر مشکور فرمائیں

میں اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتی، اور نہ ہی یہ پسند کرتی ہوں کہ کسی مفروض نام سے دنیا کے سامنے نمودار ہوں، لہٰذا اس مضمون کے کاتب کو گمنام ہی رہنے دیجئے، خیر طلب ———!

مضمون کا عنوان تو "اظہار تشکر" ہے لیکن ہے وہ حقیقتاً صرف "اظہار محبت" ایک ایسی ہستی کے حضور میں جس کا حصول مضمون نگار کو محال معلوم ہوتا ہے — یہ مضمون بالکل اسی قسم کا ہے جس میں بہت سی لمبی لمبی لکیریں، بات بات میں متعدد سوالیہ نشان اور ہر ہر جملہ کے بعد درجنوں علامات حیرت و استعجاب نظر آتے ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ لکھا گیا ہے خاص تاثر کے ساتھ

یقیناً میں یہ مضمون شایع کرنے کے لئے تیار نہیں اور میں اس کو واپس کر دیتا اگر خاتون محترم نے اپنا پتہ لکھا ہوتا لیکن چونکہ انھوں نے میرے لئے عزت تخاطب کی کوئی صورت پیدا ہونے نہیں دی ہے اور میں جانتا ہوں کہ کسی طرح اُن کی تحریر کا جواب بھی اُن تک پہونچ جائے اس لئے مجبوراً نگار ہی کی وساطت سے اُن کو مطلع کرتا ہوں کہ نگار میں یقیناً عورتوں کے مضامین اس وقت تک شایع نہیں ہوئے، لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ خدانخواستہ مجھے یا نگار کو عورتوں سے کوئی ضد ہے بلکہ صرف اس بناء پر کہ نگار کے معیار کے مضامین لکھنے والے مردوں میں بھی بہت کم ہیں چہ جائیکہ عورتیں جنکا ادبی ذوق ہنوز بہت زیادہ پست حالت میں ہے

ہمارے یہاں کی عورتیں لکھ پڑھ کر دنیائے ادب میں آتی بھی ہیں تو صرف دو طرح سے، یعنی یا تو وہ غزلسرایانہ انداز سے تشریف لاتی ہیں یا "والہانہ محبت" کی بیباکیوں کے ساتھ — اور میں ان دونوں کو مردوں کے لئے بھی مضرت رساں سمجھتا ہوں، چہ جائیکہ عورتیں جو سوسائٹی میں اساس اخلاق کی حیثیت رکھتی ہیں

بہرحال میں عورتوں کے مضامین نہایت مسرت سے شایع کرنے کے لئے طیار ہوں بشرطیکہ ان میں کچھ کام کی باتیں ہوں - ورنہ محض مصنوعی آہ و فریاد کی گرم بازاری اور بہکے ہوئے جذبات محبت کا تھکا ہوا اظہار اب تو دل میں بھی کوئی جنبش پیدا نہیں کرتا عقل و دماغ کا کیا ذکر ہے

افسوس ہے کہ مجھے یہ مضمون تلف کرنا پڑا، درانحالیکہ اس کے اوراق کے ٹکڑے اب بھی اپنی عطریت سے "دعوت نظارہ" دے رہے ہیں —

نیاز

مطبوعات موصولہ

مغل اور اُردو | یہ کتاب صرف ایک باب ہے، اُس کتاب کا جسے نواب نصیر حسین خاں خیال داستان اُردو کے نام سے مرتب کر رہے ہیں۔ اس قابل قدر تصنیف کا مقصد جیسا کہ اس نام سے ظاہر ہے۔ اُردو زبان کی مبسوط و مفصل تاریخ لکھنا ہے اور جو حضرات، جناب خیال کی ادبی قابلیت سے واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ شاید ہی کوئی شخص ان سے بہتر اس خدمت کو انجام دینے والا ہندوستان میں مل سکتا ہے

کتاب زیر تبصرہ میں ابتداء عہد مغلیہ سے لے کر انتزاع سلطنت تک زبان اُردو کے رواج و ترقی پر نہایت پُرلطف طریقہ سے محققانہ نگاہ ڈال کر مسلسل طور پر مغلیہ دَور کی اُردو کی داستان سنا دی گئی ہے کتاب نہایت مفید و دلچسپ ہے اور وہ حضرات جن کو ادبِ اردو سے ذوق ہے اُن کے لئے اس کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں ——— تنقید کی جو روش جناب خیال نے اس کتاب میں اختیار کی ہے وہ حد درجہ دلکش ہے۔ یہ کتاب دو روپیہ میں عثمانی اینڈ سنس ۷۵ چونہ گلی کلکتہ سے مل سکتی ہے

تعلیم زدہ بیوی | جناب فضل حق قریشی بی۔ اے (دہلوی) کا لکھا ہوا ڈرامہ ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ عورت کی تعلیم بعض صورتوں میں مردوں کیلئے کیسی عذاب ثابت ہوتی ہے۔ زبان صاف و شگفتہ ہے، مزاح کا پہلو بھی کافی سنجیدہ ہے، لیکن پلاٹ میں ترقی کی گنجائش تھی اگر توجہ کی جاتی۔ قیمت ۸ر۔ ملنے کا پتہ ساقی بکڈپو دہلی

سلمٰی | ترجمہ ہے آسکر وائلڈ کے مشہور ٹریجڈی سالومی (Salome) کا جسے سید انصار ناصری بی۔ اے (دہلوی) نے پیش کیا ہے۔ اس سے قبل مجنوں گورکھپوری بھی اسی کتاب کا ترجمہ کرکے شائع کر چکے ہیں اور غالباً خلاف انصاف نہ ہوگا اگر مجنوں کے ترجمہ کو اس ترجمہ پر ترجیح دی جائے۔ کیونکہ مجنوں کا ترجمہ کسی جگہ ترجمہ کی شان سے نہیں ہٹا اور جناب انصار ناصری نے اکثر جگہ صرف اخذ مفہوم کو کافی سمجھ کر حذف و اضافہ سے بھی کام لیا ہے۔ قیمت ۸ر ہے اور ملنے کا پتہ ساقی بک ڈپو دہلی

نجمہ نوری | جناب انصار ناصری دہلوی کا لکھا ہوا ڈرامہ ہے جس میں مادری محبت کے کرشمے دکھائے گئے ہیں۔ زبان سلیس ہے اور پلاٹ دلکش ساقی بکڈپو دہلی سے ۱۲ر میں مل سکتا ہے

چندرا موہنی | یہ فسانہ بھی جناب انصار ناصری کا لکھا ہوا ہے، جس میں بتایا ہے کہ محبت کا تعلق صورت سے نہیں

بلکہ سیرت سے ہے - زبان وطرز ادا کی خوبی کے ساتھ جذبات کا بھی مصنف نے کافی لحاظ کیا ہے - قیمت درج نہیں ہے، ملنے کا پتہ ساقی بکڈپو دہلی ہے

اخوان الشیاطین اور دیگر افسانے | مجموعہ ہے جناب افضل حسین صاحب چشتی بی - اے کے افسانوں کا جو علامہ مُضحک کے نام سے رسالۂ ساقی میں اکثر نکلتے رہتے ہیں - آپ ملک کے اچھے مزاح نگاروں میں سے ہیں اور کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں - قیمت عہ ، ملنے کا پتہ ساقی بکڈپو دہلی

رقص و سرود | جناب عظیم بیگ چغتائی کا مختصر سا رسالہ ہے جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ رقص و سرود اسلام میں ممنوع نہیں ہے - اس مسئلہ میں مولویوں کی طرف سے جناب چغتائی پر کافی لے دے ہو چکی ہے اور ہونا بھی چاہیے تھی کیونکہ مولوی ایک ایسا درندہ ہے جو جوع البقر کی بیماری میں مبتلا ہے اور جو ہر وقت اسی فکر میں رہتا ہے کہ کوئی شکار اس کے ہاتھ آئے اور وہ اپنی چیر پھاڑ شروع کر دے

اب جناب چغتائی نے اپنے خیالات ایک مستقل رسالہ کی صورت میں پیش کئے ہیں دیکھئے کیا ہوتا ہے ؟ قیمت ۸ہر ہے اور ساقی بکڈپو دہلی سے مل سکتا ہے ؛

اعادۂ شباب و درازیٔ عمر | اس وقت یوروپ میں فن طب کا ایک مخصوص شعبہ صرف اس جستجو کے لئے علیحدہ کر دیا گیا ہے کہ انسان کی عمر طبیعی کو کس حد تک طویل بنایا جا سکتا ہے - اور اعادۂ شباب ممکن ہے یا نہیں ؟ لیکن ہندوستان میں لوگوں کو اس فن سے صرف اسقدر دلچسپی ہے کہ اخباروں میں اس قسم کے تجربات کو پڑھ لیتے ہیں اور یوروپ کی ترقی کو دیکھ کر تھوڑی دیر کے لئے حیران ہو جاتے ہیں

لفٹنٹ کرنل ڈاکٹر محمد اشرف الحق صاحب (جو گولکنڈہ حیدرآباد میں افواج باقاعدہ کے سینیئر میڈیکل افسر ہیں) ایک زمانہ سے اس طرف عملی جستجو میں لگے ہوئے تھے - اور مختلف قسم کے جانور جمع کرکے تجربہ میں مصروف تھے چنانچہ انکا یہ شوق انھیں کشاں کشاں یوروپ لے گیا اور وہاں تمام ممالک میں گھوم پھر کر اس فن کے ماہرین سے ملے اور کافی روپیہ خرچ کرکے علمی و عملی درس لے کر واپس آئے - اس رسالہ میں انھوں نے اپنے نتائج مطالعہ پیش کئے ہیں اور ظاہر کیا ہے کہ کہاں کہاں کس طریقہ سے اعادۂ شباب کی کوشش جاری ہے اور ہندوستان کے لئے کونسا طریق کار مفید ہے

ڈاکٹر صاحب موصوف نے یوروپ سے آکر خود بھی متعدد آپریشن کئے ہیں اور اس باب میں وہ ہر شخص کو مفت مشورہ دینے کے لئے طیار ہیں

اس رسالہ کے علاوہ اور بھی متعدد رسالے انھوں نے شایع کئے ہیں جنمیں یوروپ کے قائم کئے ہوئے مختلف نظریہ ہائے اعادۂ شباب سے بحث کرتے ہوئے وہاں کے مختلف طریق جراحی پر ماہرانہ رائے دی ہے

ہندوستان کو ڈاکٹر صاحب موصوف کا ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے اسقدر محنت شاقہ اور زر خطیر صرف کرنے کے بعد اس مخصوص شعبہ میں مہارت حاصل کی اور اب وہ اپنی معلومات سے اہل ہند کو بلا خیال کسی مادی منفعت کے فائدہ پہونچانے کے لئے لا رہے ہیں

یہ تمام رسالے ڈاکٹر صاحب موصوف سے مفت مل سکتے ہیں۔ لوگوں کو چاہیئے کہ ان کا مطالعہ کریں اور جن کو اعادۂ شباب سے کچھ بھی دلچسپی ہے وہ خط وکتابت کرکے ڈاکٹر صاحب کا مشورہ حاصل کریں

شہوانیات یا ترغیبات جنسی

حضرت نیاز کے قلم سے

اس میں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات اور اُن کی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اور آیندہ اخلاق انسانی کے بنیاد کن اصول پر قائم ہوتا ہے۔ الغرض اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب بالکل نئی چیز ہے اور ایک بار شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے ہوئے آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ اس کتاب میں ایسے ایسے حیرت انگیز حالات و واقعات درج ہیں۔ کہ آپ نے کبھی سنے نہ ہوں گے۔ اگر آپ **نگار** کے خریدار ہیں تو علاوہ محصول آٹھ آنے کے مجلد کتاب صرف ۲؎ میں ——— اور غیر مجلد ۱؎ میں ملے گی ——— اور اگر آپ **نگار** کے خریدار نہیں ہیں تو مجلد ۳؎ میں۔ اور غیر مجلد ۲؎ میں علاوہ محصول ۱۰؎ کے ملے گی ——— اگر ارشاد ہو تو کتاب ذریعۂ وی۔ پی روانہ کی جائے　　حجم ۳۷۵ صفحات۔ آرڈر میں مجلد و غیر مجلد کی صراحت ضروری ہے ———

منیجر نگار لکھنؤ

انعامی مضمون

(لمحۂ غور و فکر کی دعوت)

موجودہ آبادی کی رُو سے، بنگال میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ہندوؤں کے مقابلہ میں یہ ہے :—

مسلمان = ۵۴،۸ فی صدی

ہندو = ۴۲،۱ ”

لیکن تعلیم کے لحاظ سے ہندو با وصف کمی آبادی کے کس قدر بڑھے ہوئے ہیں، اس کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ بہ مقابلہ مسلمانوں کے عام تعلیمی حالت اُن کی ۶۲،۲ فی صدی ہے اور انگریزی تعلیم میں ان کا تناسب ۶۹،۶ ہے جو طلبہ اس وقت زیر تعلیم ہیں اُن میں ہندوؤں کی تعداد بہ مقابلہ مسلمانوں کے حسب ذیل ہے :—

ہائی اسکولوں میں	۷۹،۶ فی صدی	انجنیری میں =	۸۵،۵ فی صدی
انٹر کالجوں میں =	۸۴،۶ ”	تجارتی مدارس میں =	۸۶ ”
یونیورسٹیوں میں =	۸۴،۸ ”	بنک، بیمہ کے کاموں میں	۸۳ ”
پوسٹ گریجویٹ درجوں میں =	۸۵،۷ ”	قانون پیشہ	۸۷،۴ ”
میڈیکل کالجوں میں =	۸۶،۳ ”	ڈاکٹری = ۷۹،۷ فیصدی	دیگر فنون میں = ۹۱،۳

اب اسی کے ساتھ تصویر کا دوسرا رُخ بھی ملاحظہ ہو کہ افلاس و ذلت بداخلاقی و بداقبالی میں مسلمانوں کی ترقی کا کیا عالم ہے :

آوارہ گرد، فقیروں میں ان کی تعداد ۵۲،۷ فی صدی ہے

قلتبانی و فحاشی وغیرہ میں ” ۶۲،۷ ” ”

اخلاقی جرائم کے ماتحت جیل خانوں میں ۵۳،۱ ” ”

اِس کی ذمہ داری کس پر عاید ہوتی ہے ؟

جو صاحب اس کا معقول جواب دیں گے اور اس کا زود اثر علاج بتائیں گے ان کی خدمت میں ایک طلائی تمغہ پیش کیا جائے گا۔ مضمون کا انتخاب مُدیر نگار کریں گے۔ اور منتخب مضمون نگار ہی میں شائع کیا جائیگا

ایک دردمند مسلمان

حُسنِ سرِرَاہ

ہوئی ہے آج یہ کس سحری نگاہ دوچار | کہ خود بخود ہوئی جاتی ہے، سلبِ طاقتِ ہوش
یہ کس کا جلوہ ہے یہ کس کے جلوہ کی ہے کرن | کیا ہے خاک کے ذرّوں کو جس نے آئینہ پوش
مچل رہی ہیں رگِ شب میں کیف کی موجیں | یہ کس نے چھیڑ دیا زندگی کا سازِ خموش
ہجومِ رنگ سے ہے نبضِ کاہ میں حرکت | وفورِ حُسن سے ہے موجِ خاک لالہ فروش
اٹھا رہا ہے کوئی بزمِ راز کے پردے | سرودِ موجِ صبا ہے کہ ہے نوائے سروش
ندیم! کس کو ملی ہے یہ نعمتِ سرمد | نگاہِ جلوہ شناس و نگارِ جلوہ فروش
خوشا! لطافتِ پنہاں کہ آج دل میں نہیں | خیالِ تلخیٔ فردا، غمِ مصائبِ دوش

گئی وہ تیرگیٔ شب، وہ رسمِ بے خبری
جبینِ دہر پہ چمکا ستارۂ سحری

نگاہِ حسن طلب چاہیے کہ بزمِ حیات — نہیں کچھ اور بجز اک ادائے جلوۂ ناز

کھلا ہوا ہے ازل سے درِ حریمِ جمال — کوئی حجاب ہے، صبر آزمائے پردۂ راز

جھلک رہا ہے پیالوں میں رنگ بادۂ ناب — لرز رہی ہے سرِ دوش موجِ زلفِ دراز

سمجھ نہ شانِ تغافل کو درسِ محرومی — کہ ہے نیاز کے اجزا سے حسنِ خلوتِ ناز

جدا ہے عقل کی سرحد سے بیخودی کا مقام — نہ پیچ و خم ہیں نہ اس راہ میں نشیب و فراز

درونِ ساغرِ دل چاہیے، رہینِ طپش — وہ موجِ بادہ کہ ہو آتشِ پیالہ گداز

یہ مشتِ خاک اور اتنی بصیرت افروزی — مگر عمیق ہے کتنا فریبِ حسنِ مجاز

نہاں ہے بے خبری میں نشاطِ منزل بھی

شکستِ دل میں ہے تعمیرِ ہستیٔ دل بھی

علی اختر

(حیدر آباد دکن)

ارمغانِ غم

نگاہ اندوہناک، چہرہ اُداس، دل بیقرار کیوں ہے
خبر نہیں اسقدر فراوانیٔ غمِ روزگار کیوں ہے

وفا شعاروں پر اوجفا کیش! بیدریغ اور بے محابا
عنایتِ جانگداز کیوں ہے، نوازشِ دلفگار کیوں ہے

مری خموشی نہیں ہے تسکینِ دل کی آئینہ دار ہمدم
میں دم بخود ہوں کہ زندگی ایک ذلتِ ناگوار کیوں ہے

کبھی کبھی لب پہ آ ہی جاتا ہے آہ کے ساتھ نام تیرا
خبر نہیں تیرا ذکر لوٹے ہوئے دلوں کا قرار کیوں ہے

کچھ ایسا مانوس ہوگیا ہوں مصیبت آمیز زندگی سے
کبھی نہیں یہ خیال آیا، زمانہ ناسازگار کیوں ہے

یہ زندگی خود بہت بڑا غم ہے، اے غمِ عشق دینے وا
یہ دردمندوں کے حال ہی پر نوازشِ بیشمار کیوں ہے

کہو عدم دل کا حال کیا ہے؟ یہ کیسی چپ تم کو لگ گئی ہے
یہ ہر گھڑی، آہ! آہ!، اور بات بات میں اختصار کیوں ہے

عدم

وارداتِ امروز

افسونِ بیخودی کا عمل بیکراں ہے آج   دل بے نیازِ ہستی کون و مکاں ہے آج
ڈوبی ہوئی ہے وجد میں رفتارِ زندگی   اِک کیف ہے کہ ہوش کی روح رواں ہے آج
کیا تذکرہ ہے ارض و سما کے وجود کا   ہر چیز محویت کے سوا بے نشاں ہے آج
رعنائی مجاز میں ہیں وہ تجلیاں !   رعنائی مجاز میں گم سب جہاں ہے آج
اک پُر بہار و روح فزا جوئے بار میں   موجِ خرام کشتیٔ عمرِ رواں ہے آج
بیتاب ہے عناصرِ دل میں خوشی کی لہر   ہر سانس میں گدازِ مسرت نہاں ہے آج
پھر کاروبارِ شوق کا بازار گرم ہے   پھر دل سے محو کاوشِ سود و زیاں ہے آج
پھر افتتاح جلسۂ عیش و نشاط ہے   پھر اہتمام زندگیٔ کامراں ہے آج

حسن اپنے کیف و ناز سے سرشار ہی عدم!
عشق اپنے سوز و ساز سے آتش بجاں ہے آج

عدم

خالد

آہ! اے اک غمزدہ شاعر کی تسکینِ حیات
زندگی کی ایک چھوٹی سی منوّر کائنات

امن کی اک پُرسکوں دنیا ہے گہوارہ ترا
شورشوں کی دسترس سے دور ہے جھولا ترا

تیری میٹھی نیند کے پردے میں کوئی حور ہے
تیرا سپنا خلد کے انوار سے معمور ہے

جھولے جی بھر کے جھولے میں اٹھا لطفِ خواب
اے مرے لختِ جگر! آنیکو ہے اک انقلاب

تلخیاں ہی تلخیاں ہیں گردشِ ایام میں
جھولنا ہے کل تجھے گہوارۂ آلام میں

عہدِ طفلی کا رو پہلا خواب ہے ناپائدار
دیکھنی پڑتی ہے انساں کو جفائے روزگار

پیارے خالد تجکو لے آئیگی دنیا ہوش میں
کھولنا ہے آنکھ تجھکو حشر کے آغوش میں

امتحانِ عزم و استقلال کرنے کے لئے
ناتواں انسان کو پامال کرنے کے لئے

گرم ہے آفات کا بازار ازل سے دہر میں
سرخرو ہوتے ہیں ذی ہمت عمل سے دہر میں

اک سپاہی بن کے میداں میں اترنا ہے تجھے
روح فرسا حادثوں سے جنگ کرنا ہے تجھے

عدم

پروانہ

اے سراپا گداز پروانے　　　ملتہب، عشقباز پروانے
بامُراد اور کامگار ہے تو　　　مذہبِ عشق کا وقار ہے تو!
کیا ابد تاب ہے حیات تری　　　کیا منور ہے کائنات تری
اُف! ترے آب و گل میں کیا شے ہے؟　　　دل ہے سینے میں، دل میں کیا شے ہے؟
شمع، خاموش جلتی رہتی ہے　　　آگ کی لَو نکلتی رہتی ہے
پہلے اُس کا طواف کرتا ہے　　　عشق کا اعتراف کرتا ہے
اور پھر بیخودی میں گُم ہو کر　　　نشۂ سرمدی میں گُم ہو کر
خوب دل کی لگی بجھاتا ہے　　　شوق سے آگ میں نہاتا ہے

عشق نغمہ ہے اور ساز ہے تو
وہ حقیقت ہے اور مجاز ہے تو

عدم

لمعات اختر انصاری

مہتاب :-

آسماں کے ہاتھ میں ہے اک ستار   پڑ رہی ہے مست نغموں کی پھُوار
آہ ! ان نغمات سے ہے مرتعش   سازِ دل کا کوئی نامعلوم تار

دھوپ اور آئینہ

ہلکی ہلکی پھوار کے دوران میں ،   دفعتہً سورج جو بے پردہ ہوا
میں نے یہ جانا کہ وحشت میں کوئی   روتے روتے کھِل کھِلا کر ہنس پڑا

مطربہ

تیری نازک اور پتلی اُنگلیاں   ساز کے تاروں کو جب کرتی ہیں مَس
کانپنے لگتی ہے زہرہ عرش پر   دل پکار اٹھتا ہے "بس، للہ! بس!"

مغنیہ

تیرے شوق انگیز اور جاں سوز نغموں کی قسم   تیرے خوش آہنگ اور دل دوز نغموں کی قسم
تیرے کیف آور، طرب افروز نغموں کی قسم   تیرے صہبا ریز ، وجد آموز نغموں کی قسم

جب دلوں کو سحر زا نغموں سے تڑپاتی ہے تو   جب رگوں میں زندگی کا خون دوڑاتی ہے تو
بزم کو جب راگ کی حدّت سے گرماتی ہے تو   غرق ہو کر بحرِ موسیقی میں جب گاتی ہے تو

گیت کے طوفاں میں بہ جاتی ہے ساری کائنات
ایک نغمہ بن کے رہ جاتی ہے ساری کائنات

لذتِ غم

یوں بھی ہوتا ہے کہ فکر و ذوق کی تشنہ لبی! چھین لیتی ہے نشاطِ غم سے آسودگی!
یوں بھی ہوتا ہے کہ رہتا ہوں میں اکثر سوگوار! روح میں پاتا ہوں اپنی مستقل اک اضطرار!
صرف غم ہوتی ہے جب میری حیاتِ سوگوار اور چھا جاتا ہے مجھ پر سخت ذہنی انتشار!
دفعتاً ایسے میں "ای محبوب" تو آتا ہے یاد! اک خیال روح پرور دل کو کر دیتا ہے شاد!

ایک نامعلوم سرمستی میں کھو جاتا ہوں میں! حسن کی رنگینیوں میں جذب ہو جاتا ہوں میں!
دل میں وہ پہلا سا احساسِ الم ہوتا نہیں! روح میں بیدار اب وہ جوشِ غم ہوتا نہیں!
کیا کہوں ہوتا ہوں کیسی شادمانی سے دوچار؟ سیکڑوں ایامِ خوش اس ایک ساعت پر نثار!

کوئی اس احساس کی لذت بتا سکتا نہیں!!
کوئی اس رودادِ عشرت کو سنا سکتا نہیں!!

جمیل راز بنگش سرحدی

"تازیانہ"

اسیرِ دامِ خیال و شکستہ پر کب تک ذلیل و خستہ فریادِ بے اثر کب تک
قصورِ حوصلہ، کوتاہیٔ نظر تا کے سرِ نیاز، تمنائے سنگِ در کب تک
درازِ دستِ سوال و شکستہ پائے عمل جبیں فگار، لب افسردہ، چشم تر کب تک
دماغ سست، دلِ بد شعار، طبع رکیک مذاقِ پست، خیالات منتشر کب تک
اسیرِ یاس، تن آساں، مریضِ وہم و خیال رہینِ غم، ہدفِ مشقِ چارہ گر کب تک

وطن فروشی و غداری و ضمیر کشی فریفتگیٔ طلسماتِ جاہ و زر کب تک
درندگی و برادر کشی و سفاکی ستیزہ کاری و اندازِ فتنہ گر کب تک
غلامِ نفس اسیرِ کمندِ حرص و ہوس سیاہ مستِ مئے عمرِ مختصر کب تک
عدو نواز و عدو دوست و عدہ و پرور فریب خوردہ و مدہوش و بے خبر کب تک

ہوا پرست، غلط رو، فساد خیز، شریر
تباہ کار، زیاں کوش، بے بصر کب تک

کوکب (شاہجہانپوری)

معلومات

چیونٹی چھوٹا انسان ہے اور انسان بڑی چیونٹی

امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی میں ڈاکٹر ولیم مارٹن ہوبلر نہایت مشہور طبیعی عالم ہیں اور حشرات میں خصوصیت کے ساتھ چیونٹی کی تحقیق کے لئے انھوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ صرف کر دیا ہے۔ اس موضوع پر جو لٹریچر انھوں نے پیش کیا ہے وہ نہایت عجیب و غریب حقایق اور نادر معلومات کا ذخیرہ ہے۔ ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کرۂ ارض پر چیونٹی کا وجود تقریباً ۳۰ کرور سال سے پایا جاتا ہے اور اپنی معیشت وغیرہ کے لحاظ سے وہ نظام بشری سے بہت زیادہ مشابہ ہے، یہاں تک کہ ان دونوں میں اگر کوئی خاص فرق پایا جاتا ہے تو یہ کہ چیونٹیوں کا نظام اجتماعی انسان کے نظام اجتماعی سے زیادہ بسیط ہے، کیونکہ اس نے جو ایک وتیرہ اختیار کر لیا ہے اس سے کبھی ہٹتی نہیں اور انسان تغیر پسند ہے

چیونٹی کی مشہور قسموں کی تعداد ۳۵۰۰ تک بتائی جاتی ہے، لیکن ان میں سے اگر ہر نوع کی مختلف قسموں کو سامنے رکھا جائے تو یہ تعداد سات ہزار سے متجاوز ہو جاتی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ کثرت انواع کے لحاظ سے شاید ہی کوئی مخلوق اس کے مقابلہ میں پیش کی جا سکے

چیونٹیاں روئے زمین کے ہر حصہ پر پائی جاتی ہیں سوائے شمال وجنوب کے اس منطقۂ باردہ یا پہاڑ کی اُن اونچی چوٹیوں کے جہاں ہر وقت برف منجمد رہتی ہے۔ ان کی اکثر قسمیں اپنا گھر ہمیشہ زمین کے اندر بناتی ہیں اور جب غیر معمولی رطوبت پیدا ہو جاتی ہے یا درجۂ حرارت بدل جاتا ہے تو دوسری جگہ منتقل ہو جاتی ہیں

چیونٹی کی کوئی غذا متعین نہیں ہو سکتی کیونکہ اگر ایک طرف وہ کیڑے مکوڑے کھا کر اپنے گوشت خوار ہونے کا ثبوت دیتی ہے تو دوسری طرف غلہ اور پتیاں وغیرہ کی شایق ہونے کے لحاظ سے نباتاتی بھی کہلائی جا سکتی ہے، یعنی اس باب میں جو حالت انسان کی ہے وہی اس کی بھی ہے۔ پھر جس طرح انسان میں یہ دستور ہے کہ وہ دوسروں سے خدمت لیتے ہیں۔ اسی طرح چیونٹیاں بھی اپنے خادموں سے کام لیتی ہیں اور جس طرح انسانوں میں سارق و رہزن پیدا ہو جاتے ہیں اسی طرح چیونٹیوں میں بھی پائے جاتے ہیں

چیونٹی کی ایک قسم ایسی ہے جو اپنی غذا صرف لوٹ مار کے ذریعہ سے حاصل کرتی ہے اور دوسری امن پسند محنتی چیونٹیوں سے غذا چھین کر خود لے بھاگتی ہے۔ ایک قسم چور چیونٹیوں کی بھی ہے جو زیادہ تر دیواروں کے اندر رہتی

ر اندر ہی اندر نہایت پیچیدہ راستے بناکر چرائی ہوئی غذا کو ان میں جمع کرتی رہتی ہے۔ یہ زرد رنگ کی چھوٹی چیونٹی
تی ہے اور گھروں میں ہر جگہ نظر آتی ہے

ان میں باہم گرعلاقۂ محبت بھی پایا جاتا ہے اور ایک قسم کی چیونٹیاں دوسری قسم کی چیونٹیوں کے ساتھ رہتی ہیں
ں ہیں۔ ایک چھوٹی قسم اس کی ایسی ہے جو بڑی چیونٹی کی پیٹھ پر سوار ہوجاتی ہے اور اس کے سر اور منھ کو چاٹتی
ہتی ہے۔ یہ بڑی چیونٹی اسی حال میں غذا کی بھی تلاش کرتی رہتی ہے اور اُسے یہ بار مطلق ناگوار نہیں ہوتا۔ بعض چیونٹیاں
سری چیونٹیوں کو غلام بنانے اور اُن سے خدمت لینے کی بہت شائق ہوتی ہیں۔ چنانچہ ایک قسم اس کی جس کا نام
زدن ہے، یہ پوری اجتماعی قوت سے دوسرے گروہ پر حملہ کرتی ہے اور غلام بنالیتی ہے، یہ محارب قسم کی چیونٹی خود
ے بچوں کو نہیں پالتی بلکہ انھیں غلام چیونٹیوں سے یہ خدمت لیتی ہے

بعض چیونٹیاں دوسرے کیڑوں کو متبنّی بناکر ان کی پرورش بھی کرتی ہیں۔ یہاں تک جب وہ متبنّی کیڑا بڑھ جاتا
ہے تو بھی انھیں کے درمیان رہتا ہے اور یہ اس کی راحت و آسایش کا پورا لحاظ رکھتی ہیں

الغرض چیونٹی کی دنیا بھی بالکل انسانی دنیا ہے اور سوائے اس کے کوئی فرق نہیں کہ چیونٹی ایک چھوٹا انسان
ہے اور انسان ایک بڑا چیونٹا

رانس کا قدیم طریقۂ احترام فرانسیسی قوم پر بھی مغرب کی دوسری قوموں کی طرح زمانۂ وحشت گزر چکا ہے
اور اس عہد کے بعض مراسم ان کے یہاں عجیب و غریب تھے، مثلاً آٹھویں صدی
ت وہاں یہ رواج عام طور پر پایا جاتا تھا کہ جب کوئی معزز کسی شخص کے گھر آتا تھا اور عزت و احترام کے ساتھ اس کی
یرائی کی جانی مقصود ہوتی تھی تو صاحب خانہ یا میزبان سب سے پہلے اپنے سر کا ایک بال اکھاڑ کر آگے بڑھتا تھا
ور ہاتھ پر رکھ کر اس کے سامنے پیش کرتا تھا۔ چنانچہ جس وقت سان جرمان فرانس آیا ہے تو کلوفیس نے یہی
رکت کی تھی اور دربار کے تمام امراء نے بھی اپنے اپنے بال اکھاڑ کر اس رسم کو ادا کیا تھا۔ تنکا منھ میں داب کر ایک
وں سے سامنے کھڑے ہو کر خیر مقدم کرنے کی رسم ہندوستان کی بعض خانہ بدوش قوموں میں اب بھی پائی جاتی ہے
ور ایران میں بھی کسی وقت یہ رواج پایا جاتا تھا۔ چنانچہ اظہار عجز کے مفہوم میں "خس بدنداں" کا محاورہ فارسی
یں اسی رسم کے بنا پر قائم ہوا تھا

غالب لکھتا ہے:-

ہجوم نالہ، حیرت عاجز عرض یک افغاں ہے
خموشی، ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے

شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہجوم نالہ فرط حیرت سے اس قابل بھی نہیں کہ نالہ و فریاد کرسکے اور میری یہ خاموشی میرے

عجز کو بالکل اسی طرح ظاہر کر رہی ہے جس طرح "نیستاں" کی خاموشی جس کا ریشہ دار ہونا گویا "خس بدنداں" ہونا ہے،

ایک عجیب بازار برلن کے ہر ہوٹل و قہوہ خانہ میں ایک بار ہر مہینے خاص قسم کا بازار لگتا ہے جہاں خرید و فروخت یا لین دین سکوں کے ذریعہ سے نہیں ہوتا بلکہ ایک چیز کا تبادلہ دوسری چیز سے کر لیا جاتا ہے۔ انعقاد بازار کے دن مختلف لوگ مختلف چیزیں لیکر آتے ہیں اور باہم کر تبادلہ کر لیتے ہیں۔ مثلاً کوئی مچھلی لے کر آیا ہے تو وہ کسی دوسرے جانور سے تبادلہ کر لیتا ہے، کوئی خاص قسم کی تیتری لے کر آیا ہے تو کسی پودے کے عوض میں دیدیتا ہے۔ الغرض اپنی بے ضرورت چیز کے عوض دوسرے سے اپنی ضرورت کی چیز یہاں لے لیجاتی ہے۔ حال ہی میں ایک شخص یہاں گھڑیال کا چھوٹا بچہ لایا۔ اور صرف ایک پھول کے عوض اس کو دے گیا — دنیا بھر میں کسی جگہ یہ رواج نہیں پایا جاتا اور عہد قدیم کے طریق خرید و فروخت کی یہ یادگار اس وقت صرف برلن ہی میں پائی جاتی ہے

اندھوں کا شہر شرقی ترکی میں ایک مقام ہے جس کا نام ادلیامان ہے جہاں سات ہزار کی آبادی ہے لیکن لطف یہ ہے کہ ان میں سوائے ۲۰۹ آدمیوں کے باقی سب اندھے ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ قدیم ترکی حکومت نے اندھوں کے لئے یہاں کوئی خاص انتظام علاج کا کیا تھا جو اب باقی نہیں ہے اور اس طرح ایک مستقل آبادی اندھوں کی یہاں ہو گئی ہے اور اب نسل میں اثر پیدا ہو کر اولاد بھی اندھی پیدا ہونے لگی ہے

تحفۂ قبر دنیا کا شاید سب سے عجیب تحفہ وہ ہے جو امریکہ کے ایک پادری ویل ہوالن کو قبر کی صورت میں دیا گیا — اس کا واقعہ یوں ہے کہ سنہ ۱۹۰۵ء میں ایک ولیم بینگ مرا اور دفن کر دیا گیا، لیکن بعد کو اس کے ورثہ کا ارادہ یہ ہوا کہ اسے کسی دوسری جگہ دفن کر دیں چنانچہ اس قبر کو خالی کر کے اس کا کتبہ وغیرہ علیحدہ کر لیا اور ایک دوسرا کتبہ لگوا دیا۔ جس میں پادری ویل ہوالن کا نام لکھ دیا۔ تاریخ وفات کی جگہ خالی چھوڑ دی۔ جب یہ سب کچھ ہو گیا تو یہ خالی شدہ قبر معہ کتبہ کے پادری ویل ہوالن کو تحفۃً دیدی گئی تاکہ جب وہ مرے تو اس قبر سے کام لے اور کتبہ میں تاریخ وفات درج کرا دے۔ لطف یہ ہے کہ پادری صاحب موصوف اس ہدیہ سے بہت خوش ہیں کیونکہ ان کے نزدیک محبت کا ہدیہ خواہ وہ موت ہی کی صورت میں کیوں نہ ہو قابل قدر ہے

صبا ؎ عشق یوسف نے یہ کی خانہ خرابی برپا ٹھوکریں کھاتی زلیخا سربازار پھری

اعتراض۔ خانہ خرابی برپا کرنا کہاں کا محاورہ ہے سند چاہیئے

جواب ۔ اہل زبان سے محاورہ کی نسبت سند مانگنا یعنی چہ

(مؤلف) حقیقتاً اعتراض بالکل صحیح ہے۔ خانہ خرابی برپا کرنا کوئی محاورہ نہیں ہے۔ خانہ خرابی کرنا محاورہ ہوسکتا ہے یہ کہنا کہ نااہل کو اہل زباں سے سند مانگنے کا کوئی حق نہیں بالکل غلط ہے۔ اس واسطے کہ وہ قواعد جن پر زباں داں حاوی ہوتا ہے وہ سب بھی اہل زبان ہی کے مقرر کئے ہوئے ہیں۔ اور اُن سے باہر ہونے کا کسی اہل زبان کو حق نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ جاہل اہل زباں کو ایک عالم اہل زبان پر کوئی ترجیح نہیں دی جاسکتی بلکہ وہ اس سے کمتر مانا جائیگا

صبا ؎ موجد گلشن ہو تاثیر بیان عندلیب ہے نموئے نخل گل نوک زبان عندلیب

اعتراض۔ تاثیر بیان عندلیب موجد گلشن کیونکر ہوسکتی ہے لفظ موجد سے ؏ اول مہمل ہوگیا

جواب ۔ سامعین کے دلوں کا باغ باغ کرنا تاثیر بیان عندلیب کا کام ہے۔ یہ تعریف تاثیر بیان بلبل کی غیر معتبر نہیں مسلم عام ہے۔ یہی گلشن کی ایجاد ہے۔ مگر اس بات کو وہی سمجھے گا جسے علم بیان کچھ یاد ہے

(مؤلف) اعتراض صحیح ہے۔ تاثیر بیان عندلیب کو موجد گلشن کہنا بالکل بے معنی ہے۔ میری سمجھ میں یہ بھی نہیں آتا کہ باغ کیا کوئی ایجاد ہے جس کے لئے تاثیر بیان عندلیب کو موجد قرار دیا گیا ہے۔ اصل میں صبا مرحوم کا خیال یہ معلوم ہوتا ہے کہ عندلیب کے نغموں ہی کی تاثیر سے باغ میں بہار آتی ہے۔ اس مضمون کی گنجایش نہ دیکھی تو یوں کہدیا

صبا ؎ خط یہانتک لکھوں اُسکو کہ کروں سب کو قلم ہاتھ لگ جائے اگر دشتِ نیستاں مجھکو

اعتراض۔ اس شعر میں دشت کی کونسی ضرورت تھی۔ واہ ری استادی

جواب ۔ دشت نیستاں نہیں اصل میں دشت و نیستاں ہے آپ کے پاس جو دیوان ہے اس میں واؤ غلطی کاتب سے رہ گیا ہوگا۔ اور مقصود مصنف یہ کہ اشجار دشت اور نیستاں کے نے سب قلم کر ڈالوں

(مؤلف) اعتراض صحیح تھا۔ مگر تاویل بھی اچھی خاصی کی گئی ہے۔ دوسرے مصرع کے متعلق یہ کہنا کہ اشجار دشت و نیستاں سب قلم کرڈالوں۔ کسی صورت سے قابل قبول نہیں ہے۔ مصنف کا مقصد یہ تھا کہ اگر نیستاں کا جنگل مجھے مل جائے تو اس سب کو کاٹ کر قلم بناڈالوں اور خط لکھوں۔ ان کو یہ معلوم نہیں تھا۔ یا یہ بات یاد نہیں رہی کہ نیستاں خود اس جنگل کو کہتے ہیں جہاں نے ہی نے ہو

صبا ؎ قرار اکدم نہیں ہے دیدۂ غم بیں میں آنسو کو — نہیں آرام گہوارے میں بھی اس طفل بدخو کو

اعتراض۔ دیدۂ غم بیں کی ترکیب بھی دیدنی ہے

جواب۔ جس نے کچھ دیکھا نہو اس کے واسطے دیدنی ہے میر ؎

کیا میں بھی پریشانیٔ خاطر سے قریں تھا — آنکھیں تو کہیں تھیں دل غم بیں کہیں تھا

دیکھا آپ نے یہ ترکیب کسقدر بچی ہوئی ہے۔ ذرا سوچ سمجھ کر بات کیا کیجئے۔ جس بات کا انجام خجالت ہو وہ اچھی نہیں۔

مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

(مؤلف) معترض کا اعتراض صحیح ہے۔ مگر مجیب کی یہ دیدہ دلیری کہ میر کے مصرع میں تحریف کر کے بجائے دل غمگیں، کے غم بیں بنا دیا قابل داد ہے۔ میں نے کلیات مطبوعہ کشوری میں دیکھا تو (غمگین) ہی دیکھا۔ اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے اس واسطے کہ غم بیں کوئی ترکیب نہیں ہے اور کلام اساتذہ میں میری نگاہ سے نہیں گزری

صبا ؎ خدا کو انتہا لینی بھی ایدل جور گردوں کی — وگرنہ کب عدم سے ہمسا آفت کوش آتا ہے

اعتراض۔ مصرعۂ اول مہمل ہے۔ اگر انتہا کے بدلے امتحان کہتے تو مضایقہ نہ تھا

جواب۔ کسی چیز کی انتہا لینی (اس چیز کا اندازہ کرنا خاص اہل لکھنؤ کا محاورہ ہے۔ اور بہت فصیح محاورہ ہے۔ یہ کیا ضرورت ہے کہ جن محاورات سے آپ واقف نہوں ان کا استعمال نہ کیا جائے یا وہ درست نہوں

(مؤلف) اعتراض بالکل غلط ہے۔ انتہا لینا۔ تہاہ لینے کے معنے میں آتا ہے اور خاص لکھنؤ کا محاورہ ہے

صبا ؎ روزن ہیں تیرے دیکھنے کو دل کیواسطے — آنکھوں کے اے صنم مرے منھ پر گڑھے نہیں

اعتراض۔ مصرعۂ ثانی کی ترکیب غلط اور نئی تشبیہ ہے۔ اور گڑھے کی فصاحت بھی دیدنی ہے

جواب۔ اہل بصیرت کے نزدیک تو ترکیب میں کوئی نقص نہیں تشبیہ اگر نئی ترکیب ہے تو مضایقہ کیا ہے۔ اور گڑھے کی فصاحت میں بھی آپ کو شبہ ہو تو لکھنؤ کے کسی فصیح کی زبان پر یہ لفظ نہیں ہے۔ آپ کا ہماری زبان کے لفظ کو نہ صحیح جاننا اوسے پایۂ فصاحت سے نہیں گرا سکتا

(مؤلف) مضمون رکیک ضرور ہے۔ مگر غلط نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ کوئی لفظ بذاتہ فصیح ہے اور نہ غیر فصیح بلکہ محل استعمال الفاظ کو فصیح اور غیر فصیح بنا دیتا ہے۔ گڑھا۔ سب جگہ مستعمل ہے۔ مگر جس جگہ استعمال کیا گیا ہے یہاں کوئی اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ آتش مرحوم نے ایک جگہ ایک شعر لکھا ہے ؎

آنکھیں نہیں ہیں چہرے پہ تیرے فقیر کے — دو ٹھیکرے ہیں بھیک کے دیدار کے لئے

چہرے پر بھیک کے ٹھیکرے کچھ اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ مگر اس کو غلط کہنا بھی درست نہیں ہے

صبا ؔ سرِ محفل بٹھا کر چاہنے والوں کو رُلوایا   نیا گانا نکالا آپ نے بے تال و بے سُر کا

اعتراض۔ بے تال و بے سر کے درمیان واؤ عطف کیوں ہے۔ کہ تال کا لفظ ہندی ہے اور بے کا لفظ فارسی ہے

جواب۔ اپنے اعتراض کا تال سُر درست کیجئے شعر میں حرف عطف کی کہیں ضرورت ہی نہیں۔ اور نہ اصل میں ہے آپ نے کسی غلط دیوان میں یہ شعر دیکھا ہوگا

(مؤلف) یہ تاویل تو سراسر غلط ہے کہ آپ نے کسی غلط دیوان میں یہ شعر دیکھا ہوگا۔ اگر کوئی صحیح دیوان ایسا تھا کہ اس میں واؤ عطف نہیں چھپا تھا تو معترض کو اس کا پتہ دینا چاہئے تھا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ صبا کا دیوان سو پچاس جگہ طبع نہیں ہوا بلکہ وہی ایک دو جگہ سب سے زیادہ وہ معتبر نسخہ ہے جو پہلی مرتبہ اردو کا غذ پر طبع ہوا تھا۔ اس میں واؤ عطف موجود ہے لہذا اس عذر بارد ہی کا درجہ دیا جائے گا۔ رہا یہ کہنا کہ شعر میں حرف عطف کی کہیں ضرورت ہی نہیں۔ یہ سراسر معترضین کے قول کی تائید کرتا ہے

صبا ؔ سرکشی پر جو وہ سرو ستم ایجاد آیا   پاس آرے کے گھسٹتا ہوا شمشاد آیا

اعتراض۔ گھسٹتا ہوا کی فصاحت کی تعریف نہ زبان کو یارا کہ بیان کرے اور نہ قلم کو توانائی کہ لکھے

جواب۔ بندہ پرور گھسٹتا ہوا کی عدم فصاحت پر دلیل کیا ہے۔ صرف آپ کا دعوےٰ یہ ہرگز معتبر نہیں۔ یہ تو ہمارے واسطے ہے کہ جس کو ہم کہدیں وہ فصیح ہے اور جس لفظ کو ہم غیر فصیح کہیں وہ فصیح نہیں۔ تاوقتیکہ زباں داں ہمارے مقابلہ پر نظیر نہ لائے

(مؤلف) میرے نزدیک گھسٹتا ہوا غلط یا غیر فصیح نہیں ہے۔ مگر مجیب کی یہ لنترانیاں کہ جسکو ہم غلط کہیں وہ غلط ہے اور جس کو ہم صحیح کہیں صحیح ہے زبردستی بلکہ جہالت کی حد تک پہونچتا ہے

صبا ؔ شاید کہ وہ پرے ہو کہیں مسکرا رہا   بجلی چمک رہی ہے بہت آسماں پر

اعتراض۔ مصرع دوم کی ترکیب بہت غلط ہے

جواب۔ آپ غلط کہتے ہیں۔ مصرع مذکور اس الزام سے بری ہے۔ کون سا شاعر ہے جس کے کلام میں یہ ترکیب داخل نہیں۔ اس میں برائی کیا ہے

(مؤلف) میرے نزدیک شعر کے مصرع ثانی میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ بلکہ برعکس اس کے پہلا مصرع بہت بُرا معلوم ہوتا ہے

صبا ؎ دوڑ چلنا راہِ الفت میں کب اے دل چاہیے رفتہ رفتہ چاہیے منزل بہ منزل چاہیے

اعتراض - مصرع اول کو مصرعِ دوم سے کچھ ربط نہیں یہ شعر مہمل ہے - مصنف نے جو معنی ٹھہرائے ہیں وہ اس ترکیب و بندش سے نہیں نکلتے

جواب - معنی شعر اور دونوں مصرعوں کا ربط تو ظاہر ہے مگر آپ زبان اُردو سے بخوبی واقف نہیں اس وجہ سے آپ سمجھ نہیں سکتے چلنا یہ فعل آخر مصرع دوم سے محذوف ہے - اور معنی یہ کہ راہِ اُلفت میں دوڑ کر نہ چلنا چاہیے بلکہ آہستہ آہستہ اور منزل بمنزل چلنا چاہیے

(مؤلف) اعتراض بالکل صحیح ہے - مصرعوں میں کوئی ربط نہیں - پہلا مصرع صحیح ہے مگر "رفتہ رفتہ چاہیے منزل بمنزل چاہیے" کوئی معنی نہیں نکلتا

صبا ؎ پے گلگشت جو وہ طفل دبستاں ہو جائے بوستاں دفتر اوراقِ پریشاں ہو جائے

اعتراض - پے گلگشت ہو جائے بھی نیا محاورہ ہے

جواب - اگر نیا محاورہ ہے - تو کیا قباحت ہے - یہ بھی تو اہل زبان ہی کا محاورہ ہے - زباں داں کو اس میں عذر کرنے کیا حق ہے

صبا ؎ صبا یہ اُس کا ہے موجد وہ اس کا موجد ہے بشر ہے غم کے لئے اور غم بشر کے لئے

اعتراض - موجد غم بشر مہمل - اور غم موجد بشر مہمل معلوم نہیں کہ مصنف نے اپنے زعم میں موجد کے کیا معنے ٹھیرائے ہیں

جواب - یہاں موجد سے مجازاً باعث ایجاد مراد ہے - شعر ذیل میں لفظ قاتل ملاحظہ کیجئے ؎

گفتم مرو بگوئے بتاں دل رضا نداد آخر بخوں نشاند دلم قاتل من است

دیکھئے یہاں بھی قاتل بمعنی سبب قتل ہے

(مؤلف) یہ موجد ویسا ہی ہے جیسا کہ صبا کے اس شعر میں ؎

موجد گلشن ہے تاثیر بیان عندلیب ہے نمونے نخل گل کو کب زبان عندلیب

اگر وہ صحیح ہے تو یہ بھی صحیح ہے - اور اگر وہ غلط ہے تو یہ بھی غلط ہے

صبا ؎ گھر چھٹے شہر چھٹے سارا زمانہ چھوٹے ایک وہ منتخب چیدۂ و مفرد ل جائے

اعتراض - مفرد کی فصاحت بھی دیدنی ہے

اب - مفرد کی فصاحت میں بجز آپ کے کوئی شاعر عذر نہ کرے گا
(مؤلف) مفرد یکتا کے معنے میں لانا - اور پھر اس کو صحیح بھی سمجھنا زبردست ستم ہے

مباسہ مجھ سے نہ تم ملو جو محبت ہے زر کے ساتھ ممکن نہیں صفائی دل اس کدر کیساتھ
تراض - لفظ دل بھی کس صفائی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے
راب - صفائی میں تو کچھ نقصان نہیں آپ کا دل ہی کچھ مکدر ہے
(مؤلف) دل کے لفظ میں تو مجھے کوئی خاص نقصان معلوم نہیں ہوتا - ہاں دوسرے مصرع کا قافیہ البتہ مشکوک ہے کیونکہ کدر بفتحتین تیرہ ہونے کے معنی میں مصدر ہے - مگر ایسا غیر مانوس ہے کہ اردو کے شعر میں کسی طرح اچھا نہیں مکدر البتہ مستعمل ہے

مباسہ نہیں میں ایک طرح سب طرح سے روشندل اندھیرا رہتا ہی پائے چراغ کے نیچے
عتراض - اس شعر کی ترکیب نہایت معقول ہے - اور پائے چراغ کے نزدیک اندھیرا رہنا بھی قابل دید ہے
واب - ترکیب شعر معقول تو ہے مگر معقول کے نزدیک اور "پائے چراغ کے نزدیک" اندھیرا رہنا بھی کوئی نئی بات نہیں - یہ تو ایک بدیہی امر ہے - جس کو خدا نے بصارت دی ہے وہ روز دیکھتا ہے
(مؤلف) مجیب نے یہ نہیں سمجھا کہ معترض اس واقعہ پر اعتراض نہیں کرتا - بلکہ اُس کا اعتراض پائے چراغ کے نزدیک پر ہے جو فی الواقع غلط اور مہمل ہے (پائے چراغ) کے معنے چراغ کے نیچے کے ہیں "نزدیک" کیا بلا ہے

مباسہ مثل دیوانہ بہت شاہد آبی کف لائے وہ پری سیر کو جس دم لب دریا آیا
عتراض - نہیں معلوم شاہد آبی کس جانور کا نام ہے اگر گومتی میں کوئی جانور آبی پیدا ہوتا ہو اور اُس کو شاہد آبی کہتے ہوں تو گفتگو نہیں - اگر شاہد آبی کے بدلے مردم آبی کہتے تو شعر درست ہو جاتا
جواب - مردم آبی کو اگر شاہد آبی کہا تو کیا بیجا کہا - اور آپ کے مقام سکونت سے تعجب ہے کہ آپ واقف نہیں - گومتی چھوٹا سا دریا ہے اس میں یہ جانور کہاں - دریائے شور کے ساحل پر اکثر دکھائی دیتے ہیں - اور یہ جانور ہماری زبان مطلق نہیں جانتے

(مؤلف) اعتراض یہ ہے کہ ایک جانور جو بشکل انسان دریا ہی ہوتا ہے اوس کو بوجہ مشابہت انسانی کے لوگ مردم آبی کہتے ہیں - مگر ہے وہ دراصل ایک جانور - جیسا کہ خود مجیب کو بھی اعتراف ہے - پھر ان جانوروں میں شاہد و مشہود کا جھگڑا لگا دینا کس قدر مہمل اور بے معنی بات ہے - اوس کو صرف مردم آبی ہی کہہ سکتے ہیں - اعتراض بالکل درست ہے

صبا ؎ کس یاس سے کہتا ہوں میں اُنسے دمِ رخصت ۔۔ لو جاؤ تم اللہ نگہ دار تمھارا

اعتراض۔ اللہ نگہدار تمھارا کیا فصیح محاورہ ہے۔ نگہدار کی جگہ نگہبان کہا ہوتا

جواب۔ نگہدار اُردو کیا فارسی میں بھی فصیح ہے اور وہاں کے فصحا ہمیشہ سے اس لفظ کا استعمال کرتے چلے آئے ہیں مثنوی بزم وصال حال میں عجم سے آئی ہے اور انگریزوں کے ذریعہ سے ہندوستان میں شایع ہوئی ہے اُسے دیکھئے ؎

کہ یارب علی را نگہدار باش ۔۔ بہر کارش از لطف خود یار باش

یہ شعر اُسی مثنوی کا ہے۔ اور سعدی نے بوستاں میں فرمایا ہے ؎

جہانت بکام و فلک یار باد ۔۔ جہاں آفرینت نگہدار باد

جب آپ نے سیرِ بوستاں سعدی نہیں کی تو بزم وصال تک رسائی کہا

(مؤلف) نگہدار اور نگاہ دار کے صحیح ہونے میں کلام نہیں ہے۔ مگر اعتراض یہ ہے کہ رخصت کے وقت کوئی یہ بھی کہتا ہے کہ اللہ تمھارا نگہدار ہو۔ فارسی کا ذکر نہیں اُردو میں۔ اللہ نگہبان کہا جاتا ہے اور اسی لحاظ سے بلاشبہ یہ اعتراض صحیح ہے

صبا ؎ ہو دورے میں جلوۂ طاؤس ساقیا ۔۔ مینا ضرور چاہئے سونے کے جام پر

اعتراض۔ دورے میں جلوۂ طاؤس سے کیا حاصل اگر رقص طاؤس کہتے تو مضایقہ نہ تھا

جواب۔ دورے میں رقص طاؤس سے جو حاصل ہے وہی جلوۂ طاؤس سے ہے یہاں مصنف کی غرض جام زریں کی تھی، ہنگام دور جلوۂ طاؤس کے ساتھ اس تشبیہ کو انھوں نے بہت اچھی طرح سے بیان کیا۔ اون کو جملہ لوازمات بزم میخواری کے بیان کرنے کی ضرورت کیا تھی

(مؤلف) تشبیہ جو دیگئی ہے وہ مکمل ہے۔ مگر معترض کا یہ کہنا کہ اگر رقص طاؤس کہتے تو مضایقہ نہ تھا اور فاضل مجیب کا یہ جواب کہ رقص طاؤس سے جو حاصل ہے وہی جلوۂ طاؤس سے ہے۔ دونوں فضول سے ہیں اس واسطے کہ نہ تو طاؤس کی دَورے کے وقت ضرورت پڑتی ہے۔ اور نہ کسی مجلس میکشی میں رقص طاؤس دیکھا گیا۔ میرے خیال میں جس خیال کے واسطے یہ تشبیہ تلاش کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ باغ ہو اور طاؤس رقص کناں ہو تو لطف مے کشی اس سے دونا ہو جاتا ہے۔ سو یہ خیال نامکمل رہ گیا۔ اور مصنف اس کو ادا نہیں کرسکا

صبا ؎ عوض اللہ اس کا محکمے میں حشر کے لیگا ۔۔ کریگا جو سیاست حاکم ظالم رعیت پر

اعتراض۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف سیاست کے معنی سے واقف نہ تھے۔ سیاست تو واسطے حاکم عادل کے ہے سیاست سلطنت قائم نہیں رہ سکتی چنانچہ حضرت مخدوم شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے گلستاں کے باب ہشتم میں فرمایا ہے

چیز پائدار نماند۔ مال بے تجارت۔ علم بے بحث۔ ملک بے سیاست۔ اور سیاست کے معنے کتب لغت میں پاس
شتن و حکم راندن بر رعیت وتنبیہ کردن ومحفوظ داشتن خلق اللہ از گناہ“ ہیں
ب۔ تحقیق شعر کے واسطے صرف گلستاں کا پڑھ لینا اور غیاث اللغات کا اونے پونے خرید کر طاق پر رکھ چھوڑنا کافی
ہیں اس فن کے واسطے بہت کچھ دیکھنے اور سیکھنے کی ضرورت ہے سیاست کے معنے تورہ وقانون بھی ہیں اور مجازاً
کشتن وبستن بھی یہ لفظ آیا ہے۔ بہار عجم ملاحظہ کیجئے اور اصطلاح میں سیاست گر خونریز اور سفاک کو بھی کہتے ہیں
پایہ تحقیق اپنے آپ کو محقق کہنا ایسا ہی ہے جیسے میاں سبز علی پنجرے میں بیٹھے اپنے تئیں میاں مٹھو کہا کرتے ہیں
کی تحقیق اور صبا کی ناواقفیت کا حال ایسے اعتراض سے بنئیا پر بخوبی ظاہر ہو سکتا ہے
(مؤلف) جواب صحیح ہے سیاست کے معنی کشتن وبستن کے علاوہ قہر کے بھی آتے ہیں

باس ۵ اے ترک تری باد بہاری ہے جلو میں اُڑتا ہوا جاتا ہے وہ گلگوں تہ راں ہے
تراض۔ مصرع اول کی ترکیب وبندش ناقص ہے اگر یوں کہتے تو اچھا تھا ع
اے ترک جلو میں ہے تری باد بہاری
ب۔ اظہار تعجب کے واسطے وہی ترتیب الفاظ چاہئے تھی جو صبا نے اختیار کی۔ ذوق فہم سخن حاصل کیجئے
(مؤلف) اعتراض اور اصلاح صحیح ہے۔ صبا نے جس طرح کہا ہے اوس میں سخت تعقید ہے۔ اور اصلاح سے وہ تعقید دور ہو گئی ہے۔ یہ کہنا کہ تعجب کے واسطے یوں ہی کہنا چاہئے غلط ہے۔ صبا نے یقین کے لئے کہا ہے اور اس کے واسطے وہی بندش چست و درست ہے۔ تعجب کے لئے کوئی حرف موجود نہیں کہ مصرع اولے میں اس پر دلالت کرے

باس ۵ نزع میں ہوں مرے بالیں سے نہ اٹھئے للہ آپ کس وقت میں بندے کو دغا دیتے ہیں
اندنوں میں روز ہوتا ہی ہمیں جوش جنوں بھاگتا ہے چھوڑ کر مجنوں بیاباں آجکل
تراض۔ ان دونوں شعروں میں میں کا لفظ بیکار ہے
اب۔ کہیں میں کا لفظ بیکار نہیں۔ چونکہ آپ زبان اُردو سے بخوبی واقف نہیں ہیں اس وجہ سے یہ لفظ آپکو
شعروں میں بیکار معلوم ہوتا ہے۔ شعر اول میں مصرع اول سے اگر میں کو علیحدہ کیجئے تو نزع ہوں باقی رہے گا
ع ہوں (نزع میں ہوں کی جگہ) مصرع دوم میں میں کا اس غرض سے آیا ہے کہ سامع کو استفہام کا شبہ نہو۔
کس وقت بندے کو دغا دیتے ہیں۔ یہ جملہ مقصود مصنف پر ہرگز اس طرح دلالت نہیں کرتا جس طرح مصرع
نف دلالت کرتا ہے۔ شعر دوم میں میں کا لفظ خاص دنوں کے وقوع میں جوش ظاہر کرتا ہے۔ گزشتہ سنین کے

واسطے بھی موجودہ صورت میں مصرع کے یہ معنی ہیں کہ ہر سال ان دنوں میں ہمیں روز جوش جنوں ہوتا ہے۔ اور اگر مین کو مصرع سے علیحدہ کرکے دیکھیں تو یہ معنے پیدا ہوتے ہیں کہ آجکل یعنی سال موجود کے خاص حصہ میں ہمیں روز جوش جنوں ہوتا ہے اور یہ معنی مقصود مُصنف نہیں۔ جناب من زبان اُردو ابھی اچھی طرح آپ نہیں جانتے کچھ دن اور سیکھئے

(مؤلف) اعتراض غلط ہے میرے خیال میں دونوں طرح پڑھتے ہیں بغیر میں کے بھی اور میں کے ساتھ بھی

مولانا صفی لکھنوی و مرزا یاس عظیم آبادی

صفی ؎ منھ میں کف۔ ہاتھ پہ سر۔ پاؤں میں زنجیر بہار درِ زنداں پہ کھنچی کیوں مری تصویر بہار

اعتراض مرزا یاس۔ منھ میں کف اور ہاتھ پہ سر ہے۔ نہ معلوم کس کا سر ہاتھ پر ہے۔ کیونکہ اگر اپنا ہی سر بُریدہ ہاتھ میں ہو تو پھر کف کس منھ میں ہے۔ تن پر تو سر باقی نہ رہا۔ اور اگر اسی سر بریدہ دہن کف آلود کی طرف اشارہ ہے تو سبحان اللہ پھر نہ معلوم پاؤں میں زنجیر بہار کیسی۔ اول تو یہ تصویر ہی سر سے پاؤں تک (منھ میں کف۔ ہاتھ پہ سر۔ پاؤں میں زنجیر بہار) مضحک ہے۔ دوم یہ نہیں معلوم تصویر کھنچی کس کی۔ تصویر بہار کھنچی۔ یا تصویر قایل۔ کیونکہ ایک لفظ تصویر کی اضافت دو دو طرف (یعنی مری اور بہار) سوائے مہمل ہونے کے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ مری تصویر کے ساتھ بہار کی ردیف بالکل بیکار ہے۔ مگر ان حضرات کے نزدیک ردیف محض ایک بیکار شئے ہے شعر سے کوئی معنوی تعلق ہونا ضرور نہیں گویا اک سخن تکیہ ہے کہ اثنائے کلام میں جا وبیجا ٹھونس دیا جاتا ہے

(مؤلف) اعتراض صحیح ہے

صفی ؎ سنگ مدفن کو مرے غور سے دیکھا کس نے خاک میں دوڑ گئے ریشۂ تاثیر بہار

اعتراض۔ وہی مثل ہے کہ راجا دیکھا رانی دیکھی حلق میں لکڑی کبھی نہ دیکھی، شاید جناب صفی نے کوئی خوردبین ایجاد کی ہے۔ جس سے ریشۂ تاثیر بہار کو بہت غور سے معائنہ فرمایا ہے۔ ورنہ آج تک ریشۂ تاثیر بہار کسی نے دیکھے نہ سنے

لہ مولانا صفی لکھنؤ کے ایک مشہور اور خوش گو شاعر ہیں۔ جہاں تک معلوم ہوا ہے پہلے آپ علی میاں کامل کے شاگرد تھے۔ مگر مشق سخن نے اب خود ہی آپ کو اُستاد تجربہ کار بنادیا ہے۔ آپ نے علاوہ غزلوں کے قومی نظمیں بھی بہت سی کہیں اور اسی وجہ سے اب آپ کے نام کے ساتھ لسان القوم بھی لکھا جاتا ہے۔ آپ کا کلام سادہ اور صاف ہوتا ہے۔ گر معانی آفرینی آپ کا شیوۂ خاص ہے نہایت متین سنجیدہ بزرگ ہیں۔ مولوی گنج لکھنؤ میں مکان ہے۔ اب آپ کی عمر ستر پچھتر برس کی ہوگی مگر پھر بھی اپنے اخلاق اور لوگوں کی ضد اور اصرار کی وجہ سے اکثر شریک مشاعرہ ہوتے رہتے ہیں

ایجاد بندہ اگرچہ گندہ۔ سنگ مدفن کو کسی نے غور سے دیکھا اور خاک میں ریشۂ تاثیر دوڑ گئے۔ آخر اس کا حاصل کیا ہوا

(مؤلف) میرے نزدیک یہ اعتراض بالکل غیر درست ہے۔ کیونکہ اس قسم کا اِدّعا ہر شاعر کے لئے جائز ہے۔ اور ایسے ہزارہا شعر اساتذہ کے کلام میں ملیں گے۔ معشوق کی تاثیر نگاہ کو بیان کیا گیا ہے کہ اوس کی تھوڑی سی نگاہ التفات میرے لئے اکسیر کام کرتی ہے کہ اک ذرا اس نے سنگ مدفن کو غور سے دیکھا اور قبر کو سراپا بہار بنا دیا

مغل[1] خاں صنعت - منشی لچھمی نراین شفیق

صنعت ؎ یار گھر جاتا ہے یار و کیا کروں ہائے گھر جاتا ہے یار و کیا کروں

اعتراض - اس شعر کا قافیہ درست نہیں ہے۔ مگر اس حالت میں کہ پہلے مصرع میں بجائے یار کے ماہ کہیں اور بجائے ہائے کے دوسرے مصرع میں آہ کہیں۔ مگر اس میں فصاحت کلام باقی نہیں رہتی

(مؤلف) اعتراض درست ہے۔ مگر میرے نزدیک پورے شعر کو بدلنا مناسب نہیں - بلکہ پہلے مصرع میں بجائے - گھر - کے گر - کر دیا جائے اور دوسرا مصرع جیسا ہے رہنے دیا جائے - اس طرح سے قافیہ بھی درست ہو جاتا ہے - اور ایک صنعت بھی پیدا ہو جاتی ہے

قائم[2] و شفیق

قائم ؎ یارب کوئی اُس چشم کا بیمار نہووے دشمن کے بھی دشمن کو یہ آزار نہووے

اعتراض - اس شعر میں اسی قدر نزاکت ہے کہ شاعر نے محاورۂ عام کے موافق موزوں کر دیا ہے اور دشمن کے دشمن سے خطاب کیا ہے لیکن دشمن کا دشمن اپنا دوست ہوتا ہے - چنانچہ یہ مصرع ہے - نباشد دشمن دشمن بجز دوست

(مؤلف) مطلب اعتراض کا یہ ہے کہ شاعر کہنا یہ چاہتا تھا کہ خدا کرے کسی بڑے دشمن کو بھی یہ آزار نہو اور کہہ گیا یہ کہ دوست کو بھی یہ آزار نہو ـــــ مگر میرے خیال میں دوسرا مصرع یوں کہا گیا ہے ؎ دشمن سے بھی دشمن کو یہ آزار نہووے

---

[1] دکن کے قدیم شاعروں میں مغل خاں صنعت بھی تھے - لچھمی نراین شفیق نے اپنے تذکرہ چمنستان شعرا میں فتح علیخاں کے تذکرے سے دو شعر نقل کر کے لکھے ہیں - انھیں میں سے ایک شعر پر اعتراض کیا ہے

لچھمی نراین شفیق اورنگ آباد کے رہنے والے تھے اور مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کے مایۂ ناز شاگرد تھے - قوم سے کھتری تھے - عربی - فارسی اردو کے ماہر تھے - مختلف تصنیفیں ان سے یادگار ہیں جن میں ایک تذکرہ چمنستان شعرا بھی ہے جو نہایت تحقیق سے لکھا ہے فارسی عبارت میں اردو کے شعرا کا حال لکھا ہے اور بعض بعض جگہ اُن کے کلام پر تنقید بھی کی ہے [2] قائم تخلص تھا - محمد قیام الدین نام تھا - چاند پور -

کیونکہ محاورہ یہی ہے

قتیل[۱] و مرزا غالب

قتیل ؎

یک جیب جائے بخیہ تو زخوں پاک نبود   کشتہ بر شتہ تپاں بود دگر خاک نبود

اعتراض مرزا غالب - یہاں پر (دوسرے مصرع میں بجائے خاک نبود) ہیچ نبود کا محل ہے۔ ہندی میں کچھ نہیں کی جگہ خاک نہیں بولتے ہیں

(مؤلف) مرزا کا اعتراض صحیح ہے۔ کچھ نہونے کی جگہ اہل فارس ہیچ - اور ہیچ نبون کہتے ہیں

قتیل[۲] و بیتاب

قتیل ؎

در رہِ عشق دلم شد ہدف تیر کسے   زخم من بہ شدنی نیست ز تدبیر کسے

اعتراض بیتاب - زخم کے واسطے مرہم کی ضرورت ہے۔ تدبیر سے کیا ہوتا ہے۔ مرزا قتیل نے کچھ اس کے جواب دئے بیتاب نے فوراً اسی زمین میں یہ غزل کہی۔ اور قتیل سے داد سخن حاصل کی۔ لکھا ہے کہ قتیل نے اس اعتراض کو تسلیم بھی کرلیا تھا بیتاب کی غزل کا مطلع اور بعض شعر یہ ہیں

ند بہ کارم گرہی زلف گرہ گیر کسے   کہ نہ شد وا ز سر ناخن تدبیر کسے
شب ہجومی بسرم بود و ہم میگفتند   مردہ را زندہ کند معجز تقریر کسے
میردم من نہ بجو د سایہ صفت در دنبال   موکشاں می بردم زلف گرہ گیر کسے
کرد ہر خانۂ دل را اگر غم عشق خراب   نتواند شدن آباد ز تعمیر کسے
بندۂ عشق شدار قید دو عالم آزاد   ہست وا رستہ ز غم بستہ زنجیر کسے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳۳) متعلقہ سنبھل مراد آباد کے رہنے والے سودا اور خواجہ میر درد کے شاگرد تھے عمر کا اکثر حصہ دلی میں بسر کیا۔ ایک تذکرہ شعراء اردو ان سے یادگار ہے اور ایک ضخیم دیوان ریختہ بھی موجود ہے۔ نہایت ہی خوشگو۔ خوش مذاق اور ریختہ مشق شاعر تھے ۱۲۱۰ھ میں انتقال کیا

[۱] قتیل مرحوم کا نام مرزا محمد حسن تھا۔ لکھنؤ میں قیام تھا اور نواب سعادت علی خاں مرحوم کے زمانے میں اکابر اہل علم سے مانے جاتے تھے۔ قاضی محمد صادق خاں اختر سے اصلاح و مشورۂ سخن لیتے تھے انشاء کے بڑے دوست اور ہمنشین تھے فارسی بہت اچھی جانتے تھے۔ اگرچہ مرزا غالب ان کو بالکل نہیں مانتے تھے۔ بہت سی کتابیں۔ اور ایک انشا ان سے یادگار ہے [۲] بیتاب تخلص تھا۔ شیخ محمد حیات نام تھا

در دہجراں کشدم بہر خدا ہم نفساں　بنمایند مرا جلوۂ تصویر کسے
شب چو بستند فغان دلم آتش نگفت　کرد بیتاب مرا نالۂ دلگیر کسے

ملا قدسی و ملا شیدا

قدسی ؎
عالم از نالۂ من بے تو چناں تنگ فضاست　کہ سپند از سر آتش نتواند برخاست

اعتراض شیدا ؎
ای ہنرمند سخن سنج باندیشہ بہ سنج　نقد ہر حرف بمیزان خرد بے کم و کاست
نالہ در سینہ ہوائیست کہ بے قصد رود　چونکہ از سینہ ہوا گر شد ازاں ہوا ست
عالم از وے نہ شود تنگ ولیکن ز ملال　خلق عالم گر از دل تنگ نشیند بجاست

قدسی کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ میرے نالوں سے اتنا بھرا ہوا ہے۔ کہ سپند بھی اب آگ سے چٹک کر اٹھ نہیں سکتا کیونکہ جگہ ہی نہیں ہے۔ شیدا کا اعتراض یہ ہے کہ نالہ ایک ہوا ہے جو سینہ میں رہتی ہے۔ اور بے قصد نکل جاتی ہے سینہ سے نکلنے کے بعد ہوا میں ملتی ہے پھر اس سے فضائے عالم کیا تنگ ہو گی۔ مگر ملال ایسی چیز ہے کہ اس سے زمانہ کی فضا تنگ ہو سکتی ہے

(مؤلف) میرے نزدیک شیدا کا اعتراض بیجا ہے اُس کا یہ کہنا کہ زمانہ میرے نالوں سے بھرا ہوا ہے، ایک مفروضہ بات ہے اور اس کو ادعائے محض کے سوائے اور کوئی درجہ نہیں دے سکتے۔ ملال اور نالہ دونوں برابر ہیں۔ کیونکہ نہ تو ملال کوئی محسوس اور مرئی چیز ہے نہ نالہ پھر ان دونوں میں آخر فرق کیوں نکالا گیا ہے

مولانا آزاد بلگرامی نے بھی قدسی کے ایک شعر پر اعتراض کیا ہے۔ جو ذیل میں درج ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ قدسی نے شاہجہاں کی تعریف اور حالات میں ایک کتاب بادشاہنامہ نظم کی۔ اسی میں جب عبداللہ خاں فیروز جنگ کا ذکر آیا تو عمر کی گنجائش کی وجہ

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۳۴) علی حزیں کے شاگرد تھے۔ بیتاب قتیل کے معاصر تھے لکھنؤ میں قیام تھا مگر بلگرام کے رہنے والے تھے۔ قاضی محمد صادق اختر کے دوست تھے۔ پہلے محمد صدیق سخنور سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ جب وطن سے لکھنؤ میں آئے تو چند روز تک سربسنگھ دیوانہ کے ساتھ رہتے رہے۔ مولوی غلام مخدوم سے عربی فارسی کی تکمیل بھی لکھنؤ ہی میں کی تھی۔ مرزا فاخر مکین اور میر قمر الدین منت سے معارضہ اور مشاعرے ہوا کئے ــــ ایک مرتبہ نواب غازی الدین حیدر بادشاہ لکھنؤ کی مدح میں ایک قصیدہ کہا۔ جس کے صلہ میں سو روپیہ ماہوار خزانہ شاہی سے ہمیشہ ملتا رہا۔ اور اسی زمانہ میں بادشاہ نے بیتاب کی بجائے امید تخلص رکھا اور اسی زمانہ ۱۲۳۹ھ میں انتقال ہوا۔ بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ انھوں نے قتیل سے اصلاح بھی لی ہے۔ بہرحال واقعہ کچھ ہو مگر تذکرۃ الشعرا ر فارسی مولفہ مولانا احسن بلگرامی میں لکھا ہے کہ قتیل نے ایک روز مشاعرہ میں غزل پڑھی جس کے مطلع پر سر مشاعرہ بیتاب نے اعتراض کیا

سے یہ نام بحر میں نہ آسکا۔ وہاں عذر مقام کے طور پر یہ شعر لکھا ہے

نہنگے کہ از غایت احتشام   نہ گنجد بہ بحر از بزرگیش نام

اعتراض - جہاں تک خیال کیا جاتا ہے نام کے بحر میں نہ سمانے کی مصنف نے دو وجہیں لکھی ہیں ایک غایت احتشام دوسری بزرگی - اس میں سے ایک زاید ہے - لہذا اسطرح اصلاح ہوسکتی ہے

نہنگے است از غایت احتشام   نہ گنجد بہ بحر از بزرگیش نام

اور معنی میں بھی ایک تکلف پیدا کیا جاسکتا ہے کہ شین کی ضمیر کو نام کی طرف راجع کریں - جس سے یہ معنی پیدا ہوں کہ وہ ایسا نہنگ ہے کہ اوس کے غایت احتشام کی وجہ سے اوس کا نام اسقدر بزرگ ہوگیا ہے کہ بحر میں اس کا نام نہیں سماسکتا - اور جو اصلاح دی گئی ہے وہ بھی معنی کو صاف ادا کرتی ہے

(مؤلف) قدسی نے یہ کہا تھا کہ وہ ایسا نہنگ ہے کہ اوس کے احتشام کی وجہ سے بحر میں اوس کا نام نہیں سماسکتا ـــــ مولانا آزاد نے اس بنا پر اعتراض کیا کہ غایت احتشام - اور بزرگی دو وجہیں بحر میں نام کے نہ سمانے کی شاعر نے قرار دی ہیں - مگر پہلی وجہ زاید ہے کیونکہ غایت احتشام ایسی چیز نہیں ہے کہ اوس کی وجہ سے بحر میں نام نہ آسکے - ہاں بزرگی کو ایک وجہ قرار دیا جاسکتا ہے - لہذا یہ کہنا زیادہ موزوں ہے کہ اپنے احتشام کی وجہ سے وہ نہنگ ہے - اور بحر میں بزرگی کی وجہ سے نام نہیں آسکتا ـــــ اس حالت میں میرے نزدیک اصلاح اور وجہ اعتراض دونوں درست ہیں - مگر اصل شعر بھی غلط نہیں - اور اگر اس میں شین کی ضمیر کو نام کی طرف راجع کریں تو یہ اعتراض خود ہی دفع ہوجائے گا

(نوٹ صفحہ ۲۳۵) قدسی تخلص تھا حاجی محمد جان مشہدی کا - جو ۱۰۴۲ھ میں اپنے وطن سے ہندوستان آئے - اور شاہجہاں بادشاہ کے دربار میں پہونچے - سب سے پہلے جو بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ پڑھا اوس کا یہ مطلع تھا

ای قلم بر خود ببال از شادی وبکشا زباں   در ثنائے قبلۂ دین ثانی صاحبقراں

جسپر دو ہزار روپیہ صلہ میں ملا - اس کے بعد بارہا عنایت شاہی سے سرفراز ہوا - اور ۱۰۵۶ھ میں بعارضہ اسہال بمقام دار السلطنت لاہور انتقال کیا - بادشاہ نامہ وغیرہ ان کی تصنیف سے یادگار رہیں

ملا شیدا فتحپورسیکری کے رہنے والے تھے - نہایت زود گو اور مشاق تھے ایک لاکھ کے قریب شعران سے یادگار ہیں انھوں نے قدسی مشہدی کے ایک پورے قصیدہ کے ہر شعر پر اعتراضات کئے ہیں - جسکا مطلع یہ ہے اور صرف اسی ایک اعتراض پر ہم اکتفا کرتے ہیں - کیونکہ تذکرۂ حسینی میں اب صرف یہی اعتراض پایا جاتا ہے - باقی اعتراضوں کا کوئی پتہ نہیں

قلق[1] - و حالی

مولانا حالی۔ " طلسم اُلفت میں اس موقع پر جبکہ بادشاہ عشق آباد کی طرف سے شیدا وزیر اپنے شہزادہ کے لئے نسبت کا پیام لے کر شہر حسن آباد میں شاہانہ جاہ و حشم کے ساتھ پہونچا ہے اور حُسن آباد کے بادشاہ نے اس کے آنے کی خبر سنکر اپنے وزیر کو اس سے گفتگو کرنے کے لئے بھیجا ہے وہ صاحب مثنوی اس طرح بیان کرتا ہے

جاتے ہی اسنے قرب شہر پناہ | خیمہ اپنا کیا بہ شوکت و جاہ
بسکہ دانائے روزگار تھا وہ | مرد میدان کارزار تھا وہ
رعب پہلے ہی سے بٹھانے کو | صولت و دبدبہ دکھانے کو
کی اُسی روز لشکر آرائی | کثرت فوج سب کو دکھلائی
خبر آمد اوس کی عام ہوئی | خلق دہشت زدہ تمام ہوئی
اتنے میں وہاں کے شہریار کو بھی | خبر اُس کے ورود کی گذری
کہ کسی شہر کا کوئی سردار | لے کے ہمراہ لشکر بسیار
آکے اترا ہے قرب شہر پناہ | مستعد جنگ پر ہے وہ ذی جاہ
سنتے ہی وہ کمال گھبرایا | وزرا کو بُلا کے فرمایا
دیکھو تو کس کا لشکر اُترا ہے | کون ہم پر غنیم آیا ہے
الغرض اک وزیر با تدبیر | اپنے ہمراہ لے کے فوج کثیر
تھا فروکش جہاں وہ ہم پایا | وہاں ملاقات کے لئے آیا
سنتے ہی پاس یہ کیا اُس نے | بے تکلف بُلا لیا اوس نے
تا لب فرش لینے کو آیا | مل کے پہلو میں اپنے بٹھلایا
پہلے تو ذکر ادھر اُدھر کا رہا | بعد اک طور سے یہ اوس نے کہا
کہ جہاندار جو ہمارا ہے | اس فلک قدر نے یہ پوچھا ہے
آپ نے کی ہے کیوں ادہر تکلیف | کس ارادے سے لائے ہیں تشریف
سیر کا عزم ہے تو گھر یہ ہے | ہر مسافر کا رہ گزر یہ ہے

---

[1] قلق تخلص خواجہ اسد اللہ نام تھا۔ آفتاب الدولہ خطاب تھا۔ وطن لکھنؤ تھا۔ خواجہ وزیر مرحوم کے بھانجے اور بہادر حسین فراق کے بیٹے تھے واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ کے جاں نثاروں میں تھے۔ انھیں کے ہمراہ کلکتہ چلے گئے تھے

دل میں گر اور کچھ ارادہ ہو تو میں باہر نہیں ابھی آؤں

اس بیان میں قطع نظر لفظی کمزوریوں کے بڑی کسر یہی ہے کہ کلام مقتضائے حال کے موافق ایراد نہیں کیا گیا۔ تاریخ کے بیان میں مورخ خود واقعات کے قبضہ میں ہوتا ہے اور قصہ میں واقعات اس کے قبضہ میں ہوتے ہیں تاریخ میں جس واقعہ کی صحت بخوبی ثابت ہو جائے اُس کی جوابدہی مورخ کے ذمہ باقی نہیں رہتی البتہ اوس کا یہ فرض ہے کہ اس کے اسباب کا تفحص کرے اور بتائے کہ کیوں ایسا واقع ہوا۔ بخلاف قصہ کے کہ اس کے بیان میں جو بے ربطی پائی جائے گی۔ اس کا ذمہ دار خود قصہ کا بنانے والا ہے۔ اوّل تو نسبت کے پیغام کو پہلے خط وکتابت کے ذریعہ سے طے نہ کرنا اور دفعۃً وزیر اور شاہزادے کے ساتھ ایک لشکر جرار روانہ کر دینا پھر وزیر کا فوج کثیر لے کر اور مہینوں کا رستہ طے کرکے حسن آباد کی شہر پناہ تک پہونچ جانا اور بادشاہ حسن آباد کو اس کے ارادہ کی مطلق خبر نہ ہوئی پھر اس کا حال دریافت کرنے کے لئے بادشاہ کا وزیر کو مع فوج کثیر کے بھیجنا پھر وزیر کا بادشاہ کی طرف سے مہمان کے ساتھ ایسی گفتگو کرنا جیسی کہ بازاریوں میں ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہ اگر کچھ اور ارادہ ہو تو میں اس سے بھی باہر نہیں ہوں۔ میں بس اتنی ہی راہ دیکھتا تھا۔ اب دیر کیا ہے۔ بسم اللہ۔ بالکل مقتضائے مقام کے خلاف ہے

اس کے بعد شیدا وزیر بادشاہ عشق آباد کی طرف سے نسبت کا پیغام دینے کے بعد کہتا ہے

جاہ و حشمت کا کچھ اگر ہو خیال تو یہ بیجا ہے اے ہمایوں فال
آپ ہیں اپنے شہر کے سُلطاں بندہ ہے تاج بخش باجستاں
دل میں انصاف کیجئے تو صریح ہر طرح سے ہے بندہ کو ترجیح
کہ میں سلطان خسرواں ہوں آج بلکہ شاہنشہ جہاں ہوں آج
میرے قبضہ میں ہیں کئی اقلیم بخشتا ہوں میں افسر و دیہیم
مجکو دی ہے خدا نے وہ طاقت وہ مرا دبدبہ ہے اور صولت
آج چاہوں تو باج لے قاروں رُبع مسکوں پہ سکہ بٹھلاؤں
زور دکھلانے پر میں آؤں اگر چھین لوں تاج خسرو خاور
میں دلاور وہ ہوں وہ ہوں سفاک ہفت اقلیم میں ہے جسکی دہاک
سرکش آآکے پاؤں پڑتے ہیں ناک در پہ مرے رگڑتے ہیں

اس کے بیان کی بے ربطی بھی ظاہر ہے کہ وزیر جس بادشاہ کی طرف سے نسبت کا پیغام ہے اور جسکا منصب عجز و انکسار کرنے کا ہے۔ اس کی طرف سے ایسی نامعقول گیدڑ بھبکیاں دیتا ہے اس کے بعد جب وزیر حسن آباد شیدا کی تقریر سنکر اپنے بادشاہ کے پاس واپس گیا ہے۔ اور وہاں جاکر اس نے شیدا کی تقریر کا اعادہ کیا ہے تو بادشاہ

حسن آباد اس کے جواب میں کہتا ہے

ہاں کہو جلد فوج ہو تیار | مابدولت کے لاؤ تو ہتھیار
دیکھوں تو کتنا حوصلہ ہے اسے | ہم سے عزم مقابلہ ہے اسے
لو ہاد کھلانے کو یہ آیا ہے | ہم کو کیا موم کا بنایا ہے
بادشہ اس کا کیا ہے یہ کیا ہے | کثرت فوج پر یہ پھولا ہے

یہ تمام تقریر اسقدر سبک اور کم وزن ہے کہ ہرگز کسی بادشاہ کے منھ سے زیب نہیں دیتی بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی بادشاہ کی حماقت ظاہر کرنے کے لئے کوئی شخص اس کی نقل اُتار رہا ہے۔ پھر جب امیروں نے سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا ہے تو وزیر بادشاہ کی طرف سے شیدا کے پاس یہ مصالحت آمیز پیام لے کر چلا ہے

یہ تعلّی جو آپ کرتے ہیں | اتنا جرأت کا دم جو بھرتے ہیں
سابقہ ہو تو حال کھل جائے | ادھر آؤ تو حال کھل جائے
گو کہ میں تم سا خود پسند نہیں | سیکڑوں سے بھی پر میں بند نہیں
سر بھی جائے تو یہ قدم نہ ہٹیں | ٹل بھی جائے زمیں تو ہم نہ ہٹیں
یہاں تو رستم سے بھی نہیں ڈرتے | شیر سے بھی جری نہیں ڈرتے
کیا کروں پاس ہے شریعت کا | دھیان ہے دوستی و الفت کا
شرم ہے میہماں کے آنے کی | رسم بھی ہے یہی زمانے کی
ورنہ سیر آپ کو دکھا دیتا | سب گھمنڈ آپ کا مٹا دیتا

یہاں تک خود بادشاہ کا پیغام بادشاہ کی طرف ہے۔ ان تمام ابیات میں الفاظ و محاورات کی لغزشوں سے ہم کچھ بحث نہیں کرتے البتہ ہم کو یہ دکھانا منظور ہے کہ کلام بالکل مقتضائے حال کے برخلاف ایراد کیا گیا ہے اسی داستان پر کچھ موقوف نہیں اس مثنوی میں کہیں بھی اس بات کا خیال نہیں کیا گیا۔ کہ جیسا موقع ہو ویسی گفتگو کی جائے

اس داستان سے پہلے جہاں بادشاہ حسن آباد اور اس کی بڑھیا ملکہ بیٹیوں کے عقد میں باہم مشورہ کر رہے ہیں اس طرح بیان کرتا ہے

ایک دن بادشاہ حسن آباد | اندرون محل تھا بادل شاد
اپنی بی بی سے گرم خلوت تھا | محو راحت تھا مست عشرت تھا
اُس پر یروں نے تخلیہ پا کر | عرض کی اختلاط میں آ کر

لڑکیوں کا نہیں کچھ آپکو دھیان ہو چکی ہیں سلامتی سے جوان
اور باتوں کا تو نہیں کچھ غم ہاں مگر یہ خیال ہے ہردم
کہ میں بیٹھی ہوئی ہوں پا بہ رکاب طاقت جسم دے چکی ہے جواب
سب مہیا ہیں کوچ کے سامان اور دو چار دن کی ہوں مہمان
کچھ ہی دن اب سفر میں باقی ہیں ان کا سہرا تو دیکھ لیتی میں
سُن کے کہنے لگا وہ عالی جاہ تیرے کہنے ہی تک ہے کیا اے ماہ
بخدا خود خیال ہے مجھ کو جستجو بھی کمال ہے مجھ کو

اس تقریر میں بھی اکثر الفاظ بے محل اور بے موقع استعمال ہوئے ہیں۔ بادشاہ خود شیخ فانی ہے۔ اور اس کی ملکہ بھی عجوز سالخوردہ ہے۔ وہ خود جا بجا کہتی ہے کہ میں پا در رکاب بیٹھی ہوں اور چناں ہوں اور چنیں ہوں۔ باوجود اس کے ایسے الفاظ استعمال کرنے۔ کہ اپنی بی بی سے گرم خلوت تھا۔ یا محو راحت اور مست عشرت تھا۔ یا اس پر یہ دیعنی بڑھیا نے اختلاط میں آکر عرض کی۔ یا بادشاہ کا اپنی بڑھیا ملکہ کو کہیں اے ماہ اور کہیں اے حور کہنا یہ سب باتیں مقتضائے حال کے خلاف ہیں

ایک جگہ جب کہ شاہزادے کو غش آگیا ہے اور یہی بڑھیا ملکہ جو اس کی ماں ہے محل کے اندر گھبرا رہی ہے اور بار بار اس کی خبر باہر سے منگواتی ہے۔ ایک خواص باہر سے یہ کہتی آئی ہے

لوگو بتلاؤ تو کہاں ہیں حضور کہو کیا بیٹھی کرتی ہو اے حور

پھر تھوڑی دیر کے بعد اور لونڈیاں آکر یہ کہتی ہیں

دوڑ سی دوڑ ہو رہی ہے حضور باہر اندر یہی ہے ذکر اے حور

دونوں جگہ ایک مصرع میں ملکہ سالخوردہ کو حضور۔ اور دوسرے مصرع میں اے حور کہنا اور پھر نوکروں کا اور وہ بھی نہایت تشویش کی حالت میں کہنا بالکل مقتضائے حال کے خلاف ہے

(مؤلف) مولانا حالی نے جو کچھ اعتراضات کئے ہیں سوائے اودھ پنچ سابق کے اور تمام دنیائے شاعری نے تسلیم کرلئے ہیں۔ یہاں مولانا نے علی الخصوص مثنوی سے بحث کی ہے میرے نزدیک یہاں کی تمام تر شاعری میں یہی حالت ہے۔ غزل۔ رباعی۔ قصیدہ۔ مثنوی۔ واسوخت۔ سب کو ایک ہی درجہ دیا جا سکتا ہے۔ رکیک مضامین مبالغہ اور غلو ہی نے یہاں کی قدیم شاعری کو لوگوں کی نظروں میں حقیر کردیا۔ موجودہ دور کے شاعر شاید کچھ گزشتہ کلام کی تلافی کر دیں۔ مگر دیکھئے کب وہ وقت آئے اور کب یہ بدنامی کا داغ لکھنؤ کی شاعری کے ماتھے سے چھوٹے

خواتین کے مطالعہ کی کتابیں

...رکالال ؏ہ
...ت آرا بیگم حصہ ۱ و ۲ ؏ہ
... حصہ سوم سے ر
...یدہ کے خطوط عہ ر
...ری سہیلی ۱۰ر
...یلی پیاری سہیلی ؏ہ
...رتوں کی مشا عہ ر
...نا ر نسواں عہ ر
...رۃ الکبریٰ ؏ہ
...زندگی عکر
...ذرات تیموریہ عکر
...داج النبی ۱۲ر
...داج الانبیا ؏ہ
...رۃ عائشہ صدیقہ عا؎
...ت المسلمات ؏ہ
...یس الجنان ؏ہ
...ں کی پرورش ؏ہ
...ر طفلاں عہ ر
...ذیب نسواں عکر
...دی کی تعلیم ؏ہ
...ی کی تربیت عہ ر
...بیت الاطفال ۱۲ر

فرائض مادری ۱۲ر
افسانۂ روزجہاں ؏ہ
اقبال دولہن ؏ہ
حسن معاشرت ؏ہ
ایامیٰ ؏ہ
سولہ کہانیاں ۱۲ر
سترہ کہانیاں ۱۲ر
سولہ قصے ۸ر
مرآۃ العروس ۸ر
بنات النعش ۸ر
توبۃ النصوح ۱۲ر
کنیز فاطمہ ۸ر
پنکھڑیاں ۸ر
نصیحت کا کرنپھول ۸ر
برکات سلطانی ۸ر
ابن الوقت ؏ہ
چند پند ۴ر
منتخب الحکایات ۳ر
تندرستی عہ
حفظ صحت عہ ر
طبیب نسواں ؏ہ
رہبر صحت ۸ر

ناول، ڈرامے اور افسانے

قطرات اشک ؏ہ
جتندر راناتھ عہ ر
بس کا روکھ عہ ر
فسانۂ سعید ۸ر
خوفناک محبت ؏ہ
سیلاب اشک تصویریہ ؏ہ
بے زبان دوست ؏ہ
جال ہم نشین عہ ر
تقدیر عصمت عہ ر
جوہر قدامت ؏ہ
تائید غیبی ۸ر
پر اسرار قتل عا؎
اعلان آزادی ۵ر
سرگذشت ہاجرہ ۱۰ر
قصہ زندگی ۱۲ر
قلب حزیں ۸ر
عروس کربلا ؏ہ
شہید مغرب عہ
ماہ عجم ؏ہ
تیغ کمال ؏ہ
سراب مغرب ۸ر
[illegible] مکمل عا؎

موہنی ۱۲ر
وداع ظفر ؏ہ
یاسمین شام ؏ہ
طوفان اشک عہ
شاہین و دراج ۸ر
درس عشق ؏ہ
گرو ریتی چور ؏ہ
تین بندوق باز ؏ہ
کرشمۂ رقابت ۸ر
انقلاب قسطنطنیہ ۸ر
شاہد رعنا ؏ہ
ڈیڈیا کی سرگذشت ۴ر
شگوفۂ محبت ۷ر
نسوانی زندگی ۸ر
ولایتی کنجی ۸ر
شمع خاموش ۸ر
محب زندگی کامل عا؎
مودودہ ۸ر
چندر کلا ۸ر
گلستان خاتون ؏ہ
صبح زندگی ؏ہ
شام زندگی عہ ر

تاریخ و سوانح عمریاں

تاریخ مغرب ؏ہ
مختصر تاریخ اسلامی ۸ر
" " حصہ ۲ ۹ر
" " حصہ ۳ ۱۰ر
" " حصہ ۴ عہ ر
الصالحات ؏ہ
امت کی مائیں عہ ر
الزہرا ۱۲ر
اسوۂ حسنہ ۸ر
ہند و شعراء ؏ہ
شعر و بہار ؏ہ
سوانح اکبر الہ آبادی عہ ر
سفرنامہ عراق عہ ر
تاریخ افاغنہ ؏ہ
اسلام اور غیر مسلم ۸ر
سیر المصنفین حصہ ۱ عا؎
" حصہ ۲ ؏ہ
تاریخ [illegible] ۵ جلد ؏ہ
اخبار الاندلس ۳ جلد [illegible]
خلافت موحدین [illegible]
خلافت مولدین ؏ہ
عرب اور اس کا مستقبل ؏ہ

لغات و ادب

بازاری زبان ۸ر
لغات سعیدی [illegible]
لغات کشوری سے ر
گنجینۂ تحقیق مجلد عہ ر
غیاث اللغات فارسی عا؎
محاورات نسواں ۸ر
جواہر اللغات ۱۲ر
گوہر اللغات ۱۲ر
چراغ سخن عہ ر
دکھنی لغت ۸ر
جواہرات کلیات نظیر ؏ہ
عزیز اللغات ؏ہ
تذکرۂ ریختی عہ ر
تاریخ ادب اردو قدیم ؏ہ
دکن میں اردو عا؎
منتخب کلام ہندی ؏ہ
رباعیات عمر خیام عا؎
منتخب کلام ہندی ؏ہ
اردو کے اسالیب بیان ؏ہ
تصحیح الاغلاط ۴ر
فیض اردو ۵ر
نور اللغات ۴ جلد [illegible]

دواوین فارسی

دیوان شمس تبریز ؏ہ
کلیات عراقی ۱۲ر
دیوان حافظ ؏ہ
دیوان بیدل ؏ہ
دیوان عرفی ۱۲ر
کلیات جامی عا؎

کلیات غالب ؏ہ
کلیات صائب ؏ہ
دیوان ناصر علی ۶ر
کلیات سعدی ؏ہ
کلیات حزیں ؏ہ
دیوان عنصری ۱۲ر

دیوان غنی کشمیری ۸ر
دیوان ہلالی ۶ر
اسرار خودی و رموز بیخودی [illegible]
زبور عجم ؏ہ
پیام مشرق ؏ہ
قصائد عرفی مجلد ؏ہ

دواوین اردو

کلیات ظفر عا؎
کلیات مومن ؏ہ
دیوان ناسخ ؏ہ
کلیات میر ؏ہ
کلیات سودا ؏ہ
کلیات انشا ؏ہ

کلیات نظیر اکبرآبادی عہ
گلزار داغ ؏ہ
دیوان رند ۱۳ر
دیوان ذوق ۱۲ر
گلکدۂ عزیز مع [illegible] ؏ہ
مرآۃ الغیب عہ

صنم خانۂ عشق عا؎
فریاد داغ ؏ہ
عالم خیال با تصویر عہ ر
دیوان شہیدی ۴ر
کلیات اکبر الہ آبادی ؏ہ
[illegible] ؏ہ

ذیل کی کتابیں نگار بک ایجنسی سے طلب فرمائیے

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۱۰۴

تذکرہ و تاریخ

- پیغمبر اعظم
- شب معراج
- سراج منیر
- پیغمبر اعظم
- سوانح حضرت رسول
- سید المرسلین
- حیدر کرار
- سیرۃ الصدیق
- عمر بن خطاب
- ابو بکر صدیق
- اشاعت اسلام ۱۲
- الحبیب
- عمر بن عبد العزیز
- دولت فاطمیہ
- مکمل سوانح دنیا کی مشہور بیگمات
- تذکرہ اولیا
- تذکرہ اولیائے ہند
- مراۃ الکونین
- قصص الانبیا مکمل
- سفرنامہ چین
- تلخیص التواریخ
- خاتون جنت
- مخارات الصوفیہ
- خواتین اکبرہ
- مشاہیر نسواں
- مشاہیر ہند
- مخدرات تیموریہ
- بیگمات بنگال

جاسوسی ناول

- شرلاک ہومز
- محاصرہ پیرس
- شیخ چلی
- بہرام کی واپسی
- انقلاب فرانس
- بھیری قزاق
- قدرتی جاسوس
- ترکی حرم سرا
- شہنشاہ بلس
- بہرام
- یوسف
- ابی کارنامہ
- عبد الرحمن ناصر
- عروس مصر
- سیلاب خون
- سیاحت زمین
- سیاحت ہوا
- نازنین مراکش
- سمندر کی سیر
- اسرار بالغوریزم
- روح لیلیٰ
- لندن بک
- حجاج بن یوسف
- یوسف پاشا
- انقلاب عثمانی
- بہرام کی رہائی
- بہرام کی آزادی ۱۲
- بہرام کی سرگذشت

مراثی

- مراثی دبیر
- مراثی انیس کامل
- مراثی ضمیر
- مراثی مونس
- مراثی دلگیر

عجائب و غرائب

- عجائب مخلوقات } تصویر رنگین
- با تصویر سادہ
- مجمع الفنون
- طلسم فرنگ
- کارخانۂ عالم

رینالڈز کے ناولوں کے ترجمے

- الہ دین و لیلیٰ
- فریب حسن
- سوزن عشق
- روز ایمبرٹ
- ناول اسرار
- شام جوانی
- حرم سرا

ناول سجاد حسین

- احمق الذی
- حاجی بغلول
- پیاری دنیا
- کایا پلٹ
- میٹھی چھری
- طرحدار لونڈی
- طلسمی فانوس

ناول جوالا پرشاد

- مرنالنی
- ناگ ستیری
- بنگالی دولہن
- مشوقۂ فرنگ
- پرتاب
- روہنی

ناول سرشار

- سیر کہسار
- خدائی فوجدار
- جام سرشار
- الف لیلہ مع ناول
- کامنی
- سوانح عمر عیار

ظفر عمر بی اے

- چوروں کا کلب
- نیلی چھتری
- بہرام کی گرفتاری

ادبی کتابیں

- مکمل شرح دیوان غالب
- بزم غالب
- مشاطۂ سخن
- مکاتیب حسن الملک

تذکرۃ الشعراء

- تذکرۂ حسینی
- گلشن بہار ۱۰ر
- سراپائے سخن
- سوانح نظیر اکبرآبادی

ناول شرر

- جنید بغدادی
- مخدرات
- جویائے حق
- لعبت چین
- فاتح و مفتوح
- بابک خرمی
- ایام عرب
- قیس و لبنیٰ
- یوسف و نجمہ
- زوال بغداد
- ان کا آواز
- دربار حرام پور
- مینا بازار
- قدرس نازنین
- روضۃ الکبریٰ
- فلپانا
- شوقین ملکہ

مولانا شبلی نعمانی

- سیرۃ النبی جلد اول
- 〃 〃 دوم
- 〃 〃 سوم
- الفاروق
- الغزالی
- المامون
- رسائل شبلی
- موازنۂ انیس و دبیر
- کلام شبلی اردو
- الکلام
- علم الکلام
- شعر العجم جلد اول
- 〃 دوم
- 〃 سوم
- 〃 چہارم
- 〃 پنجم

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

مطبوعہ مختار پرنٹنگ ورکس نظیر آباد لکھنؤ باہتمام سید توسل حسین

قیمت ۸ر

(بقیہ اشتہار دوسرے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

ہو ہی نہیں سکتا

اس لئے اپنے حلقہ میں کیلاس کے ایجنٹ بن جائیے

اور تھوڑی سی محنت، تندہی اور کوشش سے کام لے کر گھر بیٹھے روپیہ کمائیے۔ ایجنٹوں کی بھرتی کا کام نہایت تیزی سے جاری ہے اس لئے پہلی فرصت میں تین درجن شیشیوں کی قیمت ذریعہ منی آرڈر بھیجکر ایجنٹ بن جائیے ورنہ ممکن ہے آپ کے شہر سے کوئی اور ایجنٹ مقرر ہو جائے اور پھر آپ کو افسوس کرنا پڑے، اگر آپ کے شہر میں کوئی ایجنٹ پہلے مقرر ہو چکا ہے تو آپ کا منی آرڈر واپس کر دیا جائے گا۔ خط و کتابت صرف انگریزی میں کیجئے

کیلاس کے استعمال کرنے والے کیا کہتے ہیں

بابو سردر خاں تحصیلدار کالندری ریاست سروہی لکھتے ہیں :- آپ کی کیلاس دماغ اور بالوں کو تقویت کے لئے بے نظیر ہے، تعریف ہو نہیں سکتی

پرائیویٹ سکرٹری ٹھاکر صاحب رتنج ریاست لکھتے ہیں :- ٹھاکر صاحب کی ہدایت کے مطابق آپ کو اطلاع دیجاتی ہے کہ کیلاس تیل غیر معمولی طور پر بالوں کے لئے مفید ثابت ہوا۔ مہربانی فرما کر تین درجن شیشیاں اور بھیجدیجئے

ڈاکٹر پرامودرام۔ ڈکسٹ، بی۔اے۔ صاحب باغ، احمد آباد لکھتے ہیں :- میں تصدیق کرتا ہوں کہ کیلاس تیل دماغ اور بال کے لئے بہت تقویت بخش ہے اور اس میں کوئی مضر جزو شامل نہیں ہے

بیور کراس کمپنی ۱۰ چرچ اسٹریٹ پینانگ لکھتی ہے :- کہ کیلاس تیل ہمارے بہت سے گاہکوں نے بہت پسند کیا

بنکرز :-
بنک آف انڈیا لمیٹڈ بمبئی
سنٹرل بنک آف انڈیا لمیٹڈ بمبئی

Dharamsay & Co.
317 Hornby Road
Bombay.

ٹیلی فون نمبر کارخانہ ۲۰۰۸۹   تار کا پتہ :- "Charm" Bombay.
" " دفتر ۲۳۱۰۵

ساڑھے سات ہزار روپیہ انعام حاصل کیجئے

پہلا انعام	۵۰۰۰ روپیہ
دوسرا انعام	۱۵۰۰ ،، ،،
تیسرا انعام	۵۰۰ ،،
دس انعامات پچاس پچاس روپے	۵۰۰
میزان	۷۵۰۰ ،،

آٹھ الفاظ نوروزی مقولہ کا مقابلہ

مقابلہ کے متعلق شرائط

N	۱
A	۲
V	۳
A	۴
R	۵
O	۶
Z	۷
I	۸

آٹھ الفاظ کا کوئی فقرہ یا محاورہ لکھئے۔ جسکا ہر لفظ مندرجہ ذیل آٹھ حروف میں سے ایک حرف کیساتھ شروع ہوا ہو NAVAROZI اور اس فقرہ یا محاورہ میں نوروزی تعویذ کی مناسب تشریح ہو۔ سب سے بہترین منتخبہ مقولہ یا محاورہ بھیجنے والے کو پانچ ہزار روپے انعام دیا جائیگا۔ دوسرے درجہ پر رہنے والے کو پندرہ سو روپے ملینگے تیسرے درجہ والے کو پانسو روپے۔ اسکے علاوہ پچاس پچاس روپے کے دس انعامات اور ہیں۔ جیب لعد صاحب بذات خود مقولوں کا انتخاب کریں گے اور انعامات کا فیصلہ کرینوالے اور اس مقابلہ کے سلسلہ میں ہر بات کے متعلق وہ واحد منصف ہوں گے

ایسا موقع عمر بھر میں ایک ہی آتا ہے

آپ کیلئے پانچ ہزار روپیہ نقد حاصل کرنیکا یہ حیرت انگیز موقع ہے۔ آپ چند منٹ صرف کرکے اس بڑی نقدی کے انعام کو حاصل کرسکتے ہیں صرف ایک فقرہ یا مقولہ مندرجہ ذیل طریقہ کے مطابق بھیجدیں۔ اس بات کا امکان ہے کہ آپ ہی کی کوشش کامیاب ہو تب آپکی قسمت چمک اٹھیگی اور پانچ ہزار روپے آپ کا انعام ہوں گے

بہت آسان ہی کوشش کرکے ساڑھے سات ہزار روپے جیت لیں

پہلے ایسا کیجئے کہ نوروزی تعویذوں کے متعلق آپ جتنی واقفیت حاصل کرسکیں کرلیں کہ انکا کیا اثر ہوتا ہے پھر آپ اس قابل ہونگے کہ ایک ہی فقروں میں نوروزی طاقت کی تشریح کرسکیں اور یہ مقولہ مذکورہ بالا طریقہ پر بنایا جائے

(۱) مقابلہ ہر ایک کیلئے کھلا ہے۔ جو اشخاص پہلے ہی نوروزی کے معتقد ہیں۔

نوروزی تعویذوں کے استعمال کرنیوالے کیا کہتے ہیں!

میرا تعویذ پہننے کے بعد مجھے فوراً اطلاع ملی کہ مدراس گورنمنٹ نے حال ہی میں احکام دئے ہیں جنکے مطابق میرا بیچ جگہ کا مقام سب انسپکٹر پولیس کے عہدہ پر بحال کردیا گیا ہوں

دستخط مدراس پریزیڈنسی کی ایک سب انسپکٹر پولیس کی ہے مورخہ ۱ر فروری سنہ ۱۹۳۳ء پورا نام و پتہ میرے دفتر میں آکر دیکھا جاسکتا ہے

تعویذ نمبر ۳ جو آپنے مجھے جون میں بھیجا تھا میرے لئے بہت فائدہ کا باعث ہوا ہے (دستخط) بی۔ راجو پلائی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس ورنگرام

آتما رام بھٹ سنگھ اسپیشل فرسٹ کلاس مجسٹریٹ لکھتا ہے ۱۹۳۵ء آپکا تعویذ نمبر ۳ جو میں نے منگوایا تھا اسنے فائدہ دینا شروع کیا ہے۔ میں آپکا شکریہ ادا کرونگا اگر آپ مجھے اپنا بہترین تعویذ خیال کرینگے ہزاروں مزید تحریریں میرے دفتر میں دیکھی جاسکتی ہیں

(بقیہ اشتہار دوسرے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

فیس داخلہ صرف دو روپے بھیجیں اور جنہوں نے ابھی نوروزی تعویذ حاصل نہیں کیا وہ نوروزی نمبر ا تعویذ کیلئے آرڈر بھیجیں جسکی قیمت تین روپے ہے جو اشخاص نوروزی
قیمت چھ روپے طلب کرینگے تو وہ دو داخلے (ENTRIES) بھیج سکتے ہیں اگر وہ نمبر ۳ تعویذ جسکی قیمت پچیس روپے ہے طلب کرینگے تو وہ نو داخلے بھیجنے کے مستحق ہونگے۔
نمبر ۴۔ اسپیشل جیبی تعویذ منگوانے پر جسکی قیمت پچہتر روپے ہے وہ پچیس داخلے بھیج سکیں گے۔ ایک شخص جتنے بھیجنا چاہے ایک ہی لفافے میں بھیجدے
(۲) مقابلہ میں شریک ہونیوالے ہر فقرہ کو علیحدہ کاغذ پر لکھیں اور نیچے اپنا نام اور پورا پتہ تحریر کریں اور ایسے لفافہ میں بند کرکے اسپر الفاظ نوروزی مقولہ کا مقابلہ (NAVAROZI SLOGAN CONTEST) لکھدیں۔ تمام رقوم بذریعہ منی آرڈر بھیجی جائیں اور روپیہ بھیجنے کے متعلق ڈاکخانہ کی رسید داخلے کیساتھ ارسال کیجائے جہاں سے منی آرڈر نہیں آسکتا
وہاں ڈاکخانہ کی سخت قبول نہیں کیجائینگے۔ برٹش پوسٹل آرڈر شلنگ ۱۔ ۴ پنس فی روپیہ کے اندازہ کے حساب سے بھیجا جائے اور اسپر پیچھے رخ حبیب اللہ صاحب لکھا جائے
(۳) ان داخلوں یا دعوؤں کیلئے جو گم ہوجائیں یا کسی اور جگہ چلے جائیں یا دیر سے پہنچیں کوئی ذمہ داری قبول نہیں کیجاسکتی۔ کوئی خط وکتابت یا ملاقات نہیں ہوسکتی
اس مقابلہ کے متعلق تمام امور میں حبیب اللہ صاحب کا فیصلہ بالکل آخری فیصلہ ہوگا۔ جسکی قانوناً پابندی لازمی ہوگی اور یہ داخلہ کی ضروری شرط ہے۔ مقابلہ میں شریک ہونے
والا کوئی شخص جو مندرجہ بالا قواعد و شرائط کی پابندی نہیں کریگا مقابلہ سے خارج کیا جائیگا۔ حبیب اللہ صاحب کے ملازموں کو مقابلہ میں شریک ہونے کی اجازت نہیں
(۴) اس مقابلہ میں شرکت کیلئے بھیجی ہوئی فیس داخلہ یا تعویذ کے لئے بھیجا ہوا زر کسی حالت میں بھی واپس نہیں ہوسکتا۔ خط وکتابت اور داخلے صرف انگریزی زبان میں ہوں
(۵) تمام داخلہ مندرجہ ذیل پتہ پر بھیجے جائیں (۶) مقابلہ میں شرکت کی آخری تاریخ ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۳ء ہے اور نتائج کا اعلان ۱۵ نومبر ۱۹۳۳ء کو کیا جائیگا
ہندو مدراس۔ بمبئی کرانیکل۔ ہندوستان ٹائمز دہلی۔ لبرٹی کلکتہ۔ رنگون ٹائمز میں شایع کرایا جائے گا۔

نوروزی کیا اثر کرتا ہے

(۱) بیروزگار کو روزگار دلاتا ہے (۲) امتحانات میں کامیابی (۳) مقدموں میں کامیابی (۴) محبت اور شادی کے متعلق آپکی خواہشات کی تکمیل (۵) آپکے دشمنوں پر فتح (۶) بُری عادات دور ہوتی ہیں بُری خواہشات کے مقابلہ کی طاقت پیدا ہوتی ہے (۷) کاروبار میں وسیع ترقی۔ دوکانکی نقدی کے صندوق پر رکھنے سے فائدہ ہوتا ہے۔ اور اگر ملازمت میں ہیں تو جلدی ترقی ہوتی (۸) رہنمائی اقتدار۔ دوسروں پر مقدم ہونا شخصیت اور کیرکٹر میں بہتری۔ افسروں بزرگوں یا دیوتاؤں کی طرف سے حصول التفات (۹) عاملیات آزمائے کو دولتمند ہونا (۱۰) پرانی بیماریوں میں یقینی فائدہ اور بحیثیت مجموعی صحت کی مسرت (۱۱) خاندانکی محبت وطن غرض روزی سیل ہیں کامیابی کی خوشیاں۔ خطرات حادثوں اور جادو وغیرہ کے خلاف محافظ

یقینی کامیابی کا نوروزی طریقہ اختیار کریں!

نوروزی تعویذ

وہ طاقت جو مدت دراز سے اس پراسرار زمین پر موجود تھی۔ میرے جد کو ۱۸۹۰ء میں نوروزی کی شکل میں ملی یہ زندگیوں کی کامیابی خوشی اور اقبالمندی کی پراسرار کنجی ہے جسنے ہزاروں کو شیطان کے ہیبتناک چنگل سے چھڑایا ہے اور لاکھوں کو صحت مسرت کامیابی اور خوشحالی دی ہے۔ یہی طاقت تعویذ کی شکل میں آپکی زندگی میں چھوڑ دیجاتی ہے اور آپکی آرزوئیں ترقی اور کامیابی کی سمت حرکت کرنا شروع کرتے ہیں۔ اور آپکو کامیابی اور مسرت کی بلندی پر پہنچا دیگی۔ فی الحقیقت یہ زندگی کی اعلیٰ ترین آرزوؤں کی سب سے بڑی کنجی ہے جو محض نظریہ نہیں بلکہ ٹھوس آزمودہ اور عمر بھر کی قوانین حیات پر مبنی ہے ہزاروں نے اس طاقت کا استعمال کیا ہے اور اسکی تعریف میں رطب اللسان ہیں

حبیب اللہ صاحب (نوروزی مقولہ کا مقابلہ)
پوسٹ بکس ۱۲۳ ڈیپارٹمنٹ ۱۴۳ بمبئی

تعویذ اور اُن کی قیمتیں

نمبر ۱۔ مذکورہ بالا (۱) سے کیلئے فائدہ دیتا ہے۔ چھ مہینے تک اثر رکھتا ہے قیمت چاندی کے لاکٹ سمیت تین روپے
نمبر ۲۔ نمبر ۱ سے زیادہ طاقت رکھتا ہے مذکورہ بالا (۱) سے (۷) تک باتوں میں فائدہ دیتا ہے ایک سال تک اثر رکھتا ہے قیمت مع سلور لاکٹ کے چھ روپے
نمبر ۳۔ حیرت انگیز نتائج پیدا کرنیکی قابلیت رکھتا ہے نمبر ۲ سے دس گنا زیادہ اثر رکھتا ہے زندگی کا محافظ اور عمر کا ساتھی خوبصورت سونے کے کیس میں ملتا ہے قیمت پچیس روپے
نمبر ۴۔ اسپیشل جیبی تعویذ اعتقاد رکھنے والے کی تاریخ پیدائش اور وقت کے مطابق ذاتی بُرے اثرات کے مقابلہ کیلئے تیار کیا گیا ہے بہت کمیاب جڑی بوٹیاں رکھتا ہے اور پانڈ کے سونے کے لاکٹ میں نگینہ لگتا ہے تمام تعویذوں سے سب سے زیادہ فوری نتائج دکھاتا ہے قیمت ۷۵ روپے
بھیجتے وقت اپنی پیدائش کا وقت یا خط لکھنے کا وقت ضرور لکھئے

نوٹ۔ تمام تعویذ مکمل نصائح اور ہدایات کے ساتھ بھیجے جاتے ہیں
[illegible]
[illegible]
پوسٹل آرڈر یا ٹکٹ رجسٹری کر کے بھیجئے ... پوری قیمت بھیجئے

نگار

رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ تک شائع ہوتا ہے
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا
سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (سہ)
بیرونِ ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۴	فہرست مضامین اگست ۱۹۳۳ء	شمارہ ۲

نگار

ایڈیٹر:- نیاز فتحپوری

شمارہ ۲	اگست سنہ ۱۹۳۳ء	جلد ۲۴

ملاحظات

خدا لامذہبیت کے زاویۂ نگاہ سے

جتنے مذاہب اس وقت دنیا میں پائے جاتے ہیں، ان سب کے معتقدات کا بنیادی اصول یہ ہے کہ "خدا سے ڈرنا چاہیے" لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان نے آخر اس تعلیم کو مان کیوں لیا، اس درس میں کونسی بات ایسی تھی جس نے معتقدِ مذہب کے ساتھ اُسے خدا کی طرف سے خائف بنا دیا ——— اس کا جواب زیادہ مشکل نہیں ——— اوّل اوّل انسان نے جب اس دنیا میں قدم رکھا تو چاروں طرف دشمن ہی دشمن اس کا احاطہ کئے ہوئے تھے، اور صحرا کے خونخوار درندوں سے ہر وقت مقابلہ رہتا تھا۔ پھر چونکہ فطرت کی طرف سے اس کو قوتِ جسمانی کے مقابلہ میں قوت دماغی زیادہ عطا ہوئی تھی، اس لئے وہ اپنی تدابیر سے ان دشمنوں سے جنگ کرتا تھا اور اکثر کامیاب بھی ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان سے ڈرتا ضرور تھا لیکن اُن کی پرستش پر مجبور نہ ہوا تھا کیونکہ پرستش نام ہے انتہائی ذلّت کا، پورے اظہار عجز کے ساتھ سپر ڈال دینے کا اور ضعف کے مقابلہ میں اس حد تک کسی کی توہین ہوئی تھی ——— لیکن انسان کا ایک زبردست دشمن اور بھی موجود تھا جسے ہم "حوادث طبیعی"

گئے ہیں۔ یعنی وہ دیکھتا تھا کہ دفعتہً افق سے نہایت ہی گہرا سیاہ بادل اٹھتا ہے اور آن کی آن میں اس کے جھونپڑے کو بہالے جاتا ہے۔ وہ شکار سے واپس آتا ہے اور اچانک اس کا بدن آگ کی طرح جلنے لگتا ہے یہاں تک کہ وہ مر جاتا ہے۔ وہ کھیتیاں کرتا ہے لیکن بارش نہ ہونے سے وہ سب کی سب خشک و تباہ ہو جاتی ہیں۔ جب وہ دیکھتا تھا کہ باوجود تمام اسباب ظاہری فراہم کرنے کے بعض اوقات نتیجہ خاطر خواہ حاصل نہیں ہوتا، تو وہ حیران رہ جاتا تھا، کیونکہ اس "رجم بالغیب" کا اس کے پاس کوئی علاج نہ تھا اور وہ ان تمام باتوں کو ان بڑی بڑی روحوں کا کرشمہ خیال کرتا تھا جو اس کے نزدیک آسمان میں رہتی تھیں، چنانچہ وہ ان کے خوش کرنے کے لئے قربانیاں کرتا تھا، روتا تھا، گڑگڑاتا تھا تاکہ اس کی امیدیں پامال نہ ہوں — یہ تھی اوّلین بنیاد مذہب کی جو سب سے پہلے ارواح پرستی کی صورت میں نمودار ہوئی۔ پھر جب انسان پر کچھ زمانہ اور گزر گیا تو اُس نے اپنے خیال کے مطابق ان ارواح کی صورتیں بھی متعین کیں اور اُن کے بُت بنا بنا کر پوجنا شروع کیا۔ یہ تھا دوسرا دَورِ مذہبیت کا لیکن اس کے بعد جب انسان میں زیادہ معقولیت پیدا ہوئی تو اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور خدا کو ایک "قوتِ مجردہ" قرار دیکر یزداں پرستی شروع کی جو یقیناً مذہب کی نہایت اچھی ارتقائی صورت ہے، لیکن جو تصوّر اسے خدا کی عظمت و جلال اور ہیبت و سطوت کا پہلے قائم کر لیا تھا وہ علیٰ حالہ باقی رہا

الغرض خدا کی طرف جس چیز نے انسان کو مائل کیا وہ صرف حوادث طبیعی تھے۔ لیکن کیا یہ امر حیرتناک نہیں کہ وہی چیز جسنے کسی وقت انسان سے خدا کے وجود کو تسلیم کرا لیا تھا، آج اُسی کی بنیاد پر خدا سے انکار کیا جا رہا ہے اور جس تاثرِ بیچارگی نے اس کو ایک قوت برتر و اعلیٰ کے تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ آج وہی اعترافِ عجز و بیکسی اس قوت کے انکار پر مائل کر رہا ہے، پھر اگر انسان کا یہ میلان واقعی سرکشی ہے تو بہت بڑی سرکشی ہے۔ اور اگر کسی حقیقت کا انکشاف ہے تو بہت بڑی حقیقت کا انکشاف ہے

خدا کا وجود ثابت کرنے کے لئے تو بڑے بڑے دلائل پیش کئے جاتے ہیں، لیکن اس سے انکار کرنے والے اس کو نہ ماننے وہ بھی کیوں — آئیے آج کی صحبت میں اس پر مختصر سی گفتگو کر لیں،

منکرین خدا کے خیالات کہا جاتا ہے کہ خدا نے تمام چیزیں پیدا کیں اور وہی ان سب کا رکھوالا ہے (مدبر السماوات والارض) اس لئے مخلوق کو اس کا شکر گزار و مطیع ہونا چاہئے اور اسی اظہار شکریہ و اطاعت کا دوسرا نام مذہب ہے، جو تمام اقوام عالم میں رائج ہے

۲ — ہزاروں لاکھوں سال تک یہ عقیدہ قائم رہا کہ خدا قربانیاں چاہتا ہے، اور ان قربانیوں کے عوض میں وہ مینہ برساتا ہے، کھیتیاں اُگاتا ہے اور اگر قربانیاں نہ کی جائیں تو پھر وہ قحط، وبا، طوفان و زلزلہ بھیجکر اپنے غصہ کا اظہار کرتا ہے

۳ — اس وقت تک تمام مذہبی اقوام کا عقیدہ راسخ یہی ہے کہ خدا التجاؤں کو، دعاؤں کو سنتا ہے اور پورا کرتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی کہ وہ ایمان لانے والوں کے گناہ معاف کر دیتا ہے اور ان کی روحوں کو عذاب سے محفوظ رکھتا ہے

یہ ہے گویا اصل روح مذاہب عالم کی تعلیمات کی
اب ان تعلیمات کو سامنے رکھ کر ایک منکر خدا، ایک منکر مذہب سوال کرتا ہے کہ

۱ــــ کیا مذہب کی بنیاد و حقائق مسلمہ پر مبنی ہے؟ کیا واقعی خدا کوئی چیز ہے؟ اور اس نے ہمیں تمھیں پیدا کیا ہے، کیا حقیقتاً وہ دعاؤں کو قبول کرلیتا ہے اور قربانیوں سے خوش ہوتا ہے

۲ــــ پھر اگر واقعی خدا ہی نوع انسان کا پیدا کرنے والا ہے تو اُسنے کوڑھی، اپاہج، دیوانے، فاترالعقل لوگ کیوں پیدا کئے۔ مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے افراد کیوں وجود میں لایا۔ اور کیا کوئی ایسی قوت جو بہر نوع مکمل، ارفع و اعلیٰ ہو اس سے ایسی ناقص مثالیں تخلیق کی ظاہر ہو سکتی ہیں

۳ــــ اگر خدا تمام نظامِ عالم اور دنیا کے جملہ کاروبار کا سنبھالنے والا ہے۔ یعنی اگر یہ صحیح ہے کہ ایک ذرہ بھی بغیر اس کی مرضی کے حرکت میں نہیں آسکتا تو کیا وہ نیرو اور چنگیز کی تخلیق کا ذمہ دار نہیں اور کیا وہ تمام انسانی لڑائیاں جن میں لاکھوں بے گناہ انسانوں کا خون پانی کی طرح بہ جاتا ہے۔ بغیر اس کی مرضی کے ہو جاتی ہیں؟ کیا وہ اس کا ذمہ دار نہیں کہ اس کی مخلوق کا بڑا حصہ صدیوں تک غلامی کے بوجھ سے دبا ہوا کراہتا رہا اور کوڑوں کی مار اس کی پیٹھ سے خون کے فوارے بلند کرتی رہی۔ اور کیا خدا کا مدبرالامر ہونا اس امر کی اجازت دے سکتا تھا کہ ماؤں کی گود سے ان کے شیرخوار بچے چھین کر فروخت کر دئے جائیں اور وہ تڑپنے کے لئے بے یار و مددگار چھوڑ دی جائیں

کیا اہل مذاہب نے جو نوع انسانی کے ساتھ مظالم روا رکھے ہیں وہ خدا کی مرضی کے خلاف تھے، اور کیا خدا اس کو گوارا کرسکتا تھا کہ اس کا نام لے لے کر لوگوں کے ناخنوں میں کیلیں ٹھونک دی جائیں، ان کو زندہ جلادیا جائے، اور خاردار پہیوں میں دباکر اُن کے جسم کا ریشہ ریشہ علیحدہ کر دیا جائے

کیا خدا اس کو پسند کرتا ہے کہ ایک ظالم و کمینہ انسان دوسرے شریف و نیک انسان کو پامال کرے۔ اور کیا وہ محبان وطن کے ساتھ دار و رسن کے معاملہ کے علاوہ کوئی اور معاملہ پسند نہیں کرتا

اگر واقعی خدا نظام عالم کا ذمہ دار ہے تو

۱ــــ طوفان و زلزلہ اور قحط و وبا کے مصائب لانے سے کیا فائدہ اُس نے سوچا ہے

۲ــــ خونخوار درندوں اور زہریلے کیڑوں کی تخلیق سے کیا نتیجہ پیدا کرنا چاہا ہے

۳ــــ ناخن و چنگال کو دنیا میں کیوں پیدا کیا۔ کیا شیر کو اسی لئے قوی پنجہ بنایا کہ وہ غریب ہرنوں کو ہلاک کرتا پھرے کیا عقاب کی چونچ اسی لئے نکیلی بنائی کہ وہ چھوٹی چھوٹی چڑیوں کو چیر پھاڑ کر رکھدے

۴ــــ کیا مہلک بیماریوں کے لاتعداد جراثیم اسی لئے پیدا کئے گئے۔ کہ وہ انسانوں کو ہلاک کرتے رہیں اور کیا خدا کے لئے

مناسب تھا کہ سل و دق کے جراثیم کی غذا انسانی پھیپھڑے کو قرار دے

ان واقعات پر غور کرنے کے بعد لازماً ہم جس نتیجہ پر پہونچتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ مذہب نام ہے صرف بے بنیاد خوف کا جسے خود انسان کے واہمہ نے پیدا کیا ہے - یہی خوف ہے جو اس سے معابد و قربانگاہ کی تعمیر کراتا ہے، اور یہی ڈر ہے جو اسے دوزانو کرکے اس کے جسم پر کپکپی طاری کر دیتا ہے (جسکا دوسرا نام طاعت و عبادت ہے) پھر ظاہر ہے کہ جو تعلیم صرف جذبۂ خوف و ہراس کی پیدا کرنے والی ہوگی وہ کبھی بنی نوع انسان کی ترقی کی ذمہ دار نہیں ہو سکتی، اور اس لئے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مذہب نام ہے اُس غلامانہ ذہنیت کا جو صرف خوف و بزدلی، یاس و بیچارگی اور غربت و مسکنت پیدا کرتی ہے - اور جو جرأت و ہمت کے اُن جذبات سے جن پر تمام ترقیوں کا انحصار ہے انسان کو محروم کر دیتی ہے - مانا کہ خدا سب سے بڑا آقا ہے اور انسان اس کا سب سے حقیر غلام، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا غلامی کبھی کسی نوعیت سے خوشگوار چیز ہو سکتی ہے ؟ آقا خواہ چھوٹا ہو یا بڑا ! ــــــ اچھا اب اور آگے چلئے :-

اگر خدا کا وجود مان بھی لیا جائے تو یہ بات کیونکر ثابت ہو سکتی ہے کہ وہ رحیم و کریم بھی ہے، محبت و شفقت والا بھی ہے - لاکھوں بندگان خدا ایسے ہیں - جو دوپہر کی گرمی میں ہل چلا رہے ہیں - سر کا پسینہ ایڑی تک جا رہا ہے، جسم تھکن سے چور چور ہے، اور وہ ان تمام تکالیف کو صرف اس لئے برداشت کر رہے ہیں کہ جب ان کی کھیتیاں لہلہا اٹھیں گی تو ان تمام مصائب کا نعم البدل مل جائے گا - لیکن ٹھیک اس وقت جبکہ تکمیل آرزو کا زمانہ آتا ہے، آسمان کو دیکھتے دیکھتے اُن کی آنکھیں پتھرا جاتی ہیں - اور بارش کا ایک قطرہ اُن کی خشک کھیتیوں پر نہیں گرتا، یا یہ کہ طوفانی بادل اٹھتا ہے اور اُن کی تمام محنتوں کو چشم زدن میں بہا لیجاتا ہے ـــ یہ کیا نظام ہے ؟ ــــ کیا خدا اس کو پسند کرتا ہے کہ ہزاروں بے گناہ انسان بھوک کی تکلیف میں مبتلا ہو کر فنا ہو جائیں، لاکھوں معصوم بچے اپنی ماؤں کی خشک چھاتیوں سے لپٹ کر تڑپتے اور بلکتے رہیں - اگر غریب کسانوں پر یہ عذاب اُن کے کسی گناہ کی پاداش میں ڈالا گیا تھا تو اُن چھوٹے چھوٹے بچوں کا کیا قصور تھا جو دودھ کے ایک ایک قطرہ کے لئے ترسا ترسا کر یوں ہلاک کر دیے گئے

اسی کے ساتھ باد سموم کو دیکھو جو ریگزاروں میں گاؤں کے گاؤں تباہ کر جاتی ہے، زلزلہ کی تباہکاریوں پر غور کرو - جو ہزاروں انسانوں کو زندہ نگل جاتی ہیں، کوہ آتش فشاں کا خیال کرو جو بستیوں کی بستیاں جلا کر خاک سیاہ کر دیتا ہے، وبائی بیماریوں کو دیکھو جو لاکھوں کا ستھراؤ کرکے رکھدیتی ہیں ــــــ پھر ہم پوچھتے ہیں کہ اگر خدا یہ تمام مصائب نازل نہ کرتا تو کیا بنی نوع انسان یہ خیال قائم کر لیتی کہ خدا اُن کی پرواہ نہیں کرتا اور کیا خدا کی شفقت و مہربانی صرف قحط و زلزلہ، وبا و گرسنگی ہی سے پہچانی جا سکتی تھی ؟

ہم کو بتایا گیا ہے کہ تمام انسان یکساں عقل و دماغ کے پیدا نہیں کئے گئے، ایک کو دوسرے پر فضیلت ہے۔ لیکن کیا اس تفریق و امتیاز کا کوئی سبب بتایا جا سکتا ہے ؟ —— اگر اچھی عقل رکھنے والی قوموں کو خدا کے اس عطیہ پر اس کا شکر گزار ہونا چاہیئے، تو کیا ادنیٰ درجہ کی قوموں کو بھی خدا کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ اس لئے کہ ان کو انسان اعلیٰ نہیں بنایا یا صرف اس لئے کہ وہ جانور نہیں بنائے گئے

اگر خدا نے قوموں میں یہ امتیاز پیدا کیا تھا تو یقیناً وہ اس سے بھی آگاہ ہوگا کہ اعلیٰ قومیں ادنیٰ قوموں کے ساتھ کیا سلوک کریں گی؟ ان کے لاکھوں افراد کو غلام بنا کر کوڑوں کی مار سے تڑپایا کریں گی، میدان کے میدان اُن کی لاشوں سے پاٹ دیں گی اور ہزاروں معصوم بچّوں کو اُن کی ماؤں کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا کریں گی۔ پھر اگر یہ سب کچھ جانتے ہوئے خدا نے یہ امتیاز پیدا کیا تو ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ایسے خدا کو کون محبت و شفقت کرنے والا خدا کہے گا

وہ تنگ و تاریک قید خانے جہاں شریف الاخلاق انسان تڑپ تڑپ کر جان دیدیتے ہیں، وہ سولیاں جن پر ہمیشہ خدا کے نیک بندوں ہی کا خون بہایا جاتا ہے، وہ بے یار و مددگار غلام جنکے ہاتھ پاؤں زنجیروں سے جکڑے ہوئے ہیں، وہ بہت سے خدا کا نام بلند کرنے والے جن کا جسم شکنجوں میں دبا کر پیس ڈالا جاتا ہے، وہ بہت سی دُکھیاری مائیں جن کی گودیں تیغ و تفنگ کی قوت سے خالی کر دی جاتی ہیں، وہ بہت سے معصوم شیر خوار بچے جن کے نرم و نازک جسموں کو تلوار دو نیم کر دیتی ہے، وہ بے شمار فاقہ زدہ انسان جن کے جسم میں سوائے پوست و استخواں کے کچھ نظر نہیں آتا، وہ مہلک امراض میں تڑپنے اور کراہنے والی لاتعداد انسانی مخلوق، وہ طوفان و سیلاب سے سیکڑوں تباہ ہو جانے والے گاؤں، وہ امساک باراں یا تراتر بارش سے خشک و افسردہ ہو جانے والی کھیتیاں، وہ جابرۂ عالم جو ذبح کئے ہوئے ہزاروں انسانوں کے جسموں کا مینار بنا بنا کر خوش ہوتے ہیں، وہ ظالم و سفاک سلاطین جن کا اپنی عیش کوشی پر قوم کی قوم کو قربان کر دینا ادنیٰ مشغلہ ہے، وہ بے شمار موذی جانور جن کے دانتوں سے دوسرے غریب جانوروں کا خون ہر وقت ٹپکتا رہتا ہے، وہ لاتعداد زہریلے سانپ جو ہلاکت پھیلانے کے لئے اپنے تالوؤں میں زہر کی تھیلیاں لئے ہوئے اِدھر اُدھر رینگتے پھرتے ہیں، وہ ہر جگہ ہر وقت قوی کا ضعیف کو پامال کرتے رہنا، وہ مکر کا صداقت پر، جھوٹ کا سچائی پر، بدی کا نیکی پر غالب آجانا —— یہ سب کیا ہے؟ کیا یہ سب کچھ اسی خدا کی مرضی سے ہوتا ہے جسے رحیم و کریم کہتے ہیں، جو بڑا شفقت کرنے والا بتایا جاتا ہے ؟

بعض لوگ ایسے ہیں جو مذہب کے بتائے ہوئے وجود خداوندی کو نہیں مانتے، لیکن وہ ایک ایسی قوت برتر و اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہیں جو انسان کی رہنمائی کرتی رہتی ہے۔ یہ قوت کیا ہے؟ آئیے اس پر بھی ایک اجمالی نگاہ ڈال لیں

انسان کی گزشتہ تاریخ اٹھا کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ وہ برابر ترقی کر رہا ہے اور اس کی ترقی نتیجہ ہے محض اس کے تجربات کا ـــــ ایک شخص سفر کر رہا ہے اور دوران سفر میں وہ ایسی جگہ پہونچتا ہے جہاں دو راستے علیحدہ علیحدہ پھوٹتے ہیں۔ وہ قیاس سے کام لیکر ایک راستہ کو اختیار کرتا ہے، لیکن جب وہ اس غلطی سے آگاہ ہو جاتا ہے تو پھر واپس آتا ہے اور دوسرا راستہ اختیار کرتا ہے جو اسے منزل مقصود تک پہونچا دیتا ہے

ایک بچہ شعلہ کی رنگینی کو دیکھ کر اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے لیکن جب اس کا ہاتھ جلنے لگتا ہے تو ہٹا لیتا ہے اور پھر کبھی اس کی جرأت نہیں کرتا ـــــ اسی قسم کی ہزاروں مثالیں ایسی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انسانی تجربہ ہی وہ قوت ہے جو اس کی رہنمائی کرتی رہتی ہے اور یہ قوت نہ ضمیر انسانی سے متعلق ہے نہ خداوندی رہبری سے، نہ وہ کسی ارادہ کی ملک ہے نہ کسی مقصود کی متمنی، بلکہ وہ محض نتیجہ ہے انسانی تجربات کا جسے واقعات و حوادث سے کسی طرح علیحدہ نہیں کر سکتے

اس لئے خدا کے وجود کو ایک ایسی قوت تسلیم کرنا جس نے ہمارے اندر اخلاق کی حِس ودیعت کر دی ہے، ضمیر کی شمع روشن کر دی ہے، درست نہیں کیونکہ یہ سب کچھ ہم کو اپنے تلخ تجربوں کے بعد حاصل ہوا ہے اور کسی دوسری قوت کا اس میں کوئی دخل نہیں

انسان فطرتاً تمدن پسند واقع ہوا ہے، اور قبیلہ و خانوادہ کی زندگی بسر کرنے پر طبعاً مجبور ہے۔ پھر اگر کسی خاندان، قبیلہ یا قوم کے افراد، اجتماعی مسرت کا باعث ہوا کرتے ہیں تو ان کی تعریف کی جاتی ہے ورنہ برائی۔ اور یہی وہ چیز ہے جو ایک قوم کی زندگی اور اس کے تمدن کا مخصوص معیار مقرر کر دیتی ہے اور اس میں کوئی "مافوق العادت" بات نہیں پائی جاتی۔

فرض کیجئے کہ خدا موجود ہے جو غیر محدود و لامتناہی ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ جو چیز غیر محدود ہوگی وہ کیف و کم سے بے نیاز ہوگی اور جو کیف و کم سے بے نیاز ہے وہ نفع و مضرت سے بلند ہے۔ اس کو نہ کسی چیز کی ضرورت ہو سکتی ہے اور نہ اس پر کوئی تاثر طاری ہو سکتا ہے۔ اس لئے اگر انسان یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ ایک غیر محدود خدا کو حمد و تعریف کی ضرورت ہوتی ہے یا وہ انسانی تعریف سے خوش ہوتا ہے تو اس کو سوائے حماقت کے اور کس چیز سے تعبیر کیا جا سکتا ہے

کیا نظام عالم کسی کی دعا سے بدل سکتا ہے، کیا ہم عبادت سے سمندر کے مد و جزر کو روک سکتے ہیں، کیا قربانیوں سے ہوا کا رُخ بدلا جا سکتا ہے، کیا سربسجود ہو جانے سے کسی کو دولت مل سکتی ہے اور کیا الحاح و زاری سے کوئی بیمار اچھا ہو سکتا ہے؟

مذہب کی بنیاد اس عقیدہ پر قائم ہے کہ نظام عالم کا کوئی مدبر ضرور ہے اور وہ مدبر بالکل انسانی التجاؤں کو سنتا ہے، اپنے بندوں کو انعام و سزا دیتا ہے اور عبادت و تعریف سے خوش ہوتا ہے۔ لیکن کیا یہ عقیدہ کسی واقعہ و حقیقت پر مبنی ہے، کیا کوئی ایسا نظریہ موجود ہے جو ہم کو ایسا باور کرنے پر مجبور کر دے۔ یقیناً نہیں ہے اور یہ سب کچھ نتیجہ ہے محض تخیل، قیاس کا، ظن و تخمین کا یا پھر اُن مصالح کا جنکی رعایت لوگوں کی تخویف یا تشویق کے لئے ضروری سمجھی گئی

اب اس کے مقابلہ میں ایک لامذہب دہریہ کو دیکھئے کہ اس کا نظریہ کسقدر مستحکم ہے، اور اس کے اعتقاد کی تعمیر کن چیزوں پر قائم ہے۔ پہلی چیز مادّہ ہے۔ جو فنا پذیر نہیں، دوسری چیز قوت ہے اور یہ بھی فنا نہیں ہو سکتی، تیسری چیز یہ ہے کہ مادّہ اور قوت دونوں جدا نہیں ہو سکتے یعنی نہ مادّہ بغیر قوت کے پایا جا سکتا ہے نہ قوت بغیر مادّہ کے اور چوتھی یہ ہے کہ جو چیز فنا نہیں ہو سکتی وہ کبھی پیدا بھی نہیں ہوئی —— اور اس طرح گویا یہ ثابت ہو گیا کہ مادّہ و قوت ازلی و ابدی چیزیں ہیں اور ان کا خالق کوئی نہیں۔ پھر جب کائنات کا وجود صرف مادّہ و قوت کا ممنون ہے تو ظاہر ہے کہ خدا کے ماننے کی کوئی وجہ نہیں اور یہ سلسلۂ تخلیق اسی طرح ازل سے ابد تک جاری رہیگا۔ اور انسان کی تخلیق بھی اسی سلسلہ کی ایک چیز ہے جسکا تعلق کسی خاص ارادۂ خداوندی سے نہیں ہے۔ جو کچھ ممکن تھا وہ قوت و مادہ کے امتزاج سے واقع ہوا۔ جو ممکن ہے وہ واقع ہو رہا ہے اور جو ممکن ہوگا وہ ظہور میں آئیگا —— اجرام فلکی کی تخلیق، موسموں کا تغیر و تبدل، نباتات و حیوانات کا وجود قوتِ ذہن و ادراک، اور تمام وہ باتیں۔ جو عالم کیف و کم سے تعلق رکھتی ہیں۔ سب نتیجہ ہیں مادہ کے فعل و انفعال کا اور اسی سے یہ تمام تنوع کائنات میں نظر آتا ہے اور ابد الآباد تک نظر آئے گا

ہزاروں سال سے نوعِ انسانی کے اصلاح کے لئے کوشش ہو رہی ہے اور اسی اصلاح کے لئے لوگوں نے خدا کا خیال پیدا کیا، مذہب کی بنیاد ڈالی، صحفِ الہامی پیش کئے، دوزخ و جنت پر یقین دلایا معابد تعمیر کئے، عبادتیں کرائیں لیکن اس وقت تک کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ کیوں؟ صرف اسلئے کہ جس چیز کا وجود ہے یعنی مادّہ وہ بالکل بے حس ہے، نہ اس کے سامنے کوئی تصور ہے نہ ارادہ، نہ تاثر ہے نہ ادراک۔ بغیر قصد کے وہ پیدا کرتا ہے اور بغیر کسی وجہ کے ہلاک کر ڈالتا ہے

اس لئے اب سوال یہ ہے کہ نوعِ انسانی کی نجات کیونکر ممکن ہے، یعنی اصلاح اخلاق و تمدن جسے مذاہب عالم اب تک پورا نہ کر سکے، کیونکر تکمیل تک پہونچ سکتی ہے؟ اس کے جواب میں صرف سائنس کو پیش کیا جا سکتا ہے، کیونکہ اسی کے ذریعہ سے ہم مادّہ پر فتح پا سکتے ہیں اور اسی کی روشنی میں ہم پر یہ حقیقت واضح ہوگی کہ نیک کام خود آپ اپنی جزا ہے اور برا کام آپ اپنی سزا

یہاں تک جو کچھ بیان کیا گیا وہ خلاصہ ہے اُن لوگوں کے خیالات کا جو خدا اور مذہب کے قائل نہیں ہیں —— آیندہ اشاعت میں ہم اس پر ایک بسیط تبصرہ کر کے دیکھیں گے کہ اس میں کوئی حقیقت پائی جاتی ہے یا نہیں،

نیاز

مغربی زبانوں کے ادب لطیف پر سرسری تبصرہ

(مسلسل)

"ادبیات روس"

روسی ادبیات کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے - کتابی اور سماعی۔ سماعی ادبیات ان سنی سنائی حکایتوں پر مشتمل ہیں جن کو "اساطیر الاولین" کہتے ہیں۔ یہ اساطیر سات دور سے متعلق ہیں (۱) متعلق بہ ارباب قدیم (۲) متعلق ولادمیر شاہزادہ کیف (۳) متعلق بہ نوگراد (Novgrad) (۴) متعلق بہ ماسکو (Moscow) (۵) متعلق بہ کاسک (Cassacks) (۶) متعلق بہ پیٹر اعظم (۷) متعلق بہ دور جدید - یہ حکایتیں منظوم ہیں لیکن مقفٰے نہیں ہیں۔ ان کی قدر سترھویں صدی کے آخر میں شروع ہوئی جبکہ "رومانیت" کا اثر روس تک پہنچ گیا تھا

پہلے دور کے منظومات میں جو ہیرو پائے جاتے ہیں وہ نہایت مہیب اور جلیل القدر ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے قدرت کی بے شمار قوتوں کو مجسم کر کے پیش کر دیا ہے۔ اور کہیں کہیں واقعی پہاڑ کے دیو وغیرہ ہیرو بنا دیے گئے ہیں

دوسرے دور کے اساطیر متعلق ہیں کیف یا خیف (Kiev) کے مشہور شاہزادہ ولادمیر (Vl-admir) سے ان افسانوں میں ایک ہیرو الیاموروملیٹز (Ilya Muromets) ہے جو شجاعت اور بہادری کے زبردست کارنامے دکھاتا ہے - اس کو قد و قامت اور طاقت کے لحاظ سے فوق الانسان ہستی ثابت کیا گیا ہے - نوگراد کے افسانے متعلق ہیں واسلائی بوسلی وچ (Vasilii Buslaevich) اور سادکو (Sadko) سے جو ایک تاجر تھا۔ چوتھے دور کے "اساطیر" میں ماسکو کو دارالسلطنت کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے اور روس ایک غیر مشروط نظام حکومت کے تابع ہے۔ اس میں فتح قازان (Kazan) فتح سائبیریا کے گیت گائے گئے ہیں اور ائوان (Ivan the Terrible) کی داستانیں سنائی گئی ہیں۔

سب سے زیادہ دلچسپ پیٹر اعظم کے عہد کے اساطیر ہیں - زار نے سنہ ۱۶۹۶ء میں فتح آزف (Azof) کے سلسلہ میں جو مہمات سر کئے انھیں سے متعلق قصیدے ان اساطیر کی جان ہیں

ان اساطیر کے علاوہ کچھ عوام کی زندگی سے متعلق روایات بھی ہیں جن سے عوام کی معاشرت اور ان کے توہمات و

خرافات پر کافی روشنی پڑتی ہے

ان روایات و اساطیر سماعی کو چھوڑ کر اب کتابی ادبیات کی طرف آئیے - ان میں قدیم نمونہ وہ ہے جو گریگری (Gregory) نے آسترومیر (Ostromir) حاکم نوگراد کے حکم سے سپرد قلم کیا - اس کے بعد سواتا سلف (Sviatoslav) کے "متفرقات" (Izbornik) ہیں جو ۱۰۷۳ء میں لکھے گئے - ان کا مصنف جان ہے پھر "مباحثہ متعلق بہ عہد نامہ عتیق و جدید" مصنفہ ہلارون (Hilarion) کا درجہ ہے - اس دور کے اور دوسرے نامور مصنف تیوودسیوس (Theodosius) صاحب "ہدایات" اور "زیدیاتہ" (Zhi-diata) ہیں

"اخبار نسطور" (Chronicle of Nestor) سے روسی واقعہ نگاروں کی ابتدا ہوتی ہے - ان تواریخ کا میدان وسیع ہے اور پیٹر اعظم کے باپ کے عہد تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے - ہر شہر کو اپنے واقعہ نگار پر ناز تھا - اور ہر شہر کی ایک جدا تاریخ مرتب موجود تھی - اسی سلسلہ میں سیاحوں کے سفرنامے بھی لائق ذکر ہیں - خاصکر دانیال (Daniel) کے سفرنامے جس نے "بیت المقدس" کی زیارت گیارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں کی - اس کے بعد کا سیاح اتھانیسیس نکیٹین (Athanasius Nikitin) ہے جو تفر (Tver) کا ایک سوداگر تھا اور جس نے ۱۴۶۶ء میں ہندوستان کا سفر کیا

بارھویں صدی میں خطبات سائرل (Cyril) ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں — سائرل تورف (Turov) کا اسقف تھا - اس نے بازنطینی اسلوب کا اتباع کیا اور نہایت رنگین عبارت میں خطبے تیار کئے

اب ہم ان اساطیر کی طرف رجوع کرتے ہیں جو نثر میں ہیں ایگور (Igor) شاہزادہ نوگراد کے کارنامو سے متعلق ہیں - "افسانہ ایگور" میں مذہبی رنگ کافی ہے اور تشبیہات و استعارات میں ایک خاص جوش پایا جاتا ہے اسی قبیل کے "شعر منثور" بھی ہیں - جن کو روسی زبان میں (Zadonstchina) کہتے ہیں - ان میں ان محاربات کا ذکر ہے جو روسی سلاطین کو وقتاً فوقتاً منگول قوموں سے کرنے پڑے - ان میں تاریخی غلطیاں بھی اکثر ہیں

روس کے قدیم تعزیرات و قوانین بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہیں - ۱۰۱۸ء سے ۱۰۵۴ء تک کے قوانین ابھی تک محفوظ ہیں - ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں میں روس اور ممالک یوروپ سے تہذیب و عمرانیت میں ہم سطح تھا - لیکن منگولی حملوں نے روس کو بہت جلد پس پشت ڈال دیا - ان کے بعد آئیون ثالث (Ivan III) کے عہد کے قوانین کی اہمیت ہے جو ۱۴۹۷ء کی چیزیں ہیں - ان کے بعد آئیون چہارم کے قوانین ہیں - اسی سلسلہ میں الکسز ([illegible]) کے قوانین کا ذکر بھی ضروری ہے جن کی رو سے عورتوں کو شوہر کشی کی سزا میں زندہ دفن کردیا

جاتا تھا اور طرح طرح کی عقوبتیں ملزموں کے لئے مقرر تھیں

۱۵۵۳ء میں ماسکو میں چھاپنے کا فن رائج ہوا۔ سب سے پہلے جو کتاب چھپی وہ "اعمال" (Acts) ہے۔ چھاپنے کے بانی آئون فیودورف (Ivan Feodorov) اور پیٹر تیموفیف (Peter Timofieiev) ہیں۔ مقدم الذکر کی یادگار میں ایک مجسمہ بھی قائم کیا گیا،

آئون ظالم (Ivan the Terrible) کے عہد کی ایک عجیب و غریب چیز "کتاب تدبیر منزل" (Book of Household Management) ہے جو سلوسٹر (Sylvester) راہب کی تصنیف ہے۔ سلوسٹر نے یہ کتاب اپنے لڑکے اور بہو کے لئے لکھی تھی لیکن بعد کو یہ عوام میں بھی مشہور ہو گئی اس میں دَور وحشت کے روس کی سچی تصویر پیش کی گئی ہے۔ اس عہد کا ایک مشہور مصنف شاہزادہ انیڈریو کربسکیٔ (Andrew Kurbeskiy) ہے جو ۱۵۲۸ء میں پیدا ہوا۔ اس نے اوائل عمر میں امور سلطنت کے تجربے میں پوری مہارت حاصل کر لی تھی۔ وہ قازان کی لڑائی میں بھی شریک ہوا تھا۔ بعد کو وہ آئون سے لڑ بیٹھا۔ بنائے مخاصمت آئون کے مظالم تھے۔ کربسکیٔ بھاگ کر لتھوانیا (Lithuania) پہونچا جہاں سجمنڈ آگسٹس (Sigismund Augustus) نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ یہاں سے کربسکیٔ نے آئون کو ملامت نامے لکھنا شروع کئے۔ آئون نے بے پروائی کے ساتھ جواب دیے کربسکیٔ پردیس ہی میں مر گیا۔ اسنے عہد آئون کی ایک تاریخ بھی مدون کی ہے جسمیں اسنے جا بجا اپنے رنج و غصہ کا کافی اظہار کیا ہے۔ اسی لئے اس تاریخ کو بعد کے مؤرخوں نے مستند نہیں مانا ہے

سترھویں صدی کی ایک خاص تصنیف سرجیس کباسف (Sergius Kubasov) کی تاریخ ہے جو تخلیق کائنات سے لے کر عہد میکائل رومانف (Michael Rumanav) تک محیط ہے

"محاصرۂ آزف" (Azov) خاندان رومانف کے ابتدائی سلاطین کے زمانہ کی چیز ہے جس کو ایک قسم کا "شعر منثور" کہنا چاہیئے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ کاسک (Cossacks) کے ایک معمولی گروہ نے ترکوں کے حملوں کو کیسی بہادری اور جاں نثاری کے ساتھ روکا۔ لیکن ان سب سے بلند و برتر "حالات روس" ہیں جو کوتاشی خین (Kotoshikhin) کے لکھے ہوئے ہیں۔ کوتاشی خین سفارت خانہ میں ملازم تھا۔ بعد کو وہ پولینڈ بھاگ گیا اور پھر سویڈن پہونچکر الکسس میخائلووچ (Alexis Mikhailovich) کے عہد کے حالات روس قلمبند کئے متوسطین کا دور پولاٹزکی (Polotski) پر ختم ہوتا ہے۔ (۱۶۲۹ء تا ۱۶۸۰ء)۔ پولاٹزکی زار فیڈور (Fedor) کا اتالیق تھا۔ اس نے

پہلے پہل روس میں مغربی تہذیب و تمدن رائج کرنے کی کوشش کی۔ مذہبی مباحثے۔ مذہبی ڈرامے اور چند نظمیں اس کی یادگار ہیں

سترھویں صدی کے آخر میں روس کی عام معاشرت میں انقلابات رونما ہونے لگے۔ اور روس ادبیات میں دیگر مغربی ممالک کی تقلید کرنے لگا۔ پیٹر اعظم روس کو ابھارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور فیوفین پراکوپووچ (Feofane procoporich) نے سائنس کی ترقی میں زار کی حسب منشا مدد کی۔ قدیم روایات کے حامیوں میں اسٹیفن یاورسکی (Stephen Yavorskiy) ایک زبردست ہستی ہے جس نے نئی تحریک کی پوری مخالفت کی۔ اسی عہد کا ایک اور مشہور مصنف پوساشکف (Possoshkov) ہے جو ایک کسان تھا اور جس نے افلاس اور سرمایہ داری پر ایک موثر کتاب لکھی۔ لیکن ان سب پر سبقت لیجانے والا لومانوسف (Lomonosov) ہے جس نے نظم و نثر میں یکساں مضامین لکھے

الیزبتھ کے عہد سے روسی ادبیات میں نمایاں ترقی ہونے لگی۔ سومار وکف (Sumarokov) نے نظم و نثر میں دلچسپ تصنیفیں کیں اور اس لحاظ سے وہ لومانوسف کا پورا مقابل کہا جا سکتا ہے۔ اب تک روس میں عوام کے سامنے اسٹیج پر صرف مذہبی ڈرامے پیش کئے جاتے تھے۔ لیکن ۱۷۵۶ء میں سومار وکف کے زیر نگرانی ایک نیا تھیٹر قائم ہوا اور نئے دور کے ڈرامے پیش کئے جانے لگے۔ اس دور میں خیراسکف (Kheraskov) نے علاوہ مختصر نظموں کے دو طویل رزم نامے (Epics) لکھے۔ "روسائدہ" (Rosaaida) اور "ولادمیر" (Vladmir)

انھیں دنوں میں ایک قومی ڈراموں کا لکھنے والا پیدا ہوا جس کا نام ویزین (Vizin) تھا۔ روسی ہیئت اجتماعی کے بھدے رُخ کے ساتھ تمسخر کرنا اس کے خصوصیات میں داخل ہے۔ یہ شخص کیتھرین ثانی کے عہد میں ہوا ہے اس دور کا شاعر اعظم درژاوین (Derzavin) تھا۔ وہ روسی زبان کا ماہر تھا۔ اور مختلف اسالیب کا بادشاہ اس کی نظموں میں ایک شوکت و جلال ہے۔ "خدا سے خطاب" (Ode to God) اس کی بہترین نظموں میں سے ہے۔ کیتھرین کے دور حکومت میں دو زبردست اہل قلم طرح طرح کی عقوبتوں میں مبتلا رہے۔ رادس شف (Radiotchov -) اور نووی کف (Novikov)۔ یہ دونوں پُرجوش عبارت میں حکومت کی اصلاح کرنا چاہتے تھے

الگزینڈر کی تخت نشینی روسی ادبیات کے حق میں بہتر ثابت ہوئی۔ اس زمانہ کی ایک جلیل القدر شخصیت کرامیزین (Karamzin) ہے جو "تاریخ دولت روس" لکھ کر غیر فانی ہوگیا ہے۔ لیکن

وہ صرف مؤرخ نہ تھا۔ بلکہ شاعر بھی تھا۔ افسانہ نگار بھی تھا اور مقالہ نگار بھی

اسی زمانے میں ایک غزلیات کا لکھنے والا دمتریف (Dmitriev) بھی ہے جو انگریزی شعرا کا تتبع کرتا ہے

لیکن الگزنڈر کے عہد کا ممتاز ترین ژوکافسکی (Zhukovsky) ہے۔ اس کو اپنے عہد میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو کیتھرین کے عہد میں درژاوین کو تھا۔ اس کی طبعزاد نظموں سے زیادہ اس کے ترجمے مشہور ہیں ژوکافسکی سے روس میں "رومانیت" کا آغاز ہوتا ہے۔ اس نے جرمن شعرا مثلاً گوئٹے اور شلر وغیرہ اور انگریزی شعرا مثلاً بائرن - مور - اور سوذی وغیرہ کے ترجمے کئے - مہابھارت سے "نل دمن" اور شاہنامہ سے سہراب و رستم کے افسانے روسی زبان میں منتقل کئے۔ اسی زمانہ میں ہومر کی "الیڈ" (Iliad) کا ترجمہ گینیڈش (Gnedich) نے کیا

ژوکافسکی کے بعد پوشکن (Pushkin) کا درجہ ہے۔ منظومات اور ڈراموں میں کوئی اور اس کا ہمسر نہیں ملتا۔ پوشکن کا جانشین لرمانتف (Lermontov) تھا۔ جس کی غزلیں بڑی پاکیزہ ہوتی ہیں۔ کالٹزف (Koltsov) کے غزلیات میں بھی ایک خاص لطافت پائی جاتی ہے

روس میں ناول نگاری کی ترقی زاگوسکن (Zagoskin) سے شروع ہوتی ہے جس نے انگریزی کے ناول نگار والٹر اسکاٹ کی تقلید کی۔ لیکن سب سے پہلا ناول نگار جس کو واقعی شہرت ہوئی گوگول (Gogol) ہے "مردوں کی روح" (Dead Souls) میں اس نے روسی جماعت کے ہر طبقہ پر حملے کئے ہیں۔ بعد کے ناول نگاروں میں ہرزون (Herzon)۔ گن شارف (Goncharov) - پسیمسکی (Pisemsky) وغیرہ ہیں

لیکن جن ہستیوں نے روسی ناول کو چار چاند لگا دیئے ہیں وہ داستفسکی (Dostoevsky) تورگینف (Turgeniev) طالسطائی (Tolstoy) چیکف (Chekov) اور گورکی (Gorky) ہیں ان لوگوں نے واقعہ نگاری کی دنیا کو ایک آسمانی چیز بنا کر دکھدیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغربی ممالک میں "واقعیت" (Realism) نے کہیں یہ درجہ حاصل نہیں کیا

دور متاخرین کے شعرا میں نکراسف (Nekrasov) - اور اوگاریف (Ogariev) لایق ذکر ہیں

فلسفہ اور اخلاقیات میں روس نے بہت کم لکھنے والے پیدا کئے۔ ریاضیات میں البتہ بعض اہل دماغ ہوئے ہیں جنمیں لوباشیوسکی (Lobachevsky) بہت ممتاز ہے

حسن خون آشام

لوگ کہتے ہیں کہ عالم خواب ایک سراب ہے - اصلیت سے اس کا کچھ تعلق نہیں - کیونکہ ہر چیز کے
لئے وقت، جگہ اور سبب کا ہونا ضروری ہے - اور خواب کی دنیا ان شرائط سے بلند ہے - لیکن کیا
یہ نظریہ صحیح ہے

بعض اوقات سلیم کی ضد میرے لئے بہت پریشان کن ہوتی تھی - خاص طور پر اس وقت جب موسم گرما میں وہ مجھے شکار کے لئے مجبور کرتا تھا - حالانکہ اس قسم کی تفریحات میں میرے لئے کوئی سامان دلچسپی موجود نہیں - میری حالت بقول حضرت حافظ صرف یہ ہے کہ

فراغتے فرصتے وکتابے وگوشۂ چمنے

بس اس کے علاوہ مجھے اور کسی چیز میں لطف حاصل نہیں ہوتا - لیکن چونکہ اس کے ساتھ عہد طفلی سے دوستانہ تعلقات تھے - اس لئے کبھی اس کے ہمراہ چلنے سے انکار نہیں کیا - دوستوں کی خاطر جو مصائب برداشت کئے جاتے ہیں - ان میں بھی ایک قسم کی لذت پنہاں ہوتی ہے

حسب معمول ایک دن علی الصباح وہ میرے پاس آیا - بندوق اس کے کندھے سے لٹک رہی تھی - دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ آج جنگلوں کی خاک چھاننی قسمت میں لکھی ہے - قبل اس کے کہ وہ اپنا مقصد بیان کرے میں نے کہا

" اگر تم پانچ منٹ تاخیر سے آتے تو شاید میں نہ ملتا - مجھے ایک نہایت ضروری کام ہے - اور اب روانگی کی تیاری ہی کر رہا ہوں "

میں جھوٹ نہیں بولا - درحقیقت مجھے ہندوستان کے ایک مایۂ ناز ادیب سے ملاقات کرنی تھی - جو ان دنوں میرے شہر میں مقیم تھا - مگر سلیم کا اصرار میرے انکار پر غالب رہا - مجبوراً سوٹ اوتار کر میں نے شکار کے کپڑے پہنے اور اپنی بندوق لے کر اس کے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو گیا - ہم دونوں کے گھوڑے ایک ہی اصطبل میں بندھتے تھے - میں نے سائیس کو حکم دیا کہ زین وغیرہ کس دے - ہمیں کافی فاصلے پر جانا تھا

سلیم کو کسی نے بتلا دیا تھا کہ آج کل پہاڑی کے دامن میں تیتر بہت کثرت سے آئے ہوئے ہیں - مگر خدا گواہ ہے کہ صبح

سے شام تک سوائے ایک خرگوش مارنے کے چڑیا کا ایک بچہ بھی نظر نہ آیا - گرمی کے مارے ناک میں دم آگیا تھا - بڑی تکلیف
اسامنا کرنا پڑا - حتیٰ کہ اس روز سلیم بھی کھسیانا ہوگیا

شام کے چھ بجے تھے اور ہم ابھی جنگل ہی میں تھے کہ یکایک آندھی چلنی شروع ہوگئی - اور دیکھتے دیکھتے اس نے اسقدر
ور پکڑا کہ ہم مجبوراً ایک ویران شدہ قدیم عمارت میں گھس گئے - اور گھوڑوں کو بھی قریب کے ایک درخت سے باندھ دیا
ندھی ختم ہونے پر بارش شروع ہوگئی - اور اسقدر موسلا دھار کہ ہمارا دل دہلنے لگا - بجلی کی کڑک سے اوسان خطا ہوئے
ہاتے تھے - دس بجے کے قریب یہ طوفان کچھ کم ہوا —— تاہم بجلی کی چمک باقی تھی - اور ایک خاص وقفہ کے ساتھ اندھیرے
یں اجالا کرکے عجیب منظر پیش کردیتی تھی - روشنی ہونے پر ہم نے دیکھا تو سوائے پانی کے اور کچھ نظر نہ آیا - کچی سڑک کے نشانات
بھی کسی قدر گم ہوگئے تھے - ایسی حالت میں گھر پہونچنا آسان کام نہیں تھا - علاوہ تاریکی کے اس بات کا اندیشہ بھی
تھا کہ اگر بارش دوبارہ آگئی تو پناہ لینے کے لئے کوئی جگہ بھی نہیں ملے گی - لہذا یہ فیصلہ کیا کہ قریب کی سرائے میں رات بسر
ی جائے - یہ سرائے اس جگہ سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہیں تھی - وہاں عموماً گھوسی ٹھیرا کرتے تھے - جو علی الصباح قرب وجوار کے
گاؤں میں اپنے مویشی لے جاکر دودھ فروخت کرتے تھے

—— ہم نے گھوڑوں کی باگ پکڑلی - اور پاپیادہ سرائے کی طرف روانہ ہوگئے

سرائے کا دروازہ بند ہوچکا تھا - کیونکہ چوکیدار کو اب کسی اور مسافر کے آنے کی امید نہیں تھی - تاہم کنڈی کھٹکھٹانے
پر دروازہ بہت جلد کھل گیا - چوکیدار نے ہمارے گھوڑے ایک سائبان کے نیچے باندھ دیئے اور سب سے بڑا کمرہ سونے
کے لئے دیدیا - جو اس وقت کی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے بہت غنیمت تھا

زین کے ساتھ بندھے ہوئے تھیلے میں کچھ سامان خورونوش موجود تھا - مگر ہم نے کچھ نہیں کھایا - کیونکہ دن بھر کی تکان
سے ہاتھ پاؤں میں درد ہونے لگا تھا - بہت جلد آرام کرنا چاہتے تھے - بستر موجود نہ تھا - اس لئے مجبوراً کھری چارپائی پر
سونا پڑا - چوکیدار ایک کمبل دے گیا تھا جسے سلیم نے اوڑھ لیا - اور میں نے محض مچھروں سے بچنے کے لئے ایک چادر تان
لی - بارش ہونے کے باعث ہوا میں معمولی خنکی پیدا ہوچلی تھی

معلوم نہیں - کس قدر رات گذری تھی کہ مجھے ایک خواب دکھائی دیا —— نہایت بھیانک اور پریشان
کن خواب —— اب بھی میں اس کو یاد کرتا ہوں تو ایک ہولناک کیفیت مجھ پر طاری ہوجاتی ہے - وہ خواب کیا تھا - ایک
اسرار سربستہ تھا - جس کی حقیقت آج تک معلوم نہ ہوسکی - میں نے اپنی زندگی میں بہت سے خواب دیکھے ہیں مگر اس شان
کا کوئی بھی نہیں تھا اور نہ شاید آیندہ کبھی دیکھونگا - میں نے دیکھا کہ ایک عالیشان کمرہ ہے - جو مغربی سازوسامان سے مزین ہے میں ایک
خوشنما میز کے قریب آرام کرسی پر لیٹا کتاب کے مطالعہ میں مشغول ہوں - اور میرا دوست سلیم ایک آرام دہ صوفہ پر بے خبر سو رہا ہے - کافی رات

گذر جانے کے باوجود مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ کیونکہ کتاب نہایت دلچسپ تھی
یکایک ایک دھماکے کے ساتھ بجلی کا قمقمہ پھٹ گیا۔ اور تمام کمرے میں تاریکی پھیل گئی۔ میں ابھی اس کی حقیقت کو سمجھنے میں کامیاب نہ ہوا تھا۔ کہ مقابل کی کھڑکی میں روشنی نمودار ہوئی۔ ایک عورت ہاتھ میں مشعل لئے کھڑی تھی۔ اور ایک نوجوان حسین لڑکی اس کے پاس تھی۔ کھڑکی میں سے ایک موٹی رسی لٹکائی گئی۔ اور بوڑھی عورت مشعل لئے ہوئے نیچے اُترنے لگی۔ اس کے بعد وہ لڑکی بھی اُتر آئی
دبے پاؤں دونوں ہماری طرف آرہے تھے۔ میں خوفزدہ حالت میں جوں کا توں لیٹا رہا۔ سلیم کے قریب آکر نوجوان عورت نے مشعل کی روشنی میں اس کا چہرہ دیکھا۔ اور ایک دم بول اٹھی
"بے شک یہی ہے۔ یہی ہے۔ میں نے پہچان لیا"
ضعیفہ نے پوچھا۔ " اب تمھارا کیا ارادہ ہے؟"
حسینہ نے حقارت آمیز لہجہ میں جواب دیا۔ " میرا ارادہ وہی ہے جو بروئے انصاف ہونا چاہئے۔ اس شخص نے مجھ سے محبت کرنے کا وعدہ کیا۔ مگر اُسے نباہ نہ سکا۔ اس نے میری محبت کو ٹھکرا دیا۔ اور اب ایک دوسری عورت کو زینتِ آغوش بنانے کے لئے تیار ہے۔ کیوں نہ میں بھی اس کی آرزوؤں کو خاک میں ملا دوں؟ ——— میں اس سے انتقام لوں گی ——— ایک زبردست بے پناہ انتقام ——— جو اس کی ہستی کو نیست و نابود کردے ——— اس نے میرا دل دُکھایا ہے ——— میں بھی اس کا دل دکھاؤں گی۔ اس طرح کہ مرنے کے بعد اس کی روح بھی پریشان رہے۔ ابھی چشم زدن میں اس کا سینہ چیر کر دل نکالے لیتی ہوں ——— اور اس کو اپنے ساتھ لے جاؤں گی ——— اس بیوفا دل کو"
——— میرا تمام جسم کانپ اٹھا۔ مگر اتنی ہمت نہ تھی کہ زبان سے ایک لفظ نکال سکوں
حسینہ نے ایک خنجر نکالا ——— جس کو اپنی قمیض کے نیچے کمر کی پیٹی میں چھپا رکھا تھا۔ خنجر کی تیز چمک نے میری آنکھوں میں ایک لمحہ کے لئے چکاچوند پیدا کردی۔ اور میں ایک بار پھر کانپ اٹھا اس کے بعد اسنے اپنی جیب میں سے اسفنج کا ایک بڑا ٹکڑا نکالا اور اس کے دو حصے کردیے ——— ایک چھوٹا اور ایک بڑا ——— اس نے کمرے میں رکھی ہوئی صراحی کا گلا توڑ کر بھی ایک پیالے کی شکل میں تبدیل کردیا ——— سب کام سے فارغ ہوکر وہ اپنے زبردست انتقام کے لئے تیار ہوگئی ——— اس نے مشعل قریب لانے کے لئے بڑھیا کو اشارہ کیا ——— اس کی آنکھیں غیظ و غضب کے باعث سُرخ ہورہی تھیں ——— اور میرا دوست دُنیا و مافیہا سے بے خبر چین و آرام کی نیند سو رہا تھا ——— میں نے دیکھا کہ اس کے لبوں پر خفیف تبسم رقص کر رہا ہے
میں نے اٹھنے کی کوشش کی تاکہ اس کو اس حادثۂ جانکاہ سے بچا سکوں ——— مگر پاؤں جنبش نہ کرسکے ——— ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی غیر مرئی زنجیر سے جکڑے ہوئے ہیں ——— یکایک کمرے کی دُھندلی روشنی میں خنجر بلند ہوا اور بائیں

جانب دو پسلیوں کے درمیان سینہ کو چیرتا ہوا سلیم کے جسم میں اُتر گیا ——— میری آنکھیں خوف سے بند ہونے لگیں — اور باوجود انتہائی کوشش کے میرے منہ سے کوئی چیخ نہ نکلی — میں چاہتا تھا کہ دوسرے لوگوں کو خطرہ کی اطلاع دے کر موقعۂ واردات پر بلا لوں

خنجر کے باہر نکلتے ہی خون بہنا شروع ہو گیا - مگر اس قاتلہ نے ایک قطرہ بھی پلنگ کی چادر پر گرنے نہ دیا — بلکہ اسفنج کے ایک ٹکڑے میں جذب کر کر کے مٹی کے پیالے میں جمع کر لیا — وہ یقیناً نہایت ہوشیار اور دوراندیش تھی — جب خون کی رفتار کم ہو گئی - تو اس نے زخم کے اندر اپنی انگلیاں ڈال کر سلیم کا دل باہر نکال لیا —— الٰہی توبہ ! وہ خون میں لت پت تھا - اور باہر نکل آنے کے باوجود اس کی حرکت بند نہ ہوئی تھی — ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ محبت کی شیریں جفاؤں سے متاثر ہو کر اب بھی سینہ ہی کے نیچے دھک دھک کر رہا ہے - اس نے دل کو اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا - میں نے دیکھا کہ اس وقت اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے - اور جسم میں بھی خفیف تھرتھری پیدا ہو گئی تھی - اس نے نہایت بیتابی کے ساتھ اپنے کپکپاتے ہوئے لب خون آلود دل پر رکھ کر ایک طویل بوسہ لیا اور ...... میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ دو موٹے موٹے آنسو اس کی خونیں آنکھوں سے ڈھلک ڈھلک کر رخساروں پر آ گئے ہیں - کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ ایسے بے رحم دل میں بھی ہمدردی کا مادّہ موجود ہو ؟ —— کیا یہ درست ہے کہ عورت کے دل میں جس قدر آتش انتقام ہوتی ہے - اتنے ہی زیادہ محبت کے لطیف جذبات بھی ہوتے ہیں ؟ —— کیا درحقیقت صنف نازک فطری طور پر یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اس کے محبوب کی محبت میں کوئی دوسری عورت شریک ہو ؟

ہاں میں یہ بیان کرنا بھول گیا کہ اس دوران میں بڑھیا اسفنج کے اندر خون جذب کر کر کے پیالے میں نچوڑ رہی تھی - اور جب خون کا رِسنا بالکل بند ہو گیا - تو اس نے اسفنج کا دوسرا ٹکڑا پسلیوں کے درمیان رکھ کر زخم کے منہ کو بند کر دیا - اور کوئی ایسی چیز اس پر مل دی کہ نشان بھی غائب ہو گیا

حسینہ نے ایک طویل حسرت بھری نگاہ میرے دوست پر ڈالی اور چلنے کے لئے تیار ہو گئی — بڑھیا نے اس کا بازو پکڑ کر میری طرف اشارہ کیا - مگر اس نے لاپروائی سے یہ کہکر ٹال دیا

"اس کی فکر نہ کرو — یہ مُردے سے زیادہ بدتر اور مٹی کے بُت سے زیادہ غیر حساس ہے - یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا"

اور واقعی اس کا قول دُرست تھا - میرے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے تھے —— اور سوائے قلب کی خفیف حرکت کے کسی چیز میں جنبش نہیں تھی

اس نے ایک بار پھر مُڑ کر دیکھا - اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے - اور چہرہ کا اڑا ہوا رنگ اس کے سوز دل کا پتہ دے رہا تھا - صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت اس کو روحانی انقباض شدید حاصل ہو رہا ہے - وہ اپنے کئے پر پشیمان نہیں تھی - مگر اظہار افسوس ضرور کر رہی تھی - کچھ دیر سکوت کے بعد اس کے لبوں کو جنبش ہوئی اور اس نے کپکپاتے ہوئے لہجہ

میں کہا

" میں نے اس بے وفا کا دل چرالیا مگر ابھی آتش انتقام سرد نہیں ہوئی۔ خدایا! میری تمنا ہے کہ اس کا مردہ جسم بھی دریا کے خونخوار جانوروں کا لقمہ بنے، اگر میرے گرم گرم آنسو اور انفاس سوزاں تیری بارگاہِ عظمت وجلال میں پذیرائی حاصل کرسکتے ہیں تو اے میرے مالک! میری آخری آرزو قبول کرلے "

——اس نے آہستہ سے دروازے کی کنڈی کھولی اور بڑھیا کے ہمراہ مشعل کی مدھم روشنی میں باہر نکل گئی۔ کمرہ تاریک ہوگیا

اب میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ صبح ہوتے ہی یہ راز فاش ہوجائے گا۔ اور تمام دنیا کو سوائے میرے کسی پر شبہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ سلیم کے ساتھ میں نے تمام رات بسر کی تھی۔ اگر میں یہ بیان بھی کروں کہ ایک پُراسرار عورت نے کھڑکی کی راہ آکر اس کو قتل کردیا ہے تو کوئی باور نہیں کرے گا۔ لہٰذا اپنی جان کی حفاظت ضروری ہے۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ جتنی جلد ممکن ہوسکے یہاں سے فرار ہوجانا چاہیئے۔ ورنہ پھانسی کے تختے پر چڑھنا ہوگا

میں اٹھا۔ میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ سلیم پر غور سے نگاہ ڈالی۔ کمرے کی تاریک فضا میں یہ تمیز کرنا مشکل تھا کہ وہ بے خبر سو رہا ہے یا موت کی آغوش میں پہونچ چکا۔ اس کی موت یقینی تھی کیونکہ سینہ چیر کر دل نکالا جاچکا تھا جس کی حرکت وسکون پر حیات ومما‌ت کا انحصار ہوتا ہے——دروازہ کھلا ہوا تھا—— میں دبے پاؤں باہر نکل گیا۔ تمام فضا تاریک اور سنسان تھی۔ میں صدر دروازہ کی طرف بڑھتا چلا گیا، یکایک چوکیدار کی آواز سنائی دی

" کون ہے؟ "

میں ایک دم ٹھٹک کر رہ گیا——اب معلوم ہوا کہ کسی نے قوتِ گویائی سلب کرلی ہے۔ جسم میں بھی رعشہ پیدا ہوگیا تھا۔ مگر دل کڑا کر کے حواس درست کئے اور میں نے جواب دیا

" ایک ضروری کام کے باعث میں بہت سویرے جانا چاہتا ہوں تم اپنا کرایہ لے لو۔ اور گھوڑا اصطبل کے باہر نکال دو "

اس نے اندھیرے ہی میں لیٹے لیٹے مخمور لہجہ میں جواب دیا

" جب تک صبح کا اُجالا نمودار نہ ہو، تم نہیں جاسکتے یہ ہمارا دستور ہے کہ مسافروں کو آدھی رات کے وقت روانہ ہونے کی اجازت نہیں دیتے——بالفرض کوئی حادثہ وقوع پذیر ہوجائے تو اس کے ذمہ دار ہم لوگ ٹھیرائے جائیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ تم اپنے ساتھی کا مال چُرا کر یا اس کو قتل کر کے رات کی سیاہی میں فرار ہوجانا چاہتے ہو اگر یہ خیال درست نکلے تو اس صورت میں چوری یا قتل کا ذمہ دار کون ہوگا ظاہر ہے کہ پولیس ہم کو حراست میں لے لیگی "

غنیمت ہے کہ اس جگہ اندھیرا تھا اور چوکیدار میرے دلی اضطراب کو——جو تمام جسم کی کپکپاہٹ میں ظاہر ہورہا تھا——محسوس نہ کرسکا——ورنہ وہ اسی وقت ٹھٹک جاتا۔ اور شاید اپنے شبہ کو دور کرنے کے لئے میرے ہمراہ کمرے میں چل

آتا — یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کیا درحقیقت کوئی حادثہ تو نہیں ہوگیا
مایوس ہوکر میں واپس کمرے میں آیا۔ کواڑ بند کئے۔ اور اسی آرام کرسی پر لیٹ گیا۔ قلب کی حرکت بڑھی ہوئی تھی۔ اور تمام معصومیت کے باوجود میں خود اپنے آپ کو گنہگار تصور کرنے لگا تھا۔ دنیائے تخیل میں پولیس کے سپاہی خاکی وردیاں پہنے نظر آرہے تھے۔ پھانسی کا تختہ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ اور کوئی سرگوشی کرتے ہوئے کسی سے کہہ رہا تھا

"بے شک مقتول کا ساتھی ہی اس جرم کا مرتکب ہے"

میں اسی قسم کی ادھیڑ بن میں محو تھا۔ یہاں تک کہ غنودگی طاری ہونے لگی

"کھٹ کھٹ .... کھٹ کھٹ ......"

دروازے کے کواڑ زور سے بج رہے تھے۔ کہ میری آنکھ کھل گئی۔ طلسم خواب ٹوٹ چکا تھا۔ میں نے چاروں طرف نگاہ ڈالی — سرائے کا وہی کمرہ تھا۔ جس میں میں اور سلیم پناہ گزیں ہوئے تھے۔ اب نہ وہ عالی شان کمرہ تھا۔ اور نہ وہ قیمتی ساز و سامان۔ بارش تھم گئی تھی۔ ایک چھوٹے سے روشندان میں سے سورج کی شعاعیں اندر آرہی تھیں۔ جن میں خاک وغیرہ کے چھوٹے چھوٹے ذرات چمکتے رقص کرتے نظر آرہے تھے — آفتاب کافی طلوع ہو چکا تھا۔ میں نے صرف ایک لمحہ میں ان تمام گرد و پیش کی چیزوں پر نظر ڈال لی۔ اور اٹھ بیٹھا، کیونکہ باہر کی طرف سے کوئی مسلسل کواڑوں کو پیٹ رہا تھا

میں نے اٹھ کر کنڈی کھولی۔ چوکیدار میری نظر کے سامنے تھا۔ معاً رات کا سارا خواب میرے تصور میں آگیا۔ اس نے غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا

"یوں تو آپ کو بہت جلدی تھی کہ آدھی رات کو مجھ سے گھوڑا طلب کر رہے تھے۔ مگر اب جبکہ کافی دن چڑھ گیا تھا — آپ بیدار ہونے کا نام نہیں لیتے۔ آئیے آپ کے گھوڑے تیار ہیں"

میں عجیب اضطراب کے عالم میں تھا۔ رات کے واقعات کو خواب سے تعبیر کروں یا حقیقت سے؟ یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا — تاہم میں نے یہ کہہ کر اسے ٹال دیا کہ "ہم ابھی آٹھ دس منٹ میں آتے ہیں۔ تم باہر چل کر ٹھیرو"

میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کی موجودگی میں سلیم کو بیدار کرنے کی کوشش کروں — چوکیدار کے الفاظ سنکر میں رات کے واقعات کو حقیقت کی روشنی میں دیکھنے لگا تھا میں تنہائی چاہتا تھا۔ بالکل تنہائی — تاکہ اگر سلیم مردہ پایا جائے تو فرار کی کوئی ترکیب نکالی جاسکے۔ اس کے چلے جانے کے بعد میں نے آہستہ سے کمبل کا کونہ اٹھا کر سلیم کا جسم ٹٹولا۔ وہ بالکل سرد تھا۔ اور مجھے پسینہ کی سی نمی محسوس ہوئی۔ میرا جسم کانپ اٹھا تھا۔ مگر پھر بھی میں نے دل کڑا کر کے اس کو زور سے جھنجھوڑ دیا

سلیم نے کسمسا کر کروٹ لی اور جمائی لیتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ میں نے بے چینی کے ساتھ دریافت کیا

"کیسی طبیعت ہے؟"

اس نے لاپرواہی سے جواب دیا

"اچھی طرح ہوں - ابھی خمار باقی ہے"

وہ بھی اٹھ بیٹھا ــــــ اور میرے کہنے پر بہت جلد واپس چلنے کے لئے تیار ہوگیا ــــ ہم دونوں باہر آئے - اور مقررہ کرایہ ادا کرکے اپنے گھوڑوں پر بیٹھ کر روانہ ہوگئے ــــ ہمارا رُخ شہر کی طرف تھا - رات کو کچھ نہ کھانے کے باعث بہت زور کی بھوک لگ رہی تھی - پھر بھی میں خاموش تھا - مگر سلیم سے برداشت نہ ہوسکا ــــ وہ دریا کے پُل کے قریب ایک سبز قطعہ دیکھ کر گھوڑے پر سے اُتر گیا - تاکہ باقی ماندہ ڈبل روٹی اور مکھن سے تھوڑا ناشتہ کرلیا جائے

مجھے بھی کافی بھوک محسوس ہو رہی تھی - مگر روٹی کے لقمے حلق سے نہ اتر سکے - ابھی تک میرے دل پر دہشت طاری تھی

کھانا کھاتے ہوئے سلیم نے کہا

"تم نے غلطی کی کہ مجھے جگا دیا، میں ایک خواب دیکھ رہا تھا - نہایت پُرلطف خواب"

"خواب"! میں نے چونک کر پوچھا "کس قسم کا خواب؟"

"وہ ناتمام رہ گیا ــــ میں صرف اس قدر دیکھنے پایا تھا کہ ایک شخص میری جان لینے کے درپے ہے - اور طرح طرح سے میری گھات میں لگا ہوا ہے ــــ اس کے بعد کچھ نہ دیکھ سکا - تم نے جگا دیا تھا"

"سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا اسرار ہے - ایک ہی موضوع کا خواب میں بھی دیکھتا ہوں اور تم بھی - اور اسی کا ایک جزو چوکیدار کو دکھائی دیتا ہے"

پھر میں نے رات کا تمام خواب سلیم کے سامنے بیان کر دیا ــــ وہ بجائے ڈرنے کے قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا

"دن کو زیادہ تھک جانے کے بعد عموماً رات کا ابتدائی حصّہ بےخبری کی نیند میں اور باقی حصہ بھیانک خواب دیکھنے میں گذرتا ہے"

"لیکن یہ تو بتاؤ کہ کیا درحقیقت کوئی عورت تم سے محبت کرتی ہے ــ اور تم اس کی طرف مائل نہیں ہو"

"ہاں" ــــ اس کا چہرہ ...... ایک دم سنجیدہ ہوگیا -- "تمھارے خواب میں کسی قدر واقعیت ضرور ہے ــ میں ایک حسینہ کے دامِ محبت میں مبتلا ہوں - اور دوسری طرف میری خالہ زاد بہن مجکو اپنا گرویدہ بنالینا چاہتی ہے - یہ بھی صحیح ہے کہ میں نے ایک مرتبہ غلطی سے اس کے سامنے اظہارِ محبت کر دیا تھا ــ مگر مجھے یقین ہے کہ اس عشق کا انجام تلخ نہیں ہوگا"

تاہم مجھے اطمینان نہ ہوا - اور اپنے شکوک کو رفع کرنے کے لئے اس کے سینہ کی بائیں پسلیوں کو گھور کر دیکھنے لگا - تعجب ہے کہ وہاں کوئی نشان نہیں تھا

پانی پینے کی غرض سے ہم دریا کے کنارے کے قریب گئے۔ پہلے میں نے پانی پیا۔ پھر سلیم پُل کے کٹہرے کی چند سلاخیں پکڑ کر جھکا اس کشمکش میں اس کی قمیص تھوڑی سی پھٹ گئی تھی۔ اور اس کا سینہ عریاں نظر آرہا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ وہاں کوئی زخم وغیرہ نہیں تھا۔ وہ جھک کر چلو میں پانی لینا ہی چاہتا تھا کہ میں نے دیکھا کہ اچانک اسفنج کا ایک ٹکڑا اس کے جسم میں سے نکل کر گرا اور پانی کی موجوں پر بہنے لگا اس کے ساتھ ہی ساتھ خون کے صرف چند قطرے اس زخم میں سے نکل کر لہروں میں مل گئے

سلیم اس صدمے کو برداشت نہ کرسکا۔ اس کے ہاتھ سے سلاخیں چھوٹ گئیں۔ وہ توازن قائم نہ رکھ سکا۔ اور دھڑ سے دریا میں گر گیا

یہ تمام واقعات سینما کے فلم کی طرح چشم زدن میں ظہور پذیر ہو گئے۔ اور مجھے اس قدر مہلت بھی نہ مل سکی کہ آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لوں

اس کا پانی میں گرنا تھا۔ کہ ایک خونخوار مگرمچھ نے دریا سے سر نکالا۔ اور میرے عزیز دوست اور رفیق سفر کو اپنے مُنہ میں دبوچ کر ہمیشہ کے لئے پانی کی تہ میں پہنچ گیا

سطح پر چند بلبلے نمودار ہوئے اور مٹ گئے ــــ اسفنج کا ٹکڑا تیرتا رہا ــــ اور میں ــــ اُف! ان سمجھ میں نہ آنے والے واقعات کو اپنے ذہن میں دُہراتا رہ گیا ــ بار بار اپنے دل سے سوال کرتا تھا کہ یہ واقعہ ہے یا واہمہ

فضل حق قریشی (دہلوی)

انگلستان کی مجلس وزراء

یوں تو جمہوریت (دستور جمہوریت) کی بنیاد بہت قدیم ہے - اور موجودہ جمہوریت اسلامی تمدن کی بہت کچھ زلہ ربا ہے لیکن انگلستان کے آئینی ارتقائی داستان جمہوریت کی تاریخ میں اسقدر سبق آموز ہے کہ ہر ہندوستانی کو جسے سیاسیات سے کچھ بھی دلچسپی ہے، اس کا جاننا ضروری ہے - اس میں سب سے زیادہ دلچسپ انگلستان کی مجلس وزرا ہے جسے (Cabinet) کہتے ہیں - لہٰذا ہم آج مختصراً اُسی کی ارتقائی تاریخ پر ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں :- اس کے سمجھنے کے لئے سب سے پہلے ہم کو مختصر طور پر پریوی کونسل (Privy Council) کی تاریخ پر نظر ڈالنا ہے کیونکہ (Cabinet) فی الحقیقت اسی جماعت کی ایک شاخ تھی جس نے رفتہ رفتہ اسقدر اہمیت حاصل کرلی ہے

پریوی کونسل کی ابتدائی حیثیت بالکل ویسی ہی تھی، جیسی کہ ایشیا میں بادشاہوں کے مصاحبین کی ہوا کرتی تھی (Sanons) کے وقت میں ایک جماعت تھی جس کا نام (Vi Hauagemut) تھا یا دوسرے الفاظ میں "A. Council of Freemen" تھا - اور جب نارمنوں کا اثر انگلستان میں قوی ہوا تو کچھ تبدیلی کے ساتھ مشیروں کی ایک جماعت قائم کی گئی جس کا نام مجلس اعظم یا (Great Council) تھا - یہ جماعت فی الحقیقت بادشاہ کو تمام قانونی، اقتصادی اور مالی مشورہ دیتی تھی اور بادشاہ کی طرف سے اپیل بھی سنا کرتی تھی - رفتہ رفتہ اس میں تبدیلی پیدا ہوئی اور بادشاہ کے ان مقربین میں سے ایک کمیٹی قائم کی گئی جو ہر وقت بادشاہ کے ساتھ رہتے تھے - اس کا نام "Curia Regis" یا "مستقل مجلس" رکھا گیا - مقصد اس مجلس کا یہ تھا کہ بادشاہ ہر معاملہ میں اس سے مشورہ لے سکے - اس مجلس کے ارکان، شاہی خاندان کے لوگ اور معزز افسران ہوا کرتے تھے - رفتہ رفتہ سہولت کار کی غرض سے اس مجلس کی مختلف شاخیں قائم کی گئیں جو خصوصیت کے ساتھ مالی اور عدالتی معاملات کو فیصل کرتی تھیں - ان شاخوں کے قائم ہو جانے کے بعد مجلس اعظم، مجلس شوریٰ رہ گئی - اور اسی کا نام (Privy Council) ہوگیا - پریوی کونسل کا، ہنری ششم کے وقت میں اور اس کے بعد ٹیوڈر اور اسٹوارٹ خاندان میں بڑا زور رہا - لیکن سترھویں صدی کے اختتام پر اس کا زور گھٹ گیا - اور اسی کی ایک شاخ نے خاص اہمیت حاصل کی اور تمام نظام رفتہ رفتہ اسی کے متعلق ہوگیا - اسی کا نام (Cabinet) ہے

اس کا نام صرف اس لئے پڑا کہ بادشاہ اپنے وزراء سے محل کے اندرونی کمرہ میں مشورہ لیا کرتا تھا اور (Cabinet) کے لفظی معنی اندرونی کمرہ کے ہیں

یوں تو مشورہ کا یہ طریقہ پہلے سے جاری تھا لیکن چارلس دوم نے بہت کچھ اس طریقہ پر عمل درآمد کیا اور تقریباً تمام معاملات میں اپنی (Cabinet) سے مشورہ لیا۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ گویہ مجلس شوریٰ تھی۔ مگر ابتدا میں اس کے ممبران صرف بادشاہ کے اشارہ پر چلتے تھے اور ملک کے مفاد پر نظر نہیں رکھتے تھے اور اسی وجہ سے بار ہا پارلیمنٹ اور اس جماعت میں اختلاف ہوا

جیساکہ اوپر لکھا گیا یہ جماعت ابتدا میں (Privy Council) کی ایک شاخ سمجھی جاتی تھی لیکن رفتہ رفتہ یہ اس سے بالکل علیحدہ ہوگئی۔ پارلیمنٹری ارتقا کے ساتھ ساتھ کیبنٹ کے ممبروں کا انتخاب بھی اسی جماعت سے ہونے لگا جو پارلیمنٹ میں سب سے زیادہ طاقتور ہوتی تھی اور اس طرح کیبنٹ کی ذمہ داری پارلیمنٹ کے ساتھ خاص طور پر وابستہ ہوئی اور کیبنٹ پارلیمنٹ کی ایک طاقتور کارکن جماعت متصور ہونے لگی۔ رفتہ رفتہ کیبنٹ کے مختلف ممبران مختلف محکموں کے افسر اعلیٰ ہونے لگے۔ (Cabinet System) کی رُو سے فی الحقیقت تمام اختیارات جو بادشاہ کو حاصل تھے وہ اس جماعت کی طرف عود کر آئے۔ اور اس ارتقا کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ اب سیاسی معاملات میں کوئی حصہ نہیں لیتا۔ بیشک بادشاہ سلطنت کے ارکین سے گہرے تعلقات رکھتا ہے اور خفیہ طور پر تمام اُن معاملات سے دلچسپی ظاہر کیا کرتا ہے جو ارکین کے پیش نظر ہوتے ہیں لیکن کسی معاملہ کا قطعی فیصلہ اس کے ہاتھ میں نہیں اور نہ اپنے ملک کے سامنے وہ کسی معاملہ کا ذمہ دار خیال کیا جاتا ہے۔ بادشاہ کے نام سے فی الحقیقت وہ لوگ حکومت کرتے ہیں جن کے کاموں پر نکتہ چینیاں کی جاتی ہیں اور جو اپنے عہدے سے علیحدہ کئے جاسکتے ہیں

کیبنٹ بادشاہ کے نام سے کام کرتی ہے اور اسی کے مشورہ کے مطابق بادشاہ کی طرف سے احکام جاری ہوتے ہیں لیکن بادشاہ خود مشوروں میں شریک نہیں ہوتا۔ چونکہ کیبنٹ کے ممبران پارلیمنٹ کے ممبر ہوتے ہیں اور ممبر بھی ایسے جو عام انتخاب سے آتے ہیں. اسلئے کیبنٹ کا وجود لازمی رائے عامہ پر منحصر ہوتا ہے

اور اس لئے وہ ہر وقت رائے عامہ کا احساس کرتے رہتے ہیں۔ پھر چونکہ وہ اس پارٹی سے منتخب ہوتے ہیں جو زیادہ طاقتور ہوتی ہے اس لئے مجلس انتظامیہ اور پارلیمنٹ میں ایک نہایت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اور وہ جمہوریت کے اصول سے ہٹ نہیں سکتا۔ کیبنٹ کے خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) یہ، مجلس قانون ساز اور مجلس انتظامیہ کے درمیان ایک ذریعۂ اتحاد ہے۔ جیساکہ اوپر کہا گیا ہے شروع میں وزرا اُسی پارٹی سے منتخب کئے جاتے تھے۔ جو پارلیمنٹ میں سب سے زیادہ طاقتور ہوتی تھی اور کیبنٹ انھیں وزرا پر مشتمل ہوتی تھی لیکن بعض اوقات پارٹی بندی کے اصول میں خود کچھ تبدیلی پیدا ہوگئی اور اس کا اثر کیبنٹ پر بھی

جیسا کہ جنگ عظیم کے زمانہ میں ہوا۔ پڑا مثلاً پارلیمنٹ کی کل پارٹیاں یا ایک سے زیادہ پارٹیوں نے مل کر گورنمنٹ بنائی
اور آج بھی نظر آرہا ہے۔ ایسی حالت میں وزرا بھی لازماً ان سب پارٹیوں سے منتخب کئے گئے جنھوں نے مل کر گورنمنٹ
قائم کی تھی، مگر یہ دو اصول کبھی ہاتھ سے نہ دیئے گئے کہ کیبنٹ کے ممبران لازمی طور پر پارلیمنٹ کے ممبر ہوں گے، نیز
یہ کہ وہ پارلیمنٹ کی طاقتور جماعت کے نمایندہ ہوں گے

(۲) نظام کی سیاسی یک جہتی :— جیسا کہ اوپر تذکرہ کیا گیا۔ مجلس وزراء کا ارتقا پارلیمنٹ کی استقامت اور پارٹی
کے قیام سے ہوا یعنی کیبنٹ نتیجہ ہے پارلیمنٹ میں پارٹیاں قائم ہونے کا اور باوقعت پارٹی کے برسرحکومت ہونے
کا :—

(۳) ممبران کیبنٹ کی مشترکہ ذمہ داری :— مشترکہ ذمہ داری کا اصول کیبنٹ میں رفتہ رفتہ قائم ہوا۔ پروفیسر ہرن
لکھتا ہے کہ دوسری (Rockingham Ministry) جو ۱۷۸۲ء میں قائم ہوئی اس
نے سب سے پہلے اس اصول کو بنایا اور رفتہ رفتہ اس کی اہمیت بڑھتی گئی۔ فی الحقیقت یہ اصول جمہوریت کا
عطر ہے۔ چونکہ وزراء ایک ہی پارٹی کے ممبر ہوتے ہیں ایک ہی اصول کے موید ہوتے ہیں اس لئے ظاہر ہے کہ جب
اصولی اختلاف شروع ہو اور پبلک کا اعتماد گھٹ جائے تو وزراء کو مستعفی ہو جانا چاہیئے۔ چنانچہ اسی اصول پر ایسے
وقت پر تمام وزراء خواہ وہ کیبنٹ کے ممبر ہوں یا نہوں مستعفی ہو جاتے ہیں۔ یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ہر وزیر کیبنٹ
کا ممبر نہیں ہوتا لیکن کیبنٹ کا ہر ممبر وزیر ہوتا ہے۔ مشترکہ ذمہ داری کا ایک اور بھی راز ہے وہ یہ کہ اگر ہر ممبر ہر معاملہ
میں جو اپنے پاس قائم کرسکتا، تو آپس میں اعتماد قائم نہ رہتا اور کیبنٹ کی کارروائیاں راز نہ رہ سکتیں،

(۴) بادشاہ کا کیبنٹ کے جلسوں میں شریک نہونا :— بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کیبنٹ سے اس بنا پر
علیحدہ ہوا کہ جارج اول صرف جرمن زبان جانتا تھا۔ اور انگریزی سے ناواقف تھا۔ لہٰذا اس نے رفتہ رفتہ
جلسہ میں جانا چھوڑ دیا۔ اور اس طرح بادشاہ کیبنٹ سے علیحدہ ہو گیا، لیکن جارج اول کے وزیر
([illegible]) ونیز اس کے بعد کے وزراء کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ صرف یہی وجہ بادشاہ
کی علیحدگی کی نہ تھی بلکہ بڑی وجہ یہ تھی کہ بادشاہ کے غیرذمہ دارانہ انداز کا جو اثر کیبنٹ پر پڑتا تھا وہ اس کے ارتقا کے
منافی تھا

(۵) تمام ممبران کیبنٹ کا ایک وزیر اعظم کے ماتحت ہونا :— گو اصولاً وزیر اعظم کو اس سے زیادہ حق نہیں ہے جو
ہر وزیر کو ذاتی حیثیت سے حاصل ہوتا ہے لیکن پھر بھی وزیر اعظم کی حیثیت انگلستان کے آئین میں بہت نمایاں ہے
وہ عام طور پر اس پارٹی کا لیڈر ہوتا ہے جو سب سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔ البتہ اس وقت کے وزیر اعظم مسٹر [illegible]
کی حیثیت ذرا مختلف ہے کیونکہ وہ لیبر پارٹی کے ممبر ہیں۔ اور پارلیمنٹ میں اس وقت سب سے بڑی جماعت قدامت پسند

(Conservatives) لوگوں کی ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جس اصول پر پچھلا انتخاب ہوا ہے اس اصول سے جس جماعت نے پارلیمنٹ میں فوقیت حاصل کی ہے اس کے رہنما مسٹر میکڈانلڈ تھے اور اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ عام اصول کہ وزیر اعظم سب سے بڑی پارٹی کا لیڈر ہوتا ہے تبدیل ہوگیا

وزیر اعظم ہی تمام وزراء کا انتخاب کرتا ہے اور بہت سے معاملات میں فی الحقیقت اس کی حیثیت ایک (Dictator) (حاکم مطلق) کی ہوتی ہے اور جب تک اس پر پارلیمنٹ کا اعتماد قائم رہتا ہے بڑے بڑے اہم معاملات وہ اپنی رائے سے طے کرلیتا ہے۔ گو بعد میں وہ معاملات کیبنٹ یا پارلیمنٹ کے سامنے آتے ہیں۔ لیکن یہ تعجب سے سنا جائیگا کہ باوجود اس اہمیت کے انگلستان کے آئین میں وزیر اعظم کا قانونی وجود کوئی نہیں ہے۔ سب سے پہلے اس کا اعتراف ۱۹۰۵ء کے شاہی اعلان میں کیا گیا جس میں اس کا اعزاز اور تفوق بیان کیا گیا ہے

اب یہ امر بھی سمجھ لینا چاہیے کہ بادشاہ کا تعلق کیبنٹ سے کیا ہے۔ اوّل یہ کہ گو تمام کام بادشاہ کے نام سے ہوتے ہیں لیکن بادشاہ کسی کام کا ذمہ دار نہیں ہے اسی لئے یہ مشہور ہے کہ بادشاہ کوئی غلطی نہیں کرسکتا۔ بادشاہ کی جگہ ہر کام کا ذمہ دار وزیر ہے اور وزیر ہی سے پبلک ہر کام کا مواخذہ کرسکتی ہے۔ اسکی وجہ ظاہر ہی یہی ہے کہ جب بادشاہ کیبنٹ کے مشورہ میں شریک نہیں ہوتا تو اس کو کسی کام کا ذمہ دار بنانا اصولاً غلط ہوگا۔ دوم۔ بادشاہ کو وزارت کی تبدیلی کے عمل میں لانے کا اختیار حاصل ہے اور اس اختیار کو وہ دو وقتوں میں استعمال کرسکتا ہے۔

اوّل اس وقت جبکہ واقعات سے یہ ظاہر ہوجائے کہ وزراء اور دار العوام ملک کے رائے عامہ کی صحیح نمائندگی نہیں کر رہے۔ ایسی حالت میں بادشاہ وزراء کو موقوف کرکے پارلیمنٹ کو منسوخ کرے گا اور نئے انتخاب کا حکم دے گا

دوسرے۔ اگر بادشاہ کسی مسودۂ قانون پر اپنی رضامندی کے دستخط نہ ثبت کرے۔ اور وزراء اسکا پاس ہونا اپنے قیام کے لئے ضروری سمجھتے ہوں تو وزارت تبدیل ہوجائے گی۔ لیکن بادشاہ کے لئے ایسا کرنا آسان نہیں کیونکہ اگر انتخاب سے وہی وزارت دوبارہ قائم ہوگئی تو وہ بادشاہ کو سلطنت چھوڑنے پر مجبور کرسکتی ہے

سوم۔ بادشاہ وزراء کا انتخاب کرتا ہے :-

یہ اصول اس اصول کے متضاد معلوم ہوتا ہے جو ہم نے اوپر بیان کیا کہ وزیر اعظم وزراء کا انتخاب کرتا ہے۔ لیکن فی الحقیقت دونوں صحیح ہیں۔ ایک واقعۃً دوسرا اصولاً۔ وزیر اعظم تو جیسا ہم نے بیان کیا کوئی وجود قانونی نہیں رکھتا اس لئے تمام انتخابات بادشاہ کی جانب سے ہوتے ہیں لیکن واقعۃً بادشاہ صرف وزیر اعظم کا انتخاب ایک اصول کے تحت میں کرتا ہے اور وزیر اعظم دیگر وزراء کا۔ تمام وزراء اپنی وزارت کے تمام سیاسی کاموں کے لئے بادشاہ کی طرف سے ذمہ دار ہوتے ہیں

چہارم۔ کیبنٹ یا وزراء کسی سیاسی معاملہ میں بادشاہ کا نام نہیں لاسکتے۔ اور نہ یہ ظاہر کرسکتے ہیں کہ بادشاہ کا کیا منشا اور کیا خواہش ہے

وزراء کے مقابلہ میں بادشاہ کے خصوصی اختیارات

بادشاہ کا مشورہ دینا اس کے اختیاراتِ خصوصی میں سے ہے اور اس کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ اپنے ارکان سلطنت کو ضرورت کے وقت متنبہ کرے اور وقتاً فوقتاً اُن کا دل بڑھائے - پہلے وزراء، بادشاہ کو مشورہ دیتے تھے - اور بادشاہ فیصلہ کرتا تھا - کاغذی اعتبار سے اب بھی یہی ہوتا ہے لیکن اب بادشاہ سے مشورہ کیا جاتا ہے لیکن فیصلہ بالکل وزراء کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو دارالعوام کے نمایندے ہوتے ہیں

غرض کیبنٹ انگلستان کے آئین میں بڑی اہم جماعت ہے جو سارے نظام کی ذمہ دار ہے اور جس کے ایماء سے تمام قوانین بنائے جاتے ہیں - بادشاہ کی تقریر بھی جو پارلیمنٹ میں ہوتی ہے اسے بھی کیبنٹ تیار کرتی ہے - گو یہ کمیٹی پارلیمنٹ کے ممبروں کی ہے - اور پارلیمنٹ ہی کی مقرر کی ہوئی سمجھی جاتی ہے لیکن یہ پارلیمنٹ کو بھی منسوخ کر سکتی ہے اور اس کو آئین کے ملتوی کرنے اور اپیل وغیرہ سننے کا بھی اختیار حاصل ہے - اس کے مقابلہ میں پارلیمنٹ مجاز نہیں کہ وہ اس کی تمام کارروائیوں کی آگاہی رکھے - فی الواقعہ وزراء کے لئے یہ ممنوع ہے کہ وہ کیبنٹ کی کارروائیوں کو پارلیمنٹ میں بلا بادشاہ کے حکم کے ظاہر کریں - ہاں پارلیمنٹ کو یہ اختیار ضرور ہے کہ اگر پبلک مفاد کے خلاف نہوں تو کیبنٹ کے فیصلہ کی اطلاع اس کو دی جائے - اور اس کے سامنے وجوہ فیصلہ بیان کی جائیں - پارلیمنٹ کے سامنے جو ملکی پالسی پیش کیجاتی ہے اس کا قطعی فیصلہ کیبنٹ ہی کے ہاتھ میں ہے - اور ہر محکمہ کے حدود بیان کرنا اور ایک دوسرے کے تعلقات کا قائم رکھنا بھی اسی کے اختیار میں ہے

مجلس وزراء دو صدی سے زاید زمانہ ہوا کہ جاری ہوئی - اور بجز زمانۂ جنگ کے جبکہ مسٹر لائڈ جارج نے ایک (War Cabinet .....) علیحدہ قائم کی تھی جس میں کچھ ممبران ایسے بھی تھے جو پارلیمنٹ کے ممبر نہ تھے، یہ طریقہ ہمیشہ کامیابی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتا رہا ہے - سیاست دانوں نے اس پر وقتاً فوقتاً حملے بھی کئے لیکن یہ حملے بیکار ثابت ہوئے

کیبنٹ کا طریقہ حقیقتاً ایک ایسا طریقہ ہے جس کے ارتقاء، پر انگلستان کا آئینی دماغ جسقدر فخر کرے بجا ہے اس طریقہ کی اہمیت پر ایک بسیط نظر ڈالنا اور اس کی خصوصیات کو چراغ ہدایت بنانا ہندوستانیوں کے لئے آیندہ نظام میں یقینی مفید ثابت ہوگا

جعفری

مکتوبات نیاز

نہ آپ کا تقاضہ نہ مجھے ضرورت، لیکن "جذبۂ بے اختیارِ شوق" کا کیا علاج کہ

کس نشنود یا نشنود من گفتگوئے می کنم

ہر مہینے دو تین دن مجھ پر ایسے بھی گزر جاتے ہیں جب بالکل "معطل" ہو جانے کو جی چاہتا ہے اور اس "تعطل" میں خواہ مخواہ چھیڑنے یا چھیڑے جانے کے لئے بیقرار ہوتا ہوں ـــــ اچھا تو سنئے:-

(۱) یہ آپ نے میرے پچھلے خط کا جواب فوراً کیوں دیا اور کیوں مجھے کوئی موقعہ شکایت کا نہ دیا۔ مدعا یہ کہ آپ "اخلاق مراسلت" میں بھی اپنا تفوق مجھ پر ظاہر کرنا چاہتے ہیں!ـــ بہتر ہے۔ سمجھوں گا،

(۲) بغیر پوچھے ہوئے آپ نے "خربزے" کیوں بھیجدئے؟ غالباً مجھے جلانے کے لئے کہ آپ کو تو روز میسر آتے ہیں اور مجھے کبھی نہیں۔ خیر، دیکھا جائے گا

(۳) عبدالرزاق سے آپ نے کیوں کہا کہ آپ آیندہ اتوار کو مجھ سے ملنے ضرور آئیں گے۔ کیا آپ نہ آئیں گے تو میرا دم نکل جائے گا، آئے بڑے وہاں سے احسان کرنے والے!

(۴) آپ نے بیدل کا نسخہ کیوں واپس کر دیا۔ اپنے نزدیک آپ نے گویا بڑا ازبردست ثبوت "رعایت شوق" کا دیا ہے، لیکن میں اسے مکروفریب کہتا ہوں

پھر اگر ان میں سے کوئی ایک الزام بھی غلط ہو تو آؤ میرے سامنے اور کرو اس کی تردید، اگر بڑے مرد ہو

نیاز

او میاں تجمل حسین خاں[۵]

میں پوچھتا ہوں کہ کیا "عیش" تمھارے ہی لئے بنا ہے اور کسی کے لئے نہیں،

---

[۵] اشارہ ہے غالب کے اس مصرعہ کی طرف "بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے"

کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اے ظالم، ۔۔۔ یہ ساون کی کالی کالی گھٹائیں اور یہ "تنہا نوشیاں" ! ۔۔۔ تم سے تو نہیں لیکن اس خدا سے فریاد ہے جس نے نہ تمہیں باندازۂ توفیق ہمت دی اور نہ مجھے یہ اندازۂ ہمت توفیق ۔۔۔۔ نہیں آسکتے تو مجھی کو بلاؤ رند ہوں لیکن "بلانوش" ۔۔۔ تو نہیں۔ حسن پرست ہوں مگر "چشم بد بیں" تو نہیں رکھتا ۔۔۔۔ دور سے اگر تمھاری رنگ رلیاں دیکھ لوں گا تو کیا تمہارا کچھ بگڑ جائے گا ۔۔۔۔ اچھا، بھئی نہ بلاؤ،

اے جفا ہائے تو خوشتر ز وفائے دگراں !

نواب حامد علی خاں کو نیا نیا ذوقِ شعر پیدا ہوا ہے۔ رات دن سوائے شاعری کے کوئی اور چرچا نہیں دربار شعرا سے بھرا ہوا ہے اور اٹھتے بیٹھتے بجز شعر و مشاعرہ کے کوئی ذکر نہیں نواب، بے نظیر کی بارہ دری میں مسند پر رونق افروز ہیں اور آیندہ مشاعرہ کے لئے مصرعۂ طرح تجویز ہو رہا ہے دفعۃً پہلو بدل کر ارشاد ہوتا ہے :-

"بھئی میری رائے یہ ہے کہ داغ کا یہ مصرعہ ہونا چاہیے

وہ منتوں سے کہے چپ رہو خدا کے لئے

ہر طرف سے "احسنت و آفریں" کی صدا بلند ہوتی ہے اور نواب ایک ایک شاعر سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ :- "دیکھئے آپ وفا کے قافیہ پر زور دیجئے گا، آپ حنا کو نہ چھوڑیے گا، اور ہاں رسا صاحب آپ حیا کے قافیہ پر پورا زور طبع صرف کر دیجئے گا وغیرہ وغیرہ"

اتفاق سے اسی مجمع میں ایک غریب شاعر ایسے بھی تھے جن سے نواب نے مخاطب ہو کر کسی قافیہ کی فرمایش نہیں کی۔ جب تقسیم قوافی ختم ہو گئی تو انھوں نے حد درجہ بیکسی کا اظہار کرتے ہوئے شانہ کو سکوڑ کر آپ ہی آپ مایوسانہ لہجہ میں کہا کہ "ہم سے کسی نے بھی نہیں کہا کہ فلاں قافیہ میں طبع آزمائی کرنا"

بالکل یہی حال میرا تمھارے دربار میں ہے کہ ساری دنیا کو دعوتِ انجمن آرائی دی جائے۔ لیکن نہ پوچھا جائے تو ایک غریب نیاز کو ۔۔۔۔ ہاں، ہاں کہہ دو کہ غلطی ہوئی، میں معاف نہ کروں گا تو کروں گا کیا، لیکن یہ یاد رہے کہ خدا ایسے "وفا دشمن" کو مشکل ہی سے معاف کرتا ہے۔

کل آپ کے دوست تشریف لائے اور فرمانے لگے کہ غالب کے اس شعر کا کیا مطلب ہے :-

نوید امن ہے بیداد دوست جاں کیلئے   رہا نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے

میں شعر پڑھتے ہی سمجھ گیا کہ یہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں کیونکہ انھوں نے "بیداد دوست" کو صفت و موصوف سمجھ کر بغیر اظہار کسرہ کے پڑھا تھا۔

میں نے عرض کیا کہ "اس میں کیا اشکال جناب کو معلوم ہوا" فرمایا۔ "جب جان کی صفت "بیداد دوست" قرار دیدی تو پھر نوید امن کیسا"

میں نے کہا کہ "پہلے مصرعہ میں بیداد کی (دال) کو زیر دے کر پڑھئے ممکن ہے یہ مشکل حل ہو جائے" بولے "آپ ہی بتائیے اس صورت میں کیا مفہوم پیدا ہوگا"۔۔۔۔۔ میں نے کہا کہ "بیداد دوست (یعنی دوست کا ظلم) فاعل واقع ہوا ہے (ہے) کا اور شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ دوست کا ظلم حقیقتاً ہماری جان کے لئے نوید امن ہے کیونکہ اس نے آسمان کے لئے کوئی طرز ستم رہنے ہی نہیں دیا کہ وہ ہم پر صرف کرے"

کچھ دیر تامل فرما کر بولے کہ "نوید امن یوں بھی ٹھیک نہیں کیونکہ اس طرح آسمان نہ سہی دوست تو برابر ظلم کرتا رہے گا"۔۔۔۔۔ میں نے کہا کہ "کرنے دیجئے، اس میں کیا حرج ہے، شکایت تو فی الاصل جور آسماں کی ہوا کرتی ہے جو مقاصد عاشق میں حارج ہوا کرتا ہے نہ کہ جور محبوب کی جو عین تمنا ہے"۔۔۔۔۔ بولے اگر "ترکیب صفت و موصوف کی قائم رکھ کر "بیداد دوست" بغیر اظہار کسرہ کے پڑھا جائے تو کیا حرج ہے"۔۔۔۔۔ میں نے کہا "حرج تو کوئی نہیں لیکن شعر مہمل ہو جائے گا" مگر ان کا اصرار برابر جاری رہا اور آخر کار عاجز آ کر میں نے کہدیا کہ "جناب میری سمجھ میں جو کچھ آیا عرض کر دیا۔ لیکن اگر آپ کے نزدیک "بیداد دوست" "خدا دوست" کے رشتہ داروں میں سے ہے تو مجھے اس کا حال نہیں معلوم، کسی اور سے دریافت فرمائیے"

یہ سنکر وہ نہایت چیں بہ جبیں ہوئے اور منہ پھلا کر چلے گئے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ ضرور آپ کو میری شکایت لکھیں گے۔ اس لئے اصل واقعہ میں نے آپ پر ظاہر کر دیا کہ مبادا کوئی بدگمانی پیدا ہو

نواب صاحب قبلہ،

میں نے سنا ہے (یہ نہ بتاؤں گا کس سے سنا ہے) کہ آپ ماہ آیندہ سفر حج کا عزم رکھتے ہیں اور بر سبیل تذکرہ آپ نے یہ خیال بھی ظاہر کیا تھا کہ کیا نیاز کا ساتھ ہو جانا ممکن نہیں ۔۔۔۔ معلوم نہیں حاضرین مجلس نے اس کا کیا جواب آپ کو دیا لیکن اتنا یقینی جانتا ہوں کہ بعض چپ ہو گئے ہوں گے، بعض آپس میں اشارہ بازی کر کے مسکرا پڑے ہوں گے۔ اور ممکن ہے بعض نے صاف صاف یہ بھی کہدیا ہو کہ "آپ بھی کس کافر و مشرک کا ذکر کرتے ہیں"

سو میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ نفس حج کا خیال اور وہ بھی کسی کی معیت میں، کسی کے طفیل میں قیامت تک کبھی میرے دل میں پیدا نہیں ہو سکتا، رہا سوال سیر و سیاحت کا، سو ایک عازم حج کے ساتھ اس کا بھی کوئی لطف نہیں

کیونکہ ان دونوں میں " سنگ اسود " و " سنگ رخام " کا سا فرق ہے، آپ چلیں گے آنکھوں پر پٹی باندھ کر اور یہاں عالم ہوگا " نظارہ زجنبیدن مژگان گلہ دارد " کا، آپ کے ہاتھ میں ہر وقت تسبیح وحمائل ہوگی اور یہاں جام ومینا پھر آپ ہی بتائیے کہ اگر کسی صورت کو دیکھ کر بے اختیار میری زبان سے سبحان اللہ نکل گیا۔ اور ٹھیک اسی وقت آپ تسبیح پڑھنے لگے استغفراللہ کی، تو میں کیا کروں گا، سوائے اس کے کہ سمندر میں کود پڑوں ـــــــ غرض یہ کہ آپ کے ساتھ چلنے کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ ہاں اگر آپ یہ وعدہ کریں کہ بمبئی میں جہاز کے عرشہ پر مجھے گُم کر کے پھر اس وقت تک میری جستجو نہ کریں گے جب تک آپ پھر بمبئی واپس نہ آجائیں، تو بیشک میں طیار ہو سکتا ہوں ـــــ مگر پوچھئے کہ یہ معیت ہی کب ہوئی؟

اچھا تو آپ جائیے اور مولوی قدیر کو لیتے جائیے جو سب سے زیادہ لمبی داڑھی رکھنے کے اعتبار سے سب سے زیادہ مستحق حج و زکوٰۃ کے ہیں۔ میرے لئے تو آپ جار حبیا کی کوئی حسین کنیز لیتے آئیے گا اور یہ ممکن نہ ہو تو خیر اس کی تصویر ہی سہی۔ لیکن خاک شفا اور زمزم کے پانی سے اُسے علیحدہ ہی رکھئے گا ورنہ ممکن ہے خراب ہو جائے

مرزا جی[1] ـــــ آپ کا خط پڑھکر سخت تکلیف ہوئی ـــــ میں خدا کو بھول سکتا ہوں، قرآن و حدیث کو بھول سکتا ہوں، بیوی بچوں کو بھول سکتا ہوں، لیکن آپ کو بھلا دینا میرے امکان میں نہیں۔ اگر میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے جائیں۔ اور اس کا ریشہ ریشہ علیحدہ کر دیا جائے تو بھی اُس سے " یا غفار " ہی کی آواز نکلے گی آپ نے مجھ پر احسان نہیں کئے ہیں، مسیحائی کی ہے، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ وہ کچھ کیا ہے جو خدا نے بھی نہ کیا تھا، پھر آپ ہی بتائیے کہ یہ احساس کس طرح محو ہو سکتا ہے؟

یقیناً یہ خطا مجھ سے ضرور ہوئی کہ آپ نے یاد کیا اور میں نہ آسکا، لیکن کیا عرض کروں کہ یہ جُرم کن مجبوریوں کی بنا پر سرزد ہوا ہے ـــــ پھر بھی منہ بیٹھا ہوں۔ اور معافی چاہتا ہوں ـــــ اگر میں نہ آسکا تھا تو مجھے عدم حاضری کے اسباب تو ظاہر کر دینا ہی چاہیئے تھے۔ خدا کے لئے لکھ بھیجئے کہ آپ نے معاف کر دیا ورنہ خواب و خور مجھ پر حرام ہو جائے گا

جو حالات آپ نے لکھے ہیں، اُن سے کھلا ہوا " اختناق الرحم " ظاہر ہو رہا ہے، یوں آپ کی مرضی ہے کہ خواہ مخواہ دعا تعویذ میں اپنا وقت اور بیوی کی صحت غارت کرتے رہیں، لیکن اگر خود انھیں کا اصرار ہے تو کوئی حرج نہیں

---

[1] مکتوب الیہ کا نام مرزا عبدالغفار بیگ ہے

ہو کہ اس طرح خود اُن کی قوتِ ارادی کام کرے گی اور ممکن ہے اس سے فایدہ ہو جائے

ایک واقعہ خود میرے ذاتی تجربہ کا ہے ——— یہ وہ زمانہ ہے جب میں اجے گڈھ میں تھا۔ دوپہر کو ایک آدمی عظیمن "کا رُقعہ لئے ہوئے آیا کہ تجاری کا تعویذ لکھ دیجئے۔ میں حیران کہ یہ کیا قصّہ ہے۔ جواب دیدیا کہ میں اس پیشہ کا آدمی نہیں ہوں، کس نے آپ سے کہدیا ——— اُدھر سے اصرار ہوا اور ادھر سے انکار، لیکن مجھے اعتراف شکست کرنا پڑا اور مجبوراً ایک تعویذ لکھ کر دیدیا کہ بازو پر باندھ لیا جائے۔ تعویذ کا بازو پر باندھنا تھا کہ بخار کافور ہوگیا اور تین مہینے کی تجاری دفعتہً غائب ہوگئی ——— اب کیا پوچھتے ہیں آپ کیا ہنگامہ بپا ہوا، جشن و مسرت کا ایک سیلاب تھا جو اجے گڈھ کے ایک ایک ذرہ سے اُمنڈ ا پڑتا تھا۔ مہاراج (سر رنجور سنگھ کا زمانہ تھا) تک خبر پہونچی، مجھے یاد فرمایا اور کہا کہ یہ کیا جادو تم نے کر دیا۔ عظیمن بھی محجوب و سرنگوں انداز میں بیٹھی ہوئی مُسکرا رہی تھیں۔ میں نے عرض کیا کہ مہاراج وہ تعویذ ہی ایسا تھا۔ بولے "مجھے بھی بتاؤ" ——— میں نے کہا "آپ کو تو نہیں لیکن عظیمن اگر چاہیں تو بیشک بتا سکتا ہوں" مہاراج نے ہنس کر عظیمن سے کہا کہ "کیوں کیا ارادہ ہے" بولیں ——— "ضرور" میں نے کہا کہ "تعویذ اپنے بازو سے کھول کر دیکھئے اور جو میں نے لکھا ہے وہ آپ بھی لکھ کر دیدیا کیجئے لیکن میں اس کا ذمہ دار نہیں اگر آپ کو پھر بخار آنے لگے"

بولیں ——— "جی ہاں میں یہ ساری چالیں سمجھتی ہوں، مدعا یہ کہ میں اُسے کھول کر نہ دیکھوں اور یہ عمل مجھے نہ معلوم ہو سکے"

میں اٹھا اور ان کے بازو سے تعویذ علیحدہ کر کے اس کی تہیں کھولیں اور سامنے رکھدیا۔ اس میں صرف یہ مصرعہ لکھا ہوا تھا: ———

نام سے تعویذ کے باندھے گئے بازوئے دوست

اب آپ کیا پوچھتے ہیں کہ کسقدر قہقہہ پڑا

بہرحال اس نقطۂ نظر سے تعویذ گنڈے میں کوئی حرج نہیں کہ مریض کی طبیعت کو بربنائے اعتقاد مرض کے دفع کرنے میں مدد ملتی ہے، لیکن اس کو اصل چارۂ کار سمجھ کر دوسری تدابیر سے غافل ہو جانا مناسب نہیں

میرے تجربہ میں کوئی کُنَین کا علاج بالماء اس مرض میں بہت مفید ثابت ہوا ہے، بشرطیکہ کوئی شخص پوری پابندی کر سکے

بنگال کا باغی شاعر - نذرالاسلام

جنگِ عظیم کا زمانہ ہے ———

میدانِ کارزار دن بھر گرم رہ چکا تھا - اور اب خدا خدا کر کے رات ہوئی تھی، سناٹا ہے اور اندھیرا! کبھی کبھی زخمیوں کے کراہنے اور چیخنے کی آواز فضا میں گونج اٹھتی ہے - خندقوں میں سپاہی غفلت کی نیند سو رہے ہیں، دنیا و مافیہا سے بے خبر - کبھی کبھی ہوائی جہاز دشمن کی ٹوہ لینے کے لئے، نیچے روشنی پھینکتے ہیں - دفعتاً بندوقوں کی آواز، بموں کی شورش!

...... پھر وہی سکون، وہی خاموشی!

اس شور و سکون کے عالم میں کسی خندق میں ایک سپاہی جاگ رہا ہے - اس کے سب ساتھی غافل سو رہے ہیں تنہا وہی بیدار ہے - دن بھر مورچہ پر وہ بڑی مستعدی سے لڑتا رہا ہے تکان سے اس کے بند بند ڈھیلے پڑ گئے ہیں توپوں اور بموں کے دھماکوں نے کان سُن کر دیے ہیں - پھر بھی اس کی آنکھوں سے نیند کالے کوسوں دور ہے - یہ کیوں ؟ آخر اس بےکلی اور بےچینی کی وجہ کیا ہے ؟ اسے خود نہیں معلوم! وہ صرف اتنا محسوس کرتا ہے کہ دل میں کچھ جذبات موجزن ہیں اور الفاظ کا لباس پہننا چاہتے ہیں - لیکن وہ خود نہیں جانتا کہ کیا کہنا چاہتا ہے - یکایک وہ گنگنانے لگتا ہے - قلب سے اٹھ کر لبوں تک ایک ترنم آتا ہے - اور فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتا ہے - سپاہی کچھ دیر کے لئے مبہوت رہ جاتا ہے - وہ فوراً کاغذ اور قلم لے کر بیٹھ جاتا ہے - شاعری کی دیوی جادو پھونکنے لگتی ہے اور ایک عالم بیخودی میں وہ کچھ کہنے لگتا ہے - صبح اول جملوں کو دیکھ کر اس کے حیرت و استعجاب کی حد نہیں رہتی - نادانستہ و ناگاہ، اس نے ایک نظم لکھ ڈالی تھی - زندگی میں سب سے پہلی مرتبہ اس نے دنیائے شاعری میں قدم رکھا تھا

اس سپاہی کا نام نذرالاسلام تھا!

ایک مفلس و نادار نوجوان جنگِ عظیم کے دوران میں کلکتہ کی کوچہ گردی کرتا پھرتا تھا - ۱۸۹۷ء میں کلکتہ کے قریب ایک مفلوک الحال گھرانے میں پیدا ہوا - عہدِ طفلی میں ہی والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا - قدرت کو اس کی پرورش اسکی چچی کے یہاں کرانی منظور تھی جس کے علم و فضل کی مسلمانانِ بنگال میں دھوم تھی - اس خاتون کی لکھی ہوئی کتابیں اب ہم بڑے ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہیں - وہ یتیم بچہ اسی خاتون کے سایۂ عاطفت میں پل کر بڑا ہوا - نصابی تعلیم کا سلسلہ آٹھویں درجہ تک بڑھ کر منقطع ہو گیا - شاعروں کو حساب سے ہمیشہ کد رہی ہے - چنانچہ زبان و شاعری کا یہ رسیا حساب میں بہت کمزور تھا اور اس کی الجھنوں سے تنگ آ کر اسکول چھوڑ بیٹھا - اس کے بعد کئی سال تک کے حالات تاریک!

ہیں۔ پھر یک بیک رنگروٹوں میں بھرتی ہو کر دبصرہ چلا جاتا ہے۔ فطرت نے اسے ایک جنگجو طبیعت ودیعت کی تھی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں وہ حوالدار کے عہدہ پر فائز ہو جاتا ہے۔ اور یہ کسی کو معلوم نہیں کہ ایک روز فضائے ادب میں اس کو درخشاں ترین ستارہ بنکر چمکنا ہے۔ کسے خبر ہو سکتی تھی کہ اس سپاہی کا ایک ایک شعر ...... تابوت استعمار پر ضرب آہنی ثابت ہوگا۔ اور یہ کہ اس کے گیت دار و رسن کے کرب کو مسرت میں تبدیل کر دیں گے ؟ اُسے وہم و گمان بھی نہ ہوگا کہ اس تاریک و ہیبت ناک خندق میں بیٹھ کر اس نے جو نظم سپردِ قلم کی تھی، وہ بنگلہ ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کردے گی۔ اور اُسے وہ مقبولیت نصیب ہوگی جو بنگال میں شاید ہی کسی نظم کو میسر آئی ہو (جس اخبار میں یہ نظم شایع ہوئی تھی، ایک روز میں اسکی ۲۹ ہزار کاپیاں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئیں۔)

اس نظم کا عنوان تھا "آگ منی (آمد) اس میں لڑائی کے میدان کا نقشہ ایک نئے انداز سے کھینچا گیا تھا۔ گرمی کلام اور زور بیان کا یہ حال تھا کہ میدان کے شور و شغب کا ہنگامہ کانوں تک پہونچتا تھا۔ زور الفاظ کا اس سے بہتر نمونہ پیش کرنا دشوار ہے۔ گو کہ اُردو رسم الخط بنگلہ تلفظ کو ضبطِ تحریر میں لانے سے قاصر ہے پھر بھی ناظرین کی دلچسپی کے لئے ایک بند یہاں نقل کیا جاتا ہے:

اے کی رن باجہ باجے گھن گھن !
جھن رن رن رن۔ جھن جھن !
سیکی دکی دکی ، دھکی دھکی
داما دریمی دریمی، گمک گمک
اوٹھے چھوٹے پھوٹے
چھوٹے لوٹے پھوٹے!
بہی پھنک چمک چمک
ڈھال تلوارے گھن گھن
اے کی رن باجہ باجے گھن گھن
رن جھن جھن جھن رن رن !

ہندوستانی زبانوں میں صرف چند بردائی کا راسو اور آلہا اودل کے رزمیہ اشعار مثلاً

پھپ چھپ چھپ چھپ کھانگا باجے۔ چھنن چھنن باجے تر وار!

اس کا جواب پیش کر سکتے ہیں

جب حوالدار نذر الاسلام میدان جنگ سے ہندوستان لوٹا تو تحریک خلافت کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس نظم کے چھپتے

ہی سارے بنگال میں ایک شور برپا ہوگیا۔ قوم کی قدردانی نے حولداری اور پنشن کی ضبطی کے داغ دھودئے

اگر ہندوستان میں کبھی اشتراکی برسر اقتدار ہوئے، تو سب سے پہلا کام وہ کیا کریں گے؟ میرا خیال ہے کہ ہماری شاعری کی کتابوں کو یک لخت نابود کردیں گے!

بیسویں صدی کے آغاز تک کسی دیسی زبان کے دیوان کو اٹھا کر دیکھئے۔ منقبت اور حزنیت کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو رُلاتا ہے یا سُلاتا ہے۔ بادشاہوں اور امیروں کی قصیدہ خوانی ہے۔ اُن کی سفاکیوں اور خون آشامیوں کی تعریفیں ہیں۔ یا پھر "دولی کے پردہ" اور "عشق حقیقی" کے تذکرے ہیں۔ بھوکے ننگے عوام کے حال زار پر پھوٹے منہ کسی کی زبان سے ایک لفظ نہیں نکلتا۔ معشوق ہرجائی کے فراق میں شاعروں کے دل کوہِ آتش فشاں بنے ہوئے ہیں۔ کوچۂ یار میں تیرِ نگاہ کے ساتھ رقیبوں میں جوتوں میں دال بھی بٹ رہی ہے۔ لیکن قحط و سیلاب میں، نوابوں، راجاؤں اور بنیوں کے چنگل میں پھنس کر لاکھوں بندگانِ خدا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجاتے ہیں اور ہمارے شعرائے کرام کی عشق بازی کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شاعری کا مقصد کیا ہے۔ فن فن کے لئے ہے یا خدمتِ خلق کے لئے؟ فن فن کے لئے! اس بے معنی محاورہ نے دنیائے ادب کو سخت نقصان پہونچایا ہے ——— اگر شاعری رموزِ زندگی کو سلجھانا چاہتی ہے تو اُسے واردات حیات سے بالاتر اور بے خبر ہونے کا حق حاصل نہیں۔ تشبیہی اور تخیلی شاعری اسی حد تک پسندیدہ ہوسکتی ہے۔ جب تک وہ دنیا کی حقیقتوں سے بے التفاتی نہ اختیار کرے اور ماورائی رنگ نہ چڑھنے دے یقیناً حق کی جستجو شاعر کا کام ہے لیکن دنیا اور اپنے گردوپیش سے الگ ہوکر یہاں کی محفلوں سے اُکتا جانا اس کے لئے باعث عار ہے۔ یہ راہبانہ نقطۂ نگاہ زندگی کے انحطاط کا ثبوت دیتا ہے

بیسویں صدی کے آغاز سے ایشیا ایک دورِ انقلاب سے گزر رہا ہے۔ ہر شعبۂ زندگی میں غیر معمولی سرعت سے رد و بدل ہورہے ہیں۔ ایک طرف مغربی استعمار سے قومیت کا مقابلہ ہے تو دوسری طرف سرمایہ و محنت کی کشمکش ہے۔ یوں زور آزمائی کے لئے بہت سے محاذ قائم ہوچکے ہیں لیکن دیدۂ بینا سے دیکھو تو دراصل یہ پرانی اور نئی تہذیب کی ٹکر ہے۔ عافیت کوش اور خرد پرست بوڑھاپا، ناعاقبت کوش اور جنوں نواز شباب سے برسرِ پیکار ہے۔ شاعری زمانہ کا آئینہ ہے۔ نا ممکن تھا کہ یہ ہنگامہ خیز دور ایشیائی لٹریچر کے دھارے کو نہ پلٹ دیتا۔ اب شاعروں کے دل معشوق کی زلفوں سے نکل کر معرکۂ کارزار میں صف بستہ ہورہے ہیں۔ شاعری کا قالب ایک نئے سانچے میں ڈھل رہا ہے۔ دورِ جدید کا ہر شاعر قوم کو پیغامِ عمل دیتا ہے۔ دشمن سے لڑنے کے لئے ابھارتا ہے۔ عظمتِ دیرینہ کی یاد دلا کر رُلاتا ہے۔ موجودہ زمانہ کی زبوں حالی کا احساس دلا کر عبرت دلاتا ہے اور مستقبل کی اُمید افزا تصویر کھینچ کر منزل کی طرف بلاتا ہے۔ چین کے قومی شاعر" فسیمو ہسو

[illegible]) کو لویا اطالیہ کے " والینیرد " کو۔ فارس کے " عشقی " کو لویا ترکی کے " ضیا " کو اقبال لولویا نذر الاسلام کو ــــــــ اس مہم میں سب کا طریقۂ عمل ایک ہی ہے۔ لیکن ان تمام شاعروں کو بھی دو حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ ایک تو وہ جو پُرانی تہذیب کے علمبردار ہیں۔ قدیم کو 'جدید' پر فوقیت دیتے ہیں۔ دوسرے وہ جو ایک عالمگیر انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں۔ جو ماضی کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دینا چاہتے ہیں۔ اس گروہ کا پیشوا نذر الاسلام ہے۔ کہتا ہے:-

" غیر متمدن شباب ہمیشہ اس دنیا کا حکمراں رہا ہے
جس نے بوڑھاپے کے احکام کو ہمیشہ پائے استغنا سے ٹھکرا دیا ہو۔ آج وہ اس کی توقیر کیوں کرے گا ؟ آؤ ہم ایک
نئی دنیا کی تعمیر کریں، ایک نیا پیام سنائیں
یہ زمین ادب سے جھک کر ہمارے تحفہ کو قبول کرے گی
ابتدائے آفرینش سے بوڑھوں کو جوان ہی دفن کرتے آئے ہیں
آج ہم بڑھاپے کو ہمیشہ کے لئے سپردِ خاک کر دیں گے۔ وہ بد دعا دے گا تو ہم ہنس کر کہیں گے " اناللہ وانا الیہ راجعون ! "

نذر الاسلام اس پیام شباب کا حامل ہے۔ وہ قطعاً " حقائق پرست " (Realist) شاعر ہے وہ ٹیگور کی طرح زندگی کے مصائب سے گھبرا کر الوہیت اور حقانیت کے ترانے نہیں الاپتا۔ اور نہ ان مصائب کو دور کرنے کے لئے وہ اقبال کی طرح " گنبدِ نیلوفری " سے کسی " تماشہ " کی توقع رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا کی تعمیر اور تخریب انسان کے ہاتھ میں ہے۔ قدیم نظام تعمیر کی بنیاد ہی تخریب ہے۔ اس لئے انسانیت کا مستقبل نوجوانوں کے ہاتھ میں ہے:-

" میں اس شباب کا پیامبر ہوں
جو آج خون آشام تلوار لئے ہوئے دشواریوں کے مٹا دینے کو نکلا ہے
جس کی سانس کی لپٹ سے دقیانوسی کتابوں کے اوراق جل اُٹھتے ہیں،
مندروں اور مسجدوں کو بزدل اور ناکارہ بوڑھوں نے گناہ و نفاق کا گھر بنا رکھا ہے
میں اس شباب کا ندیم ہوں جو انھیں مسمار کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے
جس کے چشمۂ زندگی کی روانی قدامت کی چٹانوں کو بہالے جاتی ہے
وہ شباب جو روایات و رسوم کی ہڈیاں تک چبا ڈالتا ہے
میں ان کے گیت گاتا ہوں جو دنیا میں مقصدِ حیات کی طرف تیزی سے قدم اٹھا رہے ہیں
وہ مسافر جس نے اندھیری رات میں تلاطم خیز دریا کے اندر ناخدا کو ٹھکرا کر اپنے بھروسے ناؤ ڈال دی تھی وہ صبح تک بھی ساحل پر نہ پہنچا
آہ ! اُسی گم شدہ دوست کی یاد میں شمع روشن کئے نالۂ نیم شبی میں مصروف ہوں
آنکھوں میں نیند کہاں، وہ تو اس کے انتظار میں فرشِ راہ بنی ہوئی ہیں

مگر ـــــ صبح بھی وہ نہ لوٹا جو نئی دنیا کی تلاش میں نکلا تھا، جو اس بحرِ بیکراں کی تھاہ لینا چاہتا تھا، جس کے خوف سے موت

کے فرشتے ہمیشہ ہوشیار رہتے ہیں

سمندر کی گہرائیوں میں، وسیع آسمانوں میں زندگی کی پرشور روانیوں میں جو ہمیشہ موت کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے

جو زہر کی پرواہ کئے بغیر ناگ کے سر سے گوہرِ شب چراغ نکال لیتا ہے

جو برقِ تپاں کو تابعِ فرمان بنا لیتا ہے

طوفان جس کا ہمرکاب ہوتا ہے

میرا نغمہ اس کے تذکروں سے دنیا کو بھر دے گا

پھانسی کی رسی جس کے گلوگیر ہوتی ہے

جس سے آنکھیں ملا کر دخیرۂ صبح کے رخسارِ شفق کی سرخی حاصل کیا کرتے ہیں

میں اُسی کا قصیدہ خواں ہوں"

"آگ بینا" کی اشاعت نے شاعر کے سر پہ شہرت کا تاج رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد ہی "وِدروہی" (باغی) کے عنوان سے نظم شایع ہوئی، اس نے نذر الاسلام کو آسمانِ شاعری کا آفتاب بنا کر چمکایا۔ بنگالی ادیبوں نے اُسے "وِدروہی کبی" یعنی شاعرِ بغاوت" کا خطاب دیا۔ ایک عرصہ تک جرائد میں اس نظم کے چرچے ہوتے رہے۔ کئی مجلسوں میں شاعر کو یہ ولولہ انگیز نظم پڑھنی پڑی۔ مشہور زمانہ پروفیسر ونئے کمار سرکار اپنی تصنیف (Futurism of Asia) میں اس نوجوان شاعر کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"جب میں نے قاضی نذر الاسلام کی نظم موسومہ "وِدروہی" (باغی) کو پڑھا تو مجھے محسوس ہوا کہ گزشتہ دس سال سے ہم بنگلہ ادب میں جس انقلاب کے متوقع تھے، اس کا آغاز ہو گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دنیائے ادب میں زندگی اور جوش کا ایک دریا اُمنڈ پڑا ہے۔ مسلمانوں نے ابھی تک اپنی مادری زبان کی خدمت بساط کے موافق نہیں کی تھی، لیکن بنگال کی سوئی ہوئی روح کو بیدار کرنے کا سہرا شاید اُن کے ہی سر بندھنے والا تھا"

برلن یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر ہل یوتھ وان گلاسنپ نے لکھا ہے کہ نذر الاسلام کی نظمیں بانسری کی طرح سُریلی اور آگ کی طرح گرم ہوتی ہیں۔ یوروپ کے کئی نقادوں نے اُسے (Bard of Indian Revolution) "انقلابِ ہند کا نقیب" بتلایا ہے۔ یہ امر بھی خالی از دلچسپی نہیں ہے کہ اوّل اوّل یہ نظم بنگال کی مجلسِ ادب میں پڑھی گئی، جس کے صدر ڈاکٹر ٹیگور تھے۔ جب نظم کا مسودہ مجلس کے آگے پیش ہوا تو نئی نئی بندشوں اور عجیب عجیب بحروں کو دیکھ کر بوڑھے

اس مضمون میں تمام نظمیں براہِ راست شاعر کے مجموعۂ کلام (سنچیتا) سے لی گئی ہیں

ادیب بہت برہم ہوئے اور اسے پڑھنے کی اجازت دینے سے انکار کیا ۔ جب جلسہ برخواست ہونے لگا تو نذر الاسلام آستینیں الٹے بکھرے ہوئے بالوں کو سنبھالتے ہوئے چبوترے پر آکھڑے ہوئے اور اپنے مخصوص انداز میں پڑھنا شروع کر دیا ۔ اس کے بعد جو کیفیت ہوئی اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں، جنھوں نے شاعر کو پڑھتے ہوئے دیکھا ہے ۔ وہ موسیقی کا زبردست ماہر ہے اور اسی وجہ سے لفظ و معنی میں وہ حیرت انگیز ربط قائم رکھ سکتا ہے ۔ سامعین کے جوش و خروش کا یہ حال ہوتا ہے کہ ہر طرف تمتمائے ہوئے چہرے، بند مٹھیاں اور کانپتے ہوئے جسم دکھلائی پڑتے ہیں ۔ " باغی " کی اشاعت نے شاعر کی ناموری کو چار چاند لگا دئیے ــــ بنا بریں یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ نذر الاسلام کے چھ دیوان یعنی :ــــ (چندر بندو) (دشیر بانی) (بیلئے مشکھا) (یوگ بانی) (بھانگار گان) (سندھیا) اب تک ضبط ہو چکے ہیں اس طرح ان کے کلام کا بیشتر حصہ ناپید ہے ۔ باقی نظموں کا انتخاب " سنچتا " کے نام سے شائع ہوا ہے جسے شاعر نے ٹیگور کے نام پر معنون کیا ہے ۔ اس سے پہلے ٹیگور بھی اپنی ایک کتاب ان کے نام سے معنون کر چکے ہیں ۔ ان میں سے کوئی نظم زورِ بیان اور آتش کلامی کے اعتبار سے اس کی ہم پلہ نہیں ہے ۔ ضبط شدہ کلام میں البتہ کئی نظمیں اس کے مقابلہ میں پیش کی جا سکتی ہیں ۔ " طوفان " نامی نظم کی تو ٹیگور بیحد تعریف کیا کرتے ہیں ۔ انھوں نے تو اسے دنیا کے شاہکاروں میں شمار کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس موضوع پر اس سے بہتر نظم نہیں کہی جا سکتی ۔ وکٹر ہیوگو کی زندہ جاوید " آندھی " بھی اس سے پیچھے رہ جاتی ہے ــــ اسی طرح تحریک خلافت کے زمانہ میں جب شاعر کو اسیرِ فرنگ رہنا پڑا تھا ۔ قید خانہ میں نظم موسومہ " کسان " لکھی گئی مشہور روایت ہے کہ روشنائی اور کاغذ نہ ملنے کی وجہ سے نذر الاسلام نے اپنے خون اور ناخنوں سے دیواروں پر یہ نظم مرقوم کی تھی ۔ افسوس کہ یہ ادبی جواہر پارے دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو گئے ورنہ ایک روز بین الاقوامی شہرت حاصل کرتے

بحالات موجودہ " باغی " کا شمار شاعر کی بہترین نظموں میں ہوتا ہے ۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس نظم کا ترجمہ بہت دشوار ہے ۔ پھر بھی میں نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ اصل کا ایک خاکہ ناظرین کے آگے پیش کر دوں ۔ اس قسم کی شاعری کی جان زبان کی روانی اور زورِ تحریر ہوا کرتا ہے جسے دوسری زبان میں منتقل کرنا بالکل ناممکن ہے ۔ تو بھی اسے پڑھ کر شاعر کے جذبات کی گہرائی، اسلوب بیان کی ندرت اور تخیل کی بلندی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔ یہ نکتہ بھی فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ اس زمانہ میں شاعر کی عمر صرف ۲۴ سال کی تھی ۔ اس عمر میں یہ شہرت شاید ہی کسی دوسرے شاعر کو نصیب ہوئی ہو :ــ لکھتا ہے :ــ

کہدے اے جوانمرد کہدے ــــ کہ میں سربلند ہوں ! اتنا بلند ! اتنا بلند کہ ہمالیہ کی چوٹی بھی میرے آگے سرنگوں ہے

کہدے اے بہادر کہدے کہ اس وسیع آسمان کو چیر کر، چاند سورج اور ستاروں کو توڑ کر، آسمان و زمین، دوزخ و

بہشت کو دہلا کر، عرش سے ٹکرا کر میں اس دنیا کے لئے مجسمۂ حیرت بن گیا ہوں!
کہدے اے جوانمرد! کہدے کہ میرا سر ہمیشہ بلند رہے گا! میں انانی سرکش، سنگدل، اور آتش زبان ہوں، میں قیامت کا ندیم ہوں، طوفان ہوں! تباہی ہوں! دہشت ہوں، میں دنیا کے لئے سراپا ہلاکت ہوں!
میں اٹل ہوں! ہر چیز کو چکنا چور کر دیتا ہوں! لاأبالی ہوں اصول شکن ہوں! قانون، قاعدہ، پابندیوں اور بندشوں کو پاؤں کے نیچے روند ڈالتا ہوں!
بربادی کا دیوتا ہوں! موسم ہو یا نہ ہو موسلا دھار برکھا برسا دیتا ہوں!
میں باغی ہوں! مادرگیتی کی سرکش اولاد! کہدے اے جوانمرد کہدے کہ میرا سر ہمیشہ بلند ہی رہے گا!
میں ہوں بادِ سموم اور لُو کا گرم جھونکا! میری راہ میں جو چیز حائل ہوتی ہے اُسے میں چوُر کر ڈالتا ہوں!
میں وحشیوں کا رقص ہوں!
اپنے تال پر میں آپ ہی رقص کرتا ہوں! دنیا کی بندشوں سے آزاد ہو چکا ہوں۔ میں سپاہیوں کا گیت ہوں! میں سراپا آتشیں موسیقی ہوں!
میں سراب صحرا ہوں!
چلتا ہوں اور بھٹکتا ہوں، سنبھلتا ہوں اور لڑکھڑاتا ہوں ایک ایک قدم پر ہزاروں لغزشیں،
میں مضطرب برق سوزاں ہوں
جو دل میں آتا ہے کرتا ہوں
دشمن سے تکرار کرتا ہوں اور موت سے نبرد آزمائی میرا کھیل ہے!
طوفان ہوں، دہشت ہوں! مہلک مرض ہوں! ایک عالمگیر خطرہ!
حکومتوں کے لئے آفت کا آتش فشاں!
غارتگری ہوں —— تندخو، ہمیشہ بیقرار
کہدے اے بہادر کہدے کہ میں ہمیشہ سر بلند رہوں گا! میں ہوں سرمستِ ازلی، اور رندِ خانہ خراب، جسے کوئی طاقت دبا نہیں سکتی!
میرا پیمانۂ زندگی ہمیشہ چھلکتا رہتا ہے۔ میں قربانگاہ کی آگ ہوں۔ آگ کا دیوتا ہوں۔ میں خود ہی آتش ہوں اور خود ہی آتش پرست!
میں ہی تخلیق ہوں! اور میں ہی تخریب!
میں شہر آباد ہوں! اور شہر خموشاں بھی!

لیلائے شب کا قاصد ہوں !
دیوتاؤں کی ملکہ کا نورِ نظر ہوں۔ میری مٹھی میں چاند ہے اور پیشانی پر سورج جگمگاتا ہے
ایک ہاتھ میں بانس کی سُریلی بانسری ہے اور دوسرے میں لڑائی کا بگل !
میں مہادیو ہوں جس نے غم کا سمندر رکھنگال کر ہلاہل نکالا اور خود ہی پی لیا تھا[1]۔ میں "دیوم کیش"[2] ہوں جس نے گنگا کو اپنی زلفوں میں قید کر رکھا ہے۔
خود کو چھوڑ کر میں کسی اور کے آگے سر نہیں جھکاتا
میں کوندے کی لپک اور بجلی کی چمک ہوں ! صورِ اسرافیل کی بازگشت ہوں !
قیامت کے دیوتا کا پرچم اور جبریل کا عصا ہوں !
میں ان پیغمبروں کا پیرو ہوں جن کی چین جبیں ایک عالم کو تہ وبالا کر ڈالتی تھی
میں آتش کا پرکالہ ہوں ! اس دنیا کو جلا کر خاک کر دوں گا !
میں وہ قہقہہ ہوں جو دل سے نکلتا ہے لیکن دُنیا کا دشمن اور خطرۂ عظیم بھی ہوں !
میں آفتاب کی تپش ہوں ، میں کبھی پُرامن ہوں ! تو کبھی شر انگیز
میں وہ نوجوان ہوں جس کی رگوں میں تازہ خون بہتا ہے
میں وہ ہوں جو دنیا کا غرور توڑ دیتا ہے ۔ میں ... کی لپیٹ ہوں اور دریا کی پُر شور روانی ۔ میں روشن ہوں آگ کی طرح !
میں بہتے ہوئے پانی کی آواز ہوں —— چنچل موجوں کی شیریں راگنی !
کسی دوشیزہ کی زلفِ پریشاں کا جوڑا ہوں ، ترچھی آنکھوں کا تیر ہوں !
کسی حسینہ کا اوّلین بوسہ ہوں ! آفریں ہے مجھ پر !
کسی غم رسیدہ کا دل بیقرار ہوں ۔ کسی بیوہ کے دل کی آہ ہوں ! کسی لوٹے ہوئے دل کی فریاد ہوں ، میں اس مسافر کا غم ہوں جو ہمیشہ کے لئے آوارۂ وطن بن کر مارا مارا پھر رہا ہو ۔ کسی دل جلے کی پکار ہوں ! زہر کی تلخی ہوں ! محبوب نے جس دل کو ٹھکرا دیا ہو اس کی دھڑکن ہوں !

---

[1] ہندوؤں کی ایک مذہبی روایت ہے کہ سب دیوتاؤں نے سمندر کو چھان کر اس میں سے ۱۴ جوہر نکالے جن میں سے ایک زہر بھی تھا آبِ حیات پینے والے تو سب تھے لیکن سمِ قاتل پینے کی جرأت کون کرتا ؟ آخرش مہادیو جی نے زہر کو گلے سے نیچے اتار دیا

[2] مہادیو جی کا ایک لقب "دیوم کیش" ہے یعنی جس کے بال بکھرے ہوئے ہیں روایت ہے کہ گنگا ان کی زلفوں سے ہو کر نکلی ہے

کسی مغرور اور غضبناک دل کی بے کسی ہوں۔ وہ درد ہوں جو دل پر چھا گیا ہو!
پہلے بوسے کے بعد دوشیزہ کے جسم میں پیدا ہونے والی تھرتھری ہوں
کسی پردہ نشین معشوق کی سہمی ہوئی نظر ہوں جو شرارت سے دیکھنے کے بعد بھی یوں آنکھ چرا لیتی ہے گویا دیکھا ہی نہیں
کسی چنچل چیت چور کا عشق ہوں اور اس کی چوڑیوں کی میٹھی جھنکار!
میرا بچپن اور جوانی دائمی ہے
جو دیہاتی لڑکی جوانی کے بوجھ سے دبی جاتی ہے میں اس کے دامن کا بجوڑ ہوں!

میں بادِ نسیم بھی ہوں اور بادِ سموم بھی
میں اس شاعر کا متین ترانہ ہوں جو راہ طے کر رہا ہے اور بانسری پر گیت بھی گاتا جاتا ہے
میں تشنہ لب اور پریشان دل ہوں، میں وہ سورج ہوں جو آگ برساتا ہے
ریگستانی آبشار کی روانی ہوں۔ میں دیوانہ وار دوڑ رہا ہوں، میں وحشت ہوں!
میں ترقی ہوں اور تنزل! بیہوش قلب کا ہوش ہوں!
اس سرائے فانی پر میرا جھنڈا لہراتا ہے — انسان کی ظفرمندی کا میں نشان ہوں
جب طوفان کی طرح تالی بجاتے ہوئے جھپٹتا ہوں تو زمین و آسمان میرے ہمنوا ہو جاتے ہیں
دنیا کی پیٹھ پر میں آگ کا پہاڑ ہوں، شعلۂ جانکاہ ہوں
میں وہ جنگ کی دیوی ہوں جس کا سر تن سے جدا ہو گیا تھا۔ میں تباہی کی دیوی ہوں!
جہنم کی آگ سے نہا کر جب میں ہنستا ہوں تو میرے منہ سے پھول جھڑنے لگتے ہیں!
میں فانی ہوں۔ میں باقی ہوں، ابدی ہوں، ازلی ہوں، وہ وحدت ہوں جو کثرت سے بالاتر ہے
میں انسان، شیطان، فرشتہ سب کے لئے باعث خوف ہوں، دنیا میں آج تک مجھے شکست نہیں ہوئی اور نہ کبھی ہوگی
میں خدا ہوں، میں حقیقی معنی میں مکمل ترین انسان ہوں! بہشت، زمین اور تحت الثریٰ میں رقص کرتا پھرتا ہوں
میں دیوانگی ہوں، وحشت ہوں!
میں نے خود کو پہچان لیا۔ میرے سب بندھن کھل گئے
میں "پرشورام"[1] کی سنگدل کلہاڑی ہوں۔ دنیا کو خونریزیوں سے میں پاک کر دوں گا ہاں میں ہی امن و امان قائم کروں گا!

---

[1] ہندوؤں کی روایت ہے کہ رامچندر جی کے عہد میں پرشورام نے ۲۱ مرتبہ دنیا کو چھتریوں سے پاک کر دیا تھا۔ جب انھوں نے رام چندر جی سے منہ کی کھائی جو خود بھی چھتری تھے تو اپنی حرکت سے باز آ گئے

ایک نئی تخلیق کرکے اس کی خوشی میں میں اس پابند دنیا کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا
میں تحت الثریٰ کا مے نوش ہوں جہاں آگ شور و غوغا مچاتی ہوئی دہاڑیں مارا کرتی ہے
میں بجلی پر بیٹھ کر کلیلیں کرتا ہوا کبھی یہاں اور کبھی وہاں دوڑتا پھرتا ہوں !
میں زلزلہ پیدا کرکے دنیا کو لرزہ براندام کر دیتا ہوں - کرشن کی کلغی اور جبریل کے نورانی عصا کو میں نے چھین لیا ہے
میں دیوتاؤں کی اولاد ہوں میں مضطرب ہوں، میں گستاخ ہوں، مادرِ عالم کا آنچل اپنے دانتوں سے تار تار کر ڈالتا ہوں
میں آرجس کی بانسری ہوں - میری جادو بھری تان سے متوالا ہو کر سمندر گرج گرج کر آتا ہے اور دنیا کو بوسہ دے کر سلا دیتا ہے
میں خیام کے ہاتھوں کی ملسی ہوں جب میں بگڑ کر اٹھتا ہوں تو آسمان کو ہلا دیتا ہوں اور دوزخ بھی تھر تھر کانپنے لگتی ہے
میں ساون کے سینہ کی ڈبڈبائی ہوئی ندی ہوں - کبھی زمین کو شاداب بنا دیتا ہوں، تو کبھی برباد، میں بے انصافی ہوں، شہاب ثاقب ہوں، مریخ ہوں، دُمدار ستارہ کی آگ ہوں، زہریلے ناگ کا من ہوں، میں باغیوں کا سردار ہوں، خونخواری سے میرا جی بھر گیا ہے
میں اسی روز مطمئن ہوں گا جب مظلوموں کی فریاد فضائے آسمانی میں نہ گونجے گی
جب میدانِ جنگ پر تلوار اور خنجر کے خوفناک ترانے نہ سنائی دیں گے
اے وہ جو باغی ہے یا جو میدان جنگ سے نالاں ہے اسی روز وہ خاموش ہوگا !
میں وہ باغی "بھرگو" [1] ہوں جس نے بھگوان کے دل پر اپنا نقش قدم ثبت کر دیا تھا، میں اس تخلیق کا بانی ہوں، جو خیالی قسمت، سارے ظلم و ستم کی جڑ ہے اس کے سینہ کو میں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں گا
میں وہ باغی ہوں جو قسمت کا طلسم توڑ ڈال سکتا ہے - میں ہوں جوانمرد، ازلی باغی - دنیا کو ٹھکرا کر ایک بار پھر میں تن تنہا سر اٹھا کر اٹھ کھڑا ہوا ہوں !

تقریباً کبھی قوم پرور شاعروں نے اس موضوع پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہے — انگریزی زبان کے خوش فکر شاعر (S. Swinburne) نے اسی موضوع پر (Hertha) کے عنوان سے ایک غیر فانی نظم لکھی ہے "تخریب" پر لارڈ بیرن کی نظم انگریزی ادب میں اپنے رنگ کی ایک ہی چیز سمجھی جاتی ہے۔ سحر طراز روسی ادیب پوشکن (Pushkin) کا ترانۂ آزادی، تو اب کلاسک میں شمار ہونے لگا ہے - لیکن انصاف سے دیکھا جائے تو نذرالاسلام کے "باغی" کے آگے یہ تمام شاہکار پھیکے پڑ جاتے ہیں

بغاوت ! اس لفظ میں نذرالاسلام کی پوری شخصیت پنہاں ہے - ظلم و بے انصافی سے لڑنے کے لئے وہ ہمیشہ

---

[1] ہندوؤں کی روایت ہے کہ جب وشنو آرام کر رہے تھے تو برہما کے سرکش فرزند "بھرگو" نے ان کے دل پر ٹھوکر لگا دی تھی

لبریز ہے۔ مظلوموں کے حامیوں کی قصیدہ سرائی کے لئے ہمیشہ تیار ہے۔ کبھی ہم اُسے مصطفےٰ کمال کی فتح پر نعرۂ شادمانی بلند کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ کبھی وہ انور پاشا کی یاد میں بیقرار نظر آتا ہے۔ زاغلول پاشا کی موت پر اس نے جو مرثیہ لکھا تھا، شاید اپنے رنگ کی ایک ہی چیز ہے۔ کبھی گاندھی جی کے چرخہ کی تعریف کرتا ہے، کبھی اُن کی سیاسی قلابازیوں کی مذمت کے لئے شمشیر بکف ہو جاتا ہے۔ اور یہ سب اس سبب سے کہ اس کا دل غریبوں اور مظلوموں کی ہمدردی سے لبریز ہے

مشہور روسی افسانہ نویس (Turgnew) کے شاہکار "باپ اور بچے (Fathers and children) کے نہلسٹ ہیرو 'بزاریو' (Bazareo) کے کردار پر کسی نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا

(Destruction destroyed in its own destroying) "وہ بربادی جو برباد کرتے کرتے خود برباد ہو گئی"۔ ممکن ہے کہ وہ حضرات جن کے کان بلبل و قمری کی غزل سرائی کے عادی ہوں، اس صورِ اسرافیل سے برگشتہ خاطر ہو کر اس جملہ کو استعمال کریں۔ لیکن درحقیقت نذر الاسلام تخریب کا حامی نہیں ہے۔ نپولین اکثر کہا کرتا تھا کہ آئندہ نسلوں کے لئے میں اس دنیا کو توپ سے صاف کر دینا چاہتا ہوں۔ نذر الاسلام بذاتِ خود اشتراکی ہے۔ کسان، مزدور اور انقلاب پرور نوجوان کے جذبات کی ترجمانی کرنا اس کی زندگی کا مقصد ہے۔ اس کے لئے وہ ہر قسم کی قربانی کرنے کو تیار ہے۔ اس کی زندگی کا سرمایہ حکومت ضبط کر لیتی ہے۔ دو دو مرتبہ اسے قید و بند سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس کے باوجود اس کا نغمہ جاودانی ہے۔ سرمایہ داری کے نظام کو درہم برہم کرکے وہ ایک نئی دنیا کی تعمیر کرنا چاہتا ہے جس کا سنگ بنیاد اخوت مساوات اور آزادی پر رکھا جائے گا۔ "رنجگر" میں اپنے نقطۂ نگاہ کی تشریح اس نے بڑے دلکش انداز میں کی ہے۔ بعض حصوں کا ترجمہ یہاں دیا جاتا ہے:۔

انسان ۔

میں اشتراکیت کے گیت گاتا ہوں

انسان سے بڑا کوئی نہیں ہے

ہر زمانہ میں، ہر ملک میں، ہر نسل میں جتنے انسان ہوتے ہیں، سب ایک ہی رشتہ میں منسلک ہوتے ہیں۔ وہ سب انسانیت کے زمرہ میں شامل ہوتے ہیں

"پجاری، دروازہ کھول! بھوک کا دیوتا دیر سے کھڑا ہوا ہے۔ اٹھ کہ پوجا کا وقت ہو گیا ہے"

خواب میں یہ ندا سنکر پجاری چونک کر اٹھ بیٹھا اور عبادت گاہ کا دروازہ کھول دیا

سوچا کہ دیوتا کا کرم ہو تو سارے دلدر دور ہو جائیں

مسافر کے کپڑے تار تار تھے اور وہ بید مجنوں کی طرح لاغر تھا۔ بھوک سے کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ "بابا! سات دن کا بھوکا

ہوں۔"

مگر دروازہ بند ہوگیا اور ہراساں بھکاری اندھیری رات میں جاڑے میں کانپتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ بھوک کی آگ میں وہ جلا جاتا تھا۔ اس نے چیخ کر کہا۔ "دیوتا! یہ تیرا نہیں 'پجاری کا مندر ہے!"

کل مسجد میں کہیں سے کھانا آیا تھا۔ پلاؤ قورمہ کی رکابیوں کو مُلا للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اُسی وقت ایک مسافر آیا، جسکا جسم تکان سے چور چور ہو رہا تھا۔ بولا۔ "بابا! کئی روز سے فاقہ کر رہا ہوں"۔ مُلا نے دیدے نکال کر کہا۔ "مردود! یہ تیرے گناہوں کی سزا ہے! کبھی نماز بھی پڑھتا ہے؟"

بھکاری نے کہا۔ "جی نہیں!" ملا نے چیخ کر کہا "ملعون! نکل خدا کے گھر سے!" یہ کہکر مسجد میں اُس نے قفل جڑ دیا۔

درویش نے آہ بھر کر کہا۔ "یارب! اسّی سال کی مُدت میں میں نے تجھے کبھی یاد نہیں کیا۔ تاہم، میری روٹیوں پر تو نے پابندی نہیں لگائی۔ تیرے مندر و مسجد پر انسان کا کیا اختیار ہے؟ پنڈتوں اور ملاؤں نے اون پر کیوں قبضہ کر رکھا ہے؟

ہلاکو، چنگیز، غزنوی اور کالا پہاڑ کہاں ہیں؟ ان مقفل عبادتگاہوں کو توڑ کر کیوں نہیں پھینک دیتے؟

اے عبادتخانو! تمھارے میناروں پر چڑھ کر منافقت نفس پرستی کا پرچم لہراتی ہے

مجھے انسانوں سے نفرت ہے

قرآن، وید اور انجیل کو چوم چوم کر یہ کمبخت مرے جاتے ہیں۔ یہ نا سمجھ کتابوں کی پرستش کرتے ہیں۔ کوئی انھیں بتلائے کہ انسان کتابیں بناتا ہے۔ کتابیں انسان پیدا نہیں کر سکتیں

ہم سب کی رگوں میں مذہب کے بانیوں کا خون بہہ رہا ہے۔ ہم انھیں کی اولاد ہیں۔ ہم بھی اون جیسے انسان ہیں معلوم نہیں، ہم میں سے کون اون کے رتبہ کو حاصل کرے!

ہمدم! میرا مذاق نہ اوڑا۔ "انا" کی عظمت کا اندازہ کون لگا سکتا ہے؟

ممکن ہے کہ ہمیں میں کوئی کلجگی اوتار ہو، کوئی مہدی ہو، کوئی عیسیٰ ہو

پھر تو کس سے نفرت کرتا ہے؟ کس پر وار کرنا چاہتا ہے؟

ارے نادانو! اس کا سینہ بھی بیت اللہ ہو سکتا ہے

مگر وہ بیمار اور نحیف ہے۔ اگر نادار اور مفلس ہے تو کیا ہوا؟

دنیا کے تمام عبادتخانے اس پیکر خاکی سے زیادہ متبرک نہیں ہو سکتے

ہمدم! تیرے سینہ میں لالچ کی آگ سلگتی ہے اور آنکھوں سے خود غرضی ہویدا ہے ورنہ تو دیکھتا کہ فرشتوں کو جا کر تنا کر تو خدمت لیتا ہے

درد دل ہی شمع حقیقت ہے۔ لیکن ظالم! اس جوہر انسانیت کو تو اپنے نفس پر قربان کر رہا ہے

تو کیا جانے کہ موت کا راز تیری ہوس میں مضمر ہے

گناہ۔

میں اشتراکیت کے گیت گاتا ہوں

سب گناہ گار میرے بھائی بہن ہیں

اس جہانِ معصیت میں کس کا دامن گناہوں سے پاک ہے؟

آدم سے لے کر نذرالاسلام تک ــــ کون ایسا ہے جسنے گناہ کے پھل کو نہ چکھا ہو؟

یہ تو پاپوں کی بستی ہے

اسکی آدھی ملکیت شیطان کے ہاتھ میں ہے اور آدھی خدا کے ہاتھ میں

مذہبی دیوانو، سنو! دوسروں کی آنکھوں کا تنکا دیکھنے سے پہلے اپنی آنکھوں کے شہتیر کو دیکھو!

یہ دنیا تو سیہ خانہ ہے اس حمام میں سب ننگے ہیں، لیکن اپنے گناہوں کی ترازو پر ہم دوسروں کے عیوب کو تولتے ہیں۔ زاہدا! پاکی دامن کا دعوے ہے تو تزویر کی کمند "داڑھی" لٹکائے دوسروں پر اپنی معصومیت کا سکہ کیوں بٹھانا چاہتا ہے؟

پولیس کا ہونا، جس طرح چور کے وجود کا پتہ دیتا ہے،

اسی طرح تیری صورت و وضع بھی تیری سیہ کاریوں پر دلالت کرتی ہے

طوائف

تجھے طوائف کہکر کون حقارت سے ٹھکراتا ہے؟

تو جو بھی ہو، ہماری ماؤں بہنوں کی ہم جنس تو ہے

تیرے بچے بھی ہم جیسے ہیں۔ وہ بھی توقیر اور عزت حاصل کر سکتے ہیں۔ اُن کی آواز بھی روح القدس سے ہم آہنگ ہو سکتی ہے

بعید الجنس کے بعد انسان سے نفرت صریح کفر ہے

کیا گناہ کا مرتکب کبھی ثواب نہیں کر سکتا؟

اگر اہلیا[1] کو نجات حاصل ہو سکتی تھی اور 'میری'[2] عصمت کی دیوی بن سکتی تھی

---

[1] "اہلیا" گوتم رشی کی حسین و جمیل بیوی تھی، جس پر اندر دیوتا سوجان سے فریفتہ ہو گئے۔ ان دونوں کی بدنیتی کا پتہ چلنے پر رشی جی نے اہلیا کو بددعا دی کہ پتھر کی مورت بن جا۔ جب رام چندر جی کے پیر اس پر پڑے تو اس نے پھر انسانیت کا جامہ پہنا [2] "میری" ایک فاحشہ عورت تھی

تو تم بھی حق و صداقت کی راہ پر چل کر قابل عزت بن سکتی ہو ؟
تیری اولاد کو نطفۂ ناتحقیق کہہ کر جو لوگ ٹھکراتے ہیں۔ اون سے میں پوچھوں گا کہ
اے نیکی کے فرشتو! دنیا والوں میں سے کتنوں کے والدین نے جذبۂ شہوت کو ٹھکرایا ہے ؟ اون میں سے کتنے گناہ سے پاک تھے ؟
نطفۂ تحقیق ہو یا ناتحقیق ــــــ وہ شہوت کا ہی انجام ہوتا ہے
اگر عصمت فروش ماں کا بیٹا حرامی ٹھیرا تو شہوت پرست باپ کا بیٹا بھی یقیناً حرامی کہلائے گا !

عورت

میری نگاہ میں مرد عورت سب برابر ہیں
دنیا کے حشمت و جلال کی تعمیر میں عورت کا بھی اتنا ہی ہاتھ ہے جتنا کہ مرد کا
سوز و ساز، تپش و خلش، ریاکاری اور آنسو ــــــ ان کی تخلیق میں مرد کا اتنا ہی حصہ ہے۔ جتنا عورت کا
دیوی! تجھے گناہ کا سبب کون بتاتا ہے ؟
کہدے کہ گناہ کا تخم بونے والا ابلیس مرد ہی کا ہم جنس تھا
اس جہان میں جتنے پھول کھلتے ہیں، جتنے شجر ابھرتے ہیں
عورت ہی نے اُن میں رنگ و بو، شیرینی و لطافت کی روح پھونکی
ہم نشیں! تاج محل کو بھی غور سے دیکھا ہے
اندر 'ممتاز' سوتی ہے۔ باہر شاہجہاں آرام کر رہا ہے۔ عورت دل ہے مرد جسم ہے
اگر مرد سورج کی تپش اور باد سموم کا جھونکا ہے، تو عورت چاند کی کرن اور نسیم صبح گاہی
اگر مرد تشنہ لب صحرائی ہے تو عورت جام کوثر
عورت ہی نے شاعری کی بنا ڈالی اور مرد کے ہر لفظ کو موسیقی میں بدل دیا
مرد نے ہل چلایا۔ عورت نے پانی سے سینچا۔ ان دونوں کے جوگ سے کھیتی لہلہا اوٹھی
مرد کی ہر فتح و نصرت عورت کی قربانی کی منت پذیر ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۴) جسے زناکاری کے جرم میں لوگ سنگسار کرنا چاہتے تھے۔ جب انھوں نے مسیح سے اجازت چاہی تو انھوں نے جواب میں وہ معرکۃ الآرا جملہ کہا "جس کسی نے کبھی گناہ نہ کیا ہو، اس پر پتھر چلائے" بعد ازاں اس عورت نے اپنی ایسی اصلاح کی کہ لوگ اسکی پرستش کرنے لگے

تاریخ یہ تو بتلاتی ہے کہ کس جنگ میں مردوں نے کتنا خون بہایا
لیکن یہ کون بتلائیگا کہ اس کے لئے عورتوں نے کس طرح اپنا سہاگ اجاڑ دیا ؟
ان کے دل کے ٹکڑوں کو کیسے نکال پھینکا ؟
شجاعت کی داستانوں میں یہ کہاں لکھا ہے کہ فلاں فاتح کی تلوار کو عورت کی ہمت افزائی نے برق دم بنا دیا تھا۔
اسلئے مغرور مرد سُن لے کہ "عورت کو تو جتنا کچلے گا اتنا ہی نامرد ہوتا جائے گا"
عورت ! اپنے نازک ہاتھوں سے دنیا کو آج تک تو نے امرت کے پیالے پلائے تھے
لیکن، اب انھیں ہاتھوں سے سمِ قاتل پلائے جا ! ×××××
پھر وہ دن دور نہ ہوگا جب مرد کے ساتھ ساتھ عورت کے اعزاز میں بھی زمین سے شادمانی کے نعرے بلند ہوں گے

مزدور

اس روز ریل میں دیکھا کہ ایک قلی کو بابو صاحب نے دھکے دے کر نیچے گرا دیا
یہ دیکھ کر دل بھر آیا، آنکھوں میں آنسو آ گئے
کیا دنیا میں کمزور ہمیشہ یوں ہی ذلیل ہوتے رہیں گے ؟
جو مزدور اپنا گوشت و پوست لگا کر ریل کو چلاتا ہے ، اس پر بابو آکر بیٹھتا ہے مگر وہ خود خاک نشین ہے
چندن کی چوکی پر بیٹھنے والو ! تم ہوائی جہاز اور موٹروں پر اوڑے پھرتے ہو
بتلاؤ تو سہی یہ کس کا طفیل ہے !
تمہارے قصر و ایوان اس کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ انکی ایک ایک اینٹ پر مزدور کا افسانہ درد کندہ ہے خاک کا ایک ایک ذرہ تمہاری جاہ و شوکت کے راز سے واقف ہے

غرض کہ ہر فرد بشر کے درد سے شاعر کا حساس دل تڑپ اٹھتا ہے۔ اس کے نزدیک دنیا دو طبقوں میں منقسم ہے۔ ظالم اور مظلوم ! وہ دینِ حق کا یقیناً پرستار ہے۔ لیکن اس کی اشاعت کے لئے مذہبوں کے قید و بند کو توڑ دینا چاہتا ہے۔ خدا کسی خاص ملّت کا خدا نہیں ، وہ جبار و قہار بھی نہیں بہ الفاظ دیگر وہ صرف روح الاجتماع (Social mind) کو خدا جانتا ہے۔ ایک لمحہ کے لئے بھی وہ یہ ماننے کو تیار نہیں ہے کہ کوئی بیرونی طاقت اس دنیا کے معاملات میں دخل دیتی۔ انسانیت کا نصب العین فطرت کی فتح ہے۔ جس دن انسان اس کے آگے سر نیاز خم کریگا ، اسی روز تہذیب و تمدن خاتمہ ہو جائے گا

سرسری طور پر نذر الاسلام کی شاعری تین حصوں میں بانٹی جا سکتی ہے۔ دورِ اوّل کو محاورۂ عام میں "باغی اسلام"

سکتا ہے۔ مشہد مقدس کی زیارت نے شاعر کے دل میں جو ہیجان برپا کیا تھا، اس کا اثر اس دور کی تمام نظموں پر نمایاں
۔ مزار مبارک سے لوٹ کر شاعر نے ایک ولولہ انگیز نظم لکھی۔ اس کے بعد کمال پاشا۔ زاغلول پاشا۔ انور پاشا۔ محرم اور قربانی
کی اشاعت نے مسلمانانِ بنگال کے خفتہ جذبات کو بیدار کردیا۔ سب سے پہلی مرتبہ سبک اور عام فہم اردو الفاظ کا استعمال
نے ان نظموں میں شروع کیا۔ قدامت پسندوں نے اس اجتہاد کے خلاف سخت شورش برپا کی لیکن قبول عام کو کیا کیجئے
الاسلام کے اشعار کے ساتھ یہ الفاظ بھی زبان زد ہوگئے اور آج ہر طرف سے "گل وبلبل کی فریاد" اور "مے و مینا"
لہ اٹھتا نظر آتا ہے۔ قومی زبان کی اشاعت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ مقامی زبانوں کے جمود کو توڑا جائے۔ نذرالاسلام
ولت بنگال میں یہ راستہ صاف ہوگیا ہے۔ بہرکیف۔ یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ اس زمانہ میں کسی موضوع پر لکھتے ہوئے شاعر
ستان کی جنگ آزادی کو فراموش نہیں کرتا۔ مثلاً بقرعید کی قربانی میں وہ "ستیاگرہ" کی اسپرٹ پنہاں پاتا ہے۔ واقعۂ کربلا کو
کی عارضی فتح تصوّر کرتا ہے۔ اس کے نزدیک محرم کا صرف یہ مطلب ہوسکتا ہے کہ ظلم و بے انصافی کی طاقتوں کو شکست
ہادتِ حسین کا انتقام لیا جائے

"باغی" کی اشاعت کے بعد تین چار سال تک شاعر ایک ہنگامی کیفیت میں مبتلا رہتا ہے۔ یوں تو وہ استعمار
ستبداد کے خلاف سب کچھ لکھتا ہے، جیل بھی ہو آتا ہے۔ لیکن نہیں جانتا کہ اس تخریب کے بعد تعمیر کی کیا صورت ہوگی
ب کا تعمیری پہلو کیا ہوگا۔ کئی سال کے غور و فکر کے بعد وہ اپنے آپ کو پہچان جاتا ہے اسی واقعہ کی طرف اشارہ
تے ہوئے "افلاس" میں وہ لکھتا ہے:-

"اے افلاس! تو نے بھی مجھے کیا عظمت بخشی ہے
عیسیٰ کے سر پر کانٹوں کا تاج کتنا بھلا معلوم ہوتا تھا۔ تو نے مجھے بھی اسی زینت سے سرفراز کیا
میری نگاہ کو تو نے آتش فگن بنا دیا۔ میری راگنی زہر آلود ہوگئی۔ یہ تیری ہی دعا کا اثر ہے کہ میرا نغمہ شمشیر سے بھی زیادہ
تیز ہوگیا!"

اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا پوری نظم کا ترجمہ یہاں درج کیا جاتا۔ نازک خیالی اور فطرت نگاری، اثر اندوزی
وخیٔ بیان کے اعتبار سے یہ بھی اون کی اچھی نظموں میں ہے۔ اسے کئی مرتبہ فقر و فاقہ کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ خود بھی ستم رسیدہ
زخم خوردہ ہے۔ اس لئے دوسروں کے درد کا وہ بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے۔ اس پر اغیار کی چشمک ایک اور تازیانہ ہے۔ اس
باوجود اُس کا جذبہ نہ کبھی دبا ہے نہ کبھی دبے گا۔ ایک مرتبہ جب کہ شاعر کے گھر کئی فاقے گزر چکے تھے، پڑوس میں شادی
شادیانے بج رہے تھے۔ اسی واقعہ سے متاثر ہو کر شاعر نے یہ نظم لکھی تھی۔ ایک آدھ بند نقل کئے بغیر آگے نہیں بڑھا جاتا۔

"میری آرزو ایک کلی تھی جو شاخِ حسرت میں جھول رہی تھی
ظالم! ابھی وہ کھلنے بھی نہ پائی تھی کہ بھوک کی چٹکیوں سے اسے تو نے مسل ڈالا

میرا جسم بادِ زمہریر کی طرح لرزتا تھا اور زمین شبنم کے آنسو روتی تھی جنھیں بادِ صبا چوم لیتی تھی۔ شبنم کی بوند میں ارمانوں کا دریا بہ رہا تھا۔ آہ! تو نے سورج بن کر اُسے خشک کر دیا۔ حسن و جمال کی وہ دنیا اُجڑ گئی

اے غیظ و غضب کی مورت! جہاں عاشقوں کے لئے لیلیٰ شب مسرّت کی ندیم بنکر آتی ہے، وہیں جاکر دستک دے اور کہہ کہ :- "نادانو! یہ زمین عیش کدہ نہیں ہے

یہ دنیا اس لئے ہے کہ فراق میں تڑپو اور خون کے آنسو بہو۔ معشوق کے آغوش میں کانٹے بچھے ہوئے ہیں۔ ان سے بغلگیر ہو

یہ سُن کر آن واحد میں عشرت کدہ ماتم کدہ بن جاتا ہے اور شمع یہ کہہ کر دم توڑ دیتی ہے کہ

موت کی یہ رات کاٹے نہیں کٹتی!"

نذرالاسلام اپنے کو فلسفۂ قدرت (philosophy of Nature) کی اُلجھنوں سے دور رکھتا ہے خدا اور روح کے تعلقات پر زور دینا وہ اتنا ضروری نہیں سمجھتا جتنا انسان اور انسان کے رشتہ کو سمجھنا۔ سماج کے نظام کو بگاڑنا بنانا انسان کے دستِ قدرت میں ہے۔ لہٰذا فلسفۂ اقدار (philosophy of Values) کی فکر کہیں افضل ہے کانٹ (Kant) جس طاقت کو نامعلوم اور بعید از فہم (Unknowable & Inexplicable) سمجھتا ہے، بفرضِ محال تلاش کرتے کرتے وہ مل بھی گئی تو اس زندگی میں کیا فائدہ ہوگا اور اس کے نہ ملنے سے ہی کیا نقصان ہو رہا ہے جب کہ انسان کا دل ہی دیدۂ حرم ہے۔ علاوہ بریں، موجودہ حالت میں حقیقت کی جستجو بھی عبث ہے جب کہ تمام مخلوقِ خدا جبر و استبداد کے آہنی پنجوں میں تڑپ رہی ہے اور تھوڑے سے لوگ دنیا و جنت کے ٹھیکہ دار بنے بیٹھے ہیں اتنے بڑے امتیاز کے ہوتے ہوئے آزادی سے حقانیت و روحانیت کے رموز کو سمجھنا دشوار ہے۔ مساوات اور اخوت کو وہ انسانیت کا مقصد سمجھتا ہے اور اسی کے لئے لڑنا انسان کا فرضِ منصبی ہے۔ یہی اس کا مذہب و ایمان ہے۔ کسی ایسے اصول کو وہ نہ مانیگا جو اس مقصد کے حصول میں سدِّ راہ بنتا ہو۔ آخرکار، وہ اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ انسانیت کی نجات اشتراکیت کے بغیر ناممکن ہے۔ ایک تعمیری راہِ عمل کا پتہ چلتے ہی جذبات کا شعلہ بھڑکتا ہے۔ کسانوں اور مزدوروں کی عالمگیر بیداری مستقبل کو اُمید افزا بنا دیتی ہے۔ اپنی ایک نظم میں کہتا ہے :-

" وہ مبارک ساعت آپہونچی۔ قرض میں روز افزوں ترقی ہو رہی ہے۔ اُسے فوراً بیباق کرنا ہوگا۔ ہتوڑی اور کدالی سے جو پہاڑوں کو کاٹ کر رکھ دیتا ہے

راستوں کے دونوں طرف جس کی ہڈیاں بکھری پڑی ہیں

تمہاری خدمت کے لئے جس نے قلی اور مزدور کا لباس اوڑھ لیا ہے

تمہارے سامان اٹھانے کے لئے جو ہمیشہ خاک آلود رہتا ہے

دی ---- صرف وہی مزدور مکمل انسان ہے - فرشتہ ہے - میں اسی کے گیت گاتا ہوں
اسی کا شکستہ دل ایک نئی زندگی کی تعمیر کرے گا

اونچی اونچی عمارتوں پر بیٹھ کر اب یہ توقع نہ رکھو کہ ہم خاک نشین اسی وجہ سے تمھارا احترام کریں گے - جو لوگ فرط محبت سے اس زمین کو اوڑھنا بچھونا بناتے ہیں، اب یہ زمین اپنے تئیں انھیں کے سپرد کر دے گی

میں ان پیروں کو بوسہ دیتا ہوں جن میں خاک خود بخود لپٹ جاتی ہے

آج مظلوموں اور بیکسوں کے خون سے رنگ کر بطن گیتی سے آفتاب تازہ پیدا ہوا ہے - اب تمام پابندیوں اور بندشوں کو توڑ کر پھینک دو

فلک کج رفتار کو چاہیئے کہ پاش پاش ہو کر ہمارے آشیانے پر گر پڑے

ہمارے سروں پر چاند، سورج اور ستارے پھول بنکر برسیں کہ ہم نے ایک جہان نو کی داغ بیل ڈالی ہے

رنجبروں کی جمعیت کو مژدہ ہو کہ اب ہم سب ایک ہی کارواں کے مسافر ہیں

اگر ایک کو تکلیف ہوگی تو سب کے دل اس کی کھٹک محسوس کریں گے - ایک کی توہین، بنی نوع انسان کی توہین ہے

آج دنیا کے کل بندھن کٹ گئے ہیں - ایک عظیم الشان دور بیداری کا آغاز ہو رہا ہے جسے دیکھ کر خدا مسکراتا ہے اور شیطان خوف سے لرز رہا ہے!

قومیت، سرمایہ داری، تمیز رنگ و نسل اور مذہب کو وہ انسانیت کے لئے سم قاتل سمجھتا ہے ---- اخوت اور مساوات کی راہ میں یہ سنگ گراں بنے ہوئے ہیں - قدامت انھیں کو آلۂ کار بنا کر آواز شباب کو کچلنا چاہتی ہے - شاعر کا خیال ہے کہ بوڑھوں کے شریک ہوتے ہی نوجوانوں کی تحریکیں ختم ہو جاتی ہیں - ضدین میں ارتباط کیوں کر ممکن ہے؟ لہٰذا جب بھی وہ شباب کو عمل پیرا کرنا چاہتا ہے، ساتھ ہی ساتھ بوڑھے رہنماؤں کی فریب کاری سے انھیں آگاہ کرتا ہے - اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کسی نظم میں لکھتا ہے:-

"ہم تو موت کے ہاتھوں یک کر قدرت کے اس قرض سے بیباق ہو جائیں گے
یہ جسم اس لئے نہیں ہے کہ امراض کا شکار ہو - ہم تو اسے قربانگاہ پر چڑھا دیں گے - یہ جسم کتنا نازک ہے اور کتنا حسین! ہم اسے کریہہ امراض کے حوالے کیوں کریں؟
جسم کے پھول کو زندگی کی آرتی میں رکھ کر موت کے دیوتا کی نذر کیوں نہ کریں؟ مہمان کو مرجھائے ہوئے پھول نہیں دیے جاتے - جا! زندگی کے پودے سے ناشگفتہ پھولوں کو توڑ لا!
زندگی کے پیالے کو جوانی کی شراب سے بھر کر بدمست ہو جا کہ طوفان سے تجھے نبرد آزمائی کرنا ہے۔"

اب تک ہم نے نذرالاسلام کو انقلاب کے مبلغ کی صورت میں دیکھا ہے - انقلاب اُس کے قبل، وہاں کے ادیبوں

نے جو تشبیہیں طرزِ نگارش اختیار کیا تھا، اُسے (Aesopian Style) کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ہر انقلاب پرور شاعر کو اپنی جدوجہد کا سلسلہ ان دشواریوں کے باوجود جاری رکھنا پڑتا ہے۔ گل و بلبل اور ساقی و پیمانہ میں اگر روحانیت کے رموز بیان کئے جا سکتے ہیں، تو انھیں اشاروں میں اور بھی بہت سی باتیں کہی جا سکتی ہیں انھیں پابندیوں کا ذکر کرتے ہوئے اقبال کہتا ہے :-

اس چمن میں مرغِ دل گائے نہ آزادی کے گیت
آہ یہ گلشن نہیں ایسے ترانے کے لئے

نذر الاسلام کے کلام کا بیشتر حصہ نایاب ہے۔ انھیں پڑھنا تو کجا، اون کا تذکرہ بھی گناہ ہے۔ پھر بھی، مندرجہ بالا نظمیں ایک ہوشمند کے لئے ایک جہانِ معنی پوشیدہ رکھتی ہیں۔ گو مضمون کا یہ حصہ تشنہ رہا جاتا ہے تاہم مجبوراً اسی پر اکتفا کرنا پڑتا ہے

اب ہم شاعر کے اس پہلو پر نظر ڈالیں گے جس کے بغیر آرٹ کا مقصد ادھورا رہ جاتا ہے۔ جب شاعر "تدریسیت" (Realism) کی سرحد سے نکل جاتا ہے۔ جب کائنات کی تنگ وادیوں میں دم لینے کے لئے شاعر حسن وعشق اور فراق و وصال کے گیت گانے لگتا ہے۔ جسے پڑھ کر رنجگر بھی تھوڑی دیر کے لئے تمام کلفتوں کو بھول جاتا ہے جس میں صوفی عشقِ حقیقی کے نکات ڈھونڈھ نکالتا ہے اور اشتراکی سرمایہ داری کی بو پا کر چیں بجبیں ہوتا ہے

قبل اس کے کہ اصل موضوع کی طرف متوجہ ہوں، یہ ضروری ہے کہ اس سلسلہ میں موجودہ معیار کے رویہ کو سمجھ لیا جائے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہماری زبانوں میں تجریدی (Subjectivism) شاعری کا عنصر بہت زیادہ ہے کہا جاتا ہے کہ روحانیت نے ہمارے زاویۂ نگاہ کو اتنا وسیع اور بلند کر دیا ہے کہ چند روزہ حسن و جمال اور عالمِ فانی کے لذائذ ہمیں مسحور نہیں کر سکتے۔ یہ دنیا تو سرابِ صحرا ہے۔ اس سے دل لگانا نادانوں اور ناسمجھوں کا شیوہ ہے۔ صداقت (Truth) وحسن (Beauty) میں کوئی امتیاز نہیں۔ لیکن ان کی تلاش کے لئے موجودہ دنیا کی حدبندیوں سے بالاتر ہونا لازم ہے۔ اس وجہ سے ہمارے ادب کی وہ خصوصیات بہت نمایاں ہیں یا تو مادی حسن کو ہم درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھتے، خاک کے پتلوں پر نظر ڈالنا بھی غلط سمجھتے ہیں۔ اگر کبھی موجودات پر نظر ڈالتے ہیں تو اس غرض سے کہ ان سے تشبیہ و استعارہ کا کام لیا جائے۔ اگر کوئی شاعر واقعتاً "مینا کا رسیا بن بیٹھتا ہے، تو ہم عجیب طریقوں سے اس کے مطالب کو توڑتے مروڑتے ہیں۔ اور طرح طرح سے تاویلیں کر کے اُسے اپنے عادات وخصایل کا جامہ پہنانا چاہتے ہیں۔ یا پھر شاعر کھُلم کھلا اجتہاد کرتا ہے اور اس دُنیا کے "سوقیانہ لطائف" کے لئے اپنی تمنا ایسے عریاں طریقہ سے ظاہر کرتا ہے کہ زہد و تقویٰ کی دنیا میں ماتم بپا ہو جاتا ہے۔ ایسی کتابوں کو لوگ چھپ چھپ کر پڑھتے ہیں

ایک عجیب اتفاق یہ ہے کہ جن ممالک میں عورت و مرد کے تعلقات بہت کشیدہ ہوتے ہیں - جس سوسائٹی میں شہوت کو شیطانی جذبہ سمجھا جاتا ہے ——— مثلاً ہندوستان، فارس اور چین ——— وہیں شاعری کا میلان عالم بالا کی طرف ہو جاتا ہے - جو لوگ جنسیاتی لطائف سے محروم ہوتے ہیں، اپنے جذبات کے اظہار کے لئے دوسری چیزیں تلاش کرتے ہیں - جذبۂ عشق کا مرکز ایک تصوّر کو بناتے ہیں - دراصل دنیا کے لوازم کا انھیں کوئی تجربہ نہیں ہوتا - یہ انگور تو ان کے لئے کھٹے ہوتے ہیں - اسی وجہ سے اُن کا نقطۂ نگاہ راہبانہ ہو جاتا ہے - اور یا پھر مدت دراز کی رُکی ہوئی خواہشات کے میں یوں بہ نکلتے ہیں کہ اپنے پرائے کا ہوش نہیں رہتا - ابھی تک ہم نے یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی ہے کہ میلانات جنسی پر نارواتشدد کا کتنا مہلک اثر ہمارے طبائع پر پڑتا ہے

بہرکیف - تجریدی شاعری اس سوسائٹی میں مقبول ہوگی، جہاں حُسن کی جولانگاہ پر عاشقوں کی رسائی محال ہو - معشوق کے آستانہ پر بھی جہاں دربان عاشق کی خبر لیتا ہو، وہاں موجوداتی (Objective)، شاعری کا بھلا کیا امکان ہو سکتا ہے - نذر الاسلام کی عشقیہ شاعری کو سمجھنے کے لئے اس بنیادی اختلاف کو سمجھنا ضروری ہے اس جیسے موجو دیاتی شاعر سے یہ توقع عبث ہے کہ کسی خیالی معشوقہ کی تلاش میں سرگرداں رہیگا - نہیں، جن حسن کی مورتوں کے آگے وہ سر تسلیم جھکاتا ہے، وہ جیتی جاگتی ہیں اور اس دنیا کی رہنے والی ہیں - اس وجہ سے اس کا کلام اس فرضی اور مبالغہ آمیز ماحول سے قطعاً پاک ہے، جو تجریدی شاعری کا جزوِ لاینفک ہے - علاوہ بریں بوڑھے شاعروں میں جنسیاتی واماندگی (Sex Fatigue) جو حزن و ملال پیدا کرتی ہے، نذر الاسلام اس سے بالکل بے بہرہ ہے ——— اقبال کی طرح وہ کبھی نہ کہے گا،

ہم نے اقبالؔ عشق بازی کی
پی پیے ہوشیار ہونے کو
اقبالؔ عشق نے مرے سب بل دیے نکال
مدّت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی

بلکہ وہ محبّت کو ایک غیر فانی جذبہ سمجھتا ہے جس سے بہرہ مند ہونے کے لئے کسی سے عشق کرنا ضروری ہے - یہ اور ہم اس کا عشق بالکل بے لوث اور بے غرض ہے - یہ اخلاص، جذبات میں کتنی سادگی پیدا کر سکتا ہے - ملاحظہ ہو:-

" میری رانی! عشق فراق سے قائم ہے
ہمارے درمیان ایک دریا حائل ہے جو ساحل کو اپنے آنسوؤں سے دھوتا ہے
میں اس کنارے ہوں اور تم اس کنارے، بیچ میں دریائے فراق اشک فشاں ہے
میری زندگی تپتی ہوئی ریگ صحرا ہے، جس پر تمہاری عنبر افشاں زلفیں سایہ نہیں کر سکتیں

ہم دونوں کبھی نہیں مل سکے۔ صرف ایک دوسرے کا نام سنا ہے۔ × × × × × × × × × × × ×

عندلیبِ ناشاد کی طرح دو دن چہک کر میں شاخِ گل سے اُڑ آیا

ممکن ہے کہ نغمہ کا سرگم فضا میں گم ہو جائے لیکن اُس کی بازگشت غیر فانی ہے

اس وقت مرغِ بسمل نہ ہوگا، صرف اُس کے شیون کی یاد باقی رہے گی۔ اور تو غم و یاس کی آنچ میں تپا کرے گی :

برسات کی کسی صبح کیا میری طرح تو بھی اُداس اور اکیلی بیٹھ کر ماضی کو زندہ کرے گی ؟ آدھی رات کو کروٹ بدل بدل کر کیا تو بھی اپنے تصوّر کو بیان کرے گی ؟ کیا تو بھی بادلوں کے ساتھ آنسو بہائے گی ؟

اے تصویرِ حیا ! اے چت چور ! میری خوشی کا راز اسی میں مضمر ہے کہ ہم دونوں زندہ رہیں تم کہاں اور کیسی ہو ——— اس کی فکر میں کیوں کروں ؟ مجھے مست کرنے کے لئے یہی خیال کافی ہے کہ مجھے تم سے محبت ہے دل کے ساتھ تو نے میری نیند بھی چرا لی ہے۔ خوش ہوں کہ آنکھوں کی جلن دل کے سوز کو دو بالا کرتی ہے دور رہ کر بھی میرے نغموں سے تم لطف اندوز ہوتی رہو گی۔ جب مرورِ ایام سوز و ساز کو سست کر دیں گے تو تمھاری برہمی کا خیال مجھے حیاتِ تازہ بخشے گا

میں مصوّر ہوں، تم میری بنائی ہوئی تصویر ہو۔ میں شاعر ہوں، تم میری موسیقی ہو

بددعا۔

مجھے یاد کرو گی اُس دن جب میں اس سرائے فانی میں نہ ملوں گا ستارۂ شام سے میرا پتہ پوچھو گی اور میری تصویر دل میں چھپائے پُرشور دریاؤں، دہکتے ہوئے ریگستانوں فلک بوس پہاڑوں اور گاتی ہوئی ہواؤں میں مجھے ڈھونڈھتی پھرو گی

مجھے یاد کرو گی۔ اس وقت جب خواب سے چونک کر جاگ اٹھو گی۔ اور کسی کا جانا پہچانا سایہ تمھارے دھڑکتے ہوئے قلب پر جھک جائیگا۔ تم سمجھو گی کہ میں ہی تمھارے آغوش میں آ لیٹا ہوں، مگر سُونے بستر اور رنگین خواب کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگے گا تب دردِ دل آنسو بنکر آنکھوں میں چھلک آئیگا

مجھے یاد کرو گی۔ اُس وقت جب تمھارے رباب کے تار یکایک ٹوٹ جائیں گے۔ اور سب یہ کہہ اٹھیں گے کہ یہ تو اس سیہ بخت کا سکھایا ہوا گیت ہے۔ پھر تم اون دلربا صحبتوں کو یاد کرو گی اور رباب خود بخود بروگ کے گیت گانے لگے گا۔ تم لاکھ ضبط کرو گی مگر دلِ بیتاب آنکھوں کے پیالے کو اچھال دے گا

مجھے یاد کرو گی۔ جب گنگا کی سنگ آسا موجیں ناؤ سے اٹھکھیلیاں کرنے لگیں گی۔ تمھیں وہ رات یاد آئے گی۔ جب ہم دونوں اسی ناؤ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں کناروں پر تاریکی تھی اور بیچ دریا میں محبت کا چراغ روشن تھا

مجھے یاد کرو گی۔ جب آسمان سہانی چاندنی سے زر فشاں ہو جائے گا۔ اور مہ و انجم کے سرگم میں میرے گیت کی صدائیں گونجیں گی

تمہاری ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں آسمان میں اس ستارہ کی تلاش کریں گی جو میری ہی طرح پُرحسرت اور دردمند ہوگا
مجھے یاد کروگی۔ اس روز جب ہیبتناک طوفان رقص کرے گا، موسلا دھار برکھا دنیا کو جل تھل کر دے گی۔ اور تمہاری کٹیا
لرزنے لگے گی۔ کوندے کی لپک کے ساتھ تم دہشت سے چیخ اٹھوگی اور ان بازؤں کو یاد کروگی جو اس ہولناک شب میں
تمہیں عافیت بخش سکتے تھے۔ اُسے یاد کروگی جس کا گرم بوسہ تمہارے قلب مضطر کو گرما دیتا تھا

اس قسم کی تمام عشقیہ نظموں میں تلاش و تجسس کا عنصر غالب ہے اس کے نزدیک دردِ عشق مایۂ زندگی ہے کیٹس Keats کی طرح اس خلش کو وہ سرمایۂ حیات سمجھتا ہے۔ شباب مضطرب اور بیقرار ہے۔ یہی بیکلی انسانیت کا جوہر ہے۔ اپنی مشہور نظم "سمندر" میں کہتا ہے:۔

"اے سمندر! اے ہمدم! اے باغی ازل!

تیری فریاد کبھی نہیں تھمتی۔ میرے آنسوؤں کا تار بھی کبھی نہیں ٹوٹتا۔ تو ناپیدا کنار ہے، اس لئے تیرے فراق کی بھی کوئی انتہا نہیں ہے

جب کسی کی یاد میں میں آہ و زاری کرتا ہوں تو تیری آواز مجھے خاموش کر دیتی ہے
ہر طرف خلا ہے، لامحدود خلا، بیچ میں ایک بیکراں اور غیر فانی تموج نالہ و شیون کرتا رہیگا

ٹیگور، اقبال اور نذر الاسلام

ہندوستان میں جو ذہنی انقلاب شروع ہوا ہے، اس کا غائر مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہمارے سیاسی مفکرین کے آگے تین منزلیں ہیں۔ ہندو مفکر زمانہ کی رَو کو پیچھے کی طرف موڑنا چاہتے ہیں —— اس ابتدائی سوسائٹی کی طرف جس کا خواب روسو اور ٹالسٹائی دیکھا کرتے تھے۔ سیاسی اصطلاح میں اس نظریہ کو (Tolstoian Anarchism) کہتے ہیں۔ ٹیگور اسی فلسفۂ زندگی کا علمبردار ہے۔ گاندھی جی کی تحریکیں اسی ذہنیت کی پرتو ہیں۔ مسلمان مفکرین دنیا کی مشکلات کا حل قرآن اور حضرت محمدؐ کی زندگی میں تلاش کرتے ہیں۔ اقبال اسی زاویۂ نگاہ کو پیش کرتا ہے۔ جو فاسیزم سے بہت بڑی حد تک مطابقت رکھتا ہے۔ موجودہ سرمایہ داری کو وہ یقیناً دنیا کے لئے لعنت سمجھتے ہیں۔ اس کے بجائے وہ ایک ایسا نظام قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ جس میں غریب و امیر مل جُل کر رہیں —— محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو جائیں۔ بظاہر بندہ و بندہ نواز کی تفریق دور ہو جائے۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی مثال پیش کرکے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ سرمایہ دار دنیا میں امن قائم کرنے کے لئے اپنے حقوق سے خود بخود دست بردار ہو سکتے ہیں خودگزاری (Self Renunciation) کو ان کے فلسفہ میں بہت دخل ہے۔ وہ یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہے کہ یہ مستثنیات ہی اس کلیہ کی حقیقت کو ثابت کرتے ہیں جسے نذر الاسلام اپنے نظریہ کی بنیاد بناتا ہے۔ اس کے نزدیک ظالم و مظلوم ہمیشہ دست و گریباں رہے ہیں۔ سرمایہ و محنت کی کشمکش ہی سوسائٹی کے نظام کو ترتیب دیتی ہے۔ اقبال

کے نزدیک یہ "چراغِ مصطفوی" سے "شرار بولہبی" کی ستیزہ کاری ہے۔ لیکن نذر الاسلام کہتا ہے کہ ہر زمانہ کے
اعتقادات انسانی ضروریات کے ساتھ بدلتے جاتے ہیں۔ سرمایہ و محنت کے بنیادی اختلاف پر پردہ ڈالنے کے لئے "کفر و ایمان"
کا جھگڑا شروع کر دیا جاتا ہے۔ درانحالیکہ کفر و ایمان کا تخیل ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ اگر اقبال کے نزدیک ہر مرض کی دوا درود شریف
ہے تو نذر الاسلام اشتراکیت کو تمام مشکلات کا واحد حل بتلاتا ہے۔ اس بحث کو ہم کسی آیندہ صحبت کے لئے ملتوی
رکھتے ہیں لیکن یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ تینوں شاعر تین مختلف ذہنیتوں کے علمبردار ہیں جو اس وقت ملک کو مضطر
کر رہی ہیں۔ ہندوستان ان میں سے کسے اپنا ناخدا بنائے گا۔ اس کا فیصلہ مستقبل کے ہاتھوں ہے! مگر ایک چیز اظہر
من الشمس ہے۔ ٹیگور کا اثر بنگال سے زائل ہو رہا ہے۔ ملک کے جذبات کا وہ حقیقی ترجمان نہیں ہے۔ اس کے
برعکس نذر الاسلام کی شہرت دن بدن بڑھتی جاتی ہے۔ سرمایہ داروں اور اون کے حلقہ بگوشوں کو چھوڑ کر ہر طبقہ میں وہ
ازحد مقبول ہے۔ اقبال کی آواز ملت اسلامیہ تک محدود رہ گئی کیونکہ دنیا کی اصلاح وہ ایک خاص ملت سے کرانا چاہتا ہے
ایک خاص ملت کے لئے اس کا پیغام محدود ہے اور اُسی کو اپیل کر سکتا ہے۔ نذر الاسلام کے پیغام کی نوعیت بہت
بڑی حد تک بین الاقوامی ہے۔ اگر اس کی اشاعت پر پابندیاں نہ ہوتیں تو کیا عجب تھا کہ وہ بہت مشہور ہوتا۔ بحالات
موجودہ بھی، اس کی کئی نظموں کے تراجم یوروپین زبانوں میں ہو چکے ہیں

ایک دوسرا غور طلب نکتہ یہ ہے کہ ٹیگور نے کبیر داس اور بنگال کے ویشنوی شاعروں کا اثر قبول کیا ہے۔ پرانی
شراب کو نئے شیشوں میں ڈھال دیا ہے۔ اقبال کے ماخذ نٹشے اور برگسان ہیں۔ اون کے قیام جرمن کے دوران ہیں
وہاں (Superman Theory) کا بڑا زور تھا اس لئے جرمنی سے لوٹنے کے بعد بھی انھوں نے سپرمین
کا تخیل باندھنا شروع کیا۔ لیکن نذر الاسلام کے آگے ایسا کوئی شاعر نہ تھا جس کے نقش قدم پر وہ چلتا۔ انقلاب روس
کے بعد اب تک وہاں کوئی قابل ذکر انقلاب پرور شاعر پیدا نہیں ہوا ہے۔ فی الحال تو ہر شعبۂ ادب کے ساتھ شاعری بھی
پنج سالہ پروگرام کی اشاعت کے لئے وقف ہے۔ کسی بولشیوک شاعر کی نازک خیالی ملاحظہ ہو

"سرمایہ دار (Bourgeois) معشوقوں کی پنڈلیاں ہمارے پانی کے نلوں سے زیادہ حسین اور سڈول
نہیں ہو سکتیں۔"

اس حالت میں نذر الاسلام کو اپنی انقلاب پرور فطرت کو ہی شمع ہدایت بنانا پڑا۔ بنگلہ زبان میں اس نئے جذبہ کی
ترجمانی کے لئے اسے بحریں نہیں ملتی تھیں۔ لہٰذا اسے اپنے لئے خود ہی راستہ نکالنا پڑا۔ نئے نئے الفاظ اور نئی نئی بندشوں
کا استعمال کرنا — اس لحاظ سے وہ اپنے دونوں ہم عصر شاعروں سے بازی لے جاتا ہے۔ اس نئے طرز بیان کی وجہ سے
اس پر ہر طرف سے اعتراضوں کا دونگڑا برس پڑا۔ لیکن آہستہ آہستہ سب کو راہِ راست پر آنا پڑا۔ اس امر کا اظہار
بھی ضروری ہے کہ نذر الاسلام نے سب سے پہلی مرتبہ بنگلہ میں غزل لکھنی شروع کی۔ آج بنگال میں شاید ہی کوئی آدمی

ہے نذرالاسلام کی ایک آدھ غزل زیادہ ہو - ان کے ذریعہ اردو کے سبک الفاظ کی ترویج بڑی آسانی سے ہو گئی نمونتاً
یک غزل یہاں درج کی جاتی ہے :-

کے بدیشی بن اوداسی
بانشیر بانشی باجا دبنے
سر سو ہاگے تندرالاگے
کنسم باگیر گل بدسے
جھبے آئے بھو مارا یانکھا
یونتیمو چوکھے آویش ناتھا
کاتر گھومے چاندیمارا ںکا
بھو گگیر در دالاسے
درد الاسے بھورسے گگنے
درتھائی گا نتھی کنھارمالا
لوکاس کوبی بوکیر جوالا
کاندسے نرالابنشی والا
تاری اوتالا ورہی منے

شاعر کے تخیل اور طرز بیان پر اس فضا کا اثر پڑنا لازمی ہے جہاں وہ نشو ونما پاتا ہے - قومی زندگی کا ہر پہلو آب وہوا سے متاثر ہوتا ہے - زبان کا ڈھانچہ بھی یہ اثر قبول کرتا ہے - فرانسیسی اور اطالوی زبانوں میں انگریزی اور جرمن کی سختی نہ ملے گی کیونکہ وہاں کی آب وہوا زیادہ خوشگوار اور مرطوب ہے - بنگلہ کی شیرینی اور گھلاوٹ میں گرد وپیش کی نرمی اور حلاوت کو بہت دخل ہے - ناظرین نے سنا ہی ہوگا کہ جب بنگالی غصہ میں آتا ہے تو ہندوستانی گالیوں کا آسرا ڈھونڈھتا ہے کیونکہ اپنی مادری زبان میں وہ کرختگی پیدا نہیں کرسکتا - اسی وجہ سے بنگالہ زبان عشقیہ شاعری کے لئے بہت موزوں ہے لیکن اب تک اس میں کوئی قابل ذکر رزمیہ نظم نہیں لکھی گئی - کیونکہ الفاظ میں خاطر خواہ گرمی اور زور پیدا کرنا دشوار ہے - اسی وجہ سے ٹیگور جب مُلک کی خستہ حالی کا نقشہ کھینچتا ہے، تو اس میں فوراً نسوانیت پیدا ہو جاتی ہے - رزم کا جوش وخروش باقی نہیں رہتا

پنجاب کی کیفیت اس کے بالکل متضاد ہے - آب وہوا نے ہر چیز میں سختی اور کرختگی پیدا کردی ہے - اس کا اثر وہاں کی زبان پر بھی پڑنا ضرور تھا - اس سمع خراش اور درشت فضا میں رہ کر اقبال اپنی زبان میں ترنم اور کیف کیوں کر پیدا

رسکتا تھا - اسی وجہ سے اسکی غزلوں پر بھی رزم کا گمان ہوتا ہے - معلوم ہوتا ہے کہ کوئی پنجابی سپاہی پینترے بدل بدل کر اظہار عشق کر رہا ہے

نذرالاسلام کا اندازِ بیان ان دونوں عیبوں سے پاک ہے - اُردو سے آشنا ہونے اور ایک عرصہ تک فوج میں رہنے کی وجہ سے وہ بنگلہ کی زنانی کیفیت سے متاثر نہیں ہوتا - وہ ایک ایسی روش اختیار کرتا ہے، جس میں طوفان کی ہنگامہ خیزی کے ساتھ بادِ نسیم کی سبک خرامی بھی شامل ہے

اقبال نے مسئلۂ نسواں پر آج تک کچھ نہیں لکھا - معلوم نہیں اس کی وجہ کیا ہے ؟ اسے وہ اہمیت نہیں دیتے یا ان کی نظر میں عورتوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے ——— بہر حال انھوں نے اب تک اس مسئلہ کے متعلق کچھ نہیں لکھا درآں حالیکہ اس کی وجہ سے تمام دنیا پریشان ہو رہی ہے - البتہ لڑکیوں کے انگریزی پڑھنے سے برگشتہ ہو کر ایک جگہ لکھتے ہیں :-

یہ ڈرامہ دکھائیگا کیا سین   پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

آیندہ کبھی ہم ان شاعروں کا باقاعدہ موازنہ کرنے کی کوشش کریں گے - فی الحال اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے

خاتمۂ کلام

افسانہ نویس، ناول نگار اور ماہر موسیقی کے اعتبار سے بھی نذرالاسلام کی کافی شہرت ہے - افسانوں کے کئی مجموعے اور تین چار ناول اب تک شایع ہو چکے ہیں - ان میں " موت کی بھوک " نے ادبی دنیا میں ہلچل ڈال دی تھی اس میں سپاہیانہ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے - فی الحال کسی فلم ساز کمپنی میں بنگلہ موسیقی کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں

نذرالاسلام جیسے شاعر کا وجود بیک وقت قوم کی پستی اور عروج کا پتہ دیتا ہے - وہ بلندی کی طرف پرواز کرتا ہے اور قوم کو قعرِ مذلت سے نکال کر اسی منزل کی طرف بلاتا ہے - وہ انقلاب کا پیرو نہیں ہوتا بلکہ انقلاب برپا کرتا ہے جسے بن زمانہ اسے ٹھکراتا ہے، اور مر جانے کے بعد اس کی پرستش کرتا ہے - عین حیات اسی شاعر کی قدر ہوتی ہے - جو ماضی کے گیت گاتا ہے، مستقبل کے پیامبر کی آواز صدا بصحرا ہوتی ہے - لیکن ایسے ہی شاعروں کی نسبت (Shaughnessy) اپنی ایک نظم میں کہتا ہے :-

" اپنے غیر فانی گیتوں سے ہم دنیا کے بڑے بڑے شہروں کی تعمیر کرتے ہیں
اور تصور کی رنگینیوں سے سلطنتوں کے جاہ وجلال کا پرچم لہراتے ہیں
ایک آدمی کا خواب اس کے سر پر تاج رکھ سکتا ہے
اور تین آدمیوں کو ایک ولولہ انگیز نظم حکومت کا تختہ پلٹ دینے کے لئے مستعد کر سکتی ہے "

نذرالاسلام اپنے عزم راسخ کے لئے کسی عوض کی تمنا نہیں کرتا۔ وہ صرف یہ چاہتا ہے :-

" مستقبل مجھے یاد رکھے گا یا فراموش کر دیگا ' مجھے اس کی پروا بھی نہیں ہے

میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ جو لوگ ۳۳ کروڑ آدمیوں کو دانہ دانہ کا محتاج بنا رہے ہیں

میری خونچکاں تحریر اون کی بربادی کی ندیم ہو !

نگارستان حصۂ دوم

یعنی حضرت نیاز فتحپوری کے ۳۰ بہترین افسانوں کا مجموعہ جو اس سے قبل کبھی کتابی صورت میں شایع نہیں ہوئے زیر کتابت ہے۔ حجم ۵۰۰ صفحات سے زائد ہوگا۔ اور غالباً ستمبر ۳۳ء تک شایع ہو سکے گا ــــــ اسکی قیمت علاوہ محصول تین روپیہ سے کم نہ ہوگی۔ لیکن جو حضرات دو روپیہ ذریعہ منی آرڈر بھیج کر ابھی سے اپنا نام درج رجسٹر کرا لیں گے۔ ان کو اسی دو روپیہ میں یہ نادر مجموعہ مل جائیگا غالباً یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ اسوقت صحیح معنی میں انشاء عالیہ کا لکھنے والا کوئی ہے تو وہ صرف حضرت نیاز ہیں۔ اور اس لئے اس مجموعہ میں ایسے ایسے جواہر ادب آپ کو ملیں گے۔ جو کسی دوسری جگہ میسر آ ہی نہیں سکتے ،

منیجر نگار لکھنؤ

باب المراسلہ والمناظرہ

(جناب مولوی حکیم احمد صاحب۔ گوالیار)

میں کوئی مذہبی آدمی نہیں ہوں مگر حصول اطمینان قلب کی غرض سے مجکو مذہبی مضامین سے دلچسپی ضرور ہے۔ حال میں رسالۂ نگار کے ماہ فروری اور ماہ مارچ ۱۹۳۳ء کے دو پرچے میرے مطالعہ میں آئے۔ اُن میں واقعہ معراج نبوی کے متعلق کچھ بحث کی گئی ہے ـــ اصل مضمون مولوی عبدالمالک صاحب کا ہے مگر درحقیقت یہ مضمون تردید ہے ایک دوسرے مضمون کی جو کسی پادری ڈاکٹر ٹسڈل نامی نے کہیں شایع کیا ہے۔ ڈاکٹر ٹسڈل نے اس امر کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ معراج کے جن تفصیلی واقعات پر عام مسلمان اعتقاد رکھتے ہیں اُن کے راویوں نے واقعات مذکور چند پُرانی کتابوں سے خصوصاً مذہب زردہشت کی ایک کتاب موسوم بہ اردوراف نامک سے اخذ کئے ہیں۔ صاحب مضمون یعنی مولوی عبدالمالک صاحب نے اس امر کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ واقعات مذکور خود پیغمبر صاحب نے بیان فرمائے ہیں۔ اور ان کی بحث یہ ہے کہ چونکہ پیغمبر صاحب اور اوس وقت کے اہل عرب زبان پہلوی سے واقف نہ تھے اس لئے واقعات معراج مذکورہ کتاب پارسی سے نہیں لئے گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں فاضل ایڈیٹر نگار نے بھی مولوی صاحب کے مضمون پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ میں کسی لمبی چوڑی بحث سے ناظرین کا وقت لینا مناسب خیال نہیں کرتا۔ تینوں صاحبوں کے مضمون کا خلاصہ درج کردینا کافی سمجھتا ہوں اور اس کے بعد مجکو جو تردداتِ لاحق ہوئے ہیں اُن کو مختصر طور پر عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں

ڈاکٹر ٹسڈل کا اعتراض اور اس کی منطق

(۱) ابتدائی روایات میں محض واقعۂ معراج کا حوالہ ہے اور ممکن ہے کہ واقعۂ مذکور پیغمبر عربی کے خواب پر مبنی ہو

(۲) معراج کی جزئیات کی تفصیل صرف روایاتِ مابعد میں پائی جاتی ہے

(۳) جو واقعات تفصیلی روایاتِ مابعد میں مذکور ہیں وہ مماثل ہیں ان واقعات کے جو کتاب اردوراف نامک میں درج ہیں

(۴) کتاب اردوراف نامک ہجرتِ نبوی سے چارسو برس پیشتر کی لکھی ہوئی بیان کی جاتی ہے

(۵) اس لئے روایات مابعد کے تفصیلی واقعات کتاب ارد وراف نامک سے ماخوذ ہیں

مولوی عبدالمالک صاحب کا بیان

(۱) معتبر راویوں نے بیان کیا ہے کہ خود پیمبر صاحب نے تفصیلی واقعات معراج کے بیان فرمائے ہیں
(۲) پیمبر صاحب اور اُس زمانے کے عرب پہلوی زبان سے واقف نہیں تھے
(۳) اس لئے معراج کے تفصیلی واقعات ارد وراف نامک سے اخذ نہیں کئے گئے ہیں

فاضل ایڈیٹر نگار کی بحث

(۱) ڈاکٹر ٹسڈل کے اعتراض کا مدعا یہ ہے کہ واقعۂ معراج کوئی حقیقت نہیں رکھتا
(۲) ڈاکٹر ٹسڈل کی اس بحث کا (کہ واقعاتِ معراج پرانی کتابوں میں درج ہیں اور انھیں سے ماخوذ ہیں) معقول جواب نہیں دیا جاسکتا
(۳) اس لئے واقعۂ معراج کو رسول اللہ سے منسوب کرنا اُن کو جھوٹا قرار دینا ہے اور
(۴) یہ ماننا لازم آئے گا کہ دوسرے نبیوں کو بھی معراج ہوئی یا
(۵) یہ ثابت کرنا ضروری ہوگا کہ پرانی کتابوں میں کوئی ایسا بیان درج نہیں ہے جس کا ذکر ڈاکٹر ٹسڈل نے اپنے مضمون میں کیا ہے
(۶) رسول اللہ کو غلط بیانی کے الزام سے بچانے کے لئے روایات متعلق معراج کو موضوع قرار دینا مناسب ہوگا

نوٹ متعلق اعتراض ڈاکٹر ٹسڈل

(۱) ڈاکٹر ٹسڈل نے واقعۂ معراج کے صحیح یا غلط ہونے کے متعلق کسی رائے کا اظہار نہیں کیا ہے۔ اور نہ اس کے متعلق کوئی بحث کی ہے۔ اس کے برعکس اوس نے واقعۂ معراج کو پیمبر صاحب کے خواب پر امکان کے طور پر مبنی ہونا تسلیم کیا ہے
(۲) اگر دو جگہ ایک سے بیان درج ہوں اور وہ مختلف زمانوں کے ہوں تو یہ نتیجہ لازمی طور سے نہیں نکلتا کہ بیان مابعد بیان ماسبق سے اخذ کیا گیا ہے۔ جب تک کہ معتبر شہادت سے اوس کا اخذ کیا جانا ثابت نہ کیا جائے چونکہ ڈاکٹر ٹسڈل نے ایسا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا ہے اس لئے اوس نے جو استنباط کیا ہے وہ محض ایک قیاسی یا ظنی امر ہے جس طرح ممکن ہے کہ قیاس مذکور صحیح ہو اوسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ وہ صحیح نہ ہو
(۳) ڈاکٹر ٹسڈل نے اپنا استدلال اس مفروضہ پر مبنی کیا ہے کہ جو شہادت بعد میں میسر آئے وہ محض اس وجہ سے قابل اعتبار نہیں کہ اس کا ذکر کبھی پہلے نہیں آیا ہے۔ اس کے بجائے ڈاکٹر ٹسڈل کو یہ ثابت کرنا چاہیے تھا کہ جن راویوں نے تفصیلی واقعات بیان کئے ہیں اُن کی پیش کردہ شہادت معتبر نہیں ہیں

نوٹ متعلق مضمون مولوی عبدالمالک صاحب

(۱) مولوی صاحب کے مضمون سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ واقعۂ معراج کے متعلق خود اُن کا عقیدہ یا مفہوم بارے کیا ہے جس کو پیش نظر رکھ کر اونھوں نے ڈاکٹر ٹسڈل کے مضمون کی تردید کی کوشش کی ہے۔ آپ نے معراج کے جسمانی یا روحانی یا رویائی واقع ہونے کے متعلق تنقید سے کام لے کر یکایک ڈاکٹر ٹسڈل کے مضمون کے اُس حصہ سے بحث شروع کر دی ہے جو معراج کے تفصیلی واقعات سے تعلق رکھتا ہے "تنقید روایات" کے سلسلہ میں آپ نے جو کچھ بیان فرمایا ہے اس سے اس کا بھی پتہ نہیں چلتا کہ آپ کس قسم کی معراج کے قائل ہیں اور کن حالات کے تابع خلاصہ یہ کہ جب تک جواب دینے والے کے پیش نظر خود اس چیز کا مفہوم نہ ہو جس کے متعلق وہ اعتراض کا جواب دے رہا ہے۔ اس وقت تک وہ کیا صحیح جواب دے سکتا ہے ؟ مضمون سے تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا عقیدہ روایات اولین تک محدود ہے لیکن آپ بحث کرتے ہیں روایات ما بعد سے۔ اگر روایات مابعد پر بھی آپ کا عقیدہ ہے تو اس عقیدہ کی تفصیل مضمون میں درج ہونی چاہیئے تھی اور اس تفصیل کے ہر جزو کی نسبت یہ ثابت کرنا چاہیئے تھا کہ وہ پیغمبر صاحب تک پہونچتا ہے اور عقلاً یا اعتقاداً قابل تسلیم ہے۔ عقلاً سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں جیسے اور معمولی یا غیر معمولی واقعات ہوتے ہیں اسی طرح واقعات معراج کا ہونا ممکن ہے۔ اعتقاداً سے یہ مراد ہے کہ کسی ایسے اصول کے تحت جس کا تعلق ایقانِ قلب یا روحانیات سے ہو ایسے واقعات کا وجود قابل تسلیم ہے

(۲) مولوی عبدالمالک صاحب نے اپنے دعوے کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بھی ایک طریقۂ استدلال مخالفت کے دعوی کو غلط قرار دینے کا ہے لیکن کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ وہ ڈاکٹر ٹسڈل کے دعاوی کی تردید کرتے

(۳) مولوی صاحب نے یہ ثابت نہیں کیا ہے کہ جس شہادت کو وہ پیش کرتے ہیں وہ معتبر ہے محض شہادت کا بیان کر دینا اس شہادت کے کافی یا معتبر ہونے کی دلیل نہیں ہے

(۴) مولوی صاحب نے غالباً اس امر پر غور نہیں فرمایا کہ اصولِ شہادت کے اعتبار سے نفی کا اثبات بہت مشکل ہے۔ دعوی یہ کیا گیا ہے کہ اہل عرب یا پیمبر صاحب کو پُرانی داستانوں کا علم نہیں تھا۔ کیا اس قسم کے دعاوی قابل اطمینان طریق پر ثابت کیئے جا سکتے ہیں

نوٹ متعلق بحث ایڈیٹر صاحب نگار

(۱) آپ کی تمام بحث اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ واقعۂ اسریٰ یا معراج غلط ہے لیکن آپ نے اس کی کہیں تفصیل نہیں کی ہے کہ کیونکر غلط ہے

(۲) آپ نے یہ تصور کر لیا ہے کہ ڈاکٹر ٹسڈل نے ثابت کر دیا ہے کہ واقعۂ معراج کوئی حقیقت نہیں رکھتا ہے

لیکن خود ڈاکٹر ٹسڈل نے اپنے مضمون میں کسی جگہ ایسا ظاہر نہیں کیا ہے

(۳) آپ نے اپنی بحث میں واقعہ معراج اور معراج کے تفصیلی واقعات (جو مابعد کی روایات میں پائے جاتے ہیں) کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی ہے ورنہ ڈاکٹر ٹسڈل کا دعویٰ ثابت قرار پاجانے کی صورت میں آپ واقعۂ اسریٰ یا معراج کو غلط نہ فرماتے۔ آپ نے ایسے جملوں کے استعمال سے بھی جن میں لفظاً آیت یا روایات شامل ہے صحیح مفہوم اخذ کرنے کا موقع ناظرین رسالہ کو نہیں دیا ہے ـــــ مثلاً مولوی صاحب نے بحوالۂ روایات بیانِ معراج کو پیمبر صاحب تک پہونچایا ہے لیکن ایڈیٹر صاحب اُن کی دلیل کو روائتی قرار دیتے ہیں۔ جہاں تک غور کیا جاسکتا ہے۔ مولوی صاحب نے جن روایات کو پیش کیا ہے وہ بمنزلۂ شہادت ہیں جو سلسلۂ بیان کو پیمبر صاحب تک پہونچاتی ہے اور دیگر مذاہب کی روایات تک (جن کو فاضل ایڈیٹر تسلیم کرانا چاہتے ہیں یا جن کی موجودگی سے انکار کرنے کا مشورہ دیتے ہیں) وہ خود بیان ہیں کسی امر کا یعنی صورت اوّل میں مولوی صاحب نے اس امر کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایک خاص بیان ایک خاص شخص نے کیا ہے صورت ثانی میں سوال کی شکل یہ ہو جاتی ہے کہ کوئی خاص بیان غلط ہے یا صحیح۔ فاضل ایڈیٹر یہ کہتے ہیں کہ اگر صورتِ اوّل میں اس شہادت کو قابل اعتبار سمجھا جائے جو بیان واقعۂ معراج کو پیمبر صاحب تک پہونچاتی ہے تو صورتِ ثانی میں یہ تسلیم کر لینا لازمی ہوگا کہ دیگر اشخاص کا بھی دعویٰ معراج صحیح ہے۔ یہ ظاہر معلوم نہیں ہوتا کہ یہ نتیجہ کسی غیر مسلم کے نزدیک کس طور سے مستنبط ہوتا ہے

(۴) ڈاکٹر ٹسڈل کے قیاس کو آپ نے یقینی طور پر ثابت تصوّر کر کے معراج کے متعلق روایتوں کو موضوع قرار دینے کا مشورہ بغیر کوئی وجہ بیان کرنے کے دیا ہے۔ کسی غیر مسلم کے نزدیک یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ پیغمبر عربی کو الزام سے بچانے کے لئے معتبر شہادت کو رَد کر دے۔ شہادت کو رَد کرنے کے لئے کافی وجوہ علیحدہ ہونا چاہئیں۔ یعنی روایات کو موضوع قرار دینے کے لئے نہ تو ڈاکٹر ٹسڈل کا قیاس کافی ہے اور نہ پیغمبر صاحب کے جھوٹا ثابت ہونے کا احتمال

(۵) اگر دو جگہ دو بیان ایک سے کئے گئے ہوں تو فاضل ایڈیٹر کے نزدیک ایک بیان کو صحیح تصوّر کرنے کی صورت میں دوسرے بیان کو بھی صحیح ماننا لازم ہوگا۔ یہ کیوں؟ ممکن ہے کہ ایک جگہ ایک بیان محض تخیل کی کارفرمائی ہو اور دوسری جگہ دوسرا بیان امر واقعی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک بیان کے باور کرنے کی شہادت موجود ہو اور دوسرے بیان کی کوئی تائید نہ ہوتی ہو۔ اگر آج ہم ہوائی جہاز کو امر واقعہ مانتے ہیں تو ہمارے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہم مہابھارت اور رامائن کے ہوائی تخت اور الف لیلہ کے اڑنے والے

قائلین کو بھی اُمور واقعی سمجھ لیں۔ فاضل ایڈیٹر کا ڈاکٹر ٹسڈل کی اس رائے سے بھی متفق ہونا پایا جاتا ہے کہ اگر دو بیان دو مختلف زمانوں میں ایک سے کئے گئے ہوں تو بیانِ مابعد لازمی طور سے بیان ماسبق سے ماخوذ ہوگا۔ علاوہ استدلال کی خامی کے یہ ظاہر ہے کہ عبارت معنی اور خیالات کا توارد اکثر ہوتا رہتا ہے۔ عبارت کے توارد کی مثالیں سیکڑوں ہیں۔ خیالات کے توارد کی ذیل میں اسلامی تصوف کی پیدایش اور اُس کا نشو ونما ہندی تصوف سے مخفقانہ طور پر جداگانہ تسلیم کر لیا گیا ہے اور اگرچہ بابی مذہب کے بہت سے اصول زردشتی مذہب سے ملتے جلتے ہیں لیکن اُن کا زردشتی مذہب سے ماخوذ ہونا اس وقت تک ثابت نہیں ہوا ہے

(۶) ڈاکٹر ٹسڈل نے کتاب اردوراف نامک کا اسلام سے چار سو برس پیشتر تصنیف ہونا بیان کرکے اپنے آپ کو اور اپنے استدلال کو اس طریق پر محفوظ کرنا چاہا ہے کہ اگر زردشتیوں کی روایت کو مان لیا جائے تو کتاب کی تصنیف کا اسقدر زمانہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اگر آج ڈاکٹر ٹسڈل پر یہ اعتراض کیا جائے کہ کتاب مذکور اس قدر پرانی نہیں ہے تو وہ اپنی شرط کی آڑ جائز طور پر لے سکتا ہے لیکن معلوم نہیں ہوتا کہ مولوی عبدالمالک صاحب اور فاضل ایڈیٹر نگار نے اس بارے میں کیا توجہ فرمائی۔ پہلوی زبان میں صرف گنتی کی کتابیں مذہبی اور غیر مذہبی رائج وشائع ہیں جن میں سے اردوراف نامک بھی ایک مذہبی کتاب ہے۔ تنقیح طلب یہ امر ہے کہ یہ کتاب کب تصنیف ہوئی۔ فاضل ایڈیٹر نگار نے جس طرح ایک دیگر مضمون کے سلسلہ میں مزدک کا زمانہ زردہشت کے تقریباً دو صدی بعد کا قرار دیا ہے اُسی طرح وہ اس کتاب کا بھی کوئی زمانہ اسلام سے پہلے کا قرار دے سکتے تھے لیکن بہ ظاہر صاحب موصوف نے ڈاکٹر ٹسڈل کے شرطیہ بیان کو بھی تسلیم کر لیا ہے۔ اس لئے اس بارے میں کسی زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اسقدر ذکر کردینا غیر مناسب نہ ہوگا کہ اس وقت تک محققین کی جو رائے ہے وہ یہ ہے کہ پہلوی زبان کی کوئی کتاب سنہ عیسوی کی آٹھویں صدی سے پہلے کی تصنیف شدہ موجود نہیں ہے اردوراف نامک پارسیوں کا بہشت ودوزخ نامہ ہے۔ اس میں اس جوش مذہبی اور تجدید مذہب کا حال ضرور لکھا گیا ہے جس کا دور ساسانیوں کی حکومت شروع ہونے کے بعد ہوا۔ لیکن اس کتاب کی مانند جو اور کتابیں اس وقت موجود ہیں مثلاً "دین کرت" یا "مینوئے خرد" وغیرہ یہ سب نویں صدی عیسوی اور اس کے بعد کی تصنیف شدہ کتابیں ہیں۔ ساسانیوں کا زمانہ ۲۰۰ء کے کچھ بعد سے شروع ہوتا ہے اور ۶۵۰ء تک ختم ہوجاتا ہے۔ اس مدت کے آثار میں سے بہ لحاظ زبان پہلوی صرف سکے اور کتبے پائے جاتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی موجودہ کتابوں کی تصنیف آٹھویں صدی عیسوی سے پہلے کی نہیں پائی جاتی۔ بالفاظ دیگر یہ تمام کتابیں زمانۂ اسلام کی تصنیفات میں سے ہیں۔ ممکن ہے کہ اردوراف نامک پہلے کی تصنیف ہو مگر ڈاکٹر ٹسڈل کا اعتراض تسلیم کرنے سے پیشتر تحقیقی طور پر یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ (۱) یہ کتاب کب تصنیف ہوئی (۲) سورۂ

بنی اسرائیل کب نازل ہوئی (۴) ابتدائی روایاتِ معراج کا زمانہ کب کا ہے اور (۵) روایات مابعد کب سے نقل کی جاتی ہیں

گزارش

واقعۂ معراج سے کسی مسلمان نے اپنے آپکو مسلمان کہہ کر انکار نہیں کیا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا کہ ایک صاحب مولوی محمد عنایت اللہ صاحب المشرقی نے اپنی کتاب "تذکرہ" میں سورۂ نجم کی تاویل پیمبر صاحب کے معراج علم و کمال سے کی ہے اور اس طور سے کی ہے کہ عبارت اور معنی میں بہت کچھ مطابقت پیدا ہو جاتی ہے لیکن سلسلۂ تاویل میں وہ سورۂ بنی اسرائیل کی شروع کی آیت کا مضمون یا حوالہ بالکل حذف کر گئے ہیں۔ یہ آیت اسقدر صاف معلوم ہوتی ہے کہ اس سے گریز ممکن نہیں۔ عبارت صاف ہے کہ اللہ تعالے ایک رات اپنے بندے کو پاک مسجد سے دور کی مسجد کی طرف لے گیا۔ پاک مسجد کو کعبہ مانئے یا کوئی اور مسجد۔ دور کی مسجد کو بیت المقدس کی مسجد مانئے یا کوئی اور مسجد۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک رات میں اللہ تعالے اپنے بندے کو مہینوں کی راہ سے لے گیا اور واپس لایا۔ سوال یہ رہ جاتا ہے کہ کس طریق پر لے گیا۔ یہ طریقے مولوی عبدالمالک صاحب اپنے مضمون میں ظاہر کر چکے ہیں۔ اسی سورۂ بنی اسرائیل میں آگے چل کر کئی آیتیں ایسی ہیں جن سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ پیمبر صاحب کو رویا کے ذریعہ سے مکاشفہ ہوا۔ مثلاً ایک آیت اس مضمون کی ہے کہ کافروں نے پیغمبر صاحب سے یہ سوال کیا کہ تم آسمان پر چڑھ جاؤ تو پیمبر صاحب کو یہ ہدایت ہوئی کہ وہ منکرین کو ایسا جواب دیدیں کہ میں بشر ہوں۔ ایک آیت کا مضمون یہ بھی ہے کہ جب پیمبر صاحب کو رویا میں اللہ تعالے نے اپنی نشانیاں دکھائیں تو اس امر کا اظہار بھی منکرین کی جانب سے فتنۂ و فساد کا باعث ہوا۔ خلاصہ یہ ہے کہ واقعہ اسریٰ ایسا واقعہ ہے جسکی کسی مسلمان یا غیر مسلمان کے نزدیک کوئی تردید یا تاویل نہیں کی جاسکتی۔ البتہ اس طریقہ کے متعلق تاویل کو گنجایش ہے جس طریقہ سے پیمبر صاحب پر یہ واقعہ گذرا۔ یہ مانکر کہ پیمبر صاحب کو عالم خواب میں یا عالم بیداری میں مکاشفہ ہوا کونسی وجہ ایسی ہوسکتی ہے کہ اگر ڈاکٹر تسڈل نے یہ ثابت کردیا ہے کہ جو تفصیلات معراج روایاتِ مابعد میں پائی جاتی ہیں وہ پیغمبر صاحب نے بیان نہیں کی ہیں تو واقعۂ اسریٰ سے انکار کردیا جائے جیسا کہ فاضل ایڈیٹر نگار نے رائے ظاہر کی ہے

آیت اسریٰ کے متعلق جو ابتدائی روایات ہیں اون میں واقعۂ معراج کا بھی حوالہ ہے اور وقوع معراج کے متعلق اس قدر حدیثیں موجود ہیں جن سے (واقعاتِ معراج کی تفصیل کو جُدا رکھ کر) نفس واقعۂ معراج کے متعلق کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ خود پیمبر صاحب کے بیان کے مطابق پیمبر صاحب کو معراج بھی اُسی طرح حاصل ہوئی جس طرح کہ وہ مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے جائے گئے

علم روحانیات میں مکاشفہ ممکن الوقوع قرار دیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں معجزوں اور سچے خوابوں کے وجود کا

اقرار موجود ہے جب کہ ہم قرآن کو صحیح اللفظ اور صحیح المعنی قرار دیتے ہیں اور جبکہ ماہرین روحانیات مکاشفہ کے امکان
کی خبر دیتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ایک شخص جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے اپنے اس دعوی کے پیش کرنے
میں شرمائے کہ پیمبر صاحب کو معراج ہوئی خصوصاً جب کہ ایسا دعویٰ کسی ایسے شخص کے روبرو پیش کیا جائے جو خدا کی
ہستی کے راز کو تثلیث پر مبنی سمجھتا ہو اور اُس کی کوئی عقلاً تا دلیل نہ بیان کر سکتا ہو۔ نیز جبکہ وہ عیسیٰ کی معراج کا قائل
ہو تو کیا وجہ ہے کہ اُس کے ظن اور قیاس کا مقابلہ اوسی کے اعتقادی اصولوں اور روحانیات کی دلیل سے نہ کیا
جا سکے۔ ایسے شخص سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر خدا میں یہ قدرت تھی کہ اس نے عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر
اٹھا لیا تو اُس کی قدرت میں یہ ضرور داخل ہو سکتا ہے کہ وہ پیغمبر عربی یا اوس کی روح کو اپنی عجائبات کا مشاہدہ کرائے۔
یہ سوال بالکل جداگانہ ہے کہ کیا کیا عجائبات مشاہدہ کرائے گئے۔ ممکن ہے کہ جن روایات میں یہ عجائبات مذکور ہیں اُن
میں سے بعض ضعیف ہوں۔ نامعتبر ہوں۔ ناقص ہوں۔ لیکن یہ معترض کا فرض ہے کہ وہ ایسا نقص یا ضعف ظاہر
کرے۔ اگر یہ ثابت کر دیا جائے کہ فلاں روایت ضعیف ہے یا قابل اعتبار نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ ایسی روایات کو قبول
کرنے کی کوئی وجہ نہیں رہیگی۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ معراج کے بارے میں جو احادیث موجود ہیں اون میں پچھلی تحقیقات کے
مُطابق صحیح بھی ہیں حسن بھی اور ضعیف بھی۔ اگر زمانۂ حال میں کامل تر تحقیقات ہو سکتی ہے تو ایسی تحقیقات کے
کئے جانے میں کوئی امر مانع نہیں ہو سکتا

فاضل ایڈیٹر نگار سے امید ہے کہ وہ اس گذارش اور نوٹس مندرجۂ بالا پر غور کر کے ظاہر فرمائیں گے کہ کیا
موجودہ صورت میں ڈاکٹر ٹسڈل کا اعتراض صحیح ہے ———

(نگار) ہمارے فاضل دوست مولوی حکیم احمد صاحب نے واقعہ معراج پر اظہار خیال فرماتے ہوئے ڈاکٹر ٹسڈل اور
مولوی عبد المالک صاحب آروی کے بیانات پر جو تبصرہ فرمایا ہے، وہ صحیح ہو یا غلط، لیکن میری تحریر سے جو نتیجہ انھوں نے
اخذ کیا ہے وہ یقیناً درست نہیں

اگر فاضل مقالہ نگار میری تحریروں کو جو فروری و مارچ ۱۹۳۲ء کے نگار میں شائع ہوئی ہیں بامعان نظر ملاحظہ فرمائیں
گے تو معلوم ہوگا کہ میرا اصل مدعا صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ مولوی عبد المالک صاحب ڈاکٹر ٹسڈل کے اعتراض کا کوئی شافی جواب نہیں
دے سکے۔ کیونکہ ایک روایت صرف اس بنا پر کہ راویوں کا سلسلہ رسول کریم تک پہونچتا ہے، ایک مسلمان ہی کے لئے قابل
قبول ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر ٹسڈل یا کوئی اور غیر مسلم کیوں اسے یقین کرنے لگا، وہ تو برملا کہدے گا کہ اگر واقعی یہ بات تمھارے رسول
نے کہی ہے تو اور زیادہ ثبوت اُن کے نبی نہ ہونے کا ہے

اس لئے سب سے پہلے غور طلب امر یہ ہے کہ واقعہ معراج کے متعلق جو تفصیلی روایت مسلمانوں میں رائج ہے۔ اسے آتکی

عقل انسانی قبول کر سکتی ہے یا نہیں ـــــ آج سے میری مراد علوم و فنون کا دورِ ترقی ہے جب ریاضیات و فلکیات وغیرہ نے بہت سے معتقدات ماضیہ کو درہم و برہم کرکے رکھ دیا ہے ـــ اب سے تیرہ سو برس قبل جب زمین ساکن اور آسمان متحرک مانا جاتا تھا، جب آسمان کو ایک مادی چیز کی طرح جامد سمجھ کر اسے "طبق علیٰ طبق" باور کیا جاتا تھا، جب کشش زمین اور جذب مرکزی کی حقیقت سے لوگ ناواقف تھے، اس وقت تو اس کا امکان تھا کہ ایک شخص ان سب کو چیرتا پھاڑتا نکل جائے لیکن آج جبکہ آسمان و فلک نام ہے صرف فضائے بسیط کا اس کو کیونکر تسلیم کیا جا سکتا ہے

جبرئیل کا براق لے کر آنا اس پر سوار کرا کے مسجد اقصیٰ تک لیجانا، وہاں سے سات آسمانوں پر چڑھ کر مختلف انبیاء سے گفتگو کرنا۔ اور آخر میں سدرۃ المنتہیٰ تک پہونچ کر خود ذات باری سے ہمکلام ہونا اور یہ تمام مراحل طے کرنے کے بعد اس قدر جلد واپس آجانا کہ آپ کا بستر بھی ٹھنڈا نہ ہوا تھا۔ اور دروازہ کی زنجیر بھی بدستور ہل رہی تھی ـــ کیا سمجھ میں آنے والی باتیں ہیں اور آج کون ہے جو اس کو باور کرے گا

اسریٰ اور معراج کے متعلق جتنی روایات پائی جاتی ہیں۔ ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ معراج کو بالکل دنیاوی سیر و سیاحت کی طرح سمجھا گیا اور آسمانوں کو ٹھوس مادی چیز سمجھ کر وہاں انبیاء کا قیام کرنا بھی تسلیم کیا گیا جن سے رسول اللہ نے باتیں کیں ـــ اور نہ صرف یہ بلکہ خدا کے لئے بھی ایک جگہ متعین کرکے وہاں ایک درخت (سدرۃ المنتہیٰ) کا ہونا بتایا گیا جس کے پتے ہاتھی کے کان کے برابر تھے اور پھل مٹکوں کے برابر ـــ

ظاہر ہے کہ کوئی صحیح العقل انسان ان باتوں کا یقین نہیں کر سکتا اور اگر بقول ہمارے فاضل مقالہ نگار کے "کوئی مسلمان اپنے آپ کو مسلمان کہہ کر ان واقعات سے انکار نہیں کر سکتا" تو یہ بھی یقینی ہے کہ کوئی صحیح الدماغ شخص 'مسلمان' کو کبھی انسان نہیں کہہ سکتا ـــ

مجھے سخت حیرت ہے کہ مولوی حکیم احمد صاحب بھی جو "عقل و نقل" دونوں سے کام لینے کی اہلیت رکھتے ہیں یہ عقیدہ رکھتے ہیں اور اگر کوئی شخص اس کی لغویت ثابت کرکے رسول اللہ کی ذات سے اس الزام کو دور کرنا چاہتا ہے تو اُسے مخالف اسلام سمجھتے ہیں

اگر فاضل مقالہ نگار مذہب کے باب میں عقل سے کام لینا گناہ سمجھتے ہیں اور ان کے نزدیک مذہب نام ہے صرف سمجھ میں نہ آسکنے والی باتوں کا، تو وہ کم از کم روایتوں ہی کے اختلافات پر غور کرتے، اور انھیں اختلافات کو سامنے رکھ کر کوئی فیصلہ کرتے، لیکن افسوس ہے کہ انھوں نے یہ بھی نہیں کیا

فاضل مقالہ نگار کو معلوم ہونا چاہئے کہ اسریٰ اور معراج کے باب میں اتنے اختلافات پائے جاتے ہیں کہ شاید ہی کسی دوسرے مسئلہ میں نظر آتے ہوں اور اسی سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ نہ صرف اس زمانہ میں بلکہ اُس وقت بھی لوگ اس کو صحیح باور کرنے کے لئے طیار نہ تھے

نفس معراج واسراء کے وقوع کے متعلق اختلافات کی مختصر فہرست ملاحظہ ہو :-

(۱) معراج واسراء دو جداگانہ چیزیں ہیں اور دونوں علیحدہ علیحدہ ہوئیں

(۲) معراج واسراء دونوں ایک ساتھ ہوئیں

(۳) ایک بار اسراء ہوئی اور دوسری بار معراج

(۴) معراج دو بار ہوئی ایک بار بغیر اسراء کے اور دوبارہ معہ اسراء کے

(۵) معراج معہ اسراء کے دو مرتبہ ہوئی

اور لطف یہ ہے کہ ہر شخص اپنے بیان کے ثبوت میں روایات بھی پیش کرتا ہے

اب اُن روایات کو لیجئے جو تفصیل معراج کے متعلق بیان کی جاتی ہیں سو ان کا اختلاف اور زیادہ حیرت انگیز ہے صحاح ستہ کی روایتوں کو یکجا کر کے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس واقعہ کے ایک ایک جزو کے متعلق روایتوں میں اختلاف پایا جاتا ہے یہاں تک کہ آج یقین کے ساتھ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ کس وقت اور کس جگہ سے آپ معراج کے لئے لیجائے گئے، ایک فرشتہ آیا تھا یا دو تین، آپ جاگ رہے تھے یا سو رہے تھے براق پر سوار ہو کر گئے یا سیڑھی کے ذریعہ سے جیسا کہ ابن ہشام، طبری اور ابن سعد کا بیان ہے اور کون کون سے پیغمبر کس کس آسمان پر آپ کو ملے،

پھر جب حالت یہ ہے کہ اس عقل و نقل کی حیثیت سے واقعہ معراج کی صحت کا یقین نہیں ہو سکتا تو اس پر اصرار کیوں ہو ——— اگر معراج آنحضرت کو بہ حالت خواب ہوئی جیسا کہ بعض کا خیال ہے تو اس میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں، جسکا اس اہتمام کے ساتھ ذکر کیا جائے کیوں کہ سونے کی حالت میں اس سے زیادہ حیرت انگیز باتیں لوگوں کو نظر آتی رہتی ہیں، اور اگر بہ حالت بیداری مانی جائے تو خیر عقلاً تو محال ہی، نقل و روایت کی رُو سے بھی اس پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کیونکہ اس سے زیادہ مہتم بالشان واقعہ آنحضرت کی زندگی کا اور کوئی نہیں ہو سکتا اور اسی کے متعلق اسقدر اختلافات پائے جاتے ہیں

اب رہ گیا یہ امر کہ معراج کا خیال زردشتی کتابوں سے لیا گیا یا ہندوؤں کے روایات سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، کیونکہ ایک غلط بات خواہ وہ اختراع کی گئی ہو یا کسی کے تتبع میں بیان کی گئی ہو، ہمیشہ غلط رہے گی ——— اگر تھوڑی دیر کے لئے ہم اس کو مان بھی لیں کہ ورد ارات نامک میں زردشت کی معراج کا ذکر کہیں نہیں پایا جاتا، اور ارجن کی سیاحت آسمانی ہندوؤں کے قدیم لٹریچر میں کسی جگہ بیان نہیں کی گئی، تو بھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مسلمانوں کی روایت معراج کو صحیح باور کر لیا جائے ——— اس لئے فاضل مقالہ نگار اگر بجائے اس دور از کار بحث کے نفس مسئلہ معراج کی تحقیق و تنقید پر اپنا وقت صرف کرتے تو زیادہ مناسب تھا ———

فاضل مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت "اسریٰ بعبدہ" کھلی ہوئی شہادت اس امر کی ہے کہ معراج ہوئی، لیکن دبی زبان سے سلسلۂ کلام میں وہ یہ بھی ظاہر کرگئے ہیں کہ معراج غالباً حالت خواب میں ہوئی، لیکن اگر کلام مجید کی تمام آیتوں پر بغیر کسی تاویل کے ایمان لانا فرض ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ معراج بہ حالت خواب مانی جائے کیونکہ الفاظ اسریٰ بعبدہ سے نہ صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلعم اپنے جسد ظاہری کے لیجائے گئے بلکہ یہ بھی کہ خود خدا اُن کے ساتھ تھا آیت مذکورہ میں لفظ اسریٰ کے ساتھ (ب) کا صلہ استعمال کیا گیا ہے، درانحالیکہ اسریٰ میں جو تعدیہ پایا جاتا ہے وہ حرف (ب) کے صلہ کا محتاج نہیں۔ اسریٰ عبدہ سے بھی سیر کرانے کے معنی پیدا ہو سکتے تھے، پھر ظاہر ہے کہ ب کا صلہ کسی خاص مفہوم کے لئے لایا گیا ہے اور وہ یہی ہو سکتا ہے کہ خدا خود رسول اللہ کو اپنے ساتھ لے گیا ـــــ لیکن اگر وہ اس کی کوئی تاویل کرکے معراج جسمانی کے عقیدہ سے منحرف ہونا چاہتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ دوسرا شخص کوئی اور تاویل کرکے اس آیت کا کوئی اور مفہوم نہ قرار دے ـــــ کیونکہ معراج منامی کے تسلیم کرنے سے تو بدرجہا بہتر یہی ہے کہ سرے سے اس کا انکار ہی کر دیا جائے، کیونکہ محض خواب میں رسول اللہ کا یہ دیکھنا کہ وہ ہفت افلاک طے کرکے خدا سے ہمکلام ہوئے کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں جس پر کسی رسول یا اس کے متبعین کو ناز کرنا چاہیئے ـــــ علاوہ اس کے اگر فاضل مقالہ نگار واقعی معراج منامی مانتے ہیں تو پھر بدرجۂ اولیٰ انھیں روایات احادیث کو نہ ماننا چاہیئے جن میں تمام وہی تفصیلات موجود ہیں جو جسمانی سیر و سیاحت کے لئے ضروری ہوتے ہیں ـــــ مگر کسقدر حیرت ہے کہ وہ ایک طرف احادیث کی صحت کے بھی قائل ہیں۔ اور دوسری طرف معراج کا بہ حالت خواب ہونا تسلیم کرتے ہیں ـــــ

واقعہ یہ ہے کہ کلام مجید میں بہت سی آیتیں ایسی ہیں جن میں صرف تشبیہ و استعارہ سے کام لیا گیا ہے۔ مثلاً ید اللہ فوق ایدیہم، یا خلق السمٰوات والارض وما بینہما فی ستۃ ایام یا وہ تمام آیات جن میں دوزخ و جنت کا ذکر ہے اور غالباً ہمارے فاضل مقالہ نگار بھی یہ ماننے پر مجبور ہوں گے کہ واقعی نہ خدا کے ہاتھ ہے اور نہ چھ دن میں آسمان و زمین بن گئے، پھر جب وہ کلام مجید کے سمجھنے میں تاویل سے کلیتہً احتراز نہیں کر سکتے تو پھر تاویل کی تعیین و تحدید کے کیا معنی یعنی وہ کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ فلاں جگہ تو تاویل ہو سکتی ہے اور فلاں جگہ نہیں۔ تاویل اسی وقت کی جاتی ہے جب عقلاً کسی قول کے ظاہری معنی قابل قبول نہ ہوں، پھر جس طرح خدا کے لئے ہاتھ منہ کا ہونا یا کائنات کا چھ دن میں بن کر طیار ہو جانا ایک شخص کے لئے عقلاً قابل قبول نہیں اسی طرح دوسرے کے نزدیک یہ بھی لایق تسلیم نہیں کہ رسول اللہ براق پر سوار ہوکر یا سیڑھی کے ذریعہ سے آسمانوں پر چڑھ گئے ہوں اور یہ فضائی ہفتخواں طے کرکے خدا سے ہمکلام ہوئے ہوں اور وہ گفتگو صرف یہ ہو کہ ان کی امت کے لئے بجائے ۵۰ وقت کے صرف پانچ وقت کی نماز فرض کر دی جائے، درانحالیکہ یہ بات یوں بھی آسانی سے طے ہو سکتی تھی ـــــ بہرحال احادیث معراج یقیناً سب کی سب موضوع ہیں اور رسول اللہ نے کبھی ان واقعات کا اظہار نہیں کیا جو رُواۃ بیان کرتے ہیں اور اگر کوئی مسلمان اس کا یقین کرتا ہے کہ واقعی رسول اللہ نے ایسا بیان کیا کہ اپنے جسد ظاہری

کے ساتھ فلک الافلاک تک پہونچکر عرشِ خداوندی تک باریاب ہوئے تو وہ رسول اللہ کی توہین کرنے والا ہے اور اگر کوئی شخص صرف معراج بہ حالتِ خواب کا قائل ہے تو وہ رسول اللہ کی ذات گرامی سے استہزا کرتا ہے کیونکہ نیند میں تو ایک معمولی انسان اپنے آپ کا خدا ہو جانا بھی دیکھ سکتا ہے۔ چہ جائیکہ خدا کے حضور تک پہونچ جانا، اور خواب کی اس کیفیت کو کبھی رسول اللہ اہمیت دیکر بیان نہیں کر سکتے تھے

اب رہا یہ امر کہ معراج کا خیال لوگوں نے کہاں سے لے کر رسول اللہ سے منسوب کیا، اس کے متعلق میں کسی آئندہ صحبت میں اپنی تحقیق پیش کروں گا، کیونکہ علاوہ زردشتیوں کے اور بھی اقوام قدیمہ میں اس قسم کی روایتیں پائی جاتی تھیں اور محض اردوراف نامک ہی ایک ایسی کتاب نہیں ہے جس میں اس کا ذکر پایا جاتا ہو، حالانکہ اردوراف نامک بھی عہد قبل اسلام کی کتاب ہے اور پہلوی زبان کی جدید تحقیقات کے سلسلہ میں علاوہ اردوراف نامک کے اور بھی متعدد مخطوطات عہد زردشت کے دستیاب ہوئے ہیں

مطبوعات موصولہ

رہنمائے مقدمات مقدسہ | یہ کتاب خانصاحب حاجی محمد اشرف خاں مہتمم خزانہ ڈیرہ اسماعیل خاں کا سفرنامہ ہے جو دوران زیارت اماکن مقدسہ انھوں نے مرتب کیا ہے

ہر چند اس موضوع پر اس سے قبل متعدد کتابیں شایع ہوچکی ہیں اور کوئی اہل قلم ایسا نہیں جس نے سفر حج کے سلسلہ میں اپنے تجربات کو قلمبند نہ کیا ہو، لیکن کم کتابیں ایسی ہیں جو "مجموعۂ تجربات" سے بڑھ کر "نتائج مطالعہ وتنقید" کہلائی جائیں —— راستہ کی دشواریاں اور اُن کو دور کرنے کی تدابیر، مناسک حج کی تفصیل اور اُن سے عہدہ برآ ہونے کے طریقے، تو ہر شخص لکھ سکتا ہے، لیکن اس محدود سے نکل کر کسی ملک کے تمدن ومعاشرت، صنعت وحرفت، اقتصاد وتجارت اور طبعی حالات پر گفتگو کرنا آسان نہیں۔ اس کے لئے ایک خاص دماغ، ایک خاص اہلیت، اور ایک مخصوص ذوق مطالعہ وتنقید درکار ہے۔ حج کو آسانی سے طے کرا دینے والی کتابیں تو بہت نظر آتی ہیں، لیکن حج کو ذریعۂ معلومات بنا دینے والی بہت کم ہیں

اس لئے ملک کو فاضل مؤلف کا ممنون ہونا چاہئے کہ ان کا سفرنامہ صرف معمولی ڈائری نہیں ہے جو صرف مناسک حج سے بحث کرتا ہو بلکہ اس میں وہ سب کچھ ہے جس کی ایک نگاہ نکتہ رس اور فہم رمز شناس کو ضرورت ہوسکتی ہے۔ کتاب میں جابجا تصاویر بھی دی گئی ہیں اور کتابت وطباعت کا بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ یہ کتاب عہ میں فاضل مؤلف سے ڈیرہ اسماعیل خاں کے پتہ پر مل سکتی ہے

سیلاب تبسم | اس سے قبل جناب شوکت تھانوی کے مضامین کے دو مجموعے موج تبسم اور بحر تبسم کے نام سے شایع ہوچکے ہیں۔ چونکہ موج اور بحر کے بعد تدریجی ارتقار کے ماتحت ایک سیلاب کی بھی ضرورت تھی، اس لئے یہ تیسرا مجموعہ "سیلاب تبسم" کے نام سے شایع ہوا ہے، درانحالیکہ اس امر میں اختلاف ہوسکتا ہے کہ موج، بحر اور سیلاب میں ازروئے فرق مراتب مقدم ومؤخر کی نسبت وہی صحیح ہے جو شوکت صاحب نے سمجھی ہے یا اس کے برعکس —— بہرحال اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ بحر میں سیلاب بھی آتا ہے (درانحالیکہ ایسا نہیں ہوتا) اور موج بھی بحر پر مقدم ہے (جو یقیناً غلط ہے)، تو یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ سیلاب کے بعد کی منزل کیا ہوگی۔ خدا کرے وہ نہ ہو جو سیلاب کے گذرنے کے بعد علی العموم ہوا کرتی ہے ——

شوکت صاحب مُلک کے مخصوص مزاحیہ نگاروں میں سے ہیں اور میں ایک سے زائد بار اُن کے رنگ انشا پر اپنی رائے کا اظہار کرچکا ہوں ــــــ اس مخصوص طرز تحریر میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ مطالعۂ جزئیات، بے ساختگی تحریر اور استدلال شاعرانہ (جو تعبیر فکاہی سے آگے نہ بڑھنے پائے) شوکت صاحب میں یہ تینوں باتیں پائی جاتی ہیں اور اسی لئے اُن کے مضامین کا مطالعہ سنجیدہ طبایع کو بھی ناگوار نہیں ہوتا۔ چونکہ شوکت صاحب اکتسابی مزاح نگار نہیں ہیں بلکہ قدرتاً (معاف فرمائیں) "ہنسوڑ" واقع ہوئے ہیں، اس لئے اُن کے یہاں تصنع و آورد کا پتہ نہیں اور اُن کی کامیابی کا یہی اصل راز ہے

اس مجموعہ میں اُن کے چوبیس مضامین ہیں جو چھوٹی تقطیع کے ۲۸۰ صفحات کو محیط ہیں۔ کتاب مجلد شایع کی گئی ہے اور دو روپیہ میں صدیق بک ڈپو امین آباد لکھنؤ سے مل سکتی ہے جس نے اس کی اشاعت کی ہے

کلیاتِ طغرائی مجموعہ ہے (مرحوم) حکیم فیروزالدین احمد فیروز طغرائی امرتسری کے فارسی اُردو کلام کا جسے جناب تبسم ام۔اے نے مرتب کرکے شائع کیا ہے۔ شروع میں شاعر کے سوانح حیات بھی درج ہیں اور اُن کے اُردو کلام پر تنقید بھی کی گئی ہے ــــــ یہ مجموعہ اوسط تقطیع کے ۲۲۰ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں قصاید منظومات، قطعات وغزلیات وغیرہ سبھی کچھ پایا جاتا ہے

فیروز طغرائی امرتسر کے اچھے شعرا میں سے تھے اور پنجاب کی وطن پرستی نے انھیں اور زیادہ مشہور کردیا تھا افسوس ہے کہ میں بالاستیعاب اُن کے کلام کا مطالعہ نہیں کرسکا لیکن جستہ جستہ ورق گردانی سے میں جس نتیجہ پر پہونچا ہوں وہ یہ ہے کہ ان کا فارسی کلام، اُردو سے بدرجہا بہتر ہے اور کشمیری الاصل ہونے کی وجہ سے فارسیت کے ساتھ اُن کا زیادہ لگاؤ تھا ــــ ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمائیے کسقدر پاکیزہ ہیں:ــــــ

آں ترک نازک ست دگراں ست جانِ ما   ہم امتحان اوست دمِ امتحان ما
کے جائے ماندن ست بہ بازارِ عاشقی   خالی ست از متاعِ تحمل دکان ما

منصور انا الحق زدہ دیگر نتواں گفت   حرفے کہ کسے گفتہ مکرر نتواں گفت
زیں سنگ دلیہا کہ بہ بینیم بتاں را   نازک نتواں گفت، سمن بر نتواں گفت

از بادہ نوش میکدۂ آرزو مپرس   چندانکہ خم کشید رہینِ خمار بود

بتے کہ پردہ نشین حریم دل بود ست   بہ حیرتم چہ قدر عالم آشنا افتاد

کشیدم درتمنا لش من از ہر آرزو دستے		چہ خوش لے ناصح ناداں کہ بردارم از و دستے

طغرائی کے فارسی قصائد بھی خوب ہیں اور زور کلام کی اچھی اچھی مثالیں ان میں ملتی ہیں یہ مجموعہ ۱۲ر میں کتب خانہ زائی امرت سر سے مل سکتا ہے

تہذیب عمل مجموعہ ہے ملک محمد باقر نسیم ام، اے گجراتی کے چند مقالات کا جو عملی زندگی کی اصلاح کے لئے انھوں نے وقتاً فوقتاً لکھے تھے ——— فاضل مولف کا مقصود اس کتاب کی اشاعت سے یہ ہے کہ ملک کے نوجوان اور خصوصیت کے ساتھ طلبہ اپنی قوت مطالعہ کو بڑھائیں کہ اسی کا نام قوت حافظہ ہے اور یہی مستقبل کی شاہراہ کی کہلاتی ہے

غالباً اُردو میں یہ بالکل پہلی کتاب ہے جس میں قوتِ ارادی سے بحث کر کے عملی زندگی میں اس کی غیر معمولی اہمیت ظاہر کیا گیا ہے

یہ کتاب اس قابل ہے کہ نوجوان طلبہ کے درس میں داخل کی جائے اور مجھے بڑی مسرت ہے کہ جناب نسیم رضوانی باوجود جوان ہونے کے اپنے شباب کی رعایت سے سب سے پہلے کوئی فسانہ حسن وعشق شایع نہیں کیا بلکہ کام کی چیز پیش کی ہے۔ جس سے خود اُن کی قوتِ عمل پر کافی روشنی پڑتی ہے		یہ کتاب ۶ر میں دفتر ''تذکرہ'' گجرات سے مل سکتی ہے

ب آپ جس کا دوسرا نام ''شکل بدلنے کا طریقہ'' بھی ہے۔ یہ ترجمہ ہے کسی انگریزی کتاب کا جسے ''فلم ریویو'' کلکتہ نے شائع کیا ہے ——— اس کے مترجم کوئی صاحب عکاس دہلوی ہیں ———
موجودہ زمانہ میں چونکہ صنعت فلم سازی یہاں بھی مقبول ہوتی جارہی ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ اُردو میں ایسی کتابیں لکھی جائیں۔ اس کی قیمت ۱۲ر بیشک کچھ زائد معلوم ہوتی ہے

سرودِ رُوح

چل رہی ہے شام کی ٹھنڈی ہوا گاتی ہوئی
دل کو فرحت، روح کو تسکین پہنچاتی ہوئی

کچھ سنہرے اور شفق گوں بادلوں کے درمیاں
دیدنی ہے ڈوبتے سورج کا کیف افزا سماں

دور تک پھیلے ہوئے سرسبز کھیتوں کی بہار
کوہسار اور اُن میں اک ہلکا سا نورانی غبار

پیچ و خم کھاتی ہوئی پگڈنڈیوں میں بے نقاب
حریت کے روح پرور ولولوں کا التہاب

خامشی کے حُسن میں نغموں کے ہلکوروں کا رنگ
کیف، رعنائی، لطافت، زندگی، شوخی، اُمنگ

اک مئے جاں بخش سے لبریز ہے دل کا ایاغ
ڈھل گئے ہیں بادۂ کوثر سے اجڑے دماغ

کیا طرب آموز ہے شاداب جنگل کی فضا
ہو رہی ہے اک مسلسل بارشِ کیف و ضیا!

چھیڑتی ہے شام جب سازِ نشاط و تازگی
ہر رگِ مُردہ میں دوڑ اٹھتا ہے خونِ زندگی

دور ہو جاتے ہیں تلخ اور غم فزا اوہام و قیاس
روح کی موسیقیوں میں ڈوب جاتے ہیں حواس

شام کا مقصد نہیں ہے صرف تخلیقِ جمال
دے رہی ہے بزمِ قدرت دعوتِ فکر و خیال

کر رہا ہے کوئی در پردہ بشر کا احترام
گوشِ دل سے سُن ذرا فطرت کا نورانی پیام

کاش یوں ہموار ہو جائے زمانے کا نظام
کر سکیں منعم غریبوں کا بھی دل سے احترام

عقل صرفِ گمرہی ہے، ہوش وقفِ اختلال
آہ کیا ہو گا ہوس زائیدہ دنیا کا مآل

مذہبِ انسانیت سے ہے خرد کو احتراز
زندگی ہے یا جہنم کی عقوبت کا گُداز

ہر بشر کی روح اطمینان سے محروم ہے
کیا زمانے کی ترقی کا یہی مفہوم ہے؟

ہمنشیں دل میں اگر رکھتا ہے احساسِ عمیق
دیکھ عبرت کی نظر سے دہر کے طرز و طریق

کیا یہی دنیا ہے لفظِ "کن" کی جو تفسیر ہے
عشق کے ذوقِ جہاں سازی کی یہ تعبیر ہے؟

وسعتِ تخئیل میں جب ڈوب جاتا ہوں کبھی
اور چھا جاتی ہے دل پر ایک گہری بیخودی

آنکھ سے مستور ہو جاتی ہے بزمِ آب و گِل
جگمگا اٹھتے ہیں نورِ فکر سے اعماقِ دل

زندگی کی عظمتوں کے راز ہوتے ہیں عیاں
اور نظر آتا ہے اک پُرامن نورانی جہاں

گو ہنوز اُس سطح پر دنیا کا آنا ہے محال
ہے مرے پیغام میں مضمر حقیقت کا جلال

جب محبت مذہبِ اہلِ جہاں ہو جائے گی
کائنات اِک وادیٔ جنت نشاں ہو جائیگی

عدم

نغمۂ محبّت

ازل سے درد بہ دل ہوں، جنوں بہ سر ہوں میں — کہ اک غریب، محبّت زدہ بشر ہوں میں
ترے خیال میں گم ہو گیا ہے میرا وجود ! ! — مجھے کچھ اپنی خبر کیوں نہیں اگر ہوں میں
ہر ایک سانس ہے تشریحِ دردِ دل، صد حیف! — خود اپنے عشق کی رسوائیوں کا گھر ہوں میں
یہ کیا سمجھ کے غمِ عشق دے رہے ہو مجھے — یہ کس نے تم سے کہا صاحبِ جگر ہوں میں

ازل سے ضامنِ گردش ہے زندگی میری
یمِ حیات کا چھوٹا سا اک بھنور ہوں میں

محرومی

جفا کا لطف با اندازۂ وفا نہ ملا — تمھارے عہد میں مرنے کا بھی مزا نہ ملا
نہ دل سے محو ہوئی آرزو نہ بر آئی — ستم ظریفیٔ فطرت کا مدعا نہ ملا
جنوں سوار تھا سر پر کہ پاؤں توڑ آئے — کچھ اپنی منزلِ موہوم کا پتا نہ ملا
کوئی ٹھکانا ہے دنیا ترے حوادث کا — کہ خود کو ڈھونڈنے نکلے مگر پتا نہ ملا

جنابِ شیخ! یہ کیا ماجرا ہوا آخر!
سنا ہے آپ کو کعبہ میں بھی خدا نہ ملا

عدم

قطعات

شعر گوئی

خوں بھرے جام انڈیلتا ہوں میں — ٹیس اور درد جھیلتا ہوں میں
تم سمجھتے ہو شعر کہتا ہوں ! — اپنے زخموں سے کھیلتا ہوں میں

یاس میں امید

میرے مایوس دل میں اے اختر ! — اس طرح سے امید آتی ہے
جس طرح اک اداس چہرے پر — مسکراہٹ سی کھیل جاتی ہے

حسن ونغمہ

حسن ہے ایک نغمۂ دل گیر — اور نغمہ ہے روح افزا حسن
دونوں جذبات خیز ہیں یعنی — حسن نغمہ ہے اور نغمہ حسن !

مغنیہ !

اے کہ تو راگنی میں ہے مدہوش ! — اے کہ تو گم ہے مست تانوں میں !
تھم، کہ گیت اپنے بازوؤں پہ مجھے — لئے جاتا ہے آسمانوں میں !

گیت برشگال

آتشِ غم بھڑک رہی ہے آج ! — میری چھاتی دھڑک رہی ہے آج
ابر ہے، مینھ ہے، ہوائیں ہیں — میری رگ رگ پھڑک رہی ہے آج

نشاط نغمہ

زمزمہ سنج مطربہ جس وقت — طرب افزا سُروں میں گاتی ہے
زندگی کی اندھیری راتوں میں — ایک بجلی سی کوند جاتی ہے

اختر انصاری دہلی

شعراء لکھنؤ سے خطاب

تم سے کچھ کہنا ہے مجکو شاعرانِ لکھنؤ
اس لئے میں چھیڑتا ہوں آج سازِ گفتگو

نیند کے ماتوں کو غفلت سے جگانے کے لئے
غمزدوں کو بادۂ عشرت پلانے کے لئے

مردگانِ ذوق کو دیتا ہے پیغامِ حیات
اے گرفتارانِ غم پابستۂ دامِ حیات

تم نے دیکھا ہی نہیں ہے بادۂ مینائے شعر
تم نے دیکھا ہی نہیں ہے جلوۂ لیلائے شعر

شعر کیا ہے قلزمِ عرفاں کی اک موجِ خوش آب
شعر کیا ہے روح کی شانِ جمیلِ اضطراب

شعر کیا ہے جنتِ معنی کی صہبائے طہور
شعر کیا ہے لیلیٰ مقصد کی تقریبِ ظہور

شعر کیا ہے اک پیامِ جانفزائے زندگی
شعر کیا ہے محفلِ دل میں نوائے زندگی

شعر کیا ہے آتشِ خاموشِ جذباتِ نہاں
شعر کیا ہے شعلۂ بے نام و جوشِ بے اماں

شعر کیا ہے آیتِ انجیلِ تخئیلِ جمیل
شعر کیا ہے عظمتِ ہستیٔ انساں کی کفیل

شعر کیا ہے منتہائے رفعتِ پروازِ شوق
شعر کیا ہے ایک روحِ نغمہائے سازِ شوق

شعر اقوامِ جہاں کے حق میں ہے درسِ حیات
ملتوں کو شعر سے ملتی ہے تعلیمِ ثبات

اور تمہارا شعر دنیا کے لئے تعلیمِ خواب
عقلِ انسانی کے حق میں غفلتوں کا ہے حجاب

زندہ جذبات کو مردہ بنا دیتا ہے وہ
جاگنے والوں کو بھی آخر سلا دیتا ہے وہ

روح کو پیغامِ کلفت قلب کو پیغامِ یاس
محفلِ عشرت کو کر دیتا ہے مجروحِ ہراس

دیدۂ روشن کو کر دیتا ہے محرومِ بصر
ہے تمہارا شعر ننگِ محفلِ اہلِ نظر

دست بر سینہ جماعت اک گروہ نوحہ خواں
گلستانِ شاعری میں آ گئی تجھ سے خزاں

دشمنِ احساسِ ملت ہے تمہارا ہر کلام
امتِ مرحوم کے حق میں ہے نکبت کا پیام

نوحۂ و تربت کی حکایت قصۂ آہ و بکا
نامرادی کا فسانہ خودکشی کا سلسلا

زندہ ہو کر قوم کو بہرِ خدا زندہ کرو
اس طرح تم شعر کے جوہر کو تابندہ کرو

فکری (سلطانپوری)

غزلیات

اختر انصاری

غمِ حیات کہانی ہے، قصّہ خواں ہوں میں — دلِ ستم زدہ ہے راز، رازداں ہوں میں
نظر کے سامنے کوندی تھی ایک بجلی سی — مجھے بتاؤ خدارا کہ اب کہاں ہوں میں
خزاں یہ کہتی تھی "میں شوخیٔ بہاراں ہوں" — بہار کہتی ہے "رنگینیٔ خزاں ہوں میں"
مری بلا، غمِ ہستی! اٹھائے تیرے ناز — تجھے نظر نہیں آتا ابھی جواں ہوں میں
شباب نام ہے اس جاں نواز لمحے کا — جب آدمی کو یہ محسوس ہو جواں ہوں میں"
جہانِ دردوالم پوچھتا ہے مجھ کو، آہ — تپشِ جبیں ہے، لہو سجدہ، آستاں ہوں میں
وہ دن بھی تھے کہ میں جانِ شباب تھا اختر — اب اپنے عہدِ جوانی کی داستاں ہوں میں

کوکب (شاہجہانپوری)

سجدۂ شکر ہے ہر لغزشِ مستانۂ عشق — جوشِ وحشت میں بھی ہشیار ہے دیوانۂ عشق
مائلِ عرضِ تمنا ہے دلِ خانہ خراب — المدد المدد اے غیرتِ مردانۂ عشق
شعلۂ آہ نے اک آگ لگا دی دل میں — خستۂ بادۂ سرجوش ہے پیمانۂ عشق
کون کہتا ہے؟ ہوس کو بھی محبت سمجھو! — کافرِ عشق حقیقت میں ہیں بیگانۂ عشق
غیرتِ مہر ہے ہر ذرّہ زہے پرتوِ حسن — عینِ تعمیر تھی بربادیٔ کاشانۂ عشق
شوخیٔ رنگِ تجلی سے ہیں مست اہلِ نظر — بادۂ حسن سے معمور ہے میخانۂ عشق
پھول بن بن کے ہر اک نقشِ تمنا ابھرا — نہ چھپی خاک میں رعنائیٔ کاشانۂ عشق
کیوں نہ ہو حسرتِ ناکام سے دل ذوق پذیر — کیفِ اندوہ تو ہے حاصلِ میخانۂ عشق
دلِ مجروح میں باقی نہیں اک قطرۂ خوں — اور ابھی تشنۂ تکمیل ہے افسانۂ عشق
ایک اک ذرّہ ہے "معمورۂ حسرت" کوکب — کون کہتا ہے کہ ویران ہے ویرانۂ عشق

فرخ بنارسی

جورِ الفت نما کو کیا کہیے — اس فریبِ وفا کو کیا کہیے
جلوۂ حسن عام ہے لیکن — نگہِ نارسا کو کیا کہیے
بندگی خود ہے بندگی کا صلہ — طاعتِ بے ریا کو کیا کہیے
دل پہ جب اختیار ہی نہ رہے — نگہِ فتنہ زا کو کیا کہیے
میں نہیں درخورِ کرم نہ سہی — ستمِ ناروا کو کیا کہیے
جھکنے والی تھی کب جبینِ نیاز — کششِ نقشِ پا کو کیا کہیے
ہوئی جاتی ہے گم نظر فرخ — حسنِ حیرت فزا کو کیا کہیے

معلومات

مہاری جدت مغرب کی جدت پسند دنیا بھی کیسی عجیب وغریب دنیا ہے زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو اُن کی ذہانت اختراع کا ممنون نہ ہو ـــــ وہ کتابیں لکھتے ہیں تو اس میں ابداع وجدت سے کام لیتے ہیں اور کتابیں بیچتے ہیں تو اس کے لئے بھی وہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی جدت تجویز کرتے رہتے ہیں

حال ہی میں پیرس کے دو نوجوانوں نے مل کر گزشتہ جنگ عظیم کی تاریخ لکھی اور اخباروں میں یہ اعلان دیا کہ

"دونوں مصنفوں میں جنگ کا سبب متعین کرنے میں اختلاف ہوگیا ہے اور یہ اختلاف اسقدر شدید ہوگیا ہے کہ اُن کے درمیان نبرد آزمائی ضروری ہے"

اس اعلان کے بعد وہ دونوں ایک وقت مقرر کرکے آپس میں تلواروں سے لڑے بھی اور جب یہ خبر شائع ہوئی لوگوں کو شوق پیدا ہوا کہ اصل کتاب کو دیکھنا چاہیے جس پر دو پڑھے لکھے آدمیوں میں یوں وحشیانہ جنگ ہوئی ور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند دن میں تمام نسخے ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگئے

رانس کا غدار مچھر اب سے ہزاروں سال قبل جب مچھر اور نمرود کے درمیان جنگ ہوئی تھی تو کہا جاتا ہے کہ مچھر جیت گیا تھا، اور اب بھی جبکہ انسان نے یہ جنگ دوبارہ اختیار کی ہے ھر ہی کی فتح یقینی معلوم ہوتی ہے کیونکہ باوجود جدید ترین ذرائع ہلاکت کے اس وقت تک انسان اس حقیر مگر بردست دشمن انسان کیڑے کو نیست ونابود نہیں کرسکا

جب سے یہ امر متحقق ہوا ہے کہ ملیریا کا باعث مچھر ہے اس وقت سے تمام متمدن ممالک نے مچھر کے خلاف بلکہ عام اعلان جنگ کردیا ہے اور مختلف وسائل اس کی تباہی کے لئے اختیار کئے جارہے ہیں۔ خصوصاً امریکہ میں د درجہ جد وجہد اس باب میں کی جارہی ہے

چونکہ مچھر پانی کی سطح پر رہتا ہے اس لئے سمندروں میں اور سواحل پر ایسی چڑیاں، مچھلیاں، چمگادڑ اور بنڈک پائے گئے ہیں جو مچھر کو بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ لیکن حال ہی میں اہل امریکہ نے سواحل فرانس سے بہت بڑی تعداد ایسے مچھروں کی فراہم کی ہے جنکی غذا مچھر ہی ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ بہترین طریقہ مچھروں کی ہلاکت کا ہے جو

پھر فرانس سے لائے گئے ہیں ہر چند ان سے طیریا نہیں پھیلتا، لیکن ہیں بہرحال مچھر ہی اور اس لئے اگر ان کو غدار مچھر کہا جائے تو مناسب ہوگا۔ کیونکہ یہ خود اپنی ہی جنس کو برباد کرتے ہیں

ایک سیاح عالم کتا چالیس سال قبل امریکہ کی ایک جماعت جو وہاں کے محکمہ ڈاک سے تعلق رکھتی تھی، اطراف ملک کا دورہ کر رہی تھی اور اس کے ساتھ ایک کتا بھی تھا جس کا نام "اونی" تھا یہ کتا ہر جگہ ان کے ساتھ رہتا تھا خواہ موٹر میں ہوں یا پیدل، جہاز پر ہوں یا ریل میں اس کے بعد اسی جماعت نے یہ تجویز کی کہ تنہا کتے کو سیاحت عالم کے لئے بھیجا جائے، چنانچہ ۱۸ اگست ۱۸۹۵ء کو یہ کتا روانہ کیا گیا اس کے گلے میں ایک تختی ڈال دی گئی جس پر یہ عبارت تحریر تھی :-

"یہ امریکہ کے ایک لاکھ ملازمین محکمہ ڈاک کا نہایت محبوب کتا ہے
اور ۱۸ اگست کو سیاحت دنیا کے لئے روانہ کیا گیا ہے۔ جس کو
یہ کتا ملے براہ کرم اس کی سیاحت میں مدد کرے۔"

الغرض اس طرح اس کتے نے اپنا سفر شروع کیا اور فروری ۱۸۹۶ء میں سیاحت کر کے یہ کتا اپنی جگہ پر واپس آگیا۔

ملکۂ شراب مشرق میں تو ہر وہ عورت جو پیمان وفا باندھ لیتی ہے "گھر کی ملکہ" بن جاتی ہے، لیکن چونکہ مغربی تہذیب کی رُو سے وہاں کی عورت میں سب کچھ ہے مگر یہی نہیں ہے، اس لئے اس کا وہاں ملکہ بننا بھی تفنن سے خالی نہیں

حسن و جمال کی ملکہ، ملبوسات کی ملکہ، پھولوں کی ملکہ، عطر و لونڈر کی ملکہ، موٹر کی ملکہ — الغرض سبھی قسم کی ملکائیں اس وقت تک وہاں پیدا ہو چکی ہیں، لیکن "ملکۂ شراب" اس وقت تک کوئی نہ ہوئی تھی، سو فرانس نے اس کمی کو بھی پورا کر دیا۔ اور مس ایوان جوکی کو اس عزت کا مستحق سمجھ کر مجمع عام میں اس کا اعلان بھی کر دیا گیا

رہا یہ امر کہ "ملکۂ خمر" ہونے کا کیا مفہوم ہے اور کیوں مس ایوان جوکی کا انتخاب کیا گیا، سو اس کے متعلق دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں یا تو یہ کہ اس سے زیادہ شراب پینے والی خاتون فرانس میں کوئی اور موجود نہیں یا یہ کہ اس سراپا کی مینائیت یا "میگوتی" ایسی ہے جو شراب کے یونانی دیوتا کی یاد کو تازہ کرنے والی ہے

بہرحال جو سبب بھی ہو، "ملکۂ شراب" اب اصنامی و خرافیاتی چیز نہیں رہی، بلکہ دنیا کے اور حقائق کی طرح ایک حقیقت ہو کر رہ گئی ہے اور ظاہر ہے کہ بادہ خواری کے لئے اس سے زیادہ موثق فتوائے جواز اور کیا پیش کیا جا سکتا ہے

سوئیوں کا بادشاہ بوہیمیا میں جہاں اور سالانہ مشاغل تفریح ہیں، وہیں ایک مشغلہ یہ بھی ہے کہ جس

میں سوئی چبھونے کا میچ ہوتا ہے اور جو شخص سب سے زیادہ سوئیاں اپنے جسم میں چبھو لیتا ہے اس کو کامیاب سمجھا جاتا ہے

سنہ ۲۵ء میں جب یہ سالانہ میلہ قائم ہوا تو ایک شخص نے جس کا نام باگرو ہے اور جو کسی خانہ بدوش قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے تمام اگلے پچھلے رکارڈ توڑ دئے اور دنیا کو حیرت میں ڈال دیا

اس نے تین ہزار دو سو (۳۲۰۰) سوئیاں اپنے داہنے بازو اور کلائی میں چبھو لیں اور ۳۱ گھنٹے تک اسی طرح اُن کو رہنے دیا —— اس سے قبل کوئی شخص یہ جرأت نہ کر سکا تھا اور نہ آیندہ اس کی امید کی جاتی ہے

ایک لطیف حکایت

مشہور ہے کہ عورت کبھی اپنی صحیح عمر نہیں بتاتی اور یہ سوال اس پر بہت شاق گزرتا ہے۔ اگر وہ اس سوال کا جواب بھی دیں گی تو ہمیشہ اپنی عمر کو کم بتائیگی تاکہ ان کے شباب کی جاذبیت کم نہ ہو

حال ہی میں ایک خاتون کسی موٹر سے ٹکرا گئی اور ناک پر زخم آگیا۔ اس نے موٹر چلانے والے کے خلاف معاوضہ طلب کرنے کا دعویٰ عدالت میں دائر کر دیا۔ عدالت نے ڈگری دیدی۔ لیکن موٹر والا بہت ہوشیار تھا۔ اسنے عذر پیش کیا کہ معاوضہ کی مقدار سن و سال کے لحاظ سے ہونا چاہئے کیونکہ ایک جوان عورت کی ناک اور معمر عورت کی ناک میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ عدالت نے اس عذر پر مدعیہ کو طلب کیا اور حکم دیا کہ اپنی عمر بتائے، لیکن عورت نے معاوضہ سے ہاتھ دھونا تو گوارا کر لیا، لیکن اپنی عمر ظاہر کرنا کسی طرح گوارا نہ کیا

ایک مغربی صحافتی کے کارنامے

مانچسٹر سٹی نیوز کے اڈیٹر "کمنگ وولٹرز" نے حال ہی میں اپنی خدمت سے سبکدوشی حاصل کی ہے۔ انھوں نے ۲۵ سال تک اس اخبار کی خدمت کی اور اس دوران میں انھوں نے بیس کتابیں لکھیں، ۲۵۰ لکچر دئے، ۲۰۰۰۰ افتتاحیہ مقالے لکھے، ۲۰۰۰۰ کتابوں پر تقریظ لکھی، ۱۵۰۰۰ مقالے مختلف موضوع پر لکھے اور ۸۰۰۰ ڈراموں پر تنقید کی ——

ہندوستان میں بھی ایسے دماغوں کی کمی نہیں، لیکن قدرت کی طرف سے ایک بڑا مانع دماغی کام کے لئے یہاں کی گرمی ہے جو سال میں ۶ مہینے بالکل ضائع کر دیتی ہے۔ برخلاف یوروپ کے کہ وہاں ۲۴ گھنٹے کام کرنے کے بعد دماغ نہیں تھکتا

سلطنت کی بنیاد محبت پر

ترکوں کی حکومت جو کسی وقت دولت عثمانیہ کے نام سے موسوم تھی اس کے گزشتہ اقتدار سے ہر شخص واقف ہے لیکن شاید یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ حکومت عثمانی کی اس وسعت کی بنیاد ایک واقعۂ عشق و محبت پر قائم ہوئی

جب فتنۂ چنگیزی نے ایشیاء کوچک کی تمام امارتوں کو درہم برہم کر رکھا تھا اور جیوش و قبائل اُدھر اُدھر

بھاگتے پھر رہے تھے تو انھیں میں ایک قبیلہ خراسانی ترکوں کا بھی تھا جو چار سو سواروں پر مشتمل تھا - اور جس کا قائد ارطغرل تھا ــــ اسی دوران میں یہ قبیلہ ایسے حصۂ ملک سے گزرا جہاں سلجوقی اور تاتاری لشکر باہم گرا رہے تھے ــ یہ دیکھ کر ارطغرل نے سلجوقیوں کا ساتھ دیا اور فتح حاصل کی ــ اس امداد کے صلہ میں علاء الدین سلجوقی نے، حکومت بازنطینی کے حدود پر ایک صوبہ ارطغرل کو دیدیا - ارطغرل نے یہاں خود مختارانہ حکومت کی طرح ڈال کر اپنی مختصر سلطنت کا نام سلطانونی رکھا

ارطغرل کے بعد اس کا بیٹا عثمان ۱۲۸۸ء میں تخت نشین ہوا (جس کے نام پر ترکوں کی حکومت کا نام دولت عثمانیہ قرار پایا) اس نے بازنطینی حکومت کے متعدد قلعے سر کر لئے اور اپنی سلطنت کے حدود کو زیادہ وسیع کر لیا لیکن "اسکی شہر" پر جو بازنطینی حکومت میں واقع تھا - اور عثمان کے صدر مقام سے بالکل ملا ہوا تھا اس کا قبضہ نہ ہوا تھا

اسکی شہر کے ایک گاؤں میں جس کا نام اتبرونی تھا - ایک فاضل شیخ رہا کرتا تھا جس کا نام "ادب عالی" تھا ــ عثمان بچپنے ہی سے اس کے پاس آیا جایا کرتا تھا - اور اس کی صحبت سے مستفید ہوتا تھا - اس شیخ کے ایک لڑکی تھی جس کا نام "مال خاتون" تھا ــ یہ لڑکی نہایت جمیل تھی - اور عثمان اس پر فریفتہ ہو چکا تھا - کچھ دنوں تک تو اس نے انتظار کیا لیکن جب معاملہ صبر و ضبط کی حدود سے گزر گیا تو مجبوراً اس نے شیخ کو پیغام دیا، لیکن شیخ نے انکار کر دیا ــ اتفاق سے اسی دوران میں امیر اسکی شہر کو بھی اس کے حسن و جمال کا حال معلوم ہوا - اور اس نے بھی پیام بھیجا، لیکن شیخ نے اس کو بھی رد کر دیا ــ شیخ اس ڈر سے کہ امیر زیادتی نہ کرے اپنی بیٹی کو لے کر ایک دوسرے سردار کے حدود میں چلا گیا اور اس کے قلعہ میں پناہ گزیں ہو گیا - عثمان بھی اتفاق سے یہیں تھا ــ جب امیر اسکی شہر کو یہ حال معلوم ہوا تو اس نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا - لیکن عثمان نے باہر نکل کر اس کو شکست دی اور بھگا دیا - اسکے بعد بھی ایک زمانہ گزر گیا اور عثمان کی محبت کامیاب نہوئی - ایک رات عثمان نے ایک خواب دیکھا کہ وہ شیخ کے پاس بیٹھا ہوا ہے کہ ناگہاں شیخ کے سینہ سے چاند نے طلوع کیا اور اسکے سینہ میں داخل ہو گیا تھوڑی دیر بعد اسنے دیکھا کہ اسکی ناف سے ایک بڑا درخت پیدا ہوا جسکی پھیلی ہوئی شاخوں کے نیچے جبال قوقاز پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں اور جڑوں سے دریائے ڈانوب، نیل اور دجلہ و فرات جاری ہیں - اسی درخت کے سایہ میں لسے بہت سی وادیاں، پہاڑیاں اور آبادیاں بھی نظر آئیں جن پر ہلال طلوع کئے ہوئے ہے اور چڑیوں کی چہچہوں سے فضا گونج رہی ہے ــ اسنے یہ خواب شیخ سے بیان کیا - شیخ نے سنکر کچھ دیر تامل کیا اور پھر یہ سوچکر کہ غالباً یہ تمام ترقیاں عثمان کی اولاد کو حاصل ہونیوالی ہیں اپنی لڑکی کیساتھ اسکی شادی کر دی - اس خواب کی یہ تعبیر کس حد تک صحیح ثابت ہوئی اس کا ذکر فضول ہے، کیونکہ آل عثمان کا تمام شرق ادنیٰ پر قابض ہو جانا اور مغرب میں آسٹریا و اطالیہ تک اپنی سلطنت کو وسیع کر لینا تاریخ کا روشن واقعہ ہے جس سے ہر شخص آگاہ ہے ــــ

کاہی ، و ملا عبد القادر بدایونی

قاسم کاہی کابل کے رہنے والے تھے اور لوگ اُن کو میاں کالے میاں کالے کہتے تھے۔ ملا عبد القادر کا بیان ہے کہ ان کے کلام میں پختگی بالکل نہیں تھی۔ اور غیروں کے مضمون اکثر چُرا کر باندھ دیا کرتے تھے۔ مگر ان کی ہیئت مجموعی نہایت عمدہ ہو جایا کرتی تھی۔ علم تفسیر اور ہیئت اور کلام تصوف میں بھی ان کو بڑی مہارت تھی۔ علم موسیقی میں بہت سی کتابیں ان کی تصنیف ہیں۔ معمہ اور تاریخ کے کہنے میں لاثانی تھے۔ اگرچہ پچھلے بزرگوں کی صحبت اون کو حاصل ہوئی تھی اور مولانا جامی کا زمانہ بھی پایا تھا۔ مگر تمام عمر اون کی الحاد ہی میں صرف ہوئی۔ کتوں کا بڑا شوق تھا

ایک مرتبہ ایک جوگی کی لڑکی کو دیکھ کر کاہی نے یہ شعر کہا

کاہی ؎ آتشیں رویت چہ خاکستر چو نیلوفر شدہ یا نقاب از آتش روئے تو خاکستر شدہ

اعتراض ملا عبد القادر بدایونی۔ یہ مضمون ملا وصفی کابلی کا ہے اور اس سے بہت قریب ہے ؎

از تپ ہجراں نہ خاکستر مرا بستر شدہ بستر از سوز من بیچارہ خاکستر شدہ

اس میں شک نہیں کہ یہ مضمون وصفی کے مطلع سے قریب تر ہے۔ مگر سرقہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مضمون قطعاً جدا ہے۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اوسی مضمون سے ایک نیا پہلو نکالا گیا ہے۔ کیونکہ اس قسم کے بہت سے مضمون عربی فارسی اُردو میں موجود ہیں۔ جنھیں یا تو استفادہ کی صورت میں لایا جا سکتا ہے۔ یا جواب کی حد میں۔ مثال کے لئے چند شعر دیکھئے

یزید ؎ انا المسموم ما عندی بتریاق ولا راق ادر کاساً وناولہا الا یا ایہا الساقی

حافظ ؎ الا یا ایہا الساقی ادر کاساً وناولہا کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا

سلیم ؎ سلیم امشب بیاد تربت حافظ قدح نوش است الا یا ایہا الساقی ادر کاساً وناولہا

ظاہر ہے کہ حافظ اور سلیم دونوں نے، عربی کے مصرع سے نئے مضمون پیدا کر کے دوسرے مصرع لگائے ہیں۔ مگر یزید کے شعر سے علیحدہ ہیں۔ لہٰذا اس کو صرف استخراج مضامین و استفادہ کی صورت میں لایا جا سکتا ہے

حافظ کا یہ شعر بہت مشہور ہے ؎

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حائل کجا دانند حال ما سبک ساران ساحلہا

مگر یہ شعر سعدی کے اس شعر سے مستخرج معلوم ہوتا ہے ؎

از ورطۂ ما خبر ندارد آسودہ کہ بر کنار دریاست

اور اسی حافظ کے شعر کو دیکھ کر غالب نے یہ کہا ؎

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفت است

اسی طرح خسرو کا یہ شعر

خسروا در عشقبازی کم ز ہندو زن مباش   کز برائے مردہ سوزد زندہ جان خویش را

اسی کو مدِ نظر رکھ کر یہ شعر کہا گیا

مبیں نقص زنِ ہندو کمالِ عشق را بنگر   کہ با نقص زنی خود را چہ ساں مردانہ میسوزد

فیضی نے یہ شعر کہا

در محبت ہیچو ہندو زن کسے دیوانہ نیست   سوختن بر شمع مردہ کار ہر پروانہ نیست

تینوں شعروں میں ستی کے کمال کا ذکر ہے۔ مگر مضمون سب کا علیحدہ ہے

اُردو میں میر تقی میر کا یہ شعر

ہم تو سمجھے تھے کہ لکھے گا کوئی حرف ای میر   پر ترا نامہ تو اک شوق کا دفتر نکلا

غالباً اسی سے فائدہ اٹھا کر مصحفی نے یہ کہا

مصحفی ہم تو سمجھتے تھے کہ ہو گا کوئی زخم   تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

میرا یہ شعر بھی مصحفی کے شعر سے مستفاد ہے

ہم تو سمجھے تھے کہ ہو گی کوئی بات ای آسی   تو نے تو قصۂ فرقت کو بڑا طول دیا

یا میر کا یہ شعر ؎

اسی طرح گر میر روتا رہے گا   تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

یہ مضمون خاقانی کے اس شعر سے مستفاد معلوم ہوتا ہے

ہمسایہ شنید نالہ ام گفت   خاقانی را دگر شب آمد

میر حسن کا یہ شعر بھی اسی انداز کا ہے

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ   بس آج کی شب بھی سو چکے ہم

غالب کے ایک مضمون کا انداز ایسا ہی ہے مگر ترقی کے ساتھ

یونہی گر روتا رہا غالب تو ای اہلِ جہاں   دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

میرا ایک شعر ہے جو خاقانی کے شعر کو دیکھ کر کہا تھا

گریۂ غم پہ دل زار وہی بات آئی   لوگ چلائے کہ آسی تجھے پھر رات آئی

غرض کہ اس قسم کے سینکڑوں شعر ہر زبان میں موجود ہیں۔ مگر ایک مضمون کو دوسرے سے ملتا دیکھ کر صرف سرقہ کا حکم لگانا زیادتی ہے

کلیمؔ ہمدانی و آزاد بلگرامی

مولانا آزاد بلگرامی نے کلیم کے ایک شعر پر اعتراض کیا ہے

معشوق خوردسال درآید بہ قید ضبط   سروے کہ قد کشید ز بستاں برآمدہ

اعتراض - قید اور ضبط قریب قریب مترادف الفاظ ہیں - ان میں اضافت لانا قابل غور ہے - اگر واؤ عطف درمیان میں لائیں تو بھی ان دونوں لفظوں میں سے ایک زائد رہتا ہے

(مؤلف) فی زماننا الفاظ مترادف یا قریب المعنی میں اضافت وعطف لانا کچھ معیوب نہیں - بہت سے شعر اس قسم کے موجود ہیں اوّل تو یہی کہنا زیادتی ہے کہ دنیا میں مترادف المعنی الفاظ کا وجود ہے - کیونکہ مترادف المعنی کوئی نہیں

میر عقیل کوثری و مرزا فاخر مکین

کوثری

یکے شوریدہ باغے داد ترتیب   نمونے از ریاحین زیب تزئیب

بآب دیدہ پروردے گلش را   زگلہا مژدہ دادے بلبلش را

اعتراض - تزئیب کو ظاہر الفظ زیب سے نکالا ہے - جیسا کہ مزیب آراستہ کے معنی میں لاتے ہیں مگر ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ جب زیب فارسی الاصل لفظ ہے تو مزیب اور تزئیب کیونکر صحیح ہوگا - اس قسم کی غلطیاں ناواقفوں کے کلام میں بہت سی پائی جاتی ہیں - چنانچہ مزلف - مرغن مستعمل ہیں اور افسوس یہ ہے کہ بعض اوقات ان الفاظ سے اہل علم بھی دھوکے میں پڑ جاتے ہیں

جواب مرزا سودا - چونکہ اشرف علی خاں نے بیاض دستخطی شیخ علی حزیں سے یہ قطعہ نقل کیا ہے اس واسطے ان پر یہ اعتراض نہیں پڑ سکتا بلکہ شیخ علی حزیں پر پڑتا ہے اور علی حزیں وہ شخص ہے کہ دنیا بھر اس کے لکھے ہوئے کو سند جانتی ہے - انھوں نے جو تزئیب کو صحیح سمجھا تو ممکن ہے کہ اس کی اُن کے پاس کوئی سند بھی ہو - دوسرے استادان سلف نے اکثر فارسی کے الفاظ کو معرب کر لیا ہے اور اپنے اشعار میں لائے ہیں - چنانچہ خلاق المعانی خاقانی نے تحفۃ العراقین میں ذوالخور شیدین لکھا ہے - ع ذوالخورشیدین شد خراساں - اور تقی اوحدی صفاہانی نے اپنے تذکرہ میں فیضی

لہ کلیم کاشانی عہد جہانگیری وشاہجہانی کا مشہور و معروف شاعر تھا - جس نے دونوں درباروں سے صلۂ شعر حاصل کیا اور عمر بھر ہندوستان کا دلدادہ رہا دوسرے شعرائے ناحق شناس کی طرح ہندوستان سے بیزار نہ تھا - بلکہ ہندوستان کی جدائی کو اس درجہ محسوس کرتا تھا - کہ فراق ہند میں ایک غزل کہی تھی - اور اسی وجہ سے دو مرتبہ اپنے وطن سے کھنچ کر ہندوستان آیا - آخر بندرہویں ذالحجہ ۱۰۶۱ھ میں کشمیر میں انتقال کیا اور محمد قلی سلیم کی قبر کے قریب مدفون ہوا سہ کوثری سادات ہمدان میں سے مذہب شیعہ رکھتے تھے - اور شاہ عباس کے زمانہ میں پائے جاتے تھے - ایک کتاب مثنوی

کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ " جمیع متاخرین حتے مولانا عرفی ابکارۂ تیغ ہند طبعان از سوہان فطرت ومصاحبت او باصلاح آمدہ " اب معلوم کرنا چاہیے کہ ہند کے معنی یہاں (درہند ساختہ شدہ) کے ہیں۔ تیسرے یہ کہ کلا کوتری خود ولایت زا ہیں اور اسی طرح اہل عرب نے اکثر فارسی کے الفاظ کو معرب کرکے بے تکلف استعمال کیا ہے۔ چنانچہ لفظ بادہ فارسی ہے اس کو معرب کرکے مبنی لائے ہیں۔ جب یہ صورت ہے تو زیب سے تزئیب کہنا کیا ہرج کرتا ہے۔ اس کے علاوہ حزیں نے جو کچھ لکھا ہے اوس پر اعتراض کرنا ہمارے حوصلہ سے زیادہ ہے۔ اسی طرح مُزلّف جس کی اصل ومادّہ زلف ہے اسقدر اہل ایران کی زبان پر ہے کہ اصطلاح بن گئی ہے اور اس کی صحت میں اب کوئی کلام نہیں ہے۔ ولایت والے اور ہند دونوں کہتے ہیں امیر خسرو کا یہ شعر بھی ایسا ہی ہے ؎

موران خط بدور خسب صف کشیدہ اند   صد گونہ جور از تو مزلف کشیدہ اند

اسی طرح ملا محمد اشرف کا یہ شعر ؎

ہجو رخسار مزلف دلبران تازہ خط   مصحفے کرمے نوشت آنہم خط خوانا نداشت

(مؤلف) یہ اعتراض تو صحیح ہے کہ یہ لفظ فارسی ہے اور زیب سے مزیب بنایا گیا ہے۔ مگر جب اس قسم کے الفاظ کو اہل عجم نے عربی کے قاعدہ پر لانا جائز سمجھا ہے تو پھر اعتراض کی وجہ کوئی نہیں معلوم ہوتی۔ مرزا سودا کا جواب بہت کافی ہے۔ انھیں کی تائید میں ہم مششدر اور مطلا بھی پیش کرسکتے ہیں۔ چنانچہ ظہیر فاریابی کا یہ شعر ؎

مہرہ گل شد زمیں از روئے مہر آں مہرہ را   بر بساط امر او نقش مششدر یافتند

اسی طرح لفظ مُتَرَّش جو تراشیدہ کے معنی میں ہے اور تراش سے بنایا گیا ہے اس کو عربی زبان سے کوئی نسبت ہی نہیں معلوم ہوتی مگر اس کو بھی بقاعدہ عربی اسم مفعول بناکر استعمال کیا ہے۔ چنانچہ ابو نصر نصیر اے بدخشانی کا یہ شعر شاہد عادل ہے ؎

در رہ شرع و در رہِ ایماں، رہبر باید صاحب ایماں   نزد مسلماں نبود شایاں بہر امامت مرد مُتَرَّش

اسی لفظ کو ملا مفید بلخی نے کہا ہے ؎

ہر گل کہ خار خار طمع سر نہد ازو   در دیدہ ید قماشش چو روئے مترش است

اسی لفظ کو مفتی صاحب مدار الافاضل نے بے تکلفانہ اس شعر میں استعمال کیا ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۲) شیریں فرہاد ان سے یادگار ہے۔ جو نہایت عمدہ کہی ہے۔ اوسی کتاب میں سے ایک قطعہ مصنف ریاض الشعراء نے اپنے یہاں نقل کیا ہے۔ اس سفینہ یا بیاض پر شیخ علی حزیں کے بھی دستخط تھے اشرف علی خاں نے اسی بیاض دستخطی حزیں سے یہ قطعہ اپنے اس تذکرہ میں نقل کیا جو مرزا فاخر مکین کو اصلاح کے لئے دیا تھا۔ جس کا ہم پہلے ذکر کرچکے ہیں۔ مرزا نے قطعہ کے پہلے شعر پر اعتراض کرکے قلمزد کردیا۔ جس کا جواب مرزا سودا نے دیا ہے

امرداں گرچہ گل گلشن حسن اند ولے　　خار خار دل ازاں شوخ مترش باشد

منصور نے یہ شعر کہا ہے ؎

از بسکہ ہمہ ماں بدیار شدی　　چوں حسن مترش بنظر خار شدی

مُطَلّا کی نسبت خان آرزو نے لکھا ہے کہ یہ لفظ دو وجہ سے صحیح ہے۔ ایک اس وجہ سے کہ طلا لفظ فارسی ہے اس کو فارسی زبانان عربی داں نے عربی کے صیغہ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ جیسا کہ مترش۔ دوسرے یہ کہ طلا طمع کرنے کو عربی میں کہتے ہیں۔ جیسے طلا اندود۔ لہٰذا اس کو بھی مطلا کہتے ہیں۔ اور یہ بطریق اطلاق عام کے خاص پر اس وقت صحیح مانا جائے گا جب کہ اندودن خمیر مایہ کو بھی عربی میں طلا کہا ہو۔ عبداللہ ہاتفی ؎

فگندند گرداں پے وہم و بیم　　براسپان تازی مطلا گلیم

ملا طغرا در تعریف گلنار ؎

بخنگاں کے ردے ازشے بہر زینت میکنند　　در حقیقت نقرہ از غامی مطلا می شود

اس کے ماسوا جب اہل زبان نے تحرمز، حرام زادگی کے معنے میں اور تکشمر، کشمیر زادگی کے معنی میں صحیح سمجھا اور استعمال بھی کیا ہے تو پھر مُزَیّب کی صحت میں کیا کلام باقی رہتا ہے۔ نعمت خاں عالی نے کہا ہے ؎

اے سفلہ تمام کار و بار تو دغاست　　ایں جا بہ ادب باش تکشمر بیجا است

لالہ و شفیق

لالہ ؎ اگر ٹک ناز سے ابرو چڑھا چیں بر جبیں کھینچے　　مہِ نو جوں کماں گوشے میں جا کر خط کیں کھینچے

شفیق - میرے نزدیک مصرع اولٰے اس طرح ہونا چاہیے تھا ع

مہِ نو تیغ مغرب ساں دم اپنا واپسیں کھینچے

(مؤلف) شفیق نے اگرچہ اس اصلاح کی کوئی وجہ نہیں لکھی۔ تاہم جہاں تک میں خیال کرتا ہوں لالہ کے مصرع کو الجھا ہوا سمجھ کر یہ مصرع کہا ہے اور اس لحاظ سے ایک حد تک صحیح ہے کیونکہ واقعی مصرع ثانی الجھا ہوا ہے۔ مگر یہ کہنا کہ پہلا مصرع یوں ہونا چاہیے تھا۔ کچھ اچھا نہیں، کیونکہ لالہ نے پہلے مصرع کو حرف شرط اگر سے مقید کر کے دوسرا مصرع اس کی جزا کے طور پر کہا ہے۔ لہٰذا خواہ اصلاح دی جائے یا نہ دی جائے اسی طرح بہتر ہے۔ اگرچہ تقدم جزا شرط پر کلام اساتذہ میں موجود ہے۔ مگر بضرورت یہ کچھ اچھا نہیں

---

[1] سروپجی رائے نام تھا لالہ تخلص کرتے تھے۔ غزل اکثر کہتے تھے۔ منشی لچھمی نرائن شفیق کے دوست تھے اور انھیں کے معاصر تھے۔ شفیق کے حالات اس سے پہلے لکھے جا چکے ہیں۔ اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

متین کشمیری و میر محمد علی رنج سیالکوٹی

متین مرحوم کا نام محمد علی خاں تھا اور متین تخلص تھا۔ کشمیر کے رہنے والے تھے۔ ایک تذکرہ حیات الشعرائے فارس کے حال میں لکھا تھا۔ جو اب نایاب ہے

میر محمد علی سیالکوٹ کے رہنے والے تھے زیادہ بریں کچھ حال معلوم نہیں ہوسکا۔ مولانا آزاد نے تذکرۂ خزانۂ عامرہ میں آفریں لاہوری کے ذیل میں ذکر کیا ہے کہ متین نے شاہ آفریں کا یہ شعر مطلع بنا کر اپنے نام سے لکھا ہے

آفریں ؎ درمشربے کہ ما ئیم آلودہ دامنی نیست ساغر بکف چو تصویر رندیم وپارسائم

متین نے ادنیٰ سا تغیر کرکے یوں مطلع بنایا ہے اور اس کو اپنا ہی مال قرار دے لیا ہے ؎

آلودہ دامنی نیست درمشربے کہ مائیم ساغر بکف چو تصویر رندیم و پارسائیم

متین نے یہ شعر جب رنج سیالکوٹی کے سامنے پڑھا۔ تو انھوں نے اعتراض کیا

اعتراض رنج۔ شعر ناموزوں ہے۔ اور تصویر کی (رے) زاید ہے

جواب مولانا آزاد۔ یہ وزن بحر مضارع کا ہے جس کی تقطیع یہ ہے۔ مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن۔ کبھی کبھی فاعلاتن مسبّغ آتا ہے۔ اور تسبیغ اُس کو کہتے ہیں کہ سبب خفیف میں جو کہ آخر جزو میں واقع ہو اس میں الف زیادہ کر دیں پس فاعلاتن فاعلاتاں ہو جاتا ہے۔ اوس کی بجائے فاعلیّاں کر دیتے ہیں اور یہ فاعلیاں مصرعوں کے آخر میں بھی آتا ہے اور وسط میں بھی قاعدہ یہ ہے کہ اگر ایک مصرع میں فاعلیان اور دوسرے میں فاعلاتن آوے تو شعر ناموزوں نہ ہوگا چنانچہ میرزا صائب کا یہ شعر اسی طرح کا ہے

ہر شبنمی دریں باغ جام جہاں نمائے است ہر خار ایں بیاباں انگشت رہنمائے است

(مؤلف) مولانا کا جواب صحیح ہے۔ اور معترض کا اعتراض غلط ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ معترض عروض کے قواعد سے ناواقف تھا

مصحفی و انشا

شیخ غلام ہمدانی نام تھا مصحفی تخلص امروہہ کے رہنے والے تھے۔ آغاز شباب ہی سے طالب علمی کی اُمنگیں امروہہ سے کھینچ کر دلی لے آئی تھیں۔ اور اس سنگین زمانے کے گزارنے پر بھی امروہہ واپس نہیں گئے تھے بلکہ دلی ہی میں قیام تھا یہیں رہتے سہتے تھے اور شعر و سخن کے مشغلہ میں اوقات گزاری کرتے تھے۔ اس سے زیادہ دلی کے قیام کا وسیلہ معلوم نہیں ہوسکا اور نہ اُسی بادشاہ گردی کے عالم میں اوروں کی طرح یہ بھی لکھنؤ آئے اور استادی کا ڈنکہ بجا دیا۔ نزدیک و دور سے اہل عقیدت جمع ہوگئے۔ مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں انکار سوخ ہوا اور وہیں سے کچھ آذوقہ بھی بہم پہونچنے لگا

اسی دوران میں انشاء بھی وہاں آنے جانے لگے۔ کوئی طرح ہوئی اُس پر انھوں نے غزل لکھی۔ زمانہ کا دستور ہے کہ دوسرے کی ہوا اکھاڑ کر اپنی ہوا جماتا ہے۔ اور دوسروں کی بات بگاڑ کر اپنی بات بناتا ہے۔ اسی روش پر سید انشاء اللہ بھی چلے۔ باتوں باتوں میں چھیڑ چھاڑ شروع کر دی اور ان کی غزل پر اعتراض کیا۔ یوں تو انشاء عالم تھے۔ قابل فاضل نقاد تھے اور اس کے ساتھ ہی تمسخر اور خود ستائی بھی مزاج میں حد سے زیادہ تھی اس پر طرہ یہ کہ بڑی سرکاروں اور متم بالشان درباروں میں تقرب تھا اس نے اور بھی دماغ میں ہوا بھر دی تھی۔ کچھ دلی اُمنگیں۔ کچھ جوانی کے ولولے۔ کچھ تماشا دیکھنے والوں کی حوصلہ افزائیاں۔ کچھ اپنی فضیلت و قابلیت کا ناز کچھ رسوخ کی تمنا۔ یہ سب چیزیں انھیں اس بڑھے جہاں دیدہ گرم و سرد عالم چشیدہ کے مقابل میں لے آئیں۔ اور ایسا ہنگامہ بپا ہوا کہ بقول آزاد سوانگ نکلے۔ اور انشاء اللہ خاں کے شاگرد راستوں اور گلیوں میں یہ کہتے پھرتے تھے ؎

سوانگ نیا لایا ہے دیکھنا چرخ کہن لڑتے ہوئے آئے ہیں مصحفی و مصحفن

مصحفی کی ایک غزل ہے :-

مصحفی ؎
دل کیونکہ پری حور کا پھر سے نہ پھسلے صانع نے بنائی تری بلور کی گردن

اعتراض انشاء ؎
بلور گو درست ہو لیکن ضرور کیا خواہی نخواہی اس کو غزل میں کھپایئے
دستور و نور و طور رہیں قافیے بہت اسمیں جو چاہیے تو قصیدہ سنائیے

(مؤلف) انشانے تو اعتراض کر ہی دیا۔ مگر اعتراض کی نوعیت سمجھ میں نہیں آتی۔ مصحفی کا مقصد تو یہ ہے کہ صانع نے تیری گردن ایسی بنائی ہے کہ اس کی صفائی بلور کی سی ہے اور وہ بلور کی معلوم ہوتی ہے۔ ڈرتے ڈرتے خود انشا نے بھی کہا ہے۔ کہ بلور اگرچہ درست ہو مگر شعر میں باندھنے کی کیا ضرورت ہے۔ بلوریں گردن کی کوئی مثال میرے ذہن میں نہیں ہے مگر میں نے اس کی مثالیں اور نظیریں دیکھی ضرور ہیں۔ مگر ساق بلوریں کی مثالیں تو سبھی نے دیکھی ہوں گی۔ ایک شعر آتش کا اس وقت بھی مجھے یاد ہے

ساعد سیمیں تو ہیں الماس کے ترشے ہوئے اک نظر ساق بلوریں بھی دکھایا چاہئے

شیخ مصحفی نے خیال کیا ہے کہ انشا کا اعتراض بلور پر اس لئے ہے کہ یہ لفظ مشدد درست نہیں ہے اسی واسطے انھوں نے یہ جواب دیا ہے ؎

یہ لفظ مشدد بھی درست آیا ہے تجھ سے خم ہوتی ہے کوئی مری بلور کی گردن

مصحفی ؎
سر مشک کا ہے تیرا تو کافور کی گردن لے موئے پری ایسے نہ یہ حور کی گردن

اعتراض انشا ؎
کیا لطف ہے کہ گردن کافور باندھ کر مردے کی باس ڈھنڈے کو لا کر سنگھایئے
یوں خاطر شریف میں گذرا کہ بزم میں کچلا ہوا شریفہ غزل کو بنائیے

(مؤلف) اس اعتراض کو انشاء کی ظرافت اور خوش طبعی کی طرف منسوب کریں تو سب کچھ ہے اور نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ کوئی غور

سے بدرجہا بہتر ہیں۔ اگر سودا کے قصاید کی تشبیہات و استعارات کو دیکھئے تو نہ معلوم مرحوم معترض کی زبردستی پر اُسے کتنی ہنسی آتی۔ مصحفی نے خود اس کا یوں جواب دیا ہے جواب مصحفی ؎

کافور سے مطلب ہے مرا اس کی سفیدی ٹھنڈی تو میں باندھی نہیں کافور کی گردن

مصحفی ؎ مچھلی نہیں ساعد میں ترے بلکہ نہاں ہے دو ہاتھ میں ماہیٔ سقنقور کی گردن

اعتراض انشا ؎ گردن کا دخل کیا ہے سقنقور میں بھلا سانڈے کی طرح آپ نہ گردن ہلائیے

جواب مصحفی ؎ میں لفظ سقنقور مجرد نہیں دیکھا ایجاد ہے تیرا یہ سقنقور کی گردن

(مؤلف) انشا کا اعتراض یہ ہے کہ سقنقور کی گردن کیوں لکھا۔ مصحفی یہ کہتے ہیں کہ اعتراض میں تم نے مجرد سقنقور کیوں لکھا ماہیٔ سقنقور لکھا جاتا ہے یا یہ کہ مصحفی کی غزل کے جواب میں انشا نے جو غزل کہی تھی اوس میں انھوں نے یہ شعر لکھا ہے ؎

اچھلی ہوئی ورزش سے ترے ڈنڈ پہ مچھلی ہے نام خدا جیسے سقنقور کی گردن۔

مگر یہ انشا پر اعتراض ہو سکتا ہے مگر ایسے انشا کے اعتراض کا جواب نہیں کہا جا سکتا۔ میرے نزدیک اعتراض صحیح ہے۔ اگرچہ خود بھی اس غلطی میں مبتلا ہوئے ہیں اور مصحفی سے زیادہ ماہی سقنقور ایک مچھلی ہوتی ہے۔ جو خشکی میں رہتی ہے بعض کے نزدیک ماہیٔ زریں بھی اسی کو کہتے ہیں۔ صرف سقنقور کے معنی ایک گزندہ جانور کے بتاتے ہیں۔ اور غالباً وہ گوہ۔ ہے۔

مصحفی کے اسی شعر پر سید انشا کا یہ بھی اعتراض تھا کہ ماہی کو مشدد لکھنا درست نہیں ہے۔ چنانچہ تعریض کرتے ہوئے کہتا ہیں ؎ مشفق کڑی کمان کو کڑی نہ بولئے چلّے کے مفت تیر ملامت نہ کھائیے

اُردو کی بولی ہے یہ بھلا کھائیے قسم اس بات پر اب آپ ہی مصحف اٹھائیے

شیخ مصحفی نے اس کے جواب میں سنداً کسی استاد کا یہ شعر پیش کیا

مائیم وفقیریٔ وسیہ روئی دو کونین زخسار سفید اُمرا را نہ شناسیم

اعتراضات بر مصحفی از شاگرد سودا[1]

سودا کے ایک قصیدے پر مصحفی نے کچھ اعتراضات کئے تھے۔ اسی پر سودا کے ایک شاگرد نے مصحفی کے ایک قصیدے کی تشبیب پر اعتراض کئے۔ چنانچہ مصحفی کا ایک شعر یہ ہے

مصحفی ؎ گر باز معانی کا مرے ہووے ہوا گیر پیدا کریں احرار ہوا حکم عصافیر

---

[1] ان کا نام وحال معلوم نہیں ہو سکا

اعتراض ؎

احرار و معانی کو کیا تو نے ہے یک جا — ہرگز کسی استاد کو سوجھی نہ یہ تدبیر
بولا کوئی استاد نہ اسطرح سے اک لفظ — جو کچھ ہے معانی کے بیاں میں تری تقریر
بولے ہیں معانی کو ہزاروں جگہ استاد — طائر بھی کہہ اور مرغ بھی اور وحشی و نخچیر
لیکن کہیں احرار ہوا کو نہیں لائے — دی کتنی ہی معنی کے تئیں شوکت و تقریر
استاد زبردست جو گزرے ہیں انھوں نے — بافکر متین و بخیالات و بہ تدبیر
تھے عرش پہ جو بال کشا مرغ معانی — لفظوں کا بچھا دام کیا ان کو گرہ گیر
اندیشہ کو شاہین و خیال اپنے کو شہباز — وہ کہہ گئے اس فن کے جو تھے موجد تقریر
معنی ہے شکار اور خیال انکا ہے صیاد — خود صید سے ہر چند معانی ہو ہوا گیر
اس باز معانی کے اڑانے سے تو باز آ — اور جانوروں پر اسے زنہار نہ کر شیر
معنی کو اڑاتا ہے کوئی جانوروں پر — میں فرض کیا یہ کہ ترا باز ہوا شیر
احرار ہوا سے جو عصافیر کو خارج — کرتا ہے عصافیر نے کیا کی تری تقصیر
جتنے کہ ہیں طائر وہ سب احرار ہوا ہیں — آفاق میں سیمرغ سے لے تا بہ عصافیر
تو نے تو معانی کا نیا باز اڑایا — تا پکڑے تو اس باز سے احرار ہوا گیر

(مؤلف) معترض نے اس شعر پر کئی اعتراض کئے ہیں - ایک یہ کہ شعراء معانی کو نخچیر سمجھتے ہیں اور اپنے خیال و اندیشہ کو باز یا شاہین سمجھتے ہیں - پھر انھوں نے معانی کو باز کیونکر لکھا - دوسرے یہ کہ احرار ہوا میں عصافیر بھی ہیں ان کو کیوں احرار سے خارج کیا تیسرے یہ کہ احرار و معانی کو ایک جگہ کیوں لکھا - پہلے دو اعتراضوں کی سنگینی میں کلام نہیں - اگرچہ پہلے اعتراض میں معانی کو باز کا مستعار منہ مان کر اور دوسرے میں عصافیر کو بہ لحاظ موقع عاجز اور مکروہ کے معنے میں جانکر جواب اور تاویل کی خاصی گنجایش نکل آئیگی - مگر انصاف پسندی کے لئے تاویل بہرحال تاویل اور قال و قیل بہرصورت قال و قیل ہے - تیسرے اعتراض کی نوعیت سمجھ میں نہیں آئی

مصحفی ؎

اور باندھوں ہوں جب شست نشانہ پہ سخن کے — رہ جائے ہی منھ دیکھ مرا دیدۂ زہ گیر

اعتراض ؎

یہ شست نشانے پہ جو باندھی ہے سخن کے — ہے اس میں طبایع کو تردد بجہا ہیر
اس مصرع بے ربط کے معنے نہیں سمجھے — رہ جائے ہے منہ دیکھ مرا دیدۂ زہ گیر
زہ گیر کے منہ دیکھ کے رہ جانے سے تیرے — کیا پائی تری شاعری و شعر نے توقیر
بہتر تھا کہ کر دیتا ارادے کی تو اپنے — اس شعر کے ساتھ حاشیہ میں شرح بھی تحریر

(مؤلف) اعتراض بالکل صحیح ہے اول تو مصرع ثانی شیخ مصحفی کے شعر میں بیکار ہے - اگر کھینچ تان کر معنے پیدا کئے جائیں

تو پھر وہی دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر دہ نہ گرمنہ دیکھ کے رہ بھی جاتا ہے تو اس سے شعر میں کیا افزونی ہو جاتی ہے

مصحفی ۔ مصرع کو بصد خون جگر مصرع سے چسپاں کرتے ہیں تو پھر وہ بھی دو پلکے کی بہ تعبیر

اعتراض ۔ مصرع سے بصد خون جگر مصرع کو چسپاں مصرع یہ عجب یوں تو لایا ہے بہ تسطیر

مصرع کا جو مصرع میں ترے لفظ ہے اک کو عین اس میں سماتا نہیں ہرگز کسی تقدیر

(مولف) اعتراض صحیح ہے۔ مصحفی کے یہاں عین تقطیع سے ساقط ہے۔ اس سے ان لوگوں کو سبق عبرت لینا چاہیے جو یہ کہتے ہیں کہ پہلے لوگ حروف کے تقطیع سے ساقط ہونے کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔

مرزا باقر در رنگین

رنگین نے مجالس رنگیں میں لکھا ہے۔ کہ دلی میں ایک مرتبہ ہم اور بھائی سبحان قلی بیگ اور بہت سے آدمی شادی کی محفل میں جمع تھے۔ کہ رباعیات فارسی کا ذکر چھڑ گیا۔ ہر کوئی اساتذہ میں سے ایک ایک دو دو رباعیاں سنانے لگا۔ مرزا موصوف نے اپنے استاد مرزا باقر بہادر جنگ کی یہ رباعی سنائی۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اب اس سے بہتر رباعی کہنا ممکن نہیں ہے۔ میں نے اس پر اعتراض کیا۔ رباعی یہ تھی

مرزا باقر ۔ در دشت بہ جستجوئے لیلے می گشت مجنوں بہوائے روئے لیلے در دشت

لیلے می گفت تا زبانش مے گشت مے گشت ہمیشہ بر زبانش لیلے

اعتراض رنگین ۔ می گشت کا قافیہ دونوں شعروں میں آیا ہے۔ دوسرے اور پہلے میں ایک ہی معنی ہیں اور کوئی توجیہ سمجھ میں نہیں آتی۔ شاید دوسری جگہ می گشت کے معنے یہ ہیں کہ جب تک قید حیات میں تھی

(مولف) مراد یہ ہے کہ رباعی میں تینوں قافیے علیحدہ علیحدہ ہونا چاہئیں۔ یہ اعتراض صحیح ہے اور دوبارہ جو توجیہ کی گئی وہ عذر بدتر کا درجہ رکھتی ہے۔ زبانش مے گشت کے معنے قید حیات کے نہیں لئے جا سکتے۔ ہاں اگر اس سے گشت کے معنی یہ لیتے کہ جب تک اوس کی زبان لوٹتی تھی وہ لیلے لیلے کہے جاتا تھا تو بات بن جاتی۔ زبان لوٹنا زبان کا الفاظ کو ادا کر سکنے کے معنی دیتا ہے

میر محمد زماں راسخ سرہندی و معترضین

مولانا آزاد مرحوم نے تذکرۂ خزانۂ عامرہ میں حاکم لاہوری کی زبانی یہ نقل بیان کی ہے۔ کہ ایک مرتبہ میر جمال الدین اور میر فخر الدین حسین لاہوری کے مکان پر لاہور میں مجلس شعر و سخن گرم تھی۔ اوسی مجمع میں میر محمد زماں راسخ سرہندی بھی نغز شعر خوانی ہو رہی تھی۔ راسخ مرحوم نے ایک شعر پڑھا۔ لوگوں نے اعتراض کیا

میر محمد زمان راسخ ؎ جامۂ صبر بہ بالائے جنوں تنگ آمد آنچہ از دست برآمد بگریباں کردیم

معترضین ۔ جامہ قد پر کوتاہ ہوتا ہے نہ کہ تنگ۔

جواب شاہ آفریں ۔ میر صاحب کا شعر بالکل درست ہے جامہ قد پر تنگ بھی لکھا ہے۔ چنانچہ ہاتفی ظفرنامہ میں لکھتا ہے

نہ ہندی عناں تافت از راہ جنگ نہ بر قامت ترک شد جامہ تنگ

(مؤلف) جواب صحیح ہے تنگ کے معنے بھی کوتاہ ہی کے ہیں۔ اور قد کے لئے جب تنگ لکھیں گے۔ اوس کے یہی معنے لئے جائیں گے۔ اور کچھ نہیں

منشی محمد اسماعیل حسن صاحب منیر و مولوی عصمت اللہ صاحب شاگرد ناسخ

اسم گرامی منشی محمد اسماعیل حسن تھا۔ شکوہ آباد کے رہنے والے تھے۔ ناسخ لکھنوی کے شاگرد تھے مگر ناسخ نے اپنے تذکرہ میں رشک کا شاگرد لکھا ہے بہر حال آپ ایک جلیل القدر اور کامل الفن شاعر تھے اول اول میں نواب صاحب باندہ کی سرکار کے نمک خوار تھے۔ کہ غدر ۱۸۵۷ء کا زمانہ آیا اور اسی زمانہ میں آپ بھی قید فرنگ کی ہوا کھانے پر مجبور ہوئے مگر آخر رہائی پائی اور دربار رامپور کے متوسلین میں داخل ہوئے۔ اور اس بہانہ سے باقی عمر بخوشی و خرمی بسر ہو گئی۔ مثنوی معراج المضامین اور سراج منیر آپ کی یادگار ہیں۔ نہایت بہتر سخن سنج تھے اور اپنے زمانہ کے قادر الکلام شعرا میں آپ کا شمار تھا۔ لکھنؤ کے دیگر شعراء کے سلسلہ میں مولوی عصمت اللہ شاگرد ناسخ نے آپ پر بھی اعتراض کئے تھے جو ذیل میں درج ہیں

منیر ؎ فصل گل آئی ہے مبرص ہوئی لیلیٰ شب قیس خفاش کی الفت میں تہ آجائے خلل

اعتراض ۔ جب مصنف صاحب جدت مضمون کی طرف آجاتے ہیں تو ایسا ہی کہتے ہیں۔ چنانچہ اس طرح کے ہزاروں مہمل شعر ان کے دیوان میں بھرے ہوئے ہیں جس کی نسبت اہالیان لکھنؤ کو طرز شوکت بخاری کا گمان ہے

جواب مولوی آغا علی ۔ میں نے سنا ہے کہ رامپور میں آپ نے منشی صاحب سے مباحثہ میں کئی بار نیچا دیکھا۔ شاید وہی دل کے پھپھولے آپ نے یہاں پھوڑے۔ ورنہ شعر تو ایسا ہے کہ سیکڑوں دفتر الٹ ڈالئے ایک بھی نہ نکلے گا۔ آپ کے انکار سے شعر کا مرتبہ اہل نگاہ کی نظر میں کم نہیں ہو سکتا

(مؤلف) مولوی آغا علی صاحب نے جس واقعۂ تاریخی کا ذکر کیا ہے کہ مولوی عصمت اللہ اور منیر سے مباحثہ ہوا۔ یہ کسی دفتر تاریخ میں لکھنے کے قابل ہو تو ہو۔ مگر جواب دیتے ہوئے یہ کہنا تو عجز کی ہی دلیل ہے۔ وجہ یہ ہے کہ معترض کے اعتراض کا جواب دینے کے بجائے لوگوں سے اعتراض کا سبب بتانا شاید اپنی طرف متوجہ کرنے سے زیادہ کوئی درجہ نہیں رکھتا۔ رہی یہ بات کہ دفتر کے دفتر الٹ ڈالئے تب بھی ایسا شعر نہ نکلے۔ اس جواب کا میں بھی قائل ہوں

منیر ؎ ہوا اشارہ حضرت سے چاند دو ٹکڑے ہوا سے کوچۂ شق القمر میں کی رفتار

اعتراض - ہوا کا کوچۂ شق القمر میں رفتار کرنا کیا۔ مصرع دوم مہمل ہے

جواب - رفتار ہوا اجرام قمر کے اندر دلیل اوس کے شق ہونے کی ہے۔ مصرع دوم کو مہمل بھی مہمل نہ کہے گا

(مؤلف) مجیب نے معترض کے اعتراض پر غور نہیں کیا - بلکہ بغیر سمجھے جواب دیدیا - اعتراض یہ ہے کہ ہوا کا رفتار کرنا کیا معنے

یہ غلط ہے رفتار کرنا اردو کا محاورہ نہیں ہے - اس اعتراض کا کوئی جواب نہیں

منیر ؎ قند مصنوع ہے ہو زہر عداوت شیریں باغباں میٹھی چھری سے جو تراشے حنظل

اعتراض - شاید قند غیر مصنوع بھی ہوتا ہے - ورنہ مصنوع کی خصوصیت کیوں ہے

جواب - مصنوع کہنے سے غیر مصنوع کا وجود نہیں لازم آتا - کیا خدائے قہار کہنے سے یہ لازم آتا ہے کہ خدائے جبار اور ہے - سعدی ؎

آتش سوزاں نکند با سپند آنچہ کند دود دل دردمند

کیا آتش غیر سوزاں بھی ہوتی ہے

(مؤلف) جو جواب دیا گیا ہے یہ جواب نہیں ہے - بلکہ اس جواب نے شعر کو مہمل بنا دیا - جواب یہ ہو سکتا ہے کہ قند نام ہے ایک

خمیر شکر کا - اوسی قند کو جب اور زیادہ بنایا جاتا ہے تو وہ نبات ہوتی ہے - یا قند کرر کی صورت اختیار کرتی ہے ورنہ قند بجائے خود قند ہے

اور وہ ایک مستقل نام ہے - شعر صحیح ہے اعتراض نافہمی پر مبنی ہے

منیر ؎ نہ دیکھے آپ کو جس سال ہو کم حج میں سیاہ پوش ہو کعبہ کمر شکستہ حطیم

اعتراض - کعبہ تو ہمیشہ سیاہ پوش رہتا ہی ہے

جواب - یہاں سیاہ پوش بمعنی ماتمدار آیا ہے

(مؤلف) جواب صحیح ہے

منیر ؎ رکھتے ہیں اور صنعتوں میں بھی قاری آغا علی نمودار ی

اعتراض - نمودار ی رکھنا کہاں کا محاورہ ہے سند چاہیئے

جواب - یہ لکھنؤ کا محاورہ ہے اور اسی شعر کو سند سمجھئے - اس واسطے کہ منیر اہل زبان تھے - زباندان کے واسطے اہل زبان کا شعر سند اً کافی ہے

(مؤلف) یہ جواب بالکل غلط ہے نمودار ی رکھنا کوئی محاورہ نہیں ہے

منیرؔ ؎ حسین ایسے ہیں سقے کہ وقت آب کشی فروغ عکس سے یوسف نشیں بنا ہر ڈول

اعتراض - یوسف نشیں کی ترکیب ایجاد مصنف ہے سند چاہئے

جواب - ترکیب تو قدیم ہے یوسف البتہ نیا ہے - سلمان ساوجی ؎

جائے شاہانست یار بفرخ وفرخندہ باد جاوداں بر بادشاہ شہ نشاں ایں شہ نشیں

اس شہ نشیں کو ملاحظہ کیجئے جو اس کی ترکیب ہے وہی یوسف نشیں کی بھی ترکیب ہے

(مؤلف) سبحان اللہ فاضل مجیب نے کس آسانی اور لاپرواہی کے ساتھ یہ جواب دیدیا کہ شہ نشین - اور یوسف نشیں کی ترکیب ایک ہے - میرے نزدیک مصنف کی مراد یہ ہے کہ سقے اسقدر حسین وجمیل ہیں کہ وہ یوسف معلوم ہوتے ہیں - اور پانی کھینچتے وقت جو ڈول کے پانی میں ان کا عکس پڑتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر ڈول میں ایک یوسف بیٹھا ہے یوسف کا ڈول میں ہونا تلمیح ہے قصہ حضرت یوسف کی - منیرؔ نے بھی یہاں اوسی طرح عکس کو یوسف - اور ڈول کو یوسف نشیں قرار دیا ہے - مجیب نے شہ نشیں کے مانند یوسف نشیں کو بھی قرار دیا ہے - اور ترکیب کے لحاظ سے اس کو غلط کہا بھی نہیں جاسکتا - مگر سوال یہ ہے - کہ یوسف نشیں کی ترکیب کی کہیں دنیائے ادب میں سند بھی مل سکتی ہے یا نہیں اس کا جواب نفی میں ہے - اور جب جواب نفی میں ہے تو معترض کا اعتراض کرسی نشیں ہے

منیرؔ ؎ موجود راندن ہیں اطاعت میں گرم وسرد حامی آفتاب ہے اور آبدار چاند

اعتراض - کیا مصنف نے گرم وسرد کو مثل سیاہ وسفید رُطب ویابس تروخشک کے استعمال کیا ہے یہ درست نہیں

جواب - یہاں تسمیہ سبب باسم مسبب ہے - گرم وسرد بمعنی رطب ویابس نہیں ہے بلکہ گرم سے مراد آفتاب ہے اور سرد سے ماہتاب اور یہ مراد مصنف کی دوسرے مصرع سے بخوبی ظاہر ہوتی ہے

(مؤلف) جواب صحیح مانا جاسکتا ہے - مگر گرم وسرد پھر بھی اچھا نہیں ہے

منیرؔ ؎ گل داغ جگر ہائے شگفتہ طبع دنیا میں بجز زخم جبیں کوئی نہیں ہے خندہ پیشانی

اعتراض - مصرع ثانی مہمل ہے

جواب - جب غنچہ کا مسکرانا اور گل کا ہنسنا درست ہے تو زخم جبیں کا خندہ پیشانی ہونا کیوں درست نہیں اور اگر استعارہ درست ہے تو مصرع ثانی مہمل کیوں ہے

(مؤلف) جواب صحیح ہے - معترض کے اعتراض کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی - میرے نزدیک اگر پہلے مصرع کو مہمل کہا جاتا تو درست ہوتا اس لئے گل داغ کا طبع دنیا میں شگفتہ ہونا کچھ سمجھ میں نہیں آتا

منیر ؎ اگرچہ گندمی رنگوں کو پیسا اس جزیرے نے   نہ پائی ایک دن بھی آرد گندم نے ارزانی

اعتراض ۔ لفظ آرد کے حرف (را) کو کس قاعدے سے متحرک کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح استاد مرزا سلامت علی صاحب دبیر نے مصرعۂ مندرجۂ ذیل میں کارد کا حرف را متحرک کیا ہے

شرط یہ تجھ سے ہے کہ کارد نہ دکھاؤ اس کو

جواب ۔ وزن میں متحرک ہو جاتا ایسے حروف کا ممنوع نہیں ہے ۔ حافظ ؎

خوبان پارسی گو بخشندگان عمرند   ساقی بشارتے دہ پیران پارسا را

جو حالت یہاں پارسی گو میں حرف را کی ہے وہی شعر منیر میں آرد کے حرف را کی ہے

(مؤلف) ساکن کو متحرک کرنا شاعر کے لئے صرف وزن تقطیع کے درست کرنے کے لئے جائز ہے ۔ نہ کہ ظاہرا شعر میں متحرک کو ساکن اور ساکن کو متحرک کر دینے کی اجازت ہے

منیر ؎ ادھر رکابیں بنیں عرش کے تلے قوسین   اُدھر غزالِ حرم سایۂ حواس شکار

اعتراض ۔ سایۂ حواس شکار کے کیا معنے ۔ مصرع ثانی مہمل ہے

جواب ۔ مصرع مہمل کیوں ہے ۔ یہ شعر بُراق کی تعریف میں ہے ۔ اور حواس شکار اوس کے سایہ کی صفت ہے یعنی بُراق کا سایہ ایسا تھا کہ حواس کو شکار کرتا تھا ۔ یعنی حواس اوس کی ماہیت کی دریافت میں عاجز و مغلوب تھے

(مؤلف) حواس شکار کی ترکیب غلط تو نہ تھی مگر جناب مجیب نے غلط کر دی ۔ انھوں نے پہلے یہ جواب دیا ہے کہ براق کا سایہ ایسا تھا کہ حواس کو شکار کرتا تھا ۔ اور پھر تشریح یہ فرمائی ہے کہ ۔ یعنی حواس اوس کی ماہیت کی دریافت میں عاجز و مغلوب تھے پہلے فقرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ حواس کو مفعول قرار دیا گیا ہے ۔ اور دوسری توجیہ سے حواس کو فاعل ٹھیرایا ہے ۔ جب حواس اوس کی ماہیت دریافت کرنے سے عاجز تھے تو حواس شکاری ہوئے زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُس کا سایہ دسترس شکار حواس سے باہر تھا ۔ نہ یہ کہ اوسکا سایہ حواس کو شکار کرتا تھا ۔ میرے نزدیک مصنف کا مطلب نہ حضرت معترض نے سمجھا ۔ اور نہ جناب مجیب نے ۔

مصنف تقابل کے طور پر کہتا ہے کہ ادس طرف تو اوس کی رکابوں کے سایہ سے یا خود رکابوں سے قوسین بنیں اُس طرف سے مراد بالائے آسمان یا عرش ۔ اور اسی کے مقابلہ میں ادھر غزال حرم حواس شکار کے سایہ کی طرح معلوم ہوتے تھے ۔ یعنی جیسے کہ شکار بھاگا جا رہا ہو اور اس کا سایہ پڑ رہا ہو اسی طرح حواس شکار کا سایہ یہ آہوان حرم بن گئے ۔ مصنف کمال نزاکت مضمون کی وجہ سے شکار کا سایہ آہوان حرم کو نہیں کہتا بلکہ حواس شکار کا سایہ کہتا ہے ۔ اور شکار کے حواس چونکہ شکار سے بھی زیادہ جلد گزرنے والے ہوتے ہیں اس واسطے آہوانِ حرم کو ان کا سایہ کہنا مناسب تھا

منیر ؎ ضیائے ریش مقدس سے چہرۂ انور کنار رحل میں جس طرح رحل کا اظہار

اعتراض - اظہار کا استعمال اس طرح پر غلط ہے - شاید مصنف نے اپنے استاد مرزا دبیر کی تقلید کی ہے

جواب - اظہار کے اس طرح پر استعمال کرنے میں از روئے لغت کوئی غلطی نہیں - ہاں یہ البتہ ہے کہ اس طرح پر فصحائے ہند نے بندرت استعمال کیا ہے

(مؤلف) اگرچہ دبی زبان سے مجیب نے اس اعتراض کو مان لیا ہے مگر صاف صاف نہیں کہا کہ غلط ہے - یہ کہنا کہ از روئے لغت کوئی غلطی نہیں قطعاً غلط ہے - اس واسطے کہ یہاں مصدر لازم کی ضرورت ہے نہ کہ متعدی کی - لہٰذا اظہار کے بجائے ظہور کہنا چاہئے تھا - اردو میں کسی کے یہاں اس طرح اگر نکل بھی آئے تو وہ غلط ہوگا - اکثر ایسا ہوا ہے کہ اساتذہ اردو کے یہاں عربی مصادر کا استعمال برمحل نہیں ہوسکا - مگر وہ سند نہیں ٹھہر سکتے

مرزا فاخر مکین و سودا

مرزا فاخر مکین ؎ راستی من یاد دادم کجکلاہ خویش را من گدائے خویش کردم بادشاہ خویش را

اعتراض سودا - اس شعر کے معنی میں کوئی لطف نہیں - فرض کیجئے کہ عاشق نے معشوق کو راستی کی یاد دلا ہی دی - مگر اس سے کیا ہوتا ہے راستی کے یاد دلانے سے شاہ گدا نہیں ہوسکتا - معشوق کی کج کلاہی اچھی معلوم ہوتی ہے نہ کہ راستی اگر یہی مراد ہے تو کوئی لطف نہیں ہے

(مؤلف) میرے نزدیک یہ شعر کسی نہ کسی طرح مسخ ہوگیا ہے - اگر در اصل یوں ہی تھا تو کچھ لطیف نہیں ہے سودا کا اعتراض اس لحاظ سے صحیح ہے - مگر یہ کہنا صحیح نہیں کہ اس سے بادشاہ گدا کیونکر ہوگیا - اس سے مراد یہ ہے کہ عاشق نے معشوق کو راستی کی تعلیم دی - اس سے وہ عاشق کا محتاج ہوا - اور یہی احتیاج ایک بادشاہ کے لئے گدائی کا مرتبہ رکھتی ہے - اس صورت میں تشبیہ بہ ادنےٰ مناسبت پیدا ہوگی جو تمام فصحاء کے نزدیک جائز ہے

مکین ؎ زن سیرتان دور جہاں را خبر کنند ساقی گرفت ساغر مرد آزمائے ما

اعتراض مرزا سودا - زن سیرتوں کی مردانگی کا دعوےٰ پہلے ثابت کرنا چاہئے تھا - اوس کے بعد ساغر مرد آزما اُن کو دیا جاتا - وہ غریب مردانگی کا دعوےٰ ہی کب کرتے ہیں - دوسرے یہ کہ جس کے ہاتھ میں ساغر مرد آزما ہے اس کو چاہئے کہ اُن کو صلا دے جو مردانگی کا دعوےٰ رکھتے ہوں نہ کہ زن سیرتوں کو - اور لفظ آزمائے کا بھی یہی فائدہ ہے جیسا کہ نظیری نیشاپوری کے اس شعر میں

کار نظیری در رضا غم خوردن و خوش بودن است دارم مے مرد آزما نوشش باد شیخ و شاب را

نظیری کا مقصد یہ ہے کہ نظیری کا کام رضائے الٰہی میں غم کھانے اور خوش رہنے کا ہے۔ یہ حالت ایک مئے مرد آزما ہے۔ اس کے بعد شیخ و شاب سے خطاب ہے کہ جس کو دعوے ہو وہ آئے۔ اس طرح نہیں ہے جیسے مرزا فاخر مکین نے کہدیا ہے کہ ساقی مئے مرد آزما لے کر زن سیرتوں کو آواز دے رہا ہے۔ شیخ ابوالفیض فیضی کا بھی یہ شعر ہے

گرد فنا شدند حریفان بزم عشق   بر خاک ریز جرعۂ مرد آزمائے ما

اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ جو حریف مئے مرد آزما کے پینے کا حوصلہ رکھتے تھے وہ فنا ہوگئے۔ اسی لئے ساقی سے کہتا ہے کہ شراب مرد آزما کو خاک پر گرا دے۔ غرض یہ کہ نظیری مئے مرد آزما کے لئے شیخ و شاب کو صلا دیتے ہیں کہ جس میں طاقت ہو وہ آئے اور پئے۔ اور فیضی کہتے ہیں کہ حریف گرد فنا ہوگئے کوئی باقی نہیں رہا کہ اس شراب کو پی سکے۔ ان دونوں کی تو یہ کیفیت ہے۔ نہ معلوم مرزا صاحب کس سند پر ساغر مئے مرد آزما لے کر زن سیرتوں کو صلا دے رہے ہیں۔ اس صورت میں جاہل سے جاہل پر بھی یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ مرزا مکین کی شاعری نظیری اور فیضی کے مقابلہ میں ذرہ اور آفتاب کی بھی نسبت نہیں رکھتی اگر وہ دونوں شاعر بھی زن سیرتوں کو ساغر مرد آزما کے پینے کا اہل جانتے تو اپنے شعروں میں کیوں نہ کہتے۔ اس مضمون کو مکین صاحب کے لئے کیوں چھوڑ جاتے کہ وہ ساغر مرد آزما پینے کے لئے زن سیرتوں میں صدائے بے ہنگام لگاتے پھرتے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سیرت مرزا صاحب ہی کی ہے کہ مرد آزما ساغر پر زن سیرتوں کو بلائیں۔ یہ صرف رعایت الفاظ ہے کہ مرد لائے تھے تو زن بھی لائے ہمارے نزدیک تو اس شعر کے معنی سمجھنے کی جو کوشش کرے وہ بھی بیوقوف ہے

(مؤلف) مرزا سودا نے اپنے نقطۂ نظر سے جو اعتراضات کئے اور فیضی و نظیری کی جو نظیریں لائے ہیں وہ درست ہیں مگر حق تو یہ ہے کہ مرزا فاخر مکین کے مقصد کو نہیں سمجھے اور ان کے معنے کو نہیں پہونچے۔ اور اس لحاظ سے اعتراض بے معنی ہے۔ میرے نزدیک مکین کے شعر کے معنے یہ ہیں۔ کہ زمانہ میں جتنے زن سیرت مخنث نما بھرے ہوئے ہیں ان کو آگاہ کردو کہ اب ساقی نے ساغر مئے مرد آزما ہاتھ میں لیا ہے۔ زن سیرتی کا دور گزر گیا مرد بنو۔ اور مردوں کی سیرت اختیار کرو۔ وہ زن سیرتوں کو نہیں چاہتا۔ اس کی شراب مردوں کے لئے ہے

مرزا فاخر ۵   از مدارا گرچہ کام دل نشد حاصل ولے   خاطر یار و دل دشمن بدست آمد مرا

اعتراض مرزا سودا۔ مرزا صاحب نے غالباً اس شعر کے یہ معنے رکھے ہیں۔ کہ یار کا مقصد یہ تھا کہ ہم تمنا کو ترک کردیں۔ لہٰذا ہم نے اسی پر صلح کرلی اور اپنے مقصد سے دست بردار ہوگئے۔ اس سے اپنا مقصد تو کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ دشمن اور دوست دونوں ہم سے راضی ہوگئے۔ لیکن اب ہم پوچھتے ہیں کہ جب دوست اور دشمن کا دل حاصل کرلیا تو حصول مقصد دل میں کون سا عقدہ باقی رہ گیا۔ اس صورت میں جو تمنا کہ عاشق کے دل میں



قیمت ۸ر

بیوسی پٹ برانڈ شو مثل ولایتی شو کے ہے

مرد عورت اور بچوں کے لئے

گھر بیٹھے براہ راست کارخانہ کو آرڈر دیکر اطمینان بخش شوز خرید فرمائیے۔ ناپسندیدگی کی حالت میں قیمت واپس۔

فہرست مفت طلب کیجئے

قیمت سائز

نمونہ نمبر	قسم چمڑہ	3/6	7/10	11/1	2/5	2/7 زنانہ	5/10
325	سیاہ کروم		2/-	2/12	3/8		4/8
326	براؤن کروم		2/2	3/-	3/12		5/-
410	سیاہ یا براؤن پیٹنٹ چپک فاکس			3/4			3/15
417	چیری پیٹنٹ گرے یا شیمپین کا چپک فاکس			3/8			4/4
418	براؤن کروم شیمپین کاف فاکس			3/4			3/15
419	چیری پیٹنٹ شیمپین کاف فاکس			4/4			4/15
420	براؤن کروم ابر سول یا کریپ سول	1/10	2/2	2/12	خرچ ڈاک بذمہ خریدار		

نگار

رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ تک شائع ہوتا ہے

رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا

سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (سے)

بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۴ — فہرست مضامین سنہ ۱۹۳۳ء — شمارہ ۳

نگار

ایڈیٹر :- نیاز فتحپوری

جلد ۲۴	ستمبر سنہ ۳۳ء	شمارہ ۳

ملاحظات

منکرین خدا کے خیالات پر تبصرہ

گزشتہ ماہ کے ملاحظات میں ہم نے اجمالاً منکرین خدا کے خیالات ظاہر کرتے ہوئے وعدہ کیا تھا کہ اس ماہ کے ملاحظات میں ان پر تبصرہ کرکے دیکھیں گے کہ واقعی ان میں کوئی صداقت پائی جاتی ہے یا نہیں، لیکن افسوس ہے کہ اس وقت ہم اس مسئلہ پر مفصّل بحث کرنے کے لئے طیار ہیں اور نہ ملاحظات کے چند صفحات کسی ایک صحبت میں مختتم گفتگو کی اجازت دے سکتے ہیں تاہم چند ابتدائی باتیں فی الحال بتا دینا چاہتے ہیں تاکہ ناظرین کی حالت منتظرہ دور ہو سکے

۱۔ جس حد تک دلائل کا تعلق ہے خدا کے اثبات وانکار کا مسئلہ اتنا الجھا ہوا ہے کہ شاید ہی انسان کبھی اس گتھی کو سلجھا سکے اُس شخص سے جو خدا کا ماننے والا ہے دریافت کیجئے کہ وہ کن دلائل کی بناء پر خدا کے وجود کا قایل ہوا ہے تو سوائے اس کے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اتنا بڑا عالم بغیر کسی صانع کے آپ ہی آپ کیونکر وجود میں آسکتا تھا اور کائنات کا اسقدر وسیع نظام بغیر کسی مدبر کے اپنے حال پر کس طرح قائم رہ سکتا ہے ۔ بظاہر یہ دلیل اتنی صاف وصریح ایسی روشن وواضح ہے کہ اس میں چون وچرا کی کوئی گنجایش معلوم نہیں ہوتی ، لیکن ایک منکرِ خدا ، سوال کرتا ہے کہ جب بغیر وجودِ صانع کے مصنوع کا پایا جانا تمہاری سمجھ میں نہیں آتا، تو خدا کا

آپ ہی آپ ظہور میں آجانا کس طرح سمجھ میں آجاتا ہے تو اس کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں دیا جا سکتا اور عقل انسانی گم ہو کر رہجاتی ہے

اسی طرح جب منکر خدا سے پوچھا جاتا ہے کہ مادّہ اور قوت کیونکر وجود میں آئے تو وہ جواب دیتا ہے کہ از خود پیدا ہو گئے اور جب اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ "خدا کا از خود پیدا ہو جانا تو تمھاری سمجھ میں نہیں آتا، لیکن مادہ و قوت کا آپ ہی آپ ظہور میں آجانا سمجھ میں آجاتا ہے، یہ کیا بات ہے" تو وہ بھی گھبرا جاتا ہے اور اس کے پاس بھی اس کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں ہوتا

الغرض وہ خدا ہو یا مادّہ، آپ ہی آپ پیدا ہو جانا ہم کو اسقدر عجیب و غریب بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک انسان خود تو آنکھ بند کر کے بغیر کسی دلیل و حجت کے شاید مان بھی لے اگر اس کا ضمیر اس یقین کی طرف رہبری کرتا ہے، لیکن کسی ایسے شخص کو باور کرانا جو ہم سے کسی قطعی و اذعانی دلیل کا طلبگار ہو بالکل محال ہے

اس لئے جس حد تک دلائل عقلی کا تعلق ہے اس مسئلہ کی نوعیت صرف یہ قرار باقی ہے کہ اگر آپ ہی آپ کسی چیز کا ظہور میں آنا سمجھ میں آسکتا ہے تو خدا اور مادّہ دونوں پر منطبق ہو سکتا ہے۔ ورنہ ایک پر بھی نہیں —— اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اس باب میں دونوں جماعتیں اس درجہ کمزور واقع ہوئی ہیں اور بہ لحاظ وجود خدا اور مادّہ دونوں ایک ہی حیثیت کی مانی جاتی ہیں تو خدا کے ماننے والے کیوں مادّہ کی قدامت پر ایمان نہیں لے آتے یا مادہ پرست جماعت کیوں خدا کے ماننے سے احتراز کرتی ہے ——

اس کا جواب اہل مذاہب کی طرف سے یہ دیا جاتا ہے کہ اگر خدا کو چھوڑ کر صرف مادہ کی قدامت پر ایمان لایا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ انسان کو اخلاقی لحاظ سے بالکل درندہ بنا دیا جائے اور وہ کسی قوت برتر و اعلیٰ کے خوفِ بازپرس سے مطمئن ہو کر جو جی میں آئے کرتا پھرے۔ ایک ملحد و منکر کہتا ہے کہ اگر خدا کا ماننا انسان کی درستی اخلاق و اصلاح تمدن کو مستلزم ہے تو کیا وجہ ہے کہ یہ مقصد اس وقت تک پورا نہیں ہوا اور اگر خدا واقعی قادر مطلق ہے تو اوس نے کیوں اس وقت تک تمام اُن بربادیوں، ہلاکتوں، مصیبتوں اور بدعنوانیوں کو روا رکھا۔ (جنکا ذکر ملاحظات ماہ اگست میں ہو چکا ہے)۔ اس کا جواب اہل مذاہب زیادہ سے زیادہ یہی دے سکتے ہیں کہ وہ مالک و مختار ہے اور اپنے مصالح کو وہی خوب جانتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ فریق مخالف کو اس جواب سے تسکین نہیں ہو سکتی اور اس طرح گویا دونوں فریق ایک دوسرے کو مطمئن کرنے میں ناکام رہتے ہیں

منکرین خدا کی جماعت تین حصوں میں منقسم ہے۔ ایک تو وہ پکا منکر و ملحد گروہ ہے جو انتہائی یقین کے ساتھ خدا کے وجود سے انکار کرتا ہے مثلاً فیور بخش (Feuerbach) جو کہتا ہے کہ "خدا کا نہ ہونا دن کی طرح واضح اور آفتاب کی طرح روشن ہے" یا فلورنس (Florence) جس نے ایک جگہ صاف صاف لکھدیا کہ "خدا کے وجود کا خیال نوع انسان کے ساتھ سخت دشمنی ہے" —— دوسرا گروہ متشککین کا ہے جن کا کہنا یہ ہے کہ "انسان کی سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آسکتی کہ خدا کا وجود ہے یا نہیں اور یہ ارتیابیت اس کی کبھی دور نہیں ہو سکتی۔ تیسرا گروہ ناقدین کا

ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ خدا کے وجود کا جو ثبوت پیش کیا جاتا ہے وہ مفید علم و یقین نہیں
اوّل الذکر گروہ تو خارج از بحث ہے کیونکہ انکار محض کا ثبوت آج تک نہ کوئی دے سکا ہے نہ دے سکتا ہے، علاوہ اس کے جب تک تمام کائنات اور اس کے موجودات کا استقصار نہ کر لیا جائے کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ خدا کے وجود کی کوئی دلیل نہیں لائی جا سکتی، بالکل ممکن ہے کہ مادّہ کی قدامت پر ایمان لانے والے اب یا آئندہ کوئی ایسی مثال پا سکیں جو ان کے نظریہ کو بدل دینے والی ہو اور وہ مادّہ و قوت کی ازلیت و ابدیت سے انکار کرنے پر مجبور ہوں۔ مؤخر الذکر باقی دو جماعتیں ضرور قابل لحاظ ہیں اور اس وقت مغرب کا بڑا حصہ انھیں دو میں سے کسی ایک خیال کا مؤید ہے۔ پھر دیکھنا یہ ہے کہ اہل مذہب یا خدا کے ماننے والے ان کے تذبذب کو دور کر سکتے ہیں یا نہیں اور اگر کر سکتے ہیں تو کیونکر ——
جواب کی بظاہر دو ہی صورتیں ہوا کرتی ہیں۔ یا تو کوئی شخص اپنے دعوے کو دلیل و برہان سے ثابت کر دے یا مخالف کے دعوے کو بھی لغو قرار دے۔ اوّل الذکر صورت جواب کی اثباتی کہلاتی ہے جو یقیناً بہترین صورت دوسرے کو قائل کرنے کی ہوا کرتی ہے اور دوسری صورت جواب کی الزامی ہے، جو مخاطب کو خاموش تو کر سکتی ہے لیکن مطمئن نہیں کر سکتی
یقیناً ہم ایک منکر خدا کے مقابلہ میں کوئی ایسا بدیہی ثبوت تو پیش نہیں کر سکتے جو اسے وجود باری کے یقین پر مجبور کر دے، لیکن اگر ہم خود اسی کے علم و یقین اور اسی کے نظریوں سے یہ ثابت کر سکیں کہ وہ باوجود انکار خدا کے، کسی نہ کسی طرح سے خدا کا قائل ہے تو شاید ایک حد تک کامیاب کہلائیں
آپ کسی بڑے سے بڑے منکر خدا سے سوال کیجئے کہ کیا اس کا خدا سے انکار کرنا اس بنا پر ہے کہ وہ خدا سے نفرت کرتا ہے یعنی اگر واقعی کسی خدا کا وجود ہو تو وہ اس کو حقارت کی نگاہ سے دیکھے گا، ظاہر ہے کہ اس کا جواب وہ نفی میں دے گا، کیونکہ نفرت و اکراہ کی کوئی وجہ موجود نہیں۔ اس لئے خدا سے انکار کرنے کا سبب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ اس کے وجود کی دلیل اسکے پاس نہیں ہے۔ یا یہ کہ اس کی عقل میں یہ بات نہیں آتی کہ ایک چیز اپنے آپ کیونکر پیدا ہو گئی۔ لیکن اسی کے ساتھ طرفہ تماشا یہ ہے کہ وہ خدا سے انکار کرنے کے باوجود خدا ہی کی طرح ایک دوسری چیز مادّہ کے از خود پیدا ہونے کا بھی قائل ہے
اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ حقیقی معنی میں منکر خدا تو کوئی نہیں ہے۔ بلکہ خدا کو جس مفہوم میں پیش کیا جاتا ہے وہ بعض کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اور اس کو تسلیم نہ کر کے وہ دوسرے نام اور دوسرے مفہوم کے ساتھ خدا کو پیش کرتے ہیں۔ اس لئے حقیقتاً دنیا میں یہ اختلاف خدا کے وجود یا عدم وجود میں نہیں ہے بلکہ صرف اس تعبیر یا اس مفہوم میں ہے جو خدا کے تصور سے متعلق ہے۔ یعنی ایک اگر اس کا تصور اس طرح کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ وجود میں آیا ہے، قادر مطلق ہے، خلاق عالم ہے، ہر وقت ہر آن اختیار کامل کے ساتھ بنانے بگاڑنے کی قدرت رکھتا ہے، نیکی پر انعام دیتا ہے، بُرائی پر سرزنش کرتا ہے، — اوس سے باز پُرس نہیں کی جا سکتی وغیرہ وغیرہ تو دوسرا بھی بجائے خدا کے "مادّہ و قوت" کا ماننے والا ہے کم و بیش اسی خیال کا مؤید ہے کیونکہ وہ بھی مادّہ کو از خود پیدا ہو جانے والا تسلیم کرتا ہے، اسی کو تخلیق عالم کا سبب قرار دیتا ہے، اسی کی مختلف کیفیات کو وہ اشیاء کے بننے

، بگڑنے سے تعبیر کرتا ہے۔ فرق اگر کوئی ہے تو صرف اسقدر کہ ایک اپنے خدا کو ارادہ کا مالک سمجھتا ہے اور دوسرا نہیں، یعنی ایک کا خدا اگر جاننے بوجھنے والا ہے، سمیع و بصیر ہے تو دوسرے کا ایسا نہیں ہے، لیکن اگر ہم اہل مذاہب میں سے اس جماعت کے اعتقاد کو اپنے سامنے رکھیں جو مقادیر الٰہیہ میں تغیر و تبدل کا قائل نہیں ہے تو یہ فرق بھی دُور ہو جاتا ہے کیونکہ اگر ایک مقدرات کو بدلنے کی قدرت رکھنے کے باوجود نہیں بدلتا[1] تو دوسرا بدل نہیں سکتا اور ان دونوں کا نتیجہ وہی ایک نکلتا ہے

اب رہ گیا سوال انعام و سرزنش کا سو میری رائے میں یہاں بھی باہم کوئی اختلاف نہیں ہے۔ میں اس کو ذرا وضاحت کے ساتھ سمجھانا چاہتا ہوں

اہل مذاہب کہتے ہیں خدا کی عبادت کرو کہ نجات اسی سے متعلق ہے، مادئین کہتے ہیں کہ علم حاصل کرو کیونکہ ترقی اس سے وابستہ ہے۔ اس لئے اب مقابلہ ہوا درمیان عبادت و علم کے اور نجات و ترقی کے۔ پھر آئیے غور کریں کہ کیا ان دونوں میں واقعی کوئی معنوی تضاد پایا جاتا ہے یا صرف تعبیرات کا اختلاف ہے

اگر آپ عبادت کا صحیح مفہوم معلوم کرنے کی کوشش کریں گے تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ خدا کی محض ظاہری پرستش یعنی خاص مراسم و حرکات کی پابندی کبھی کسی مذہب کا مقصود حقیقی نہیں رہا ہے۔ کیونکہ خدا کو بے نیاز مطلق سمجھنے والے یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ خدا کو نہ عبادت سے کوئی فائدہ پہونچ سکتا ہے نہ ترک عبادت سے کوئی نقصان۔ اس لئے ظاہر ہے کہ عبادت کا مقصود اگر کوئی ہو سکتا ہے تو صرف یہ کہ ہمیں کو اس سے فائدہ پہونچے۔ اور یہ فائدہ اُسی وقت مترتب ہو سکتا ہے۔ جب عبادت سے خود ہمارے اندر کوئی ذہنی تبدیلی پیدا ہو اور وہ ذہنی تبدیلی سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتی کہ ہم اپنی حقیقت کو سمجھیں، اور اپنی اس اہلیت کو بروئے کار لائیں جو مظاہر قدرت اور نوامیس فطرت سے استفادہ کا باعث ہوا کرتی ہے۔ اسی لئے آپ دیکھیں گے کہ عبادت کے ساتھ ہی ساتھ اچھے کام کرنے کی بھی ہدایت کی گئی ہے اور غور و فکر، تدبر و تعقل کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ تاریخ مذاہب کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے جو صورت عبادت کی متعین کی گئی۔ وہ نوامیس طبعی سے متعلق تھی اور مظاہر قدرت ہی پر غور کرنے کا دوسرا نام عبادت تھا۔ چنانچہ آفتاب کی پرستش، آگ کی پوجا، دریا کا احترام اور اسی طرح کے اور بہت سے معتقدات اسی لئے پیدا ہوگئے اور اب تک بعض قوموں میں پائے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے۔ کہ آفتاب کی پرستش سے مقصود صرف اس امر کا اعتراف تھا کہ وہ نہ صرف انسانی زندگی بلکہ انسانی ترقی کے لئے کس درجہ ضروری چیز ہے اور اسی طرح آگ اور دریاؤں کی پوجا سے یہ ظاہر کرنا تھا کہ وہ کاروبار حیات میں انسان کے کیسے زبردست ممد و معاون ہیں۔ اس کو سالہا سال کے تجربوں نے بتا دیا تھا کہ اگر سورج نہ ہو تو کھیتیاں بار آور نہیں ہو سکتیں، اگر دریا اور چشمے نہ ہوں تو امساکِ باراں کی وقت نہ زراعت کی آبپاشی ہو سکتی ہے نہ مویشیوں کو پانی میسر آسکتا ہے، اسی طرح وہ اچھی طرح جانتا تھا

---

[1] لن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا ——— لا تبدیل لخلق اللہ

کہ آگ کتنی اہم وضروری چیز ہے، الغرض مظاہر قدرت کی پرستش بھی اسی اصول فطرت کے تحت جاری ہوئی کہ انسان کو ان کا علم حاصل کرکے ان سے اپنی ترقی میں کام لینا تھا۔

اب اس کے بعد آپ اُس زمانہ کو لیجئے جب انسان آہستہ آہستہ ترقی کرکے پختگی عقل ودماغ کو پہونچا اور اُس نے خدا کا ایک بلند مفہوم پیش کرکے پرستش قرار دیا تفکر وتدبر کو جو تمام کائنات کو محیط تھا اور انسان کی عظیم الشان اہلیت کو جس کا دوسرا نام خلافت خداوندی تھا، وراثت الٰہی تھا اور جس کو صاف صاف کھول کر یوں کہہ دیا کہ " علم آدم الاسماء کلھا "[1] (یعنی آدمی کو پہلے سب کچھ بتا دیا ہے) ۔ یہ بڑی زبردست پیشین گوئی تھی۔ انسان کے دماغی ارتقاء کی، ذہنی استعلاء کی، جو آخر کار پوری ہوکر رہی، اور جس کا ثبوت عہد حاضر کے اختراعات سے بخوبی مل سکتا ہے

اس بیان سے غالباً یہ امر بخوبی واضح ہوگیا ہوگا کہ مادہ وقوت کے ماننے والے جس چیز کو علم وسائنس کہتے ہیں مذہب اس کو لفظ عبادت وپرستش سے تعبیر کرتا ہے یعنی اگر وہ کہتے ہیں کہ انسانی فلاح علمی جستجو پر منحصر ہے تو یہ بھی یہی کہتے ہیں کہ انسان کی نجات وابستہ ہے تفکر وتدبر سے اور مظاہر قدرت کے اس عمیق مطالعہ سے جو انہماک وانقیاد کی کیفیت انسان کے دل میں پیدا کر دیتا ہے البتہ نجات کے مفہوم میں تھوڑا سا فرق وہاں آکر ضرور پیدا ہوجاتا ہے جہاں سوال تمام نوع انسانی کی اجتماعیت کا پیدا ہوتا ہے اور مذہب قومیت کے تنگ مفہوم سے بلند تر " انسانیت " کے مفہوم کو پیش کرتا ہے

یقیناً جو مفہوم نجات کا ہے وہی ترقی کا ہے اور یہ سب کچھ اسی دنیا سے متعلق ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا انسان نے تمام موجودہ ترقیوں کیساتھ اس مقصود کو حاصل کرلیا ہے جو حقیقتاً نجات یا ترقی کا ہوسکتا ہے۔ غالباً نہیں۔ کیونکہ نجات یا ترقی کے مفہوم میں سب سے پہلے جو چیز ایک متمدن انسان کے سامنے آسکتی ہے وہ دنیا کا امن وسکون ہے، کیونکہ جب تک یہ حاصل نہ ہو مادی یا ذہنی ترقی کی کوئی غایت متعین نہیں ہوسکتی اور دنیا کے امن وسکون کی جو حالت اس زمانہ میں ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں کہ ایک ہی قوم، ایک ہی مسلک ومشرب، ایک ہی ذوق ومعاشرت والی جماعتوں کا اختلاف، ہابیل وقابیل کا سا اختلاف نظر آتا ہے اور بظاہر کوئی صورت اس کے دور ہونے کی نظر نہیں آتی

علمی ترقیاں بجائے اس کے کہ نوع انسانی کے تمام افراد کو کسی ایک مرکز پر لائیں، آپس میں جنگ وجدال کی نئی نئی راہیں پیدا کر رہی ہیں اور خدا کی عطا کی ہوئی وہ اہلیت جو رشتۂ اخوت ومحبت استوار کرنے کے کام میں آنی چاہئے تھی، فساد وہلاکت کی اشاعت میں صرف ہو رہی ہے۔ اور اسی نقطہ پر پہونچ کر ہم کو مذہبی نجات اور دنیاوی ترقی کا فرق محسوس ہوتا ہے۔ مذہب کہتا ہے کہ انسانی نجات منحصر ہے پُر امن ترقی پر اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ نجات نام ہے صرف فراہمی زر ودولت کا، مذہب بتاتا ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ محبت وخلوص کا برتاؤ کرو، ان کا کہنا یہ ہے کہ دوسرے کی ہلاکت پر اپنا قصر حیات تعمیر ہوتا ہے، مذہب

---

[1] اسماء سے مراد یہاں چیزوں کے نام نہیں ہیں، بلکہ تعینات فکر ودماغ مقصود ہیں

کی ہدایت یہ ہے کہ تم اس فطرت کی تحقیق کرو افادۂ عام کے لئے اور ان کا عمل یہ ہے کہ قوت ایجاد و اختراع صرف کرو بربادی و ویرانی پھیلانے کے لئے ـــــ

یقیناً فنِ پرواز انسانی ترقی کا قابلِ فخر کارنامہ ہے، لیکن کیا اس کے ذریعہ سے بم گرا کر خدا کی بے گناہ مخلوق کو ہلاک کرنا ترقی کی علامت قرار دیا جائے گا۔ عناصر کی تحقیق اور کیمیائی اختراعات کے افادہ سے کس کو انکار ہو سکتا ہے، لیکن کیا اس سے زہر آلود گیس پھیلا کر ہزاروں بندگانِ خدا کو موت کی آغوش میں دیدینا انسانی ترقی کہلائے گی۔ صنعت و تجارت کو ترقی دے کر مال و دولت حاصل کرنا یقیناً پسندیدہ امر ہے، لیکن کیا جذبۂ مسابقت سے مغلوب ہو کر ایک قوم کا دوسری قوم کو لوٹ لینے کی فکر میں رہنا اور مسئلہ زر کو اتنا پیچیدہ بنا دینا کہ خود انسانی دماغ بھی اس کو نہ سلجھا سکے، ترقی و فلاح کا باعث ہو سکتا ہے۔ الغرض اس وقت کی تمام اختراعات و ایجادات، جملہ اقتصادی و معاشری مسائل نے ایک ایسا اضطراب دنیا میں پیدا کر دیا ہے کہ امن و سکون تو کیا، انسان کو جینا بھی دشوار ہو گیا ہے اور دنیاوی ترقی کا یہی وہ نقصان رساں پہلو ہے جس سے بچنے کے لئے خدا اور مذہب کا وجود ضروری ہے اور بقول والٹیر "اگر خدا نہیں ہے تو بھی ہمیں خدا پیدا کرنا پڑے گا"

منکرینِ خدا کا ایک زبردست اعتراض یہ بھی ہے کہ اگر خدا رحیم و کریم ہے، شفقت و رافت والا ہے تو وہ طوفان و سیلاب سے، وبائی امراض سے کیوں لاکھوں بندگانِ خدا کو ہلاک کر ڈالتا ہے۔ ایک ظالم کو ظلم کرنے کے لئے کیوں زندہ رکھتا ہے، دنیا میں محکومی و غلامی کو کیوں قائم رہنے دیتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ[1] ـ اس کا جواب زیادہ مشکل نہیں

یہ امر تمام اہل مذاہب کے نزدیک مسلم ہے کہ انسان نتیجہ ہے عالم خلق کی تدریجی ترقی کا اور اس کے ذہن و دماغ کا ارتقا بھی اسی تدریج کا پابند رہا ہے اور رہے گا ـــــ فرض کیجئے کہ خدا ایک ایسا عالم پیدا کرتا جہاں سب کو ہر وقت راحت ہی راحت ہوتی، خلش و اضطراب، خوف و اندیشہ کا نام نہ ہوتا، تو ظاہر ہے کہ ایک انسان اس جانور سے زیادہ کوئی حیثیت نہ رکھتا جسے ایک جگہ پابند رکھ کر دونوں وقت بہترین غذا دی جا رہی ہے۔ اور کیا اس صورت میں خدا پر یہ اعتراض نہ ہوتا کہ انسان کو پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی

پھر جب انسان تدریجی ترقی ہی کے لئے پیدا کیا گیا تو ظاہر ہے کہ اس کے لئے ویسے ہی اسباب پیدا کرنا بھی ضروری تھے اور وہ اسباب سوائے اس کے کچھ نہ ہو سکتے تھے کہ اس کی راہ میں موانع پیش کئے جاتے اور وہ اُن کے دور کرنے کی تدبیریں سوچنے میں اپنے دماغ سے کام لیتا

اگر سیلاب نہ آتے تو انسان اپنی اور اپنی کھیتیوں کو محفوظ رکھنے کے لئے بند اور پُل وغیرہ کی تعمیر کیونکر معلوم کرتا۔ اگر امساکِ باراں نہ ہوتا تو اس کا دماغ چاہ و نہر کی تعمیر کی طرف کس طرح متوجہ ہو سکتا۔ اگر بیماریاں نہ ہوتیں تو اُن سے

---

[1] اگست کے ملاحظات میں تفصیل ملاحظہ کیجئے

بچنے کے لئے علم العقاقیر وعلم الکیمیا کے وجود میں آنے کی کیا صورت تھی، اگر دنیا مستبد بادشاہ اور ظالم آقا سے خالی ہوتی تو آزادی وحریت کے جذبات کیونکر پیدا ہوتے، الغرض آپ عہد حاضر کی کسی علمی و دماغی ترقی کو لے لیجئے، وہ یقیناً نتیجہ ہوگی کسی نہ کسی ایسی کیفیت کا، جو ناموافق حالات سے پیدا ہوئی تھی۔ اور اس لئے موجودہ ترقیاں ممنون ہیں صرف انھیں چیزوں کی جن کے پیدا کرنے کا الزام خدا پر قائم کیا جاتا ہے

اس میں شک نہیں کہ قدرت کے اس نظام میں تعمیر کے ساتھ تخریبی پہلو بھی شامل ہے، یعنی پہلے تخریب ہے اور پھر تعمیر، لیکن یہ بھی محض ہم اپنے تاثرات کے لحاظ سے کہتے ہیں، ورنہ وہاں یہ بھی کوئی چیز نہیں۔ کیونکہ خدا جسے بے نیاز مطلق سمجھا جاتا ہے، عالم تاثر سے بہت بلند واقع ہوا ہے اور جو اصول رحم وکرم کے ہم نے اپنے دنیاوی تعلقات کی بنا پر قائم کر لئے ہیں وہ اس پر منطبق نہیں ہو سکتے

اس بیان سے غالباً یہ نتیجہ آسانی سے نکالا جا سکتا ہے کہ حقیقتاً مذہب وسائنس دونوں ایک چیز ہیں، اور جو چیز مادئین کے نزدیک علم وترقی سے تعبیر کی جاتی ہے وہی اہل مذاہب کی زبان میں عبادت ونجات ہے ۔ البتہ اگر فرق ہے تو صرف یہ کہ منکرین خدا کی علمی ترقی میں اخلاق کو نظر انداز کرکے اس کی اجتماعی حیثیت کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے اور اہل مذاہب اس ترقی میں اخلاق کو بھی شامل کرتے ہیں کہ بغیر اس کے نوع انسانی نجات یا دنیا کا امن وسکون کبھی حاصل نہیں ہو سکتا

جس وقت یہ رسالہ شائع ہوگا میں حیدرآباد میں ہوں گا اور ممکن ہے کہ میری غیر حاضری اکتوبر کی اشاعت میں کچھ تاخیر کا باعث ہو۔ میں کوشش تو یہی کروں گا کہ سلسلۂ کتابت وطباعت بغیر کسی حرج کے جاری رہے اور پرچہ وقت پر نکلے، لیکن چونکہ حیدرآباد ولکھنؤ کے درمیان ایک ہفتہ سے کم میں مراسلت نہیں ہو سکتی، اس لئے شاید دو چار دن کی تعویق ہو جائے

مرادآباد یا ضلع مرادآباد کے کسی مقام سے ایک خاتون کی تحریر میرے پاس آئی ہے جس کا جواب دینا ضروری ہے لیکن چونکہ خط میں انھوں نے اپنا پتہ تحریر نہیں کیا اس لئے میں جواب دینے سے معذور ہوں۔ اگر وہ جواب چاہتی ہیں تو اپنا پتہ بھی تحریر فرمائیں ورنہ میری خاموشی پر برہم نہ ہوں کیونکہ نگار میں خط اور جواب خط کی اشاعت مناسب نہیں

نیاز

کالیداس کی شکنتلا پر ایک ناقدانہ تبصرہ

(۱)

حسن نام غلط نگاہی کا ہو یا نہ ہو، عشق عبارت فریب کاری دل سے ہو یا نہ ہو لیکن یہ یقینی ہے کہ شاعری نام ہے حسن صحرائی اوس مصوری کا جس کے پس منظر کو اگر آپ علیحدہ کر کے دیکھیں تو سوائے موسیقی کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ کیونکہ آج بیسویں صدی میں بھی جب کہ علوم و فنون کی کثرت نے ذہن انسانی کی بہت زیادہ صیقل کر دی ہے۔ "حسن کی" "کافرادائیاں" گو سرحد ادراک کے اندر رہوں مگر الفاظ کے حدود سے بدستور باہر ہیں اور آخر کار "مجبوراً" ایک شاعر کو اپنے عجز کا اعتراف اس طرح کرنا پڑتا ہے کہ

بسیار شیوہاست بتاں راکہ نام نیست!

ادبیات مشرقیہ میں تنقید و تاثر دو جداگانہ شعبے ہیں۔ جو یقیناً بمراحل دور ہیں کیونکہ یہ بہت ممکن ہے کہ ایک نغمہ دلکش کسی کے روح پر رقص بسمل کی کیفیت پیدا کر سکے لیکن یہ بالکل ضروری نہیں ہے کہ اوس نغمہ کے تاثر اور اوس کی روح کی تاثیر میں جو ربط معنوی ہے اس پر بھی وہ حکیمانہ و فلسفیانہ نظر بھی رکھتا ہو ؎

کہ بچشمان دل مبیں جز دوست   ہر چہ بینی بدانکہ مظہر اوست

حقیقت یہ ہے کہ کالیداس کا کلام جس کا ایک ایک حرف کمال شاعری کا دلکش مرقع ہے اوس کی نسبت ناقدانہ حیثیت سے کچھ بھی لکھنا آسان نہیں ہے واقعہ یہ ہے کہ مجھ میں اس قدر اہلیت نہیں ہے کہ میں اس قادر الکلام شاعر اعظم پر شان شایان تبصرہ پیش کر سکوں اور اس لیے یہ بہت آسان امر ہے کہ اپنی حقیقی بے بضاعتی کا ابتدا میں اعتراف کر لوں۔ کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ اس تہی مائگی کا اعتراف ہی میرے صحت ذوق کا ہر آئنہ ثبوت ہوگا ؎

ادائے بندگی آوردہ درد جود مرا
وگرنہ ذوق جبیں آمدن نہ بود مرا

ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب کائنات کے اکثر حصوں میں خورشید علم کی شعاعیں نہ پھیلی تھیں اور ان پر ظلمت و جہالت کی گھٹا ٹوپ تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اوس وقت قدرت نے چند ایسے ممالک بھی منتخب کر لئے تھے۔ جہاں حسن و جمال فلسفہ تصوف فنون لطیفہ مصوری و موسیقی نسائیات و عمرانیات ادبیات و مذہبیات کی تعلیم رائج تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ

ہندوستان میں بھی حسن وجمال مشہور ہے۔ یہ دور یونان میں اصنام پرستی کے لئے مشہور ہے۔
ممالک عرب یونان مصر و ہندوستان تھے۔ یہ دور یونان میں اصنام پرستی کے لئے
کے مظاہرہ سے یہ عہد خالی نہیں ہے۔ مصر کے افسانے بھی زبان زد خلائق ہیں اور یادش بخیر عرب کے ایام جہالت کے بازار عکاظ
کے میلے آج بھی آپ کو محو حیرت بنائے ہوئے ہیں۔ "جذبہ حسن وجمال" واقعہ یہ ہے کہ اس دور عشرت کی ہمہ تاسیس میں نمایاں
حیثیت رکھتا تھا۔ فلسفہ و تصوف بھی حسن وجمال کی تجلیوں سے معرّیٰ نہ تھا۔ خانقاہیں بھی اس کیف سے خالی نہ تھیں مصوری و
موسیقی تو اون کا خاص حصہ تصور کیا جاتا تھا۔ فنون لطیفہ و خطابت کا شعبہ بھی اس حسن وجمال کے مظاہرات کا کچھ کم رہین
منت نہیں تھا۔ اگر یونان میں ہیلنا کا قیامت سوز حسن فتنہ محشر ثابت ہو سکتا تھا۔ تو عرب کی بادیہ نشیں لیلائیں اور وادی نیل
کی بنات زلیخا غالباً انسانی قلوب ..... کو اپنے بے پناہ حسن کا آماجگہ بنا کر صاعقہ فتنہ شکن ثابت ہوا کرتی تھیں۔ بھلا ایسے رنگین
عہد میں ہمارا وطن کس طرح پیچھے رہ سکتا تھا۔ لہٰذا اب آپ کی اس علم پرور جماعت کو اُسی دور باستاں کے ایک عشرت افزا،
حیرت انگیز ہوش ربا افسانہ کو اس غنیمت صحبت شبی میں سناتا ہوں
ہمارے دوست حکیم عبدالقوی صاحب کا ایمان ہے کہ حسن قدرت کی پہلی شان نمود ہے جب حسن تخلیق ہوا تو اس کی پیدائش
کے لئے عشق بھی ظاہر ہوا اور ظہور عشق کے بعد ہی نظام دہر کی جلوہ طرازیاں شروع ہو گئیں۔ حسن نہ ہوتا تو عشق کا پتہ بھی نہ ہوتا
اور اگر عشق نہ ہوتا تو کائنات اپنی گراں خوابی سے کبھی بیدار نہ ہوتی ؎

پیش از ظہور عشق کسی کا نشاں نہ تھا
تھا حسن مہمان کوئی میزباں نہ تھا

عشق کو حسن نے پیدا کیا عشق قدیم نہیں حادث ہے گر آفرینش کے جملہ عشوہ طرازیوں کے مقابلہ میں قدیم ہے اور بیکراں
آب و گل کے سرشت میں داخل ہے یہ جذبۂ فطری ہے اور بحر کائنات کے ایک ایک قطرہ نے اوس کی آغوش ناز میں آنکھ
کھولی ہے
کمند حسن کی ہمہ گیریوں سے کائنات کی کوئی طاقت انکار نہیں کر سکتی حسن میں جاذبیت ہے یا حسن ہی عین جاذبیت
ہے بلکہ مقناطیسی کشش ہے۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو یہ مشاہدہ ہے کہ جہاں شمع روشن ہو وہاں پرستاران حسن خود بخود کھنچکر چلے آتے ہیں
قوموں کے عروج زوال کی داستان ہوشربا ہو یا نسلوں و ملتوں کے بننے و بگڑنے کی خون آگیں تاریخیں ہوں۔ آپ یقین کیجئے
حسن و عشق کے تاثرات آپ کو ہر جگہ یکساں کارفرما نظر آئیں گے۔ بلکہ ایسے ہی مواقع افسانہ نگاری کی جان ہیں اور یہی وجہ ہے
اس دور میں فرانس سے بہتر افسانہ نگاری کسی دوسرے ملک کی تسلیم نہیں کی جاتی کیونکہ اوس کا پس منظر خونی ہے اور اس
پشت پناہی کے لئے انقلاب فرانس یا فرنچ ریولیوشن بھی موجود ہے

یہ صحیح ہے کہ طرازی حسن کا دائرہ غیر محدود ہے اوس کی جولانگاہ ارض سے سماوات تک نہیں۔ بلکہ عرش تک اد[illegible]

حکمرانی مسلم ہے آفرینش کا ایک ایک ذرّہ اس کے جعد مشکیں میں مقید ہے بس یہ کیوں نہ کہا جائے کہ قصۂ مختصر نظام کائنات کا انحصار حسن ہی پر ہے"

یہ حسن کی کرشمہ سازیاں تھیں جس نے روز الست ہی سے آزاد معصوم ارواح کے حلقوم میں طوق عبودیت ڈال دیا۔ جو ابھی قید آب و گل میں بھی نہ آئی تھیں۔ کیا اس حقیقت سے بھی انکار ممکن ہے کہ حسن ہی کی جلوہ آرائیاں تھیں جس نے ایک نادیدہ مجسمۂ حسن کو خواہ آپ اوس کو مذہبی لغات میں کچھ ہی کیوں نہ کہئے مسجود خلائق بنا دیا

قول فیصل یہ ہے کہ حسن ازل سے ہے اور ابد تک رہیگا۔ نیست میں بھی حسن تھا۔ اور ہست میں بھی حسن ہے اور فنا میں بھی حسن جلوہ گر رہے گا

ادبیات مشرقیہ میں " بدلیشی " پرستاران حسن کے دلی تاثرات کی صحیح تصویر کھینچنا مشکل ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ادبیات شرقیہ ہو یا غربیہ اس کو پڑھا جائے تو اوس کا ایک ایک صفحہ حسن وعشق کی گلکاریوں سے مزین ہو لیکن اس بارگاہ " نازونیاز " کی نقابت کا شرف محض ایک شاعر کو حاصل ہوسکتا ہے۔ عرب کے تپتے ہوئے میدان میں اگر یہ صدا سنائی دیتی ہے کہ

الا من العشق وحالاته
احرق قلبی بحرارته

تو " تجلی گاہ یزدان " سے یہ آواز سنائی دیتی ہے کہ

دلم بسوخت تنم سوخت استخواں ہم سوخت
تمام سوختم و ذوق سوختن باقی است

تو گنگا جمنا کے ساحلوں پر بیٹھکر چاندنی راتوں میں بانسری بجاتے ہوئے آپ نے اکثر یہ دل وجگر جلا دینے والا نغمہ بھی سنا ہوگا کہ

مورے ہردے میں لاگی اگ پریم کی

غرضکہ حسن وعشق کی عشوہ طرازیوں سے کوئی شے خالی نہیں ہے اور آج کی مجلس میں اسی سے متعلق ایک حیرت انگیز واقعہ سناتا ہوں

دنیا جس قدر ترقی کرتی جائے گی اسی حد تک عہد اصنام کے قادر الکلام شاعر کالیداس کی عظمت میں اضافہ ہوتا جائیگا وہ یقیناً زمانہ قدیم کا ایک بہترین شاعر ہے۔ اُس نے شکنتلا کا ڈرامہ لکھا۔ اور اس صہبائے کہن کو نئے ساغر میں ایسی دلکشی کے ساتھ پیش کیا کہ لوگ متحیر ہوکر رہ گئے۔ یہ بالکل سچ ہے کہ شکنتلا کا ڈرامہ آریہ ورت کے ادبیات میں ایک شاداب گلاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور جسقدر اوس کی تعریف و توصیف کی جائے وہ کم ہے۔ جس عمدہ پیرائے میں کالیداس نے آئین دلنوازی پیش کئے ہیں۔ اون کا مغربی ادبیات میں مجکو باوجود تحقیق کے پتہ نہیں ملتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ المانی فلسفی گئٹے چیخ اٹھا کہ:

" سال نو کی کلیاں اختتام سال کے میوے اور وہ تمام چیزیں جو غذائے روح ہوسکتی ہیں یا زبان کو لذت دینے والی بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ارض و سما میں جو کچھ ہے وہ سب تو نے ایک نام میں جمع کر دیا ہے اور اے شکنتلا! تیرا نام زبان پر آتے ہی وہ تمام نعمتیں مل جاتی ہیں "

کیا ادبی دنیا کا یہ افسوس ناک سانحہ نہیں ہے کہ آج تک بھی یہ معلوم نہ ہوسکا کہ کالیداس کہاں پیدا ہوا۔ اور کب اوس نے اس عالم فانی کو چھوڑا اور کب اوس نے یہ ڈرامہ لکھا۔ آیا کالیداس ہی وہ خوش نصیب شاعر ہے جو اس دلفریب نزہت آفریں۔ جذبات خوابیدہ کو بیدار کرنے والے شاہ کار ڈرامہ کا قادر الکمال مصنف بے ہمتا ہے؟ خود اس شاعر اعظم کی شخصیت ادبی دنیا کے لئے ایک معمہ ہے، ایک راز ہے۔ کالیداس خود اس درجہ بے نیاز ہے کہ کسی تصنیف میں بھی اوس نے اپنا نسب نامہ یا شاہانہ سرپرستی کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ یہ بھی مشتبہ ہے کہ آیا۔ کوئی ایسا ادبی مجمع جس کو " نورتن " کہتے ہیں راجہ بکرماجیت کے عہد زریں میں پایا جاتا تھا یا نہیں۔ اور یہ مسئلہ بھی محتاج تحقیق ہے کہ کہیں راجہ بکرماجیت راجہ بھوج کا دوسرا نام تو نہیں[۱] ہے۔ اس وقت کالیداس کی تصانیف کی تعداد جو ایک معتبر[۲] ذریعہ سے معلوم ہوئی ہے ۴۱ تک پہونچتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ پہلی صدی (ق م) سے لے کر ساتویں صدی عیسوی تک کم از کم تین شاعر اسی نام کے گزرے ہیں۔ اور جہاں تک میں نے علمائے متبحر سے اس مسئلہ میں گفت و شنید کی اون کا خیال ہے کہ ان تینوں شاعروں کی تصانیف بھی ان ۴۱ نسخوں میں شامل ہیں۔ بہرحال کالیداس کی تصانیف میں تین ڈرامے اور تین مسلسل نظمیں بہت مشہور ہیں۔ جن میں سے ایک شکنتلا بھی ہے۔ کالیداس کس زمانہ میں پایا جاتا تھا تحقیق کے اس حصہ کو مضمون سے علیحدہ کرکے مختصراً اتنا ظاہر کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ کالیداس یقیناً حضرت مسیحؑ سے قبل داد سخن دے رہا تھا

کالیداس کے حالات بہت کچھ پردۂ خفا میں ہیں لیکن یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس کے عہد میں عمرانی اور تاریخی حالت آریہ ورت کی کیا تھی۔ جس کا اثر اوس کی شاعری پر بھی لازماً پڑا ہوگا۔ کالیداس کی تصانیف سے تاریخی حالات کا بہت

---

[۱] کالیداس کی قبر سیلون میں سمندر کے کنارہ ایک پہاڑی پر تھی۔ جس کا اب پتہ نہیں ملتا۔ پروفیسر مورٹر۔ ہانگ ساگر صفحہ ۲۴۱

[۲] قاصد سحاب۔ بابو گجپت سرن داس ایڈوکیٹ۔ سنبھل۔ ج ایڈیشن ۳۔ مسلم یونیورسٹی پریس علیگڈھ

کم پتہ چلتا ہے - شمالی ہند کے شرقی حصہ میں سورج بنسی خاندان حکمران تھا - غربی حصہ میں چندر بنسی حکومت تھی - اور وسط ہند میں ریاست مگدہ شباب پر تھی - جس میں مالوہ بھی شامل تھا - لیکن باہم جنگ و جدال کا بازار گرم نہ تھا - ورنہ کالیداس کو اس قدر سیر و سیاحت کا موقع نہ ملتا - راجگان ہند کے دربار میں ایشیائی ممالک کے حسب دستور علاوہ وزراء سلطنت اور مشیران مملکت کے دیگر ارباب علم و ہنر کو بھی شرف باریابی بخشا جاتا تھا - حکمران بالعموم عادل، رعیت نواز، رحمدل، فیاض طبع اور علم دوست تھے - رعایا فارغ البال - بلند حوصلہ اور علم و ہنر کی شائق تھی - گرنہ تو تجارت کی گرم بازاری تھی اور نہ اوس کی ضرورت - مذہبی حیثیت سے نرا کار پرماتما کی قوت انہدام کو شیو کی شکل میں محسوس کیا جاتا تھا - جابجا شیو پرستی ہوتی تھی - اور اسی جذبہ کے تحت اخلاقی وغیرانی ڈرامہ کھیلے جاتے تھے - بود و باش کے طریقے بہت دلچسپ تھے - رہبانیت کا دور دورہ تھا - دور دراز جنگلوں میں نفس کشی اور علائق دنیوی سے قطع تعلق کی تعلیم بالعموم دی جاتی تھی - جنگلوں میں ستار - مردنگ - جل ترنگ - بانسری اون کی دل بستگی کے سامان تھے - شہری نفیس مکانات میں رہتے تھے - موسم گرما میں تپش سے محفوظ رہنے کے لیے پہاڑی غاروں اور دریائی ساحلوں اور شاداب مرغزاروں میں رنگ رلیاں مناتے تھے - اون کے طرز بود و باش میں سادگی کی خصوصیت نمایاں تھیں - شوق تزئین - مصنوعی دستکاریوں کا محتاج نہ تھا - عورتوں میں شوق آرایش بہت زیادہ تھا - گو شادی کی تعداد محدود نہ تھی مگر کثرت بھی نہ تھی - شوہر کے خلوص کی بنا پر سوکنوں میں رشک و حسد پیدا نہ ہوتا تھا - اور جب ہوتا تھا تو انجام خوفناک ہوتا تھا - طلاق رائج نہ تھا - ستی کے واقعات سنے جاتے تھے - چنانچہ ہندی شاعری ان بُردگوں سے مالامال ہے

زرعی حالت کے لحاظ سے خشک سالی کا پتہ خال خال چلتا ہے - آبادی کم تھی - وسائل درامد و برآمد عنقا تھے - اس لئے دیہاتوں اور شہروں میں سود سے فائدہ اٹھانے والے مہاجن مفقود تھے - زراعت پیشہ افراد میں زمیندار و کاشتکار کی تخصیص نہ تھی - تعلیم والدین - اور ادھیاپک کے ذریعہ سے ہوتی تھی - گو شہروں میں ابتدائی مدرسوں (پاٹ شالوں) کا رواج تھا - وید اور اپنشد کی تعلیم کم تھی

شاستر - پوران - رامائن - مہابھارت - اور گیتا کی تعلیم کا رواج زیادہ ہو گیا تھا - کتھا کا دستور شایع ہو رہا تھا - فلکیات سے زیادہ دلچسپی شروع ہو گئی تھی - اور ادویات کی بھی تحقیقات کی جاتی تھی - نسائیات کے متعلق خاصا لٹریچر مہیا کیا گیا تھا - ادبیات میں نظم کا حصہ بلند تھا - اور اس صنعت میں شعرا کی زیادہ توجہ تھی - تاریخ کا عنصر بہت کم تھا - لیکن فنون لطیفہ کا ستارہ عروج پر تھا - حسن کی نمایش ہر رنگ میں جلوہ گر تھی

یہاں پر یہ بھی واضح کر دینا غالباً نامناسب تصور نہ کیا جائے گا - کہ ہندوستان فن تمثیل نگاری (ڈرامہ) میں کسی دوسرے ملک کا رہین منت نہیں ہے - چنانچہ انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا کا فاضل مقالہ نگار لکھتا ہے کہ " ہندوستان میں یہ فن اُسوقت بھی پایا جاتا تھا - جب کسی بیرونی اثر کا خیال بھی ناممکن تھا "

مشہور المان فلسفی شیگل نے بھی اس خیال کی تائید کی ہے - چنانچہ لکھتا ہے کہ

" ہندوستانیوں میں جنگی عمرانی اور ذہنی تہذیب زمانہ لامعلوم سے چلی آتی ہے۔ ڈرامہ کا عنصر اوس وقت بھی موجود تھا۔ جبکہ کسی بیرونی ملک سے متاثر ہونے کا خیال وگمان بھی نہ ہو سکتا تھا "

کالیداس کی عظمت اس آخری صداقت نامہ کی روشنی میں بہت ارفع ہو جاتی ہے کیونکہ شینگل کالیداس کے مداحین کی فہرست میں گٹے کے بعد دوسرا نمبر رکھتا ہے۔ شینگل نے اپنی بےنظیر کتاب میں شکنتلا پر بھی عمدہ تبصرہ کیا ہے

مشرق مغرب میں شکنتلا کی ستایش وتنقید میں اسقدر کافی لکھا گیا ہے کہ اوسے بار بار دُھرانا بےسود ہے لیکن پھر بھی چند مخصوص ناقدین کے تبصرہ کو کسی طرح نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ سر ولیم مونیر جو مشہور ناقد گزرا ہے اوسکا صداقت نامہ ملاحظہ کیجئے ـــــ وہ شکنتلا کے متعلق کیا خیال رکھتا ہے کہ :-

" کالیداس نے جس قدر معنی آفرینی پرواز تخیل۔ گرمجوشی۔ شوخی طبع۔ قلب انسانی سے شناسائی اور اوس کے نہایت پاکیزہ اور نازک جذبات کی دقیقہ شناسی اور اونکی متضاد خواہشات کی کشمکش سے واقفیت کا اظہار شکنتلا میں کیا ہے اوس قدر کسی دوسرے کی تصنیف میں نہیں پایا جاتا۔ قصۂ مختصر محض شکنتلا کی تصنیف ہی کالیداس کو ہندوستان کا شکسپیر بنا سکتی ہے "

سنسکرت کا اشلوک اب بھی اس دیسی ہومر کے لئے مشہور انام ہے :-

" عشقیہ نظموں میں ڈرامہ۔ اور ڈراموں میں شکنتلا۔ اور شکنتلا میں چوتھا ایکٹ شیرینی اور لطف کا مخزن ہے اور اس میں بھی آخری چار اشلوک انتہائی خوبی سے معمور رہیں "

کمارلا شاعر نے بہت لطیف پیرایہ میں کالیداس کے کمال کا اعتراف کیا ہے

کالیداس نے انسان اور پری اور دیوی کے حسن کی توصیف جس طریقہ سے کی ہے گو اپنے اپنے طور پر اپنے طبقہ کے اعتبار سے ہر ایک بےنظیر ہے لیکن اگر کسی ایک کا مقابلہ دوسرے سے کیا جائے تو یقیناً ایک قسم کا خوشگوار اختلاف محسوس ہوتا ہے اور دراصل یہی اوس کا کمال ہے۔ کیونکہ یہ بہت مشکل امر کہ باوجودیکہ ہر ایک کو بطور خود منتہائے حسن پر پہونچا دیا ہے۔ لیکن پھر بھی عورت عورت ہی معلوم ہوتی ہے اور پری پری ہے اور دیوی دیوی ہے اوس کا بڑا کمال یہ ہے۔ کہ خواہ اُس نے اجمال سے کام لیا ہے خواہ تفصیل سے خواہ تشریح سے خواہ تشبیہ سے لیکن ہر حالت میں جو کچھ بھی حوالۂ قلم کیا ہے اُس سے بہت زیادہ پڑھنے والوں کی قوت متخیلہ کے لئے چھوڑ دیتا ہے اور اس لئے بعینہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کسی نے حسن مجسم کی تصویر عالم مثال سے لاکر عالم شہود میں رکھدی ہے یا یوں کیوں نہ کہا جائے کہ اس میں ہر شخص کو اپنی ہی شبیہ ذہنی یا مثالیہ حسن کا جلوہ نظر آتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر ذہن انسانی سے فضول خیالات خوش شکن کا جلوہ نظر آتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر ذہن انسانی سے فضول خیالات خوش کن امیدیں غلط نظریہ ذہنی تصورات اور اون کے مثل دیگر اشیا خارج کر لئے جائیں تو کون شک کر سکتا ہے کہ بہت سے انسانوں کے دماغ محض کھوکھلے ہو کر غم اور افسردگی سے لبریز اور خود اپنے کو ناگوار ہوئے کرنے والی چیز بن کر نہ رہ جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ کالیداس کے نقوش مکمل اور ہمیشہ غیر فطری حیثیت سے ہمارے دماغوں

پر مستولی ہوا کرتا ہے۔ اور یہ قادر الکلام شاعر جو کچھ کہتا ہے وہ غم اور افسردگی سے اگر لبریز ہے تو دوسری جانب ایپکورین فلسفہ کا بھی قایل ہے اگر وہ بچوں کی جماعت میں ہے تو وہ معصومانہ خوش فعلیاں کرتا ہے کہ آپ ہنستے ہنستے لوٹ جائیں گے اور سنجیدہ افراد میں اس درجہ متین ہوجایا کرتا ہے کہ دھوکا ہوتا ہے کہ واقعی یہی کالیداس ہے۔ خیام کا فلسفۂ عیش بھی اوس کے کلام میں آپ کو ملیگا۔ لیکن مذہبی احترام اور اخلاقیات کے حدود سے ایک انچ نہیں ہٹتا۔ یہی وہ کلام ہے جو دوسرے کو نصیب نہیں ہے۔ نقاش کو حسن کی تصویر کھینچنے میں کسی مادی نمونے کی ضرورت ہوتی ہے گو کہ اس کو آئینی مثالیہ کے مطابق بنانے کے لئے بہت کچھ رنگ و روغن کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن شاعر کا میدان اس سے بہت زیادہ وسیع ہے اوس کو خد و خال کی مصوری کے لئے کسی مادی نمونہ کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنے محسوسات ذہنی سے یہ کام لینے کا عادی ہوتا ہے بشرطیکہ وہ شاعر ہو اور انسان بھی! اہل یونان نے جو کمال فنون لطیفہ میں پیدا کیا وہ محتاج تصریح نہیں ہے۔ اور اسی وجہ سے ان کو آغاز ہی میں توصیفِ حسن کی طریقہ داخلی تک آسانی پیدا کرنے میں کامیابی ہوئی ہومر نے ہیلن کی تصویر پیش کی ہے جس کے عالم سوز حسن نے تمام دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ اور یورپ و ایشیا کو دس سال تک جنگ میں مصروف رکھا تھا۔ لطافت بیان اور نزاکت خیال تو یونانیوں کا حصہ تھا۔ وہ کسی اور قوم کو نصیب نہیں ہوا۔ البتہ یہ کمال سنسکرت کے شعرا میں مہاکوی کالیداس کو حاصل ہے کہ جہاں کہیں اوس کو "حسن و جمال" کے اظہار کا موقع ملا ہے اوس نے اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا ہے اور اس نے حسن و جمال کی ایسی زندہ اور دلکش تصاویر پیش کی ہیں کہ بھلانے سے بھی ذہن انسانی سے فراموش نہیں ہوسکتیں کالیداس "گھر کی رونق" ایک ہنگامہ پر موقوف نہیں تصور کرتا بلکہ وہ فلسفی ہومر کی طرح اس کا کوشاں تھا کہ وہ مسرت و شادمانی کو تمام خارجی اشیاء سے آزاد بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرے۔ وہ بیک وقت واعظ مجلس بھی ہے اور رند مے پرست بھی وہ خیام کے الفاظ میں اپنی مے نوشی کو چھپاتا نہیں ہے بلکہ دنیا کے سامنے پیش کرکے لوگوں کو بھی مے نوشی کی دعوت رندانہ دیتا ہے۔ خیام نے کیا خوب کہا ہے کہ

افتادہ مرا بائے و مستی کارے ؛ خلقم ز چہ می کند ملامت بارے ؟
اے کاش کہ ہر گناہ مستی دادے تا من بجہاں ندیدمے ہشیارے

اور کالیداس بھی یہی کہتا ہے کہ " اگر میں حسن پرست ہوں تو دنیا مجھکو کیوں مطعون کرتی ہے اے کاش ہر طاعت "خمار آلود" ہوجائے۔ تاکہ حمام کائنات میں مجھکو جلوۂ حق کے شاہدان پاک نظر کے سوا کوئی دوسرا دکھائی نہ دے۔ کالیداس کی نگاہ خیام کے راستہ سے ہٹ کر معرفت تک بھی پہنچتی ہے اور اسی لئے زیادہ آزادی سے مذہب کے خلاف کچھ کہنے کی کالیداس کی ہمت نہ ہوئی

اجین (مالوہ) کی ہُن پرستی دارالحکومت میں یہ عدیم المثال شاعر و بے نظیر تمثیل نگار حضرت مسیح سے ایک صدی قبل

مہاراجہ بکرماجیت کے عہد جہانبانی میں شکسپیر۔ ہومر۔ چاسر۔ بن جانسن۔ فردوسی۔ امراءالقیس۔ علقمہ۔ اعشیٰ۔ نابغہ وغیرہ کے کمالات دکھلا کر بقائے دوام کی مہر مقبولیت محض اپنے نام کے لئے وقف و ثبت کر رہا تھا۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ الیڈ (Homer [illegible]) و سبع معلقات کی طرح کالیداس کی شاعرانہ حکمت و موعظت شب و روز ترقی کر رہی ہے۔ اظہار حیات کی نزاکت اور تخیل بلند پروازی اوس کا حصہ خاص ہے۔ اور تاثرات قلبی کو عیاں کرنے میں کالیداس نے جو کمال پیش کیا ہے۔ اوس کو اب تک سنسکرت میں اوس سے بہتر کوئی دوسرا شاعر مظاہرات حسن و عشق کی حیثیت سے پیش نہ کر سکا۔ وہ محاکات کا بادشاہ تھا۔ جو تصویر وہ اپنے موقلم سے پیش کرتا تھا۔ وہ آپ اپنی نظیر ہوتی تھی۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ شکنتلا کو ادبیات (آریہ) ہندی کے شاداب سدا بہار چمن میں حسین و جمیل پھول کی حیثیت حاصل ہے" اگر زندہ جاوید شاعر کو اس فن خاص (تمثیل نگاری) کا قلب تصور کیا جائے تو شکنتلا یقیناً اس قلب کا درد۔ تمنا۔ آرزو اور خواب ہو گی" اس ڈرامہ کا ترجمہ انگریزی، فارسی۔ المانی، فرانسیسی۔ بنگالی۔ ہندی اور اردو میں ہو چکا ہے انگریزی میں عدالت عالیہ کلکتہ کے فاضل جسٹس سر ولیم جونز (ہفت زبان) نے (۱۷۸۹ء) پیش کیا اور نظم کا جامہ پروفیسر ولیم منرو نے پہنایا۔ المانی ترجمہ شلیگل برادران وگٹے ہر ڈرکا رہین منت ہے۔ ہندی میں راجہ لکشمی سنگھ (۹۵-۱۸۲۶) سابق ڈپٹی کلکٹر ممالک متحدہ نے ۱۸۶۲ء میں غالباً اٹاوہ سے شایع کیا بنگلہ میں سر ٹیگور نے" اپنایا" اردو میں جہانتک میں نے تحقیقات کی ہے محض تین نسخہ شایع ہوئے ہیں۔ جس میں بحیثیت قدامت میر کاظم علی جوان کا آزاد ترجمہ نثر بہت قدیم ہے جوان کا اصلی وطن عروس البلاد دہلی تھا۔ لیکن وہ لکھنؤ آیا اور یہیں سکونت اختیار کر لی۔ اور لکھنؤ سے وہ کلکتہ کے مدرسہ (فورٹ ولیم کالج) کے لئے بحیثیت مترجم و مددگار کے ڈاکٹر جان گلکرائسٹ صدر مدرس (پرنسپل) کی خواہش پر گیا۔ اور ڈاکٹر کی حسب خواہش اس نے ۱۸۰۱ء میں شکنتلا کا ڈرامہ ترجمہ شروع کیا جو ۱۸۰۴ء میں چار سال کی محنت شاقہ کے بعد مکمل ہوا[1]۔ یہ ترجمہ للوجی لال کب بولتے تھے اور جوان اردو میں لکھتے جاتے تھے۔ یہ ڈرامہ فرخ سیر بادشاہ کے عہد میں سنسکرت سے برج بھاشا میں بھی منتقل ہو چکا تھا۔ فرخ سیر نے نواز کیشور کو حکم دیا کہ سنسکرت سے شکونتلا کو برج بھاشا میں منتقل کرو۔ چنانچہ کبت و دوہرے یہ ترجمہ للوجی کی شرکت سے ریختہ میں ہوا۔ یہ اڈیشن ۱۸۰۴ء میں شایع ہوا۔ اور رومن حروف میں چھاپا گیا۔ اور نصاب میں شامل ہوا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اشاعت خاطر خواہ نہ ہو سکی۔ ۱۸۴۶ء میں علم دوست بابا کریم بہمن ڈوسا بھائی منشی نے اسے لیتھو میں مرزا حسن کاشانی کے مطبع سے شایع کیا۔ لیکن اس کو بھی عام مقبولیت حاصل نہ ہوئی حتی کہ برنی صاحب کا خیال یہ ہے کہ سیر المصنفین سے لائق مرتب کو بھی اس کی زیارت نصیب نہ ہوئی اوس کا ایک نسخہ برنی صاحب کے پاس ہے اور وہ مقدمہ کے ساتھ شایع کرنے والے ہیں لیکن این خیال است ــــ دیکھئے برنی صاحب کا ارادہ

[1] سید حسن صاحب برنی بی۔اے ال ال بی (علیگ)، وکیل ہائیکورٹ۔ یہ انصاف کے خلاف ہوگا اگر میں برنی صاحب کا شکریہ نہ ادا کروں مجکو آپ کے مضمون سے بہت قیمتی امداد ملی ہے اور میں نے بہت آزادی سے اوس سے فائدہ اٹھایا ہے۔ م۔ا۔ علوی

وعدے پورے کرتے ہیں۔ ایک منظوم ترجمہ رشک گلزار کے نام سے مولوی سید محمد تقی صاحب نے نولکشور مطبع سے شایع کیا۔ غالباً اس امر کے اظہار میں کوئی ہرج نہیں ہے کہ ان صاحب نے قصہ کو بڑی خوبصورتی سے نظم کیا لیکن انھوں نے قدیم سنت قائم رکھتے ہوئے ہر ایک فصل میں بہار ساغر و مینا کا تذکرہ چھیڑا ہے اور وہ اس کے لئے مجبور بھی تھے کیوں کہ وہ زمانہ ہی ایسا تھا اور اس حمام میں سب عریاں ہی نظر آرہے تھے۔ دقت یہ ہوگئی ہے کہ آج ہمارے لئے یہ مسئلہ بہت مشکل ہے کہ آیا قصہ ایرانی ہے یا خالص ہندی۔ اس ترجمہ میں عجمی عنصر (رنگ) اس درجہ گہرا ہے کہ میر حسن و گلزار نسیم سے اس کا امتیاز مشکل ہے "مثنویات" کے تحت خواہ اوس کا درجہ کسی قدر ارفع کیوں نہ ہو لیکن مقامی معاشرت (آریائی تہذیب ! ، Aryan Civilization) کی عدم واقفیت نے مصنف کی کاوشوں پر پانی پھیر دیا ہے اور ہم اس کو کوئی درجہ ادبی حیثیت سے نہیں دے سکتے۔ عرصہ ہوا زمانہ کے مقبول مقالہ نگار مسٹر اقبال ورما سحر ہتگامی نے اس تمثیل کو منظوم حیثیت سے دنیائے ادب میں پیش کیا۔ اور یہ نہایت درجہ مسرت سے کہا جا سکتا ہے کہ جو نقائص رشک گلزار میں تھے ان کی اصلاح اس میں ہو گئی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سحر اپنے آبائی وطنی مراسم سے واقفیت تامہ رکھتے تھے انھوں نے قصہ (اصلی) کی "وطنیت" کو بدرجۂ اتم قائم رکھا۔ اون کے کردار، اون کے مماثل۔ اون کے اداب، اون کے اخلاق، اون کے اداب صحبت و مراسم و مدنیت خالص ہندی نژاد ہیں اور مسٹر نگم کا یہ خیال ایک بڑی حد تک بالکل صحیح ہے کہ بلاغت اور روانی بیان میں سحر کی مثنوی نیرنگ سحر۔ گلزار نسیم سے بہت کچھ مشابہت رکھتی ہے۔ سحر ہتگامی محض رسماً مہاکوی کے رہین منت ہیں۔ ورنہ طرز بیان کلیاً اون کا ہے گو میں اس سے اتفاق نہیں کرتا کہ انھوں نے شعر کی مجبوری سے قصہ میں بھی انحراف کیا ہے اگر یہ نہ کرتے اور بجائے اس کے جدید شاہ راہ پر اوس کو پیش کرتے تو میرے خیال میں اوس کا حسن اور چمک اٹھتا میرا مطلب قوافی و بحور کی قدیم پابندی سے آزادی تھا ! لیکن پھر بھی قصہ کی نوعیت اور دلچسپی میں کوئی فرق نہیں ہے

کالیداس کو سمجھنے کے لئے ضرورت ہے کہ حسب ذیل امور پر غور کر لیا جائے :-

(۱) سنسکرت کے قدیم شعراء زیادہ تر عزلت نشین ہوتے تھے

(۲) لطف سخن اصول مذہب تاریخ اور ادبیات کو اس طریقہ پر ملایا گیا گویا وہ کسی سماوی ہستی کے چار روشن موتی ہیں تاریخ کو اصول مذہب کی تائید سے استوار کیا گیا۔ وقت و تفصیل سے کوئی علاقہ نہ تھا

(۳) آریہ ورتہ کی قناعت پسندی اور رجحان روحانی نے۔ اون کی ضروریات کو ہندوستان کی قدرتی پیداوار تک محدود رکھا۔ اسی لئے استعارات تشبیہات رموز معرفت اور کرشمہائے قدرت سے مالامال ہیں

عام خیال ہے کہ کالیداس آزاد منش اور شوخ طبع تھے۔ اس بحث پر واقعہ یہ ہے کہ بہت کچھ دونوں جانب کہا جا سکتا ہے۔ کالیداس کا کلام حسن و جمال کا ایک دلکش مرقع ہے لیکن اگر نظر تعمق سے دیکھا جائے تو جس تصویر میں کالیداس کے قلم نے حسن و عشق کی کوئی رنگین داستان صفحات جمیل پر پیش کی ہے۔ اوس مرقع کے اصلی خد و خال پاکیزگی۔ طہارت۔ توحید پرستی

اور معرفت کے وہ لافانی نقوش ہیں جن کی تعریف دانایانِ فرنگ کو بھی مجبوراً کرنا پڑی!

کسی کا خیال ہے کہ حُسن میں کشش لازمی اور عشق میں شورش لابدی - اگر ایک عطیہ الٰہی ہے تو دوسرا خاصۂ طبع انسانی اور ستم ظریفی تو یہ ہے کہ دونوں ناگزیر ہیں! ——— نہ اس کو واپس کر سکتے ہیں اور نہ اوس کو ترک - مغربی عینک سے اگر نہ دیکھا جائے تو اس "حُسن" کا لطف معلوم ہوتا ہے باقرآن پر سر دُھننے والے - خدا کی شان مشرقی شوخیوں کو اپدال کہ کر سامنے سے ہٹا دیا کرتے ہیں - بہرحال یہ مسئلہ بہت بحث طلب ہے اس وقت ہم کو کالیداس کی خصوصیات کلام پیش کرنا ہے اور اس کے بعد یہ دیکھنا ہے کہ ہندوستان میں اوس کی کن تصانیف کو مقبولیت عامہ کا خلعت عطا ہوا ہے - کالیداس کی شاعری مرکب ہے ان اجزاے ترکیبی سے :-

(۱) صفائی - سادگی - نزاکت اور پاکیزگی کالیداس کی شاعری کی روحِ رواں ہے

(۲) تصنع اور طویل مرکبات پامال محاورات ذومعنین الفاظ سے کالیداس کا کلام پاک ہے

(۳) روانی - سلاست - موزونیت پُرمعنی اور دلفریب تشبیہات سونے پر سہاگہ کا کام کرتی ہیں

(۴) معنی خیز اساطیر - اخلاق رموز افسانوں اور حسبِ حال قابلِ تقلید کرداروں کی کوئی کمی کالیداس کے یہاں نہ ملیگی

(۵) تزکیہ نفس و تزکیہ باطن کی فضا میں سوزشِ عشق اور شوخیِ حُسن کو روحانیت کی معراج پر پہنچانا - کالیداس کی عدیم المثال خصوصیت ہے

(۶) لوکل کلر (مقامی رنگ) کالیداس کے کلام کا نمایاں عنصر ہے - ہمالہ کی برفانی چوٹیاں معدنیات سے پُر اور جڑی بوٹی سے لدے ہوئے شاداب مرغزار اور پُرسکون پہاڑ - راج ہنس آہوئے رم خوردہ - طاؤس زرنگار - مہر و مہ - سیارگانِ فلکی - مان سرور جھیل کے عرفانی نظاروں کو پیش کرنا ہندوستان کے فردوسی (کالیداس) ہی کا کام تھا

آمدم برسرِ مطلب - اوس کے شاہکار ڈرامہ شکنتلا کو ملاحظہ کیجئے، ایک ایک لفظ میں ندرت کا خزانہ پوشیدہ ہے - ملاحظہ ہو شکنتلا ایک چمپا کے درخت کے پاس کھڑی ہے اوس کی سہیلی کہتی ہے - شکنتلا! تو ایسی نظر آتی ہے کہ گویا اس درخت پر ایک بیل لپٹی ہے - سہیلیوں کی چھیڑ چھاڑ کو سنکر منچلا دشییت اس تشبیہ کی اپنے دل میں وضاحت کرتا ہے - اور اس وضاحت کو کالیداس اس طرح پیش کرتا ہے

برگِ ملائم لعلیں لب ہیں نازک شاخیں بازو ہیں　　جوبن سے معمور عجب اثمارِ جوانی دلجو ہیں[۱]

---

[۱] یہ ترجمہ بابو جگت سرن داس صاحب قاصد سہاب سے دستیاب ہوا ہے جو آیندہ اوراق میں پیش کیا جارہا ہے - مرتب

آبیاری کرتے کرتے شکنتلا تھک گئی ہے اور خانقاہ کو واپس جانا چاہتی ہے اوس کی سہیلی روکتی ہے۔ اور مے عشق سے مدہوش دشینت شکنتلا کی وکالت کرتا ہے ؎

جھکے کندھے کلسوں کی آفت کے مارے — ہتیلی ہوئیں لال زحمت کے مارے
بلا وجہ یہ سینہ ابھرا نہیں ہے — ہے "پھولی ہوئی" سانس محنت کے مارے
گر پھول بھی رخ پہ ہلتا نہیں ہے — یہ چپکا ہے عرق مشقت کے مارے
پریشان ہوئی کھل کے جب جعد مشکیں — تو لی . . . . کلفت کے مارے

شکنتلا کو سوز عشق پریشان کر رہا ہے۔ تمام سہیلیاں اوس کی حالت زار دیکھ کر متفکر ہیں راجہ دشینت بھی دلگرفتہ درختوں کی آڑ سے شکنتلا کے مرض کی تشخیص کرتا ہے ؎

لیپ سینہ پہ کیا خس کا مٹانے کو جلن — ہاتھ میں ڈالے کمل نال کے ڈھیلے کنگن
رخ پہ ہی سوز دروں گرچہ نمایاں کچھ کچھ — دلفریبی تو وہی ہے مری ترچھی چتون
فصل گرما کی تپش عشق کی سوزش کیا ہو؟ — وہ بگاڑے یہ بنائے گل تر کا جوبن
دیکھکر اوسکی پھبن دل کو یقین آتا ہے — اوسکے جی کو بھی لگی ہے کسی دلبر کی لگن

سہیلیوں میں مشورہ ہوتا ہے اور برگ نیلوفر پر شکنتلا پریم پترا لکھتی ہے ؎

کیا جانوں ترے دل کو میں اے یار خوشخصال — مجکو تو کر رہا ہے پریشان ترا خیال
سوز دروں جلاتا ہے فرقت میں رات دن — دل میں ہے شوق وصل نظر میں ترا جمال

راجہ دشینت کی رانی ہنس پادکا باز ارحسن سرد پڑنے لگا تو مہاراجہ کا التفات بسومتی کی جانب بڑھ گیا تو ہنس پاد سرود خانہ سے ایک شکایتی نغمہ بلند کرتی ہے ؎

ای حریص گل تو۔ زنبور تھا داس خود غرض — ام پر جب مول تھا رہتی تھی حاضر دائما
جب نظر آ کنول صورت دکھائی چھوڑ دی — تھی یہی شرط وفا! او بے مروت بے وفا

دربار سارنشی کی بد دعا رنگ لائی۔ دشینت نے شکنتلا کو فراموش کر دیا۔ منکا اوس کو لے کر اڑ گئی۔ انگشتری ملتے ہی طلسم شکست ہوا۔ راجہ کو شکنتلا یاد آئی جوش محبت عود کر آیا تھا، دیر دیکھتا اور دل بہلاتا۔ اس کیفیت کو کالیداس

یوں پیش کرتا ہے

یا تو وہ دن تھا کہ ہر وصل تھی وہ بیقرار — اور میں نے دیدیا تھا اک جواب لفگار
آج وہ دن ہے کہ اس کا کچھ پتا چلتا نہیں — تک رہا ہوں کب سے اس تصویر کو دیوانہ وار
اس فضائے چشمۂ آب بقا کو چھوڑ کر — ہو رہا ہوں اس سراب بے حقیقت پر نثار

ایک تصویر اور بھی نہایت دلفریب عنوان سے فردوسی ہند نے پیش کی ہے۔ راجہ اپنے ہم جلیس ماڈھو کے ساتھ تصاویر سے دل بہلا رہا ہے آخر میں یہ خیال آیا کہ ایک تصویر اس موقع میں اور ہونا چاہئے۔ لیکن اس کو علانیہ پیش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کالیداس کی عقل نے ایک لطیف جدت سے کام لیا۔ اور دونوں کو ہرن اور ہرنی کی صورت میں دکھلا دیا ہے —— اور راز و نیاز کو اس طرح ظاہر کیا ہے کہ ہرنی اپنے بائیں آنکھ کی خارش کی شدت کو دور کرنے کیلئے ہرن کے سینگ سے رگڑ رہی ہے۔ اس حصہ میں جس منظر کو دشینت دکھانا چاہتا ہے وہ دراصل دشینت و شکنتلا کی ملاقات ہے اسے سنئے۔

ایک منظر اور بھی اس میں دکھاؤں ہم نشیں — کچھ نہ کچھ آخر بندھے تو اس دل غمگیں کو آس
شوخی و ناز و ادا سے موجزن ہو مالنی — ہنسوں کے جوڑے کنارہ و نیر کھڑے ہوں بے ہراس
دونوں جانب دامن کوہ ہمالہ کی فضا — چر رہے ہوں آہوئے صحرائے نیلوں پہ گھاس
ایک درخت خوشنما کی شاخ ہو سایہ فگن — سوکھتا ہو جن پہ ان صحرا نشینوں کا لباس
اسکے سایہ میں ہرن کا خوشنما جوڑا بنے — ہوں محبت سے کھڑے اک دوسرے کے آس پاس
چشم چپ کو سینگ پر نر کے رگڑتی ہو غریب
شدت خارش سے ادہ ہو کے مضطر بے حواس

علم الحیوانات کے ماہر اس مسئلہ سے واقف ہیں کہ ہرنی کی بائیں آنکھ میں جب خارش ہوتی ہے تو وہ کیوں ہرن کے سینگ پر رگڑتی ہے —— کیا اس "افشار راز" کو —— پہلے اس سے زیادہ لطیف کنایہ میں پیش کیا جا سکتا تھا[1]۔ یہی وہ ادعا ہیں۔ جنہوں نے ہمارے شاعر اعظم کو ہومر فردوسی چاسر اور شکسپیر کا ہم پایہ بنا دیا ہے

---

[1] اس امر کا اظہار کر دینا بہت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس تاریخی عنصر کے لئے میں بہت بڑی حد تک سہیل کے فاضل مقالہ نگار بابو گجیت کمار بی۔ اے ایل ایل بی وکیل ہائیکورٹ ڈیرہ دون کا رہین منت ہوں

شکنتلا کو لوگ غلطی سے محض ایک عورت ہی تصور کرتے ہیں حالانکہ وہ تو ایک مستقل تاسیس ہے جس کے عناصر ترکیبی ۔ شعریت ۔ حسن ۔ موسیقی وفا ۔ درد و سوز و ہجر ہیں" چونکہ یہ جملہ عناصر کسی ایک ہستی میں بہ یک وقت جمع ہونا بظاہر مشکل ہیں اس لئے اوس کو محض ایک عورت کہنا یقیناً غلط ہے ۔ میں اس کو تسلیم کرتا ہوں کہ اس میں سیتاجی کی سی روحانیت کا اعلیٰ جذبہ اوس میں ساوتری کا سا استقلال کا زبردست عنصر اوس میں دمینتی کا سا صبر کا معرکۃ الآرا شریفانہ کردار یقیناً نہیں ہے یہ بھی تسلیم ہے کہ وہ کوہ تحمل نہیں وہ مضبوط درخت نہیں وہ سنگ گراں نہیں بلکہ وہ کمزور ہے ۔ ناتواں ہے اور عاجز ہے ۔ مصیبت کی باد صرصر چلتی ہے اور اوس کے متاع صبر کو تاراج کر دیتی ہے اوس کے پائے ثبات میں لغزش ہوتی ہے اور اوس کا خرمن حیات خس وخاشاک کی طرح جل کر ہوا میں منتشر ہو جاتا ہے ۔ وہ غریب الدیار مصیبت زدہ بن باسی ہے محبت کرنا چاہتی ہے لیکن محبت کی راہوں سے ناآشنائے محض ہے اور میرے نظر میں یہی وہ اعلیٰ جوہر ہے جو شکنتلا کو اوس کے ہمجنسوں پر فوقیت عطا کرتا ہے ۔ اوس کی انسانی کمزوری سے ایک لطیف سبق کائنات کو ملتا ہے اور اسی خامی نے اوس کے کردار کو ماہ تاباں ہی پہونچا دیا ہے ؎

در خرمن کائنات کردم چو نگاہ
یکدانہ محبت است باقی ہمہ کاہ!

اُجین کے افراد آج بھی اپنے قادر الکلام شاعر پر بجا طور سے ناز کرتے ہیں ۔ اور فرط عقیدت سے یہ بالکل درست کہتے ہیں کہ سلاست زبان اور صداقت جذبات میں شکنتلا سے بہتر کوئی دوسرا ڈرامہ نہیں ہے ۔ شکسپیر کی طرح کالیداس نے بھی اس ڈرامہ کا پلاٹ خود اختراع نہیں کیا بلکہ اساطیر اولین اس ڈرامہ کی بنیادی پتھر ہیں لیکن ان اساطیر میں قادر الکلام شاعر نے وہ رنگین بیانی اور لطافت جذبات سے کام لیا ہے کہ ڈرامہ بالکل نادر اور نیا ہو گیا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ آئین دلنوازی جس دلفریب عنوان سے کالیداس نے پیش کیا ہے اور رموز الفت کے نکات کو جس طرح اوس نے بے نقاب کیا ہے وہ اس کے سوا ماقبل کے شعرا میں یقیناً نہیں ہے ۔ کالیداس معلوم ہوتا ہے کہ ازل سے فطرت پرست یا یوں کیوں نہ کہا جائے شاہد حقیقی کا پرستار دل لایا تھا ۔ اور اس کی بے باک نظریں حُسن پنہاں کو آشکارا کرنے پر تلی رہتی تھیں ۔ جو جذبات انسانی ہی تک محدود نہ تھی بلکہ وحوش وطیور اشجار و اثمار غرضیکہ ساری کائنات اوس کے خاص نقطۂ نگاہ کے جلوہ حُسن سے معمور تھی اور وہ اوس شاہد حُسن کا واحد پرستار تھا! اوس کا موضوع محض حسن و جمال کی نمایش تھا ۔ اس نے اپنے موقلم سے جو ہلکے سے نقوش بھی قرطاس عالم پر قائم کئے ہیں وہ انتہائی دلکش ہیں اور اس کا پتہ دیتے ہیں کہ ان نقوش کا — بنانے والا محض ایک شاعر ہی ہو سکتا ہے جس کا جذبہ حسن مکمل ہو اور یہ تخیل دلکش محض ایک خلاق معنی ہی کے دلفریب احساس حُسن سے پیدا ہو سکتا ہے ۔ یہی وہ وصف ہے جس نے دانایان فرنگ کو کالیداس کا مداح بنا دیا ہے

مہاراجہ بکرماجیت کالیداس کو اپنے تاج شاہی کا بیش قیمت ہیرہ تصور کرتے تھے۔ اس لئے جب اون کو اطلاع ہوئی کہ درباری شاعر نے شکنتلا کا ڈرامہ تصنیف کیا ہے تو حکم دیا کہ اس کی پہلی نمائش موسم بہار میں شاہی محل میں کی جائے گی اور ایوان شاہی کے اسٹیج کو یہ شرف حاصل ہوگا کہ شکنتلا کا ڈرامہ وہیں شاہی سرپرستی میں پہلی بار . . . . . شایع ہوا اور اوس نے بقائے دوام کا خلعت حاصل کیا۔ آئیے آپ کو بھی اس ڈرامہ کا پر لطف حال سنائیں اور ڈاکٹر ہورو وٹز نے تقریباً ۱۴۰۰ سال قبل کے ساز و سامان کا جو تذکرہ کیا ہے اوسی میں رنگ آمیزی کرکے آپ کو آج اس صحبت میں داستان ہوش ربا کا ابتدائی باب دکھلائیں۔ دیکھئے سامنے ایوان شاہی ہے اور وہ سرکاری اسٹیج ہے جس پر شکنتلا کا ڈرامہ پیش کیا جانے والا ہے۔ منتخب روزگار ایکٹر "جگت استاد شاعر" علم پرور دربار اور اس پر موسم بہار کے لطیف اجتماع سے جو کیفیت اس وقت طبائع میں رونما ہوئی ہوگی۔ اوس کا اندازہ تھوڑا بہت تو آپ حضرات بھی کر سکتے ہیں دیکھئے وہ ایوان شاہی کا سنگت سال[1] رقص و سرود کے لئے وقف ہے بڑے بڑے دروازوں پر زردوزی پردے آویزاں ہیں سامنے کشادہ صحن میں نشست کا انتظام ہے جس کے چاروں طرف خوبصورت سنگی مجسمے ہمہ تن انتظار بنے ہوئے ستونوں کا حق ادا کر رہے ہیں ان اصنام مجازی پر پھولوں کی نچھاور ہوتی ہے۔ صحن کے عین وسط میں سرخ رنگ کا شاہی شامیانہ نصب ہے جس کی سنہری جھالریں دنیاوی نظروں کو خیرہ کئے دیتی ہیں شامیانہ چھ نقرئی چوبوں پر قائم ہے۔ اور یہ حیرت نزاکت طبع اور رعنائی خیال کا خاتمہ ہے کہ بجائے زمین کے یہ چوبیں پھولوں کے ڈھیر پر رکھی ہوئی ہیں۔ اسٹیج کے سامنے بھی کثرت سے پھول سلیقے سے سجائے گئے ہیں جس کے پہلو میں شہنشاہی پرچم ہوا میں لہرا رہا ہے اور لعل و الماس کا پر تکلف پردہ طلائی زنجیروں سے اسٹیج پر آویزاں ہے۔ یہ سنکر غالباً آپ محو حیرت ہوں گے اور مسرور بھی کہ یہ گراں انعام اس قادر الکلام شاعر کو عطا کیا جائے گا۔ سنئے آج کی طرح ناقدری کا دور نہیں ہے۔ راجہ سے پرجہ تک علم دوست ہیں مہاراجہ بھی اپنے سبھا کے بیش قیمت لعل کو اوس کے شان شایاں معاوضہ دینا چاہتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے اور حیرت سے دیکھئے کہ اس

(۱) سنگت سال ایوان رقص کا دوسرا نام ہے۔ یہ ایوان کشادہ اور خوشنما ہونا چاہئے اور اس کی سقف لاجوردی نہایت اعلےٰ اور منقوش ہونا چاہئے جو چار بجا ستونوں پر قائم ہو۔ جن پر پھولوں کے ہار چڑھے ہوں۔ وسط ایوان میں سنگھاسن پر میزبان بیٹھے داہنی جانب معزز مہمان اور بائیں جانب اہل حرم کو جگہ دینا چاہئے عقبی حصہ میں عمال سلطنت یا خانگی ملازم ہونا چاہئے۔ شاعروں۔ جوتشیوں۔ علماء کرام حکمائے حاذق کو علاقہ کے درمیان میں جگہ دی جائے۔ خوب صورت کنیزیں اپنے حسن و جمال کے حلقہ میں شفیق آقا کو لئے ہوں کسی کے ہاتھ میں اگر چنور ہو تو کسی کے ہاتھ میں مورونکا پنکھ عصا بردار یا بجا شانتی کے لئے کھڑے ہوں۔ خاموشی کے بعد ساز چھڑے۔ اور لائق رقاصہ پردہ سے نکل کر سلام کے بعد رقص شروع کرے۔

(ڈاکٹر ولسن تاٹک ساگر صفحہ ۳۳)

دُور پاستاں میں عالم ادبیات کی قدر افزائی کس طرح کی جاتی تھی۔ غالباً یہ منظر ہوش رُبا دیکھ کر چند لمحے کے [illegible] آپ بھی یہی دعا کریں گے۔ کہ اے کاش ایسے علم پرور اور عزت افزا شہنشاہ کے عہد سعید میں ہوتے !

ملاحظہ ہو۔ سپیدۂ سحر کے نمودار ہوتے ہی اسٹیج کے عقبی حصہ سے ساز عشرت چھڑتا ہے اور مہاراجہ بکرماجیت اکلیل جہانبانی فرق مبارک پر رکھے قبائے شاہی زیب تن کئے عصائے شاہی دست مبارک میں لئے اپنے خدم حشم کے ساتھ "جاہ وجلال" کا مجسمہ بنے ہوئے "حسن وجمال" کے گنگا جمنی حلقہ میں اپنی بے تاب پرستار اور اولاد سے زیادہ شفیق رعایا کو دعوت مظاہرہ بخشتے ہیں۔ اور ہر شخص شرقی عقیدہ کے مطابق ظل اللہ تصور کرتا ہوا فرط ہیبت سے سربسجود ہو جاتا ہے۔ آکاش سے نور کی بارش ہوتی ہے اور دنیا والے اس تار بارش میں یہ غیبی آواز بھی سنتے ہیں کہ جس ملک پر ہم مہربان ہوتے ہیں وہاں ایسے ہی عادل اکبر جہانگیر شاہجہاں اور نگ زیب سریرآرائے سلطنت ہوتے ہیں" باجگذار سلاطین اورنگ شاہی کے "پوتر درشیوں" کو داہنی جانب نشست عطا ہوتی ہے۔ کنیزان شاہی سراپردہ کے قریب مورچھل لئے ادب سے استادہ ہیں۔ حریم سلطنت کی حاشیہ نشین جمال و تمکنت کا مجسمہ بنی ہوئی ظل اللہ کے قرین دنیا کو محو حیرت بنائے ہوئے ہیں "العظمت للہ۔" دنیا والوں نے حیرت سے بے تاب ہو کر کہا۔ کیا آج ہی قران السعدین ہے ؟ کہیں حسن کے دیوتا نے تو اوتار نہیں لیا ہے ؟

اس جاہ وجلال سے اگر ایک طرف کسی کی فرط ہیبت سے نظریں نیچی ہیں تو دوسری جانب کسی کا وقار و جمال سینوں کو پامال کرتے ہوئے قلوب میں لطیف گدگدی پیدا کرکے نظروں کو اوپر رکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ اغیار کی دُزدیدہ نظریں اوپر اٹھتی ہیں اور حسن شاہی کا جائزہ لیتی ہوئی جلدی سے سراپردہ تک کی خبر لیتی ہوئی واپس آکر فرط عظمت سے جھک جاتی ہیں۔ دیکھئے یہی نہیں بلکہ وہ خواص اپنے پنجۂ حنائی میں طلائی سنے اور سدا بہار پھولوں کا گلدستہ بھی لئے ہے۔ یہ ملکۂ زمانی کی جانب سے وہ غیر معمولی تحفہ ہے۔ جو آج کالیداس کی خدمت میں پیش کیا جائیگا۔ اور یہی شاداب پھولوں کا گلدستہ آج بھری مجلس میں ارباب علم و ادب کے حضور میں سیاحوں اور شعرائے ادبی کو محو حیرت بنا کر کالیداس کو ملک الشعراء کا معزز خطاب دلوائے گا۔ آپ سمجھے بھی آخر حریم سلطانی سے آج پھول کیوں منتخب کئے گئے ہیں اور یہ طلائی سکے سے کیا مفہوم ہو سکتا ہے ؟ لیکن حضرات میرے خیال میں یہ ایک لطیف کنایہ ہے۔ حسن وجمال کے مظاہرہ کا۔ کہ جس طرح آج اس مجمع میں ملکۂ زمانی کے لافانی حسن کا افسانہ "بردوش صبا" اقطاع ہند میں رائج ہے اسی طرح مستقبل قریب و بعید کی آنے والی نسلیں اس سدا بہار پھولوں کی مست کن خوشبو کو سونگھیں گی اور بیخود ہو کر اس قادر الکلام شاعر کی قصیدہ خوانی میں مصروف ہو کر اس بانسری کے دلکش بے تاب کن اور ولولہ انگیز نغمات

سے مسحور ہو کر اپنا سر دھنیں گے

ہاں ہاں دیکھئے۔ میں تو بھٹکا ہی تھا اشہب خامہ بھی یہ ساز و سامان دیکھ کر بہک گیا۔ ہاں وہ ملاحظہ کیجئے ابیسینیا کے حبشی نژاد نہیں بلکہ کول و ڈراوڈ قوم کے سیاہ فام غلام سُرخ بانات کی دلفریب وردیاں پہنے اور ارغوانی پٹکے لٹکائے محترم و مفتخر مہمانوں کو عطر و پان و فواکہات تقسیم کر رہے ہیں دیکھئے وہ سیاہ سیاہ کالی گھٹاؤں میں سفید گیسوؤں والی ماہ جبیں در مُبین لعبت جبین خواتین بیش قیمت مروارید کے ہار پہنے الماسی تاج (تبسم) خوبصورت بالوں پر رکھے بجلی سی کوند کر فضائے حسن میں تہلکہ ڈال کر طبائع میں انقلاب پیدا کر رہی ہیں۔ مہمانوں کے حواس گم ہیں عقلیں بیکار ہیں اور نگاہیں خیرہ ہو گئی ہیں۔ مشیران سلطنت اور علمائے کرام قرینہ سے اپنی اپنی جگہوں پر رونق افروز ہیں۔ یہ کیوں نہ کہا جائے کہ اس وقت انجمن کے مہذب سماج کا روح عطر اور عمرانی حیثیت سے بھی بہترین عنصر ایوان شاہی میں موجود ہے۔ وہ شمالی جانب دیکھئے مدبران سلطنت نیپال کی تازہ شورش کے استیصال پر گفت و شنید کر رہے ہیں دیکھئے وہ جنوبی جانب ایک شاہی رصدگاہ کا منجم سفید ریش ایرانی سے گفتگو کر رہا ہے اور وہ شاہی مدیر سنسکرت لغات کے آخری اجزا چینی سیاح کے حوالہ کر رہا ہے جو محض اسی غرض سے پیکن سے آیا ہے اور مخصوص حیثیت سے اوس کو اس سبھا میں مدعو کیا گیا ہے۔ وہ دیکھئے نازنینان حرم کے حسن کا جائزہ لیا جا رہا ہے کہ دفعتاً سارنگی جل ترنگ۔ ستار۔ بانسری ہم آہنگ ہو کر انسانی قلوب میں مد جزر کی لطیف کیفیات پیدا کرتے ہیں اور خوش گلو ماہران فن اپنے نبیج و ملیح رنگ اپنے متناسب اعضا اور اپنے شباب کی رعنائیوں اور عشوہ آفرینیوں میں ستار ہاتھوں میں لئے زلف جھٹکا کے ساز کے ...... ساتھ ہم نوائی کرتے ہوئے ہر تان کو شراب کی حوضوں میں غوطے دیتے سرشار و مدہوشی کے چشموں سے غسل دیتے شہنشاہ وقت اور علمائے کرام کا خیر مقدمی ترانہ چھیڑتے ہیں سامعین محسوس کر رہے ہیں کہ تار مضراب پر کسی کی انگلیاں مصروف رقص نہیں ہیں بلکہ کائنات کے رشتہ حیات پر ہیں اور بلوری حلق و دہن سے آواز نہیں نکلتی بلکہ تخلیق کے ساز سے غیر فانی رقص ہو رہا ہے!

سوتر دھار (منیجر اسٹیج) ادب سے اشیرباد پیش کرتا ہے۔ اور ایک فی البدیہہ مزاحیہ نظم میں حضار مجلس کی توجہ تمثیل کی جانب منعطف کرتا ہے! حاجب۔ شاہی ایماء پا کر آگے بڑھتے ہیں اور جواہرات کی مرصع زنجیر ملک الشعراء کے قدموں پر نثار کرتے ہیں دوسری جانب سے ملکہ زمانی کی خواص رعنائی و شباب کا مجسم مجسمہ اور حسن و جذبات کا مجموعہ بنی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ اور سدابہار پھولوں کا گلدستہ قادر الکلام درباری کے حضور میں عقیدتانہ پیش کرتی ہے اور طلائی نیز ویکر مجمع کا خدنگ نظر غلط انداز سے ایک جائزہ لیتی ہوئی اور حضار کے خرمن عقل کو جلاتی حدیقہ فہم کو تاراج کرتی اپنی جگہ پر واپس جاتی ہے دیکھئے وہ انگشت شاہی کو حرکت ہوئی کہ دفعتاً اسٹیج کا خوبصورت پردہ دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے تحسین و آفرین کی صداؤں سے ماہ تا بہ ماہی غل مچتا ہے اور تالیوں کی پر زور موسیقی میں ڈرامہ کا افتتاح ہوتا ہے

(باقی)

مشیر احمد علوی (بی۔ اے)

مکتوبات نیاز

عزیز گرامی،

مبارک ہو کہ آپ کی بدولت زندگی میں آج بالکل پہلی مرتبہ جھوٹ بولنے کی "سعادت" مجھے بھی حاصل ہوگئی ۔آپ کا پیام جو حرف بحرف غلط تھا، ان کو حرف بحرف سنا دیا اور یہ کہکر کہ جو کچھ لکھا ہے سب صحیح ہے ـــــ اس سے زیادہ ایثار آپ اور کیا چاہتے ہیں ـــــ

لیکن ایک بات پوچھتا ہوں اگر بُرا نہ مانئے اور وہ یہ کہ اس مکر و فریب پر آخر کب تک زندگی بسر ہوگی۔ ایک نہ ایک دن وہ ساعت آئے گی جب جھوٹ میں بھی آپ کے لئے کوئی لذت باقی نہ رہے گی اور آپ خود اپنے ہاتھوں سے یہ نقاب نوچ کر پھینک دیں گے ـــــ پھر خدا کے لئے بتائیے کہ مجھے آپ کیوں درمیان میں ڈالتے ہیں، میری مٹی کیوں پلید کرتے ہیں ـــــ یونہی میں کونسا بڑا عقلمند ہوں کہ اس تازہ حماقت میں مبتلا ہو کر خواہ مخواہ بدنام ہوں

میرا عقیدہ تو یہی ہے کہ صداقت خواہ کتنی ہی نقصان رساں ہو، بجائے خود ایک لذت ہے۔ لیکن آپ کہتے ہیں کہ نہیں "جھوٹ" بھی ایسا ہی ہے - اچھا، تو ہوگا اس میں جھگڑا کیا ہے۔ لیکن خدا کے لئے آیندہ مجھے اس لذت سے "سرفراز" نہ فرمائیے ـــــ ڈر رہا ہوں کہ اگر کسی وقت اُن پر یہ جھوٹ کھُل گیا۔ اور ایک نہ ایک دن یقیناً کھُل کر رہیگا ـــــ تو میرے متعلق وہ کیا خیال کریں گے ـــــ میں تمھارا دوست سہی، لیکن اپنے ساتھ دشمنی کیوں کروں ـــــ دیر سے یہ خیال دماغ میں چکر کھا رہا ہے۔ اور خدا جانے کتنی بار ارادہ کر چکا ہوں کہ جا کر سارا حال صاف صاف کہدوں، لیکن پھر رُک جاتا ہوں کہ مبادا تمھیں کوئی نقصان پہونچ جائے ـــــ بہر حال اب تو جو ہوگیا سو ہوگیا، لیکن آیندہ کے لئے اس خدمت سے مجھے معاف رکھئے ـــــ اگر آپ کا اور ان کا معاملہ ہمیشہ سے ایسا ہی چلا آیا ہے تو آپ ہی تنہا یہ ثواب حاصل کیجئے اور مجھے جہنم میں جلنے کے لئے تنہا چھوڑ دیجئے۔ بڑا احسان ہوگا

نیاز

ظالم، خدا سمجھے!

جی چاہتا ہے کپڑے پھاڑ کر کسی طرف کو نکل جاؤں اور جتنی گالیاں دُنیا میں وضع ہوئی ہیں وہ سب تم پر صرف

کردوں ـــ غضب خدا کا تم یہاں آؤ، دو دن تک قیام کرو، اور مجھے خبر تک نہ ہو ـــ تمہارے پاؤں میں مہندی لگی تھی تو آدمی بھیجدیا ہوتا، کارڈ لکھدیا ہوتا۔ اور کچھ نہیں تو اپنے میزبان ہی سے کہدیا ہوتا وہ مجھے بلا لیتے ـــ یہ آخر کیا انداز تھا، کس نوع کی سفاکی تھی، بیرحمی کی کونسی قسم تھی، نا آشنائی و بیمروتی کی کونسی ادا تھی ـــ میں بھی تو سنوں! مگر تم کیا کہو گے اور میں کیا سنوں گا ـــ تمہاری فطرت کو نہ جانتا ہوں تو پوچھوں، تم اپنے آپ کو نہ جانتے ہو تو کہو ـــ بہتر ہے، اس سے بھی زیادہ ظلم اگر کوئی اور مد نظر ہے تو اسے بھی آزما دیکھئے ـــ کشتۂ دشمن تو سبھی ہوتے ہیں۔ میں کشتۂ دوست ہی سہی!

نیاز

جی ہاں،

آگرہ سے واپس آگیا اور اس حال میں کہ دل و دماغ دونوں بیکار ہیں ـــ اب آپ کیا پوچھتے ہیں کہ ایک ہفتہ کے قیام میں مجھ پر کیا گزر گئی! لب دریا اسی باغ میں اُن کا قیام ہے جہاں آپ آخری مرتبہ دیکھ گئے تھے۔ محبت کا آزار یقیناً سب کے ساتھ وہی سلوک کرتا ہوگا جو ان کے ساتھ ہو رہا ہے، لیکن میں تو یہ سوچتا ہوں کہ دنیا کیا ان سے زیادہ کوئی اور زندہ رہنے کا اہل تھا۔ جس کو ان کی زندگی چھین کر دی جا رہی ہے ـــ میں نے بڑی بڑی حساس عورتیں دیکھی ہیں، لیکن معاذ اللہ! یہاں تو عالم ہی کچھ اور ہے، زندگی میں بالکل پہلی مرتبہ میں نے دیکھا کہ شمع کا پگھلنا کسے کہتے ہیں۔ باور کیجئے ہر وقت ڈرتا رہتا تھا کہ معلوم نہیں۔ کس وقت یہ منظر میرے قلب کی حرکت کو بند کر دے ـــ یہ تو طے ہے کہ انھیں مرجانا ہے، لیکن اس ظالم کو کیونکر اس کا یقین دلایا جائے جس نے اس حال تک غریب کو پہونچا دیا ہے۔ سامنے آجائیں تو یہ معلوم ہو کہ ان سے زیادہ "غمزدۂ محبت" دنیا میں کوئی پیدا ہی نہیں ہوا اور بیٹھئے تو وہی "بزم آرائیاں" ہیں اور وہی "ناوک اندازیاں"! خیر، اس ذکر کو چھوڑئے، دل پر چوٹ لگتی ہے، یہ بتائیے تبدیل آب و ہوا اور علاج کے لئے اگر انھیں دہلی لایا جائے تو آپ کچھ مدد کر سکتے ہیں یا نہیں؟ وہ مکان تو اب تک ہمارے قبضہ میں ہے جس میں رہا کرتا تھا، لیکن تنہا مکان سے کیا ہوتا ہے؟ علی الخصوص اُس وقت جب کہ مکین نہ صرف بہ لحاظ صحت و توانائی بلکہ بہ لحاظ فطرت و طبیعت بھی حد درجہ نازک و حساس ہو

نیاز

صدیقی العزیز

مکتوب گرامی ملا۔ لیکن شکریہ اس لئے ادا نہیں کرتا کہ اس میں نہ میرے کام کی بات تھی نہ آپ کے ـــ ج

حد تک وہاں کی فضا کا تعلق ہے آپ کی غزل میں کسی ایک حرف کے اضافہ کی بھی ضرورت نہیں، لیکن یوں وہ غزل کیا نظم بھی نہیں ہے نثر بھی نہیں ہے ——— یاد رکھئے جب تک آپ تقلید و اتباع ترک کرکے خود اپنے اندر کوئی کیفیت شعر کہنے کی نہ پیدا کریں، کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے

آپ نے امیر و داغ کی بحث چھیڑ کر اور طبیعت کو مکدر کر دیا۔ جس حد تک مراۃ الغیب کا تعلق ہے، امیر و داغ کے موازنہ کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا ——— کیونکہ دونوں میں شمال و جنوب کی نسبت ہے، لیکن صنمخانۂ عشق لکھ کر خواہ مخواہ انھوں نے ایک عذاب مول لے لیا اپنے۔ لئے بھی کہ اُن کے شایانِ شان نہ تھا اور دوسروں کے لئے بھی کہ ان کو داغ کی سطح پر لاکر گفتگو کرنا پڑتی ہے

امیر شاعر تھے اس میں کلام نہیں لیکن آپ کو معلوم نہیں شاعر دو قسم کے ہوتے ہیں ——— وہبی و اکتسابی نہیں بلکہ میں نے ایک علیٰحدہ تقسیم اور کی ہے ——— مطلق شاعر اور شاعر بالقوۃ ——— یعنی ایک تو وہ جو سوائے شعر کہنے کے اور کسی کام کا نہیں، شعر نہ کہے گا تو کرے گا کیا اور دوسرا وہ جو دوسری تمام انسانی اہلیتوں کے ساتھ شعر گوئی کی بھی اہلیت رکھتا ہے ——— سو ظاہر ہے کہ جہاں تک محض شعر کا تعلق ہے امیر داغ سے کوئی نسبت نہیں۔ داغ صرف شاعر تھا اور کچھ نہیں، امیر سب کچھ تھے اور شاعر بھی ——— داغ کا سرمایۂ ہستی صرف اس کی شاعری تھی اور امیر کے لئے یہ امر باعث فخر و ناز نہ تھا ——— داغ نے تمام عمر اسی ماحول میں بسر کر دی جو گوشت پوست سے متعلق ہونے والی شاعری کے لئے ضروری ہے اور غریب امیر کو نماز پنجگانہ اور تہجد گزاری سے کہاں فرصت تھی کہ وہ اس طرف توجہ کرتے

ہر چند مراۃ الغیب (اُن کے دیوان اوّل) کی شاعری بھی صرف امیر کی سی شاعری ہے جس میں جذبات وغیرہ سے بہت کم سروکار ہے، لیکن خیر ایک مخصوص رنگ اس زمانہ کا ہے، جو اگر اچھا نہیں تو بُرا بھی نہیں ہے، لیکن صنمخانۂ عشق لکھ کر تو انھوں نے کمال ہی کر دیا۔ غضب خدا کا امیر ایسا شخص اور عامیانہ جذبات نگاری میں اس سطح تک اُتر آئے کہ

رخسار نازک ہوں تو ہوں آج ایک مانوں گا نہ میں
دو بوسے لوں گا جانِ من ایک اِس طرف ایک اُس طرف

داغ سے تو ہم اس سے زیادہ یہ بھی سن سکتے ہیں،

مٹی کی بھی لے تو رہا ہے شباب میں۔

لیکن امیر ایسے سنجیدہ و متقی شخص کی طرف سے ہم وہ بھی گوارا نہیں کر سکتے ——— البتہ ایک بات میری سمجھ میں اب تک نہیں آئی کہ وہی امیر جو مراۃ الغیب میں یکسر بے آب و رنگ نظر آتے ہیں اور صنمخانۂ عشق میں

شرمناک حد تک عریاں، جوہر انتخاب اور گوہر انتخاب میں (جو صنمخانہ کے ضمیمے ہیں) کیونکہ دفعتہً لکھنؤ چھوڑ کر دہلی کی فضا میں پہونچ گئے۔ لکھتے ہیں

کچھ آج نہیں رنگ یہ افسردہ دلی کا   مدت سے یہی حال ہے یار و مرے جی کا

کھاتے ہو قسم نہیں ہیں عاشق   صورت تو امیرؔ اپنی دیکھو

تم دکھاتے تو ہو امیرؔ کا دل   اور جو وہ کوئی آہ کر بیٹھے

اک کنارے پڑا ہوا ہے امیرؔ   کچھ تمھارا غریب لیتا ہے

کوئی امیرؔ ترا درد دل سُنے کیونکر   کہ ایک بات کہے اور دو گھڑی روئے

حیران ہوں کہ جس میں ایسے اشعار کہنے کی اہلیت ہو وہ اپنے نام سے مراۃ الغیب اور صنمخانۂ عشق کی نسبت کو گوارا کرے!

بہر حال اگر آپ کو امیرؔ کی تقلید ہی منظور ہے تو اس رنگ کو سامنے رکھئے کہ اصل تغزل یہی ہے

نیاز

اے جان کہو پھر اُس ادا سے
میں آج نظامؔ سے خفا ہوں

نظامؔ رامپوری نے جس عالم میں یہ شعر کہا ہے اس کا حال تو معلوم نہیں تم نے جس انداز سے اپنی برہمی کا اظہار کیا ہے اس پر میں (اپنے جذبات کو دیکھتے ہوئے) زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتا تھا ——

کس قدر احمق ہو، میں نے لاکھوں مرتبہ کہہ دیا کہ تم مجھ سے خفا نہ ہوا کرو کیونکہ تم جتنا غصہ کرتے ہو اتنا ہی مجھے پیار آتا ہے اور تمھیں اور زیادہ ستانے کو جی چاہتا ہے

دیکھو، غصہ سے ایک مقصود تو یہ ہوتا ہے کہ اظہار بیزاری و نفرت کیا جائے اور دوسرا مقصود یہ ہوتا ہے کہ انتقام لیا جائے، سو یہ دونوں حاصل نہیں، کیونکہ تمھاری ہر بیزاری میرے لئے ایک جدید "پیمان وفا" ہے اور انتقام کا تو خیر کوئی سوال ہی نہیں ہو سکتا۔ جبکہ معاملہ "شاہ و گدا" کا ہو ——

کتنے ناسمجھ ہو کہ محبوبیت کے لحاظ سے تو "جانِ عالم" کہلاؤ اور محبت کے اس ادنیٰ رمز کو نہ سمجھ سکو ـــــ اگر واقعی تم یہ چاہتے ہو کہ میرے ساتھ تمہارا تعلق کسی پر ظاہر نہ ہو تو تمھیں سمجھنا چاہئے کہ "عاشقی کا پردہ ہے بیگانگی" - اور منہ چھپانا ہم سے چھوڑ دینا چاہئے

خیر، "شاعری برطرف" اب آپ ذرا اپنی برہمی کی بھی حقیقت سمجھ لیجئے، آپ کی ایک تحریر آتی ہے کہ "میں فلاں وقت اسٹیشن سے گزروں گا" ـــــ میں قصداً آپ سے نہیں ملتا صرف اس لئے کہ ادہر سے گزرنا اور گزر جانا کیا معنی ـــــ آپ شکایت کرتے ہیں۔ میں اس کا جواب دیتا ہوں کہ "جی ہاں نہیں مل سکا، معاف فرمائیے" ـــــ آپ چراغ پا ہو جاتے ہیں اور برہمی ظاہر کرنے کے جتنے الفاظ آپ کو یاد ہیں سب ایک سانس میں سنا جاتے ہیں ـــــ میں ہنس کر ٹال جاتا ہوں لیکن آپ پھر بھی نہیں سمجھنا چاہتے ـــــ اور سمجھئے کیسے۔ معشوق ٹھیرے نا!

ہمت ترے یار دل آزار . . . . .

نیاز

محترم،

نوازشنامہ ٹھیک ایسے وقت ملا جبکہ میں مایوس ہو کر "خودکشی" پر آمادہ ہو چلا تھا ـــــ یقیناً یہ خودکشی ہے کہ آپ ایسے محسن و کرمفرما کی طرف سے کوئی برا خیال دل میں لاؤں ـــــ آپ کے اس التفات کا بیش از بیش شکریہ ـــــ

عزیزی ...... کو بھیج رہا ہوں اور اس توقع کے ساتھ کہ آپ ان کو اپنا چھوٹا بھائی سمجھ کر ہر اس رعایت وسختی سے کام لیں گے جو "فضل میاں" کے لئے روا رکھی جاتی ہے۔ یہ آپ ہی کے ہیں اور ہمیشہ آپ کے رہیں گے میں اگر "بندۂ گریزپا" ہوں تو یہ کیا ضرور ہے کہ مجھ سے متعلق ہونے والا ہر شخص ایسا ہی "ناشکر گزار" ثابت ہو۔ پاؤں میں زنجیر ڈالئے، ہاتھوں میں ہتکڑی اور کشاں کشاں جہاں جی میں آئے لیجائیے، نہ مجھے کوئی عذر ہو سکتا ہے نہ انھیں حالانکہ اس کی ضرورت آپ کو غالباً کبھی نہ ہوگی، کیونکہ ان کی فطرت ہی انقیاد و اطاعت ہے ـــــ رہ گیا اہلیت کا سوال، سو اس کو آپ مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ میں تو صرف اسقدر جانتا ہوں کہ آپ چاہیں تو خذف ریزہ بھی الماس بن سکتا ہے اور وہ الماس جو آپ کے درخور نظر نہ ہو خذف ریزہ سے بدتر ہے

نیاز

یہ تو نے کیا کہا ناصح! نہ جانا کوئے جاناں میں
ہمیں تو اس گلی کی ٹھوکریں کھانا مگر جانا

آئے بڑے وہاں سے چارہ ساز بنکے! کچھ عقل خراب ہو گئی ہے، حواس ٹھکانے نہیں ہیں، یا کچھ پی گئے ہو۔ آخر یہ قصّہ کیا ہے جو بیٹھے بٹھائے آپ کو "ناصح مشفق" بننے کا شوق چرّا اٹھا۔

تمھیں کچھ خبر بھی ہے کہ مجھے اُن سے کیا تعلق ہے؟ تو کیا تم چاہتے ہو کہ ناخن گوشت سے جُدا ہو جائے، جسم سے رُوح علیحدہ ہو جائے، میں مر جاؤں، تباہ و برباد ہو جاؤں —— آخر یہ تم میرے پیچھے کیوں پڑے ہو —— اپنے کام میں لگو، دفتر میں بیٹھ کر مُراسلت نگاری کیا کرو، تمھیں اس دنیا کی کیا خبر جہاں آفتاب و ماہتاب بھی سر جھکا کر گزر جاتے ہیں ——

مجھے معلوم ہے کہ تم اب بھی باز نہ آؤ گے اور اپنے آپ کو میرا بڑا خیر خواہ جتا کر لوگوں سے فریاد کرو گے، لیکن مجھے کیا پرواہ ہے تمھاری اور تمھاری دنیا کی۔ میری دنیا سب سے علیحدہ وہ ہے جسے میرے دل نے بنائی ہے اور جس کا میں خود حاکم و فرماں روا ہوں —— بڑی ہمت ہو تو آجاؤ اور اُسے تاراج کرو! — اور اگر تم اس بات پر جلتے ہو کہ انھوں نے کیوں مجھے درخورِ التفات سمجھا سو یہ ان کی مرضی

وہ جسے چاہتے ہیں اپنا بنا لیتے ہیں

تمھارا اجارہ!

نیاز

صدیقی —— میں تعمیلِ ارشاد کی غرض سے کل شام کو وہاں گیا اور اُن سے دیر تک گفتگو ہوتی رہی — انھوں نے ایک ایک کرکے اپنے تمام عذر میرے سامنے پیش کئے اور ایک ایک کرکے میں نے تمھاری طرف سے رد کر دئے ہر چند ایک ہلکی سی کیفیت جو منافرت کی پیدا ہو گئی ہے وہ دل کو صاف ہونے نہیں دیتی —— مگر یہ ضرور کہوں گا کہ نہ اُن کی معقولیت میں کوئی شک ہو سکتا ہے نہ تمھاری نامعقولیت میں وہ اس لئے کہ باوجود ان تمام شکایتوں کے تمھارا خیال وہ اسی طرح کرتے ہیں اور یہ اس لئے کہ تم نے خود آکر معاملہ کو کیوں نہ صاف کر لیا — بہر حال

قائل تو ہو گئے ہیں وہ تاثیرِ عشق کے
موقعہ نکالنا سو یہ حکمت کی بات ہے

خواہ یہ حکمت تمھاری طرف سے ظاہر ہو یا اُن کی طرف سے ——

نیاز

"انگلستان کے آئین حکومت میں بادشاہ کی حیثیت"

شاہ انگلستان کی حیثیت میں زمانہ کے ساتھ ساتھ جو تغیرات ہوئے ہیں وہ نہایت دلچسپ اور سبق آموز ہیں دنیا کے اکثر حصوں میں طرح طرح کے انقلاب ہوئے، متعدد بادشاہیاں ختم ہوگئیں اور نئے نئے قسم کے آئین دنیا میں جاری ہوئے، لیکن انگلستان کا بادشاہ انگلستان کے آئین حکومت کی طرح تمام طوفانوں کو آسانی سے برداشت کرتا ہوا۔ آج بھی برسر اقتدار ہے اور جو عظمت اس کو اپنے ملک پر حاصل ہے اس کی نظیر اس وقت آسانی سے نہیں ملے گی۔ اس کے اسباب کیا ہیں؟

(۱) فطرتاً انسان ایسی حکومت چاہتا ہے جس کو وہ آسانی سے سمجھ سکے۔ اور چونکہ انسان ابتدا ہی سے شخصی حکومت کا عادی چلا آرہا ہے یہاں تک کہ حکومت اور بادشاہی دو مترادف الفاظ ہوگئے ہیں اسی لئے وہ ملوکیت ہی کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ برخلاف اس کے، مجالس قانون سازی کی ترتیب، مختلف پارٹیوں کا قیام اور انکا مدّوجزر اور جمہوریت کی دیگر پیچیدگیاں عام لوگوں کی سمجھ میں آسانی سے نہیں آسکتیں اس لئے انگلستان میں بادشاہ کا وجود قائم رہا

(۲) شاہی وجود بسا اوقات ایسے غیر معمولی روش کا عادی ہوتا ہے جو پبلک کی ناپسندیدگی کا باعث ہوتا ہے۔ مگر انگلستان نے اپنے آئینی جدوجہد میں شاہی ذمہ داریوں کو اتنا محدود کردیا ہے۔ اور اس میں ایسی بندشیں پیدا کردی ہیں کہ اس کا خوف ہی باقی نہیں رہا

(۳) ایک صدی بلکہ اس سے زاید زمانہ سے شاہی حیثیت اس طرح کی رہی ہے کہ اُس کے وجود کو آئین حکومت سے غائب کردینے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ بلکہ شاہی وجود سے ہمیشہ لوگوں کو ہمدردی رہی ہے۔ یہاں پر ایک معمولی قصہ ولیعہد برطانیہ کا بیان کردینا بے موقع نہ ہوگا۔ " ولیعہد برطانیہ کسی موقع پر ایک افتتاحی جلسہ میں تشریف لے گئے۔ وہاں ایک ضعیف نابینا عورت بھی بڑے اشتیاق سے اُن کا استقبال کرنے کو کھڑی تھی جب شہزادہ اس جانب سے گزرا تو اس ضعیفہ نے ملنے کی تمنا ظاہر کی ولیعہد اس کے پاس آکر کھڑے ہوگئے تب اس ضعیفہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اس نے کانپتی ہوئی آواز میں یہ کہا کہ " میرا اکلوتا نوجوان لڑکا جنگ عظیم میں ہلاک ہوگیا۔ میں اپنا لڑکا تم کو تصور کرتی ہوں " یہ کہکر اس ضعیفہ نے شہزادہ کو بغلگیر کیا۔

یہ واقعہ نہایت پُرمعنی ہے۔ انگلستان میں بادشاہ کی جسقدر عزت کی جاتی ہے۔ اس کا اندازہ مشکل ہے

اب ہم ایک سرسری نظر اس امر پر ڈالنا چاہتے ہیں کہ بادشاہ کی شخصی حکومت کیونکر دستوریت میں منتقل ہوگئی ——

قرونِ وسطیٰ میں اقطاعی نظام جاری تھا یعنی ملک متعدد جاگیرداروں میں منقسم تھا۔ اور جاگیردار اپنی اپنی جاگیر کا انتظام خود کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ہر جاگیردار کے اپنے مسلح سپاہی ملازم ہوتے تھے۔ بادشاہ ان جاگیرداروں میں سب سے بڑا جاگیردار مانا جاتا تھا، اور اُس کی قانون ساز مجلس کا نام مجلس مستشار شاہی "The Norman King's Council" تھا۔ یہ بادشاہ کو صرف قومی معاملات میں مشورہ دیا کرتی تھی، لیکن دورِ حاضر کے شروع میں جبکہ خاندان ٹیوڈر انگلستان کے تخت کا مالک ہوا تو اس زمانہ کے مطابق یہ محسوس کیا گیا کہ ایک مضبوط اور باوقار قوم بننے کے لئے اور باہمی خانہ جنگیوں کے باعث جو نقصان ملک کی تجارت اور صنعت و حرفت و جملہ ترقی کو پہونچتا تھا اوس کو روکنے کے لئے ایک نہایت زبردست شخصیت کے بادشاہ کا ہونا لازم ہے۔ چنانچہ ٹیوڈر خاندان کے دورِ حکومت میں عوام کی خواہش کے مطابق شخصی حکومت قائم ہوگئی۔ پارلیمنٹ، عدالتیں اور تمام محکمے بادشاہ کے ماتحت قرار دئے گئے۔ یہاں پر یہ واضح کر دینا بے موقعہ نہ ہوگا کہ دنیا میں اس وقت ہر ملک اور ہر جگہ بادشاہ کی شخصیت بہت کچھ مذہبی جامہ پہنے ہوئے تھی۔ کہیں لوگ اس کو خدا کا سایہ خیال کرتے تھے کہیں وہ نائب خدا مانا جاتا تھا۔ چنانچہ انگلستان میں بھی بادشاہ قومی شان و شوکت و اقتدار و شکوہ کا مظہر ہونے کے علاوہ بہت کچھ معجز نمائی کا اہل سمجھا جاتا تھا۔ عوام کا عقیدہ تھا کہ اگر بادشاہ خنازیر کے مریض کو چھودے تو یقیناً شفا ہو جائے گی۔ اس بیماری کو "[illegible] King's Evil" بھی کہتے تھے۔ چنانچہ اسی عقیدہ کے تحت میں یہ رسم "Hall [illegible]" کے دعوت کے کمرہ میں کم از کم سال میں ایک مرتبہ ہوتی تھی مریضوں کا ہجوم ہوتا تھا اور بادشاہ ہر مریض کو چھوتا تھا یہ رسم ۱۸۱۵ء یعنی ملکہ این کی وفات تک جاری رہی۔ جب "اصلاح مذہب" انگلستان میں ہوئی تو پوپ سے جو تعلق انگلستان کو تھا وہ منقطع ہوگیا اور بادشاہ کو مذہبی پیشوا قرار دیا گیا۔ مذہبی امور میں بھی بادشاہ کی رائے قطعی مانی جانے لگی۔ لیکن جب رفتہ رفتہ جمہوریت کی لہر انگلستان کی فضا میں پھیلنے لگی تو لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ جب پوپ وغیرہ کے دعوے باطل قرار دئے جا سکتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ بادشاہ کے "پیدائشی حقوق" ملوکیت کی جانچ نہ کی جائے۔ چنانچہ پوری سترہویں صدی اس بگاڑ کی شاہد ہے۔ جو بادشاہ اور عوام یا رائے عامہ کے درمیان تھا یہ امر باعث نزاع تھا کہ طاقت دراصل رائے عامہ میں ہے یا بادشاہ کے پیدائشی حقوق میں اسٹورٹ خاندان کے بادشاہ ہمیشہ پارلیمنٹ سے اسی بات پر لڑتے رہے یہاں تک کہ سول وار (Civil War) ہوئی اور عوام کے دلوں میں بادشاہ کے حقوق اور وقار کے بارے میں بدگمانیاں پیدا ہوگئیں اور پارلیمنٹ کی فتح

ہوئے پر شاہی عہدہ کی اسقدر بے حرمتی ہوئی کہ چارلس اوّل کا (White Hall) کے سامنے سر کاٹا گیا۔ یہ واقعہ بعد کے بادشاہوں کے لئے نہایت سبق آموز ہوا۔ اس کے بعد بھی جیمس دوم نے شخصی حکومت کی کوشش کی اور پارلیمنٹ کے حقوق کو پامال کرنا چاہا مگر اُسکی اُس روش کا انجام یہ ہوا کہ اس کو تخت سے علیحدہ کر دیا گیا اور ولیم سوم اور میری کی مشترکہ تخت پر بٹھا دیا گیا۔ پارلیمنٹ نے مسودۂ وراثت پاس کر دیا اور اپنے تمام حقوق تسلیم کرالئے

اس کے بعد جارج اوّل تخت نشین ہوا۔ وہ انگریزی زبان سے ناواقف تھا۔ اس کے زمانہ میں وزیر اعظم نے قریب قریب تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے اور تمام امور وزیر اعظم کے ہاتھ میں ہونگے جو پارلیمنٹ کی سب سے زیادہ با اقتدار جماعت کا نمائندہ ہوتا تھا۔ اور وہ اپنی کیبنٹ کی امداد سے تمام کام بادشاہ کی طرف سے انجام دینے لگا۔ جارج سوم نے ہر چند کوشش کی کہ شخصی حکومت کا دَور پھر شروع ہو جائے۔ مگر بسبب اپنی علالت کے کامیاب نہ ہو سکا اس کے بعد جارج چہارم نے بھی بہت کچھ ہاتھ مارے مگر کچھ بن نہ پڑا۔ خوش قسمتی سے اس وقت تخت پر ملکہ وکٹوریہ بہت صغر سنی میں بیٹھی۔ اون کے شوہر نے بھی سعی کی مگر اون کی ناگہانی موت سے ملکہ کو بہت صدمہ پہونچا۔ اور اس کے بعد ملکہ نے ملکی اور نظامی معاملات سے کنارہ کشی کر لی۔ متذکرۂ بالا واقعات سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ کس طرح بادشاہ کی شخصی حکومت رفتہ رفتہ جمہوریت کی ارتقا کے ساتھ ساتھ دستوری بادشاہت میں مبدل ہو گئی مگر یہ تصور کر لینا کہ بادشاہ کی ذات انگلستان میں برائے نام اور محض بیکار ہے قطعی غلط ہوگا۔ انگلستان کے آئین میں بادشاہ کی حیثیت عجیب و غریب ہے، گو اب اس کی شخصی حکومت نہیں رہی لیکن اب بھی اس کا بہت اثر ہے اور یہ اثر بادشاہ کی شخصیت سے منتقل ہو کر "تاج" کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔ تاج کسی شخصیت کو نہیں ظاہر کرتا بلکہ وہ ایک آئینی اور منظم عنصر ہے۔

قانونی حیثیت سے تمام نظام "تخت یا تاج" کے ماتحت ہے۔ تمام بحری و بری افواج کا تقرر بادشاہ کرتا ہے۔ تمام صلحنامہ اور معاہدے اوس کے نام سے ہوتے ہیں۔ پارلیمنٹ کے اجلاس کی اجازت دینا۔ وزیر اعظم کا تقرر اور ملکی مالیات کا خرچ وغیرہ سب اوسی کے نام سے ہوتے ہیں۔ اور یہ تمام اختیارات اس عہدہ سے متعلق ہیں جس کو تاج کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے

پروفیسر بیج ہاٹ (Bagehot) لکھتا ہے کہ کمسن ملکہ وکٹوریہ بغیر پارلیمنٹ کی منظوری کے جو کچھ کر سکتی تھی اوس کو سنکر لوگ تعجب کریں گے۔ وہ تمام افواج کو برخواست کر سکتی تھی۔ صلح و جنگ کا اس کو اختیار کامل حاصل تھا۔ اور لڑائی کے جہاز اور جملہ آلات حرب فروخت کر سکتی تھی، جسے چاہے لارڈ کا خطاب دے سکتی تھی تمام یعنی افسران قانونی کو الگ کر سکتی تھی"۔ مگر حقیقتاً وہ خود کچھ نہ کر سکتی تھی۔ اگر کچھ کر سکتی تھی تو اس کی کیفیت ایک مرتبہ اوس کے وقت میں فوج کی اصلاح کا مسودہ پیش ہوا جسکو دار الامرا نے منسوخ کر دیا۔ لیکن شاہی منظوری

لے کر اوس کا نفاذ کر دیا گیا اور اس طرح "King in Council" "یعنی" بادشاہ باجلاس کونسل"
کے پردہ میں پارلیمنٹ کے دارالامراء سے جھگڑا حاصل کر لیا گیا

اب تاج ہی تمام آئینی قوت کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے اور یہ بادشاہی کا کام ہے کہ وہ طاقتور پارٹی کے لیڈر کا انتخاب کر کے وزیر اعظم مقرر کرے۔ ایک انتخاب اور دوسرے انتخاب میں جو وقفہ ہوتا ہے اس میں سب طاقت بادشاہ کے عہدہ سے منسلک ہو جاتی ہے

عام طور سے دستوری بادشاہ کے تین حقوق بڑے زبردست ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے تمام اہم امور میں مشورہ لیا جائے۔ دوسرے یہ کہ وہ جس کی چاہے ہمت افزائی کر سکتا ہے ۔ تیسرے یہ کہ کیبنٹ کو متنبہ کرنے کا حق اس کو ہر وقت حاصل ہے

یہ دیکھا گیا ہے کہ بالعموم بادشاہ کا مشورہ بہت صحیح اور بیش قیمت ہوتا ہے (Robert Peel) لکھتا ہے کہ بادشاہ تقریباً دس سال کی تخت نشینی کے بعد آئین حکومت کے متعلق ملک بھر میں سب سے زیادہ واقفکار ہو جاتا ہے۔ وزیر اعظم تو جب تک پارلیمنٹ کا اعتماد رہتا ہے اپنے عہدہ پر برقرار رہتا ہے مگر بادشاہ عمر بھر تمام آئینی اُمور کا مطالعہ غیر متعصبانہ نقطۂ نگاہ سے کرتا رہتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کا مشورہ مُلک کے بہترین مفاد کے لئے ہوتا ہے

تاج اور بادشاہ کی شخصیت اتنی بڑی سلطنت میں جیسی کہ سلطنت برطانیہ ہے مختلف ممالک میں آپس میں رشتہ اتحاد قائم رکھنے کے لئے بہترین ذریعہ ہے۔ ([illegible]) یا سلطنت کا ہر ملک اس ذریعہ کو آسانی سے سمجھتا ہے اور اُس کی شخصیت سے مناسب تعلق پیدا کرنا مُفید جانتا ہے

اس کے علاوہ تمام اعلیٰ طبقہ کی سوسائٹی میں بادشاہ کے اخلاق کا بہت بڑا اثر ہے جو سیاسیات میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ بادشاہ اور شاہی خاندان کا اخلاقی اثر تمدن کے ہر شعبہ پر پڑتا ہے

اس کے علاوہ امور خارجہ میں بھی بادشاہ کی شخصیت بہت کچھ اثر رکھتی ہے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ ناگوار اور کشیدہ تعلقات جو ممالک کے مابین ہو جاتے ہیں وہ شاہی خطوط، شاہی پیغام۔ اور شاہی ملاقات اور شاہی ورود کے باعث خوشگوار ہو جاتے ہیں۔ تعلقات خارجہ میں کشیدگی اکثر عوام کے جذبات اور خیالات پر مبنی ہوتی ہے۔ اور شاہی ورود کا اثر عوام کے دلوں پر بہت کچھ ہوتا ہے

متذکرہ بالا بحث سے یہ ظاہر ہو گیا ہوگا کہ بادشاہ کی شخصیت اور تاج کا عنصر اب اس سے بالکل مختلف چیز جو زمانۂ قدیم میں سمجھی جاتی تھی۔ قدیم زمانہ کا بادشاہ جمہوریت سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ لیکن سلطنت برطانیہ کا موجودہ بادشاہ اور اس کا تاج ایک نہایت منظم جمہوریت کا اہم عنصر اور خوشنما مظہر ہے۔ یہ اس جمہوریت کا دائرہ تنگ نہ

کرنا ہلکہ اوس پر چار چاند لگا تا ہے۔ لیکن اس کا آیندہ حشر کیا ہوگا۔ اس کی پیشین گوئی کرنا مشکل ہے۔ بہت کچھ اس کا انحصار آنے والے بادشاہوں کی شخصیت پر مبنی ہے ۔ جو روایات ادھر تقریباً پچاس ساٹھ سال سے بادشاہ اور شاہی خاندان نے قائم کئے ہیں اگر وہ آئندہ بادشاہوں نے بھی قائم رکھے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ یہ عنصر انگلستان کے آئین سے خارج ہو جائے۔ لیکن یہ اُمید رکھنا کہ وہ زمانہ بھی کبھی پھر عود کرے گا۔ جب بادشاہ کی پھر وہی عزت ہوسکے جیسا کہ قدیم زمانہ میں بطور دیوتا کے کی جاتی تھی۔ اور جب اس کی شوکت شانِ کبریائی کا مظہر بنی ہوئی تھی البتہ غیر ممکن ہے

جعفری

نگارستان حصۂ دوم

یعنی حضرت نیاز فتحپوری کے ۳۰ بہترین افسانوں کا مجموعہ جو اس سے قبل کبھی کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئے زیر کتابت ہے حجم ۵۰۰ صفحات سے زائد ہوگا۔ اور غالباً ستمبر ۳۳ء تک شائع ہوسکیگا۔ اسکی قیمت علاوہ محصول (عہ ر) سے کم نہوگی لیکن جو حضرات دو روپیہ ذریعۂ منی آرڈر بھیجکر ابھی سے اپنا نام درج رجسٹر کرا لینگے انکو اسی عا ر میں یہ نادر مجموعہ ملجائیگا۔ غالباً یہ ظاہر کرنیکی ضرورت نہیں کہ اسوقت صحیح معنی میں انشاء عالیہ کا لکھنے والا اگر کوئی ہے تو وہ صرف حضرت نیاز ہیں اور اسلئے اس مجموعہ میں ایسے ایسے جواہر ادب آپکو ملیں گے۔ جو کسی دوسری جگہ میسر آہی نہیں سکتے ،

منیجر نگار لکھنؤ

توفیق حیدرآبادی

سید جلال الدین نام توفیق تخلص، سید ابراہیم صاحب تصدیق کے فرزند تھے ۱۲۸۱ھ میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد کی نگرانی میں گھر پہ پائی۔ اور پھر مولانا سید داؤد، مولوی سید عطاء اللہ، مولانا سید نصرت اور مولوی احمد علی صاحب سیال کوٹی سے صرف نحو، طب اور کتب متداولہ کی تکمیل کی مولوی احمد علی صاحب قندھاری اور اپنے والد حضرت تصدیق سے طب پڑھی۔ حضرت جیلانی صاحب پنجہ کش شاگرد مظفر الدین خاں امیر یاور جنگ سے خوش نویسی سیکھی خط شفیعہ اور ثلث لکھتے تھے چونکہ حضرت تصدیق خود شاعر تھے۔ اس لئے حضرت توفیق کو بھی بچپن سے شعر و سخن کے ساتھ لگاؤ پیدا ہوگیا۔ مولانا شمسی مرحوم پروفیسر کلیہ جامعہ عثمانیہ نے حضرت توفیق کے مطبوعہ دیوان " فانوس خیال" کے دیباچہ میں حضرت توفیق کے حالات لکھتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ ۱۲۹۵ھ میں حضرت توفیق نے شعر کہنا شروع کیا اور توفیق تخلص بھی اسی زمانے سے اختیار کیا۔ اوائل مشق سخن میں " باغ عام کے مشاعرہ" میں یہ مطلع سنایا ؎

گل ہیں خاموش یہ سنسان چمن میں کیا ہے
بات کرنے نہیں غنچوں کے دہن میں کیا ہے

اس طرح چودہ سال کے سن سے حضرت توفیق نے شاعری شروع کی اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ایک ایک دیوان مکمل کرلیا اور کل اصناف سخن پر طبع آزمائی کی حیدرآباد کے شعرا میں حضرت توفیق اعلیٰ پایہ کے شاعر مانے جاتے تھے۔ اور معاصرین میں خاصی وقعت تھی، اُردو کا دیوان " فانوس خیال" کے نام سے اور فارسی رباعیات کا ایک مجموعہ " صد پارۂ جگر" کے نام سے طبع ہوچکا ہے۔ اردو دیوان اس قدر مقبول ہوا کہ اب اس کا کوئی نسخہ نہیں ملتا اور مرحوم کے فرزند باوجود تقاضوں کے اس کے چھپوانے کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے

حضرت توفیق کے شاگردوں کی تعداد بہت محدود رہی ہے کیونکہ توفیق ایک خاموش گوشہ نشین اور غیر شہرت پسند شاعر تھے۔ اسی لئے بہت کم لوگوں کو شعر و سخن میں استفادہ کا موقعہ دیا آپ کے شاگردوں میں سے یوسف الدین صاحب تنویر، شہاب الدین صاحب توقیر، امیر الدین صاحب توصیف، سید اللہ بخش صاحب توحید، بی۔اے، رحمت علی صاحب رفیق زیادہ مشہور ہوئے

حضرت توفیق نہایت منکسر مزاج قدیم وضعدار اور صوفی منش بزرگ تھے شاعر کی حیثیت سے انھوں نے اپنے آپ کو پیش نہیں کیا۔ شاعری کو تفنن طبع کے طور پر کام میں لاتے تھے ان کی ذاتی وجاہت وقعت اور خاندانی عزت خود انکے لئے کافی تھی۔ آج کل کے شعراء کی طرح حضرت توفیق نے اپنے آپ کو شاعر کی طرح پیش کرنے کی کوشش کی اور نہ اپنے معاصرین سے چشمک ہی کی حضرت کیفی، حضرت تجلی، حضرت ناظم، حضرت وارث، حضرت ضامن، وغیرہ آپ کے معاصر تھے۔ اور آپ ان سب حضرات سے نہایت ہی خلوص اور محبت کے ساتھ ملتے تھے۔ شاعرانہ تعلی آپ میں مطلق نہ تھی محکمہ صدر محاسبی سرکار عالی میں ملازم تھے انسٹھ سال کی عمر میں انتقال سے چند مہینے پیشتر حسب طریقہ مہدویہ ترک دنیا فرماکر خانہ نشینی اختیار کی اور ۱۶؍ ذالحجہ ۱۳۳۹ھ کو مرض ہیضہ سے انتقال فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

حضرت توفیق کے فرزند سید امیر الدین صاحب اب بھی موجود ہیں اور اپنے والد کی طرح نہایت ذی خلق اور منکسر مزاج ہیں افسوس ہے کہ مرحوم کا دیوان چھپوانے کے وعدے تو کرتے ہیں مگر کوشش نہیں کرتے۔ حضرت توفیق کے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالنے کے لئے کوئی مرحوم کا ہمعصر ہی مناسب تھا۔ مگر افسوس کہ مرحوم کے ساتھیوں میں سے اکثر چل بسے اور جو باقی ہیں وہ چل چلاؤ پر ہیں انھیں اتنی فرصت کہاں کہ کچھ لکھ پڑھ سکیں مجھے حضرت توفیق سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے اور میں نے انھیں مشاعروں میں بھی سنا ہے چونکہ میرے والد حضرت تجلی مرحوم اور حضرت توفیق سے برادرانہ مراسم تھے اس لئے حضرت مرحوم مجھ پر بزرگانہ شفقت فرماتے تھے آئندہ سطور میں جو کچھ لکھا جا رہا ہے یہ میری ذاتی رائے ہے اور میں کسی طرح حضرت توفیق کے کلام پر تبصرہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں حضرت توفیق نے غالب اور مومن کا مطالعہ اس شغف کے ساتھ کیا تھا۔ کہ بعض وقت خود مرحوم کے اشعار انہی دونوں اساتذہ کے رنگ میں ڈوب گئے ہیں مگر اس سے قطع نظر جہاں کہیں اپنے خاص رنگ میں فکر کی ہے نہایت اچھے شعر نکالے ہیں مشق سخن کی وجہ سے آپ خود اپنے رنگ کے مالک بن گئے تھے اور اس رنگ کو آخر تک اچھی طرح برقرار رکھا ہے غالب کی مشہور غزل "رازداں اپنا" والی زمین میں حضرت توفیق کی غزل دیکھئے تو خود اندازہ ہو جائے گا کہ مرحوم کا رنگ کیا تھا ؎

اب وہ دن کہاں اپنے اب وہ دل کہاں اپنا　　کس امید پر سمجھیں تجھکو مہرباں اپنا
پوچھتا نہیں جب تو کوئی ہمکو کیوں پوچھے　　تو ہی جب نہیں اپنا کوئی پھر کہاں اپنا
وہ اگر نہیں سنتے جز زبان خاموشی　　کس طرح کرے کوئی حال دل بیاں اپنا
لٹ گئے چمن میں ہم نازِ خندہ گل سے　　برق نے جلا ڈالا ہائے آشیاں اپنا
تو کمی نہ کر اے غم دل کے خون بنانے میں　　رنگ خود جمالے گی چشم خونفشاں اپنا
رنگ گلشن عالم کیا طلسم نسیاں تھا　　یاد بھی نہیں اب تو ہم کو آشیاں اپنا
اے ہوائے بربادی میٹ دے مزار آخر　　اپنی بے کسی کو بھی کیوں رہے نشاں اپنا

پھر بُری نگاہوں سے دیکھتے ہیں وہ ہمکو | ان کا نازِ بے مہری پھر ہے مہرباں اپنا

کھو چکا ہمیں توفیق اپنا جوشِ ناکامی
کام کر چکی آخر کاوشِ نہاں اپنا

علامہ اقبال نے جب یہ غزل کہی ؎

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں | کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

تو حضرت توفیق نے بھی اسی زمین میں طبع آزمائی کی ؎

کبھی پردہ در ہوں میں راز کا کبھی ہوں میں پردۂ راز میں | کہ حقیقت اک مری مشترک ہے حقیقت اور مجاز میں
یہ کہاں کے جلوے سما گئے یہ کہاں کی حسرتیں چھا گئیں | کہ ہزاروں آئینے لگ گئے ہیں نگاہِ آئینہ ساز میں
کبھی تو بھی طالبِ رحم ہو کبھی تو بھی غیر پہ جان دے | کبھی جلوہ گر ہو خدا کرے ترا ناز میرے نیاز میں
نہ کروں سلام جو کعبہ کو نہ کروں جو سجدہ تو کیا کروں | ہے خیالِ بُت مرے سامنے میں کھڑا ہوا ہوں نماز میں
تری برق جلوہ جلا چکی تھی اٹھا کے پردۂ رخ مگر | مری بے خودی نے چھپا لیا مجھے اپنے پردۂ راز میں
مری شہرتیں مجھے کھینچ لائیں فریب دے کے وگرنہ میں | وہ طلسمِ عالمِ راز ہوں کہ رہا ہوں مدتوں راز میں

وہ طلسمِ گم شدگی ہوں میں کہ فنا ہے اپنی بقا مجھے
مری خامشی ہے نواگری میں نہاں ہوں پردۂ ساز میں

بعض غزلوں میں قدیم اساتذہ سے ہٹ کر مسلسل شعر بھی کہے ہیں ایک جگہ "بادِ صبا" سے کس لطافت کے ساتھ مخاطب ہوتے ہیں ؎

صبا اب کے اگر اس بیوفا تک ہو گزر تیرا | یہ کہنا آ کبھی تو ہے دلِ مشتاق گھر تیرا
یہ کہنا رہ گئی تھیں کچھ امیدیں تجھ سے ملنے کی | خیال آتا رہا برسوں اسی امید پہ تیرا
یہ کہنا شاید آ نکلے کسی دن اس تمنا میں | تکا کرتی ہے رستہ روز چشمِ منتظر تیرا
یہ کہنا نازِ مشتاق تغافل ہائے بیہم سے | کوئی یہ بھی طریقِ ناز ہے بیداد گر تیرا

اُس نے کہا ہستی تری میں نے کہا جلوا ترا | اُس نے کہا پھر نیستی میں نے کہا پردا ترا
اس نے کہا شامِ بلا میں نے کہا گیسو ترے | اس نے کہا صبحِ صفا میں نے کہا چہرا ترا
اس نے کہا دل لے گیا میں نے کہا ہاں لے گیا | اسنے کہا وہ کون تھا میں نے کہا غمزا ترا
اس نے کہا کس سے گلہ میں نے کہا تقدیر سے | اس نے کہا تقدیر کیا میں نے کہا منشا ترا
اس نے کہا تو کون ہے میں نے کہا نقشِ قدم | اسنے کہا منزل تری میں نے کہا کوچا ترا

اس نے کہا شب کون تھا میں نے کہا توفیق تھا — اُس نے کہا وہ کون ہے میں نے کہا شیدا ترا

عرض کی میں نے کہ تیرا دل ہے دیوانہ مرا — ہنس کے فرمایا کہ کس سر میں نہیں سودا مرا
عرض کی میں نے کہ کیا تھی سرگزشتِ کوہِ طور — ہنس کے فرمایا کہ وہ بھی اک کرشمہ تھا مرا
عرض کی میں نے کہ شمعِ بزمِ رعنائی ہیں آپ — ہنس کے فرمایا کہ تو بھی تو ہے پروانہ مرا

بعض شعر نہایت اچھے نکالے ہیں اور بڑی سیر غزلیں کہی ہیں ؎

ہزار ہا پردۂ حیا میں بھی جلوہ گر حسنِ یار ہوگا — چھپے گا جتنا یہ راز بن کر اسی قدر آشکار ہوگا
لئے ہوئے چشمِ شوق میں ہم ہزار ہنگامۂ تماشہ — انھیں امیدوں پہ جی رہے ہیں کبھی تو ظالم دوچار ہوگا
کیا ہو جو مدتوں تبسم ہنسا ہو جو زندگی پہ برسوں — امید کیا مرگ پر بہائے وہ سنگدل اشک بار ہوگا
لہو میں ڈوبیں گے گل سراپا قلم سرِ شاخ ہوگی یکسر — چلیں گے وہ تیغِ ناز بن کر چمن میں خونِ بہار ہوگا
جو مر بھی جائیں گے ہم تو ہم سے ہوائیں بچکر چلا کریں گی — نہ پھول بھڑکیں گے داغ بن کر نہ گل چراغِ مزار ہوگا

روزمرہ نہایت صاف اور اکثر شعر خاص تیور میں کہے گئے ہیں ؎

ہاں سچ ہے کہ بھیجا ہے کبھی تم نے کسی کو — ہاں سچ ہے کہ میرا ہی کہیں گھر نہیں ملتا

میں اپنے اختصارِ مدعا سے خود پریشاں ہوں — نہ چھیڑ افسانہ اے طولِ ہوس زلفِ پریشاں کا

حسرتِ مردہ نویدِ وصل سنکر جی اٹھی — موت کا پیغام اعجازِ مسیحا ہو گیا

کیا اور نہ تھیں راہیں گھر غیر کے جانے کی — کیا میرے ہی گھر پر سے آج انکو گزرنا تھا

اچھا بھی ہوا ظالم مارا تری غفلت نے — ہم یوں بھی تو مر جاتے آخر کبھی مرنا تھا

مانا کہ ہوس کاری میں اگر اے چرخ نہ تھا ہمسا کوئی — بتلا کہ ترے کیا ہاتھ آیا تو نے جو ہمیں بدنام کیا

شکل حباب دونوں ہیں دم بھر کے میہماں ہم کیا ہماری زندگی مستعار کیا

نگاہیں لوٹتی رہتی ہیں ہنگامِ نظر بازی کبھی کاکل سے عارض پر کبھی عارض سے کاکل پر

پس مرگ بھی یہ ہجومِ غم رہا میری حالتِ زار پر کبھی ابرِ اشک بہا گیا کبھی شمع روئی مزار پر

ہوگئے خود اسیر ہم ورنہ فریب ناز سے اس کی بلا کو کیا غرض زلف میں دل پھنسائے کیوں

جس کو ہو پاس جان و دل تم پہ وہ جان کیوں دے جس کو ہو زندگی عزیز تم پہ وہ مر نہ جائے کیوں

درِ دل سے گوشِ قبول تک مرے مدعا کا گذر نہیں وہ دہن ہوں جس میں زباں نہیں وہ زباں ہوں جس میں اثر نہیں۔

توفیق نے مومن اور غالب کا اسقدر انہماک سے مطالعہ کیا تھا کہ دونوں اساتذہ کا رنگ آپ کے کلام میں جھلکنے لگا ذیل میں چند شعر غالب کے ہم رنگ نقل کئے جاتے ہیں ؎

میری بیتابی کی مشکل آپ آساں ہوگئی بڑھ گیا دردِ دل بیتاب تو کم ہوگیا
درد کے خوگر ہوئے جب ہم تو اچھے ہوگئے زخم خود اپنے لئے توفیق مرہم ہوگیا

غالب کا شعر ہے ؎

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

حضرت توفیق کا ایک شعر ہے ؎

کرتا ہے جمع کیوں جگر لخت لخت کو کیا آگیا الٰہی دلِ چارہ گر میں آج؟

غالب کا شعر ہے ؎

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو مدت ہوئی ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

حضرت توفیق فرماتے ہیں ؎

مری بربادیوں میں ہے مرا ضبطِ نفس مضمر
میں خرمن ہوں کسی برقِ تبسم ہائے پنہاں کا

غالب کا شعر ہے ؎

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

حضرت توفیق فرماتے ہیں ؎

وقتِ فریاد تپش ہائے ندامت تھی ہی نالہ نکلا بھی تو دودِ نفسِ سوختہ تھا

عالم کوچۂ گم گشتگیٔ شوق نہ پوچھ ہوش اُڑا کرتے ہیں یاں عالم عنقا ہو کر

ہنگامۂ طلب ہی ہوسِ جوشِ طپیدن ارمانِ سکون اے دلِ بیتاب کہاں تک

نیرنگِ استحالۂ سوزِ دروں نہ پوچھ ٹپکے بجائے خوں مرے داماں سے آگ

ایک دل ہے مرے پہلو میں سو وہ بھی صد چاک لائقِ نذر نہیں قابلِ سوغات نہیں

تیر تھا خنجر نہ آیا ہائے لطفِ جانکنی رہ گئی دل میں تمنا مرگِ دشوار کی

داغِ حسرت جوشِ ناکامی ہجومِ اضطراب ایک بے مہری سے تیرے ہائے کیا کیا ملیں ہیں

ترے ستم کا ہے اک جلوۂ تبسم ناز دگرنہ شوخیٔ شمشیر برق دم کیا ہے

ورقِ گل تھا ہر اک نسخۂ بربادیٔ باغ نالۂ بلبلِ دل سوختہ آموختہ تھا

آرزو دل میں ہی داغِ تمنا دل پہ درخورِ آرزوئے داغِ تمنا نہ بنا

تا بظرف رہی حالت متعارف مُدام عالم تنگیٔ دل وسعتِ ارماں ہی رہا

در و دیوار ہیں دولت کدۂ ویرانی گھر بیاباں میں ہے گھر میں ہے بیاباں میرا

کتنا اچھا شعر کہا ہے ؎

جو یونہی ہو ہم کو مٹنا تو مگر کی قید پھر کیا ترا آستانہ کیوں ہو ترا رہ گذار کیوں ہو

غالب کا شعر ہے ؎

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھیرا تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

ذیل کے شعر مومن کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں اور اس میں وہی تغزل ہے جو مومن کے رنگ کی جان ہے

حیراں ہوں یا الٰہی دونوں میں کسکو توڑوں پیمانہ ہاتھ میں ہے پیمان سامنے ہے

کرلی کچھ ہمنے بھی مشق بیقراری ہائے شوق دل کے صدقے میں ہمیں بھی کچھ تڑپنا آگیا

نہ کرتے ہم سے اگر ذکر وہ تو ہم بھی مرتے نہ اسپہ اتنا خود اپنے ہاتھوں ہوئے ہیں رسوا وہ اپنے منھ کو چھپا چھپا کر

کون سوتے ہوئے فتنے کو جگائے توفیق کون پوچھے کہ رہے رات کو بیدار کہاں

پھر طور رہو تیری نگۂ ہوش رُبا ہو بے ہوش ہوں موسیٰ کی طرح ہم تو مزا ہو

کیوں ہم سے ہوا تھا یہی اقرار محبت چاہیں ہم اگر تم کو تو تم غیر کو چاہو

کیوں ہو وہ نالۂ بیتاب جو منھ سے نکلے ٹپکے جو آنکھ سے وہ خونِ تمنا کیوں ہو

کس کے گھر سے رات پھر گھیں ارمانِ نشاط آتے ہو کس کی بہار آرزو لوٹے ہوئے

سنا ہے آج ادھر سے وہ جانیوالے ہیں کہیں کھڑے ہوئے ہم بھی سلام کرلیں گے

مفت بھی جو ہاتھ آئے پوچھتا نہیں کوئی — آجکل متاعِ دل ہائے کیسی ارزاں ہے

خود مری وضع سنا دے گی انھیں حال مرا — میرا خاموش ہی رہنا مری گویائی ہے

حال کہدیتی ہے خود وضعِ تمنا میری — گویا اندازِ خموشی بھی ہے گویا ہونا

حیرت ہے اسیری پر ان کہنہ اسیروں کی — جنکو نہ تڑپنا بھی اب تک تہِ دام آئے

یوں تو مری پرسش کو احباب تمام آئے — پر کوئی نہیں آیا ایسا کہ جو کام آئے

کبھی لکھا تو ہوتا ایک حرفِ شوق ہی ظالم — کبھی پوچھا تو ہوتا کوئی جیتا ہے کہ مرتا ہے

آج ہی وہ آنے والے ہیں بڑی مدت کے بعد — آج ہی کمبخت دم بھی ہے نکلنے کے لئے

عمر گھٹتی ہے تو بڑھتی ہے ہوس دنیا کی — پیر ہوتا ہے تو انسان جوان ہوتا ہے

غالباً "ناسخ" کا مطلع ہے ؎

مسی مالیدہ لب پر رنگ پاں ہے — تماشہ ہے تہِ آتش دھواں ہے

اسی کو حضرت توفیق نے اپنے رنگ میں ادا کیا ہے ؎

پان کی سرخی میں کیونکر ہو نہاں رنگِ مسی — زیرِ آتش کہیں پوشیدہ دھواں ہوتا ہے

فلسفۂ موت کو مختلف لوگوں نے مختلف طریقوں سے ادا کیا ہے مگر توفیق نے بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے ؎

جسکو ہم موت سمجھتے ہیں یہی تو دراصل — قید پابندئ ارماں سے رہا ہونا ہے

اتنا بڑا دیوان مرتب کرنے کے بعد چند پامال مضامین کا بندھ جانا بھی ضروری ہی تھا۔ چنانچہ حضرت توفیق نے تکمیل غزل کے لئے بعض پامال اور بیش پا افتادہ مضامین بھی باندھے ہیں ؎

مسند کاؤس ہے میری گلیمِ بے کسی — ساغرِ جمشید ہے جامِ گدایانہ مرا

توفیق دَورِ چرخ سے دلریش ہیں وہ آج　　تلوار کل جو رکھتے تھے مردانہ دوش پر

پھرتے ہیں مارے مارے ہزاروں کمار بند　　کوڑی کے مول کوئی انھوں پوچھتا نہیں

دو قدم بھی تو نزاکت سے وہ چل سکتے نہیں　　کس طرح پھر قائل ہنگامۂ محشر ہوں میں

بتائیں کیا کہ مرگ نامرادی کیسی ہوتی ہے　　انھیں سے پوچھئے جو دل میں حسرت لیکے جاتے ہیں

دیکھ ہر بات پر اچھا نہیں اتنا اصرار　　لوگ کیا سمجھیں گے ظالم مرے سمجھانیکو

نعش بھی میری پئے مشقِ ستم　　قبر سے باہر نکالی جائے گی

مانا کہ تیری دید بہت سہل ہے مگر　　موسیٰ کا حوصلہ بھی تو پیدا کرے کوئی

پھیلا نہ کبھی دستِ دعا غیر کے آگے　　جس چیز کی حاجت ہو تجھے مانگ خدا سے

روئے گلگوں کی صفت لکھنے میں ہم　　مشق کرتے ہیں خطِ گلزار کی

ہو کر بلند ہوتا ہے فوارہ سرنگوں　　جھکتا ہے وہ ضرور جو گردن فراز ہے

حضرت توفیق کی زبان صاف اور منجھی ہوئی تھی دلی اور لکھنؤ کے فرق کو محسوس کرتے تھے مگر لوگوں کی طرح شمالی ہند کی تتبع میں اپنی زبان کو بھولے نہ تھے بلکہ حضرت کیفی کی طرح حق الامکان اپنے اشعار میں دکنیت کی جھلک پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ ان اشعار سے اس کا اندازہ ہو سکے گا ؎

کس ادا سے منہ چھپایا ہائے کیا پردہ کیا　　کر لیا دامن کا آڑ آنکھیں چھپا لیں شرم سے

ہجوم آہ و نالہ تھم کے نکلے اس طرح دل سے — کہ جیسے ٹھیر کر منزل سے کوئی کارواں نکلے

کہئے تو کہئے کیونکر کچھ ان سے حال اپنا — وہ پٹ کی آڑ میں ہیں دربان سامنے ہے

نکلنے بھی دے کہیں ہم کو اے گراں جانی — کہ ٹھیرنے سے اجل بدگماں نہ ہو جائے

غالب کی تتبع نے دقت پسندی کے علاوہ حضرت توفیق کو اضافتوں کا شوق بھی پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ اکثر اشعار میں اضافتوں کی بھرمار کی ہے ؎

مانعِ دیدِ رُخِ یار ہوئی تابِ جمال — نورِ خورشید ہی نظارہ کا حائل نکلا

بعض لغزشیں بھی ہوئی ہیں جن کا اظہار غالباً بے جا نہ ہوگا۔ غالباً یہ لغزشیں پُرگوئی اور بے خیالی کی وجہ سے ہوئی ہیں ؎

دل کو امید کہ قابو سے نکل جاؤں گا — ان کو یہ ضد کہ ابھی خاک میں مل جاؤنگا

"مل جاؤں گا" یا تو مل کر جاؤں گا کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے یا ملا کر جاؤں گا کے معنی میں مگر خاک میں مل کر جانا کوئی بات نہیں غالباً خاک میں ملا کر جانا کہنا چاہتے ہوں گے

تم اگر وعدے پہ آتے ہو نہ جانا شادِ مرگ — ایک مرنا تھا مرا آسان کیا تھا کچھ تھا

"شادِ مرگ" شادیٔ مرگ کے معنی میں استعمال ہوا ہے

ہوا یہ فائدہ آخر کو عشق گلرخاں ہو کر — برنگِ گل قبا اُتری ہماری بہیاں ہو کر

"عشق گلرخاں" ہونے سے یا عشق گلرخاں کرنے سے یہ فائدہ ہوا کہنا چاہتے ہوں گے

خیالِ رخ نے آخر رنگ کیا کیا دور کے بدلے — بنا داغِ دلِ عاشق چراغ طور کے بدلے

"دور کے رنگ بدلنا" ذرا کانوں کو بُرا معلوم ہوتا ہے

فنا مشتاق ہے کیوں میرا جوشِ بیخودی ساقی — پلا دی آج کیا تو نے مئے انگور کے بدلے

"مشتاقِ فنا" کی بجائے فنا مشتاق ذرا نامانوس ہے

ہمنے چاہی جب مصور سے شبیہِ زلفِ یار — کھینچدی ظالم نے اک تصویر ساغر مار کی

"ساغر مار" ایک نئی چیز ہے

سوتے نہیں ہیں برسوں ارمان بسملی کے — اے تیغِ ناز قاتل اب تو ہمیں سلا دے

"بسمل کے ارمان" شاید ارمان تپیدن کا اُردو ترجمہ ہے

ذکر ابروئے جاناں کا چلتا تو ہے محفل میں — ڈر ہے کہیں آپس میں تلوار نہ چل جائے

"ذکر چلنا" ذکر ہونا کے معنی میں استعمال ہوا ہے

بسمل ہیں جبھی سے ہم اے تیغ ادا تیرے — چمکی بھی نہ تھی ظالم جب تیغ ادا تیری

مصرع اولیٰ میں تیغ ادا سے مخاطبت ہے کہ جب ہی سے تیرے بسمل ہیں مگر مصرعۂ ثانی میں مطلوب کو ظالم کہکر مخاطب کیا ہے کہ جب تیری تیغ ادا چمکی بھی نہ تھی

ہمارا قتل کیا تزئین کے قابل نہ ہو جاتا — لہو اُڑ اُڑ کے نقش دامن قاتل نہ ہو جاتا

یہاں قابل باعث یا سبب کی جگہ استعمال کیا گیا ہے

داغ نے ایک عجیب وغریب زبان

اس سوچ میں بیٹھا ہوں آخر مجھے کیا کرنا

میں جو غزل کہی ہے اسی زمین میں حضرت توفیق نے بھی غزل کہی ہے۔ چنانچہ مقطع کا قافیہ بھی عجیب عزیب طریقے سے بیٹھا ہے ؎

بے یار جئیں ہم بھی توفیق تو کیا حاصل — کس کام کا دنیا میں ایسا بھی جیا کرنا

رہا کرتا ہوں غرقابِ ندامت خشک بختی سے — میانِ بحر ہوں میں اور مری کشتی ہے ساحل پر

"غرقاب" غرق کی جگہ استعمال ہوا ہے اگر اس مصرع کو یوں بنا دیا جاتا

رہا کرتا ہوں میں غرق ندامت خشک بختی سے

تو مناسب تھا مگر خشک بختی اور بحر وکشتی کے لئے آب لگایا گیا ہے خیر اس حد تک بھی گوارا تھا مگر یہ "خشک بختی" کچھ خشک سالی کی سی ہو گئی ہے

بعض جگہ سہو نظری سے کچھ عجیب شعر نکل گئے ہیں

صفتِ نالۂ زنجیر چھپے رہتے ہیں — چھیڑ لو ہم کو تو ہوتے ہیں ابھی ہم پیدا

"ہوتے ہیں ابھی ہم پیدا" ذرا کھٹکتا ہے

قتل ابرو کے اشارے سے کیا — بیٹھے بیٹھے یار نے تلوار کی

مصرع ثانی —— بیٹھے بیٹھے یار نے تلوار کی

ذرا رکیک ہو گیا ہے

اس طرح بعض اشعار میں فروگذاشت ہوئی ہے مگر اس سے حضرت توفیق جیسے اُستاد کے کمالِ فن کو کوئی صدمہ نہیں پہونچ سکتا۔ ایسی چھوٹی چھوٹی غلطیاں ہر اُستاد کے دیوان میں پائی جاتی ہیں

غزلوں کے علاوہ حضرت توفیق نے مثلث، مسدس، وغیرہ بھی بہت کہے ہیں۔ چنانچہ ایک مثلث نقل کیا جاتا ہے

چُپ جو رہتی ہوں کلیجہ کھنچ کے منہ کو آئے ہے کچھ جو کہتی ہوں تو یہ ڈر ہے کہ وہ سُن پائے ہے
یاد جب آئے ہے اُس کی جان پر بن جائے ہے

کیا لگے جی ہم نشینوں عیش و عشرت کیا سہائے دل جلا فرقت میں ایسا کچھ نہ پوچھو ہائے ہائے
نالہ جو نکلے ہے مُنہ سے وہ دھواں بن جائے ہے

بڑھ گیا جوشِ جنوں وحشت گلے کی ہار ہے اب کہاں چلنا قدم تک بھی اُٹھانا بار ہے
الفتِ گیسوئے جاناں بیڑیاں پہنائے ہے

اے پپیہا بس خدا کے واسطے چپ ہو ذرا رات آدھی آگئی ظالم تجھے کیا ہو گیا
تیرے پی پی کہنے سے وہ بے وفا یاد آئے ہے

جا ری کوئل باوری مست کوک اتنا زور سے ٹیس اٹھتی ہے جگر میں ہائے تیرے شور سے
تو جدا تڑپائے ہے اور وہ جدا تڑپائے ہے

درد و غم بدلے غذا کے ہائے کب تک کھاؤں میں ہجر میں جیتی رہوں کچھ روز یا مر جاؤں میں
کوئی پوچھے اس مسیحا سے کہ کیا فرمائے ہے

ہائے کیا کم بخت کے آئی دلِ ناکام میں پھر چلا پھنسنے کو دل بیٹھے بٹھائے دام میں
آج پھر زلف ستمگر دوش پر لہرائے ہے

لگ گئی ہے اِک جھڑی سی غم کا بادل چھا گیا کوئی بتلادے یہ ساون ماس کیسا آگیا
چشمِ تر فرقت میں کس کی اشک خوں برسائے ہے

کیوں یہ آہِ سرد ہے کس واسطے رُخ زرد ہے اشک کیوں آنکھوں میں ہیں کیوں دل سراپا درد ہے
آج اے توفیق کیوں اس طرح جی گھبرائے ہے

حضرت توفیق نے رباعیات بھی کہی ہیں مگر ان میں کوئی خاص بات نہیں

حیرت کش آئینۂ حیرانی ہوں گیسوئے مسلسل پریشانی ہوں
اسلام کی میرے کچھ نہ پوچھو توفیق بدنام کنندۂ مسلمانی ہوں

رباعیات کی طرح قطعات بھی بہت لکھے ہیں ایک قطعہ ملاحظہ ہو

ایک وہ بھی ہیں کہ ساقی کی بدولت سر پہ سارے میخانے کا میخانہ لئے پھرتے ہیں
ایک ہم بھی ہیں کہ خالی صفتِ دل توفیق مے کی اُمید پہ پیمانہ لئے پھرتے ہیں

اسی طرح مسدس اور مخمس بھی کہے ہیں مشہور اساتذہ کی غزلوں کو خمسہ کیا ہے، مبارکباد بھی بہت کہے ہیں چنانچہ ایک مبارکباد حیدرآباد میں بہت مقبول ہوئی ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

ہوا پھر جلوہ مصروف خود آرائی مبارک ہو
بنا پھر آئینہ چشم تماشائی مبارک ہو

دیوان میں کئی ایک سہرے بھی ہیں اور مرثیے بھی مگر ان میں کوئی خاص بات نہیں۔ قصائد بھی کہے ہیں۔ اور قدیم رنگ قصیدہ گوئی سے ذرا ہٹ کر کہا ہے مگر پھر بھی کوئی بات ان قصائد میں نہیں ہے۔ دیوان کے آخر میں بہت سی ٹھمریاں بھی لکھی ہوئی ہیں ان ٹھمریوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت توفیق موسیقی سے اچھی طرح واقف تھے۔ مگر افسوس ہے کہ ہندی سے واقف نہ تھے جس کی وجہ سے ٹھمریاں کچھ اچھی نہیں کہہ سکے ظاہر ہے کہ ہندی زبان اور ادب سے ناواقف رہ کر چند ہندی الفاظ کو استعمال کرتے ہوئے جو شخص ٹھمری کہے وہ کیسی ٹھمریاں کہہ سکتا ہے

حضرت توفیق غزل کے شاعر تھے۔ اور غزل اچھی کہتے تھے۔ راقم الحروف کا مقصد اس مضمون سے حضرت توفیق کے کلام پر تقریظ کرنا ہے نہ تنقیص اور نہ تنقید بلکہ مرحوم کے کلام سے لوگوں کو روشناس کرنے کے لئے ایک خاتون کی فرمائش کی تکمیل میں یہ مضمون لکھا جا رہا ہے۔ میں مشکور ہوں اپنی بھاوج اہلیہ محمد عبدالحق صاحب مہتمم مکتبۂ ابراہیمیہ کا کہ انھوں نے دیوان توفیق جسے وہ بہت عزیز رکھتی ہیں اس مضمون کی ترتیب کے لئے دیا

تمکین کاظمی

حسن کی شہر آشوبیاں

شام کا وقت ہے، ہلکی ہلکی تاریکی افق سے بڑھ رہی ہے، اور اُن پرندوں کی طرح جن کو بسیرا لینے کے لئے دیر ہو گئی ہو، ماہی گیر اپنی اپنی کشتیوں کے بادبان جلدی جلدی لپیٹ رہے ہیں

ساحل اسکندریہ پر آخری کشتی آہستہ آہستہ پہونچتی ہے، ایک آدمی سیاہ لبادہ میں لپٹا ہوا خاموشی سے اُترتا ہے، اور ایک عورت کو ہاتھ کا سہارا دیتے ہوئے نیچے اُتارتا ہے —— ہم نے اس کو عورت کہا، حالانکہ اپنے چھریرے نازک جسم کو لئے ہوئے جس طرح وہ ہلکے قدموں کے ساتھ اتری تھی۔ اس کے لحاظ سے کمسن لڑکی کہنا زیادہ موزوں ہوگا

سترہ سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے اور وہ کونسی عورت ہے جسے اس عمر میں "لڑکی" سے زیادہ کسی اور لفظ سے منسوب کیا جا سکے، لیکن کلیوپیٹرا جو اس وقت کی نہایت ہی شائستہ و ترقی یافتہ قوم کی فرد تھی اور جو ادب و انشا و فنون لطیفہ میں مہارت تامہ حاصل کر چکی تھی، اپنے دل و دماغ کے لحاظ سے اسی عمر میں "پوری عورت" ہو چکی تھی اور حقیقت یہ ہے۔ کہ تولمی کی لڑکی کو ایسا ہی ہو جانا چاہئے تھا —— وہ تولمی جس نے اندرونی بغاوتوں اور بیرونی حملوں کے وقت بھی بانسری اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑی اور جس نے ملک کی ہر تباہی کا خیر مقدم تازہ جام شراب سے کیا —— ظاہر ہے کہ وہ لڑکی جس کی پرورش ایسے عیش کوش دربار میں ہوئی ہو، جس کا ماحول صرف "شباب و شراب" کی بدمستیاں رہا ہو، وہ سترہ سال کی عمر میں کیا کچھ نہ ہو گئی ہوگی

یہ وہ زمانہ ہے جب کلیوپیٹرا کو اس کے بھائی نے جلا وطن کرکے قصبا ڈمیں نظر بند کر دیا تھا اور سیزر اسکندریہ میں موجود تھا —— یوں تو کلیوپیٹرا ہر وقت اسی ادھیڑ بن میں لگی رہتی تھی۔ کہ کیونکر اپنے بھائی سے انتقام لے کر مصر کے تخت و تاج پر قابض ہو، لیکن سیزر کی آمد سے اس کو اپنی کامیابی کی امیدیں زیادہ قوی ہو گئی تھیں اور اس لئے وہ اپنے ایک خاص شخص اپالوڈورس کی مدد سے خفیہ طور پر ساحل اسکندریہ تک پہونچ ہی گئی تاکہ سیزر کی امداد سے اپنی کھوئی ہوئی حکومت مصر پھر حاصل کر سکے

کلیوپیٹرا، ساحل اسکندریہ تک تو تمام مصائب برداشت کرنے کے بعد پہونچ گئی تھی، لیکن اب بڑا اہم سوال یہ تھا کہ سیزر تک کیونکر پہونچ سکے۔ کیونکہ مصری سپاہیوں اور جاسوسوں سے اس وقت اسکندریہ کی ایک ایک گلی معمور تھی

اور کلیو پیٹرا جانتی تھی کہ اگر ذرا بھی پتہ کسی کو چل گیا تو اس کی گرفتاری یقینی ہے

اپالوڈورس نے جو بہت ذہین تھا۔ آخر کار ایک تدبیر نکالی اور کلیو پیٹرا کے نازک و لچیلے جسم کو قالینوں میں لپیٹ کر اپنے قوی شانوں پر رکھا اور قصرِ سیزر کی طرف روانہ ہوگیا

جب اپالوڈورس، قصر کے دروازہ پر پہونچا تو حاجبوں اور دربانوں نے اس کو روکا لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ یہ شخص قالینوں کا تاجر ہے اور سیزر کے سامنے اپنا مال پیش کرنا چاہتا ہے تو کوئی تعرض نہ کیا گیا اور وہ آزادی کے ساتھ اندر داخل ہوگیا

ہر چند سیزر اب جوان نہ تھا اور زندگی میں ایک انسان کو جتنی مسرتیں اور لذتیں میسر آسکتی ہیں۔ ان سب سے وہ لطف اندوز ہو چکا تھا، لیکن احساس نشاط ہنوز اس میں باقی تھا۔ اور یہی وہ خصوصیت تھی جس پر اعتماد کر کے کلیو پیٹرا اس کے پاس آئی تھی

جس وقت اپالوڈورس نے کلیو پیٹرا کو قالینوں کے اندر سے نکالا تو اس کی حالت ایسی تھی جیسے کسی وحشی ہرن کو آزاد کر دیا جائے اور وہ تھوڑی دیر تک گھبرایا ہوا ادھر ادھر دیکھتا رہے۔ اس نے اپنے چھوٹے سے نقرئی آئینہ میں جو کمر کی طلائی زنجیر میں لٹکا ہوا تھا اپنی صورت دیکھی تو معلوم ہوا کہ نہ آنکھوں میں سرمہ کی تحریر کا کہیں پتہ ہے نہ گالوں میں غازہ کی سرخی کا، لباس بھی حد درجہ بے ترتیب ہے۔ اور بال بھی الجھے ہوئے شانوں پر بکھرے ہوئے ہیں، لیکن تھوڑی دیر بعد اس کا احساس حسن پھر قوی ہوگیا۔ اور وہ اس سادگی حسن و شباب کو لئے ہوئے سیزر سے ملنے کے لئے اور اس کو مغلوب کرنے کے لئے آگے بڑھی

وہ آگے بڑھتی جا رہی تھی اور سیزر اس کے لچیلے جسم کی جنبش کو ناگن کی طرح اس کے چھریرے نازک جسم کے لوچ کو، اور اس کے دلکش سبک رفتار کی نزاکت کو نہایت حریصانہ نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ وہ قریب آئی تو سیزر نے اس کی ابروؤں کے خوبصورت خم کو دیکھا، اس کی مست و مخمور آنکھوں سے نکلنے والے جادو کو دیکھا، اس کے باریک پنکھڑی کی طرح باریک نتھنوں کو دیکھا، ایک دوسرے سے جدا رہنے والے گداز لبوں کو دیکھا، اس کے جسم کے نرم کندن کو دیکھا۔ اور ایک ایسے جذبہ کے ساتھ جو اس وقت تک کبھی اس کے دل میں پیدا نہ ہوا تھا بے اختیار کہہ اٹھا کہ "اے کلیو پیٹرا بول، میں تیرے لئے کیا کر سکتا ہوں"

کلیو پیٹرا نے جو یونانی، شامی، مصری اور لاطینی زبانوں کی ماہر تھی، سیزر کو اس کی ملکی زبان میں جواب دیتے ہوئے بھائی کے مظالم بیان کئے اور یہ التجا پیش کی کہ مصر کا تاج و تخت حاصل کرنے میں اس کی مدد کی جائے ظاہر ہے کہ سیزر جو ہمیشہ سے عورت کے حسن و شباب کا غلام رہا ہے۔ کلیو پیٹرا کی کسی خواہش کو رد نہ کر سکتا تھا اور

وہ فوراً اس کے فرمان کی تعمیل کے لئے آمادہ ہوجاتا، لیکن حالات اسقدر تعجیل کے مقتضی نہ تھے کیونکہ وہ اسکندریہ صرف سیاحانہ طور پر آیا تھا۔ اور اس کے پاس اتنی فوج نہ تھی کہ وہ مصری سپاہ کا مقابلہ کرسکتا

کلیوپیٹرا نے اس کو سمجھا اور کہا کہ " اگر یہ پس وپیش کی افواج کی وجہ سے ہے تو فی الحال میری حکومت کا صرف اعلان کردیا جائے۔ اور جب تمہاری فوج آجائے تو میرے بھائی کو تخت سے اُتار کر میرے سپرد کردیا جائے "

اُس طرف جب ٹولمی دوازدہم کو معلوم ہوا کہ اس کی بہن قید سے نکل کر سیزر کے پاس پہونچ گئی ہے، تو اس نے اچلیس کی قیادت میں ایک زبردست فوج اسکندریہ کی طرف روانہ کی اور رومی سپاہ کے ایک دستہ کو جو وہاں موجود تھا تہ تیغ کرادیا ——— یہ تھی ابتدا اس جنگ کی جو کامل دو سال تک مصری و رومی سپاہ کے درمیان جاری رہی اور جس نے ہزاروں انسانوں کا خون بہانے کے بعد اسکندریہ کے مشہور کتب خانہ کو بھی جلاکر خاک سیاہ کردیا

سیزر تازہ رومی افواج کے انتظار میں قصر بروشیم کے اندر محصور رہے اور کلیوپیٹرا ابھی سرزمین مصر پر لڑائی کی آگ روشن کرکے سیزر کے ساتھ ہی قصر کے اندر مقیم ہے

بروشیم، اسکندریہ کا وہ مشہور محل تھا جس کی بنیاد سکندر اعظم نے ڈالی تھی اور جس میں اس کے جانشینوں نے برابر اضافہ کرکر کے اس کو ایک نہایت ہی مستحکم قلعہ، اور نہایت ہی جمیل قصر کی صورت دیدی تھی، اس کے بڑے بڑے مرمری ایوان جو یونانی و مصری فن تعمیر کی نازک ترین صناعیوں کا نمونہ تھے ....

..... اس کے زریں درودیوار، مطلا بام وسقف، صیقل شدہ آئینہ کے حوض، بلور کے ترشے ہوئے فوارے، وسیع قطعات چمن، یوں تو سیزر کے لئے ہمیشہ جاذب نظر تھے، لیکن یہ حقیقت کلیوپیٹرا کے آنے کے بعد ہی اُس پر کھلی کہ ان تمام چیزوں میں کبھی کبھی جان بھی پڑجایا کرتی ہے اور جس وقت ان مناظر میں یوں جان پڑجاتی ہے تو پھر ایک انسان کے لئے تمام کائنات کو بھلا دینا کسقدر آسان ہوا کرتا ہے

واقعی سیزر اس وقت تمام دنیا کو حرف غلط سمجھ رہا تھا اور کلیوپیٹرا کی معیت میں جو اُسے مجسم " عطریت " نظر آتی تھی، ایک ایسی زندگی بسر کررہا تھا۔ جو اس سے قبل اس نے کبھی بسر نہیں کی تھی اور جسے وہ قدرت کا انتہائی انعام سمجھتا تھا

کامل چھ مہینے سیزر کو اس " خلوتکدۂ فردوس " میں زندگی بسر کرتے گزر گئے ہیں اور اسے مطلق ہوش نہیں کہ قصر بروشیم کے باہر کیا ہنگامہ برپا ہے اور مصری افواج نے اس کے سپاہیوں کو کسقدر پریشان کردیا ہے

ایک دن صبح کو تختۂ گلاب میں بیٹھا ہوا وہ کلیوپیٹرا کے بالوں کی عطریت کا لطف اٹھا رہا تھا۔ کہ اس کو افواج روم کی آمد کی اطلاع ملی اور اس کا عسکری احساس دفعۃً بیدار ہوگیا۔ وہ اٹھ بیٹھا اور بولا کہ " اے کلیوپیٹرا، اب وقت آگیا ہے کہ میں تیرے احسانات کے اعتراف میں مصر کا تاج و تخت تیرے قدموں پر لاکر ڈال دوں، اس لئے

مجھے اجازت دے کہ چند دن کے لئے تجھ سے جدا ہو کر پھر انھیں تلواروں کے سایہ میں پناہ لوں۔ جو سیزر کو ملکۂ مصر کے التفات کا زیادہ اہل بنا سکتی ہیں"

جس وقت روم کے سوار، گال کی پیادہ فوج، سلیشیا اور رموڈس کے جہاز سامان رسد سے لدے ہوئے، ساحل اسکندریہ پر پہونچے، تو سیزر بھی جو ۶ ماہ سے قلعہ بند تھا، باہر نکل آیا اور جنگ میں مصروف ہو گیا اس میں شک نہیں کہ مصری فوج جو اچیلس کی سیادت میں برسرپیکار تھی، بہت قوی تھی، لیکن روم کی منظم سپاہ اور سیزر کی کوہ شکن جرأت کا کیا مقابلہ کر سکتی تھی، آخرکار اسے شکست ہوئی، کلیوپیٹرا کا بھائی مارا گیا اور سیزر نے اسکندریہ کی کنجیاں کلیوپیٹرا کے قدموں پر ڈال کر اس کو ایک بار ملکۂ مصر تسلیم کرا ہی دیا

یقیناً یہ وقت کلیوپیٹرا کی انتہائی مسرت کا وقت تھا اور اس کو وہ چیز حاصل ہو گئی تھی جس کے لئے وہ تڑپ رہی تھی، مگر وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر نہ تھی کہ جس قوت سے یہ سلطنت حاصل کی گئی ہے اسی قوت سے قائم بھی رکھی جا سکتی ہے اور اس لئے وہ چاہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح سیزر کو ہمیشہ کے لئے اپنا بنا لے

اُدھر چونکہ سیزر کی واپسی کے لئے روم نہ صرف یہ کہ بیتاب تھا، بلکہ اس کی طویل غیر حاضری سے برہم بھی ہو چلا تھا، اس لئے اس کو جلد سے جلد لوٹ جانا چاہیے تھا۔ کلیوپیٹرا نے بہت کوشش کی اور اپنے حسن و جمال کا ہر نا آزمودہ سحر اس نے آزما دیکھا لیکن چونکہ اس وقت سیزر میں جذبۂ وطنیت پھر ایکبار عود کر آیا تھا۔ اس لئے وہ کامیاب نہ ہوئی اور سیزر واپسی کی طیاریاں کرنے لگا

جب سیزر روانہ ہوا تو کلیوپیٹرا بھی اس کو جزیرۂ اسیس تک پہونچانے کے لئے ساتھ ہو گئی اور کافی حصہ وقت کا لطف و نشاط میں بسر کرنے کے بعد جب جدائی کا وقت قریب آیا تو اس نے باچشم پُرنم سیزر سے کہا کہ "کم از کم اتنا انتظار تو اور کرو کہ تمھاری امانت جو میں اپنے شکم کے اندر لئے ہوئے ہوں، وہ تمھاری آغوش میں سونپ سکوں"

یہ ایک ایسی خبر تھی جس نے سیزر کو پھر اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ کیونکہ اس کی تین بیویوں میں سے کسی کے اولاد نہ تھی۔ اور وہ اس کا متمنی تھا کہ دنیا میں اپنے بعد کوئی وارث دولت و حکومت کا چھوڑ جائے۔ چنانچہ وہ ٹھیر گیا۔ اس کے تیرہ دن بعد جب سرداران روم، سیزر سے اس کی واپسی کے لئے الحاح و زاری کرتے کرتے تھک گئے تھے۔ اور مایوس ہو کر واپس جانے لگے۔ تو دفعۃً یہ خبر معلوم ہوئی کہ ولادت ہو گئی ہے اور ولادت بھی لڑکے کی۔ سیزر خوشی سے اُچھل پڑا۔ اور کلیوپیٹرا کو ایک موقعہ اور مل گیا کہ وہ اس سے نکاح کر لینے پر اصرار کرے سیزر خود بھی یہی چاہتا تھا کہ ہمیشہ کے لئے کلیوپیٹرا کو اپنے لئے مخصوص کر لے، لیکن وہ مجبور تھا۔ کیونکہ اس کے بیوی موجود تھی اور علاوہ اس کے قانون روم کی رُو سے وہ کسی اجنبی عورت کو اپنے نکاح میں نہ لا سکتا تھا۔ کلیہ

اس سے کہا کرتی کہ وہ قانون سیزر کے لئے نہیں ہے جو خود قانون بناتے اور توڑنے کے لئے پیدا ہوا ہو لیکن سیزر اس کو ٹال جاتا۔ اس بار بھی اس نے اس مسئلہ کو نظر انداز کرنا چاہا، لیکن اس میں کامیاب نہ ہوا۔ اور دبی زبان سے وعدہ کرکے اپنے ملک کی طرف روانہ ہوگیا

چونکہ سیزر کی غیر حاضری سے دشمنوں کے حوصلے بڑھ گئے تھے۔ اسلئے سلطنت رومہ اس وقت سخت خطرہ میں مبتلا تھی۔ اور پمپائی کی فوجیں برابر بڑھتی آرہی تھیں۔ کلیوپیٹرا کی آغوش سے جدا ہوتے ہی سیزر کے فاتحانہ عزائم پھر عود کر آئے اور بجائے اپنے وطن واپس جانے کے وہ سیدھا ایشیائے کوچک کی طرف روانہ ہوا اور وہاں دشمن کے بیڑہ کو تباہ کرکے اس نے کیسیس پر حملہ کیا، فرناسس کو شکست دی اور افریقہ پہونچ کر تھاپسس کی مہم سر کی اور اس طرح بے شمار دولت، بے اندازہ مال غنیمت لے کر وہ روم واپس آیا، جہاں اس کی پزیرائی ایسے تزک و احتشام سے کی گئی کہ سرزمین رومہ نے اس سے قبل کبھی نہیں دیکھا تھا —— سیزر نے جشن عام کے لئے خزانہ کو ملک عام کردیا اور کامل ۴۰ دن تک جوش مسرت کی یہ کیفیت برپا رہی کہ لوگوں کو تن بدن کا ہوش باقی نہ رہا۔ جب جشن سے فراغت ہوئی تو دربار منعقد کیا گیا۔ جہاں بانئ اعظم کا خطاب دے کر اُس کی کرسی سب سے بلند مقام پر رکھی گئی اور معبد جیوپیٹر میں اس کا مجسمہ قائم کرکے اس پر دیوتا کا لفظ کندہ کیا گیا

اسکندریہ کی حالت البتہ قابل اطمینان نہ تھی اور باوجودیکہ سیزر وہاں فوج چھوڑ آیا تھا، کبھی کبھی بغاوت کے آثار پیدا ہوجاتے تھے۔ اور لوگوں کی بے چینیاں بڑھ رہی تھیں —— کلیوپیٹرا پر پبلک کی طرف سے یہ الزام قائم کیا جاتا تھا کہ وہ ایک اجنبی شخص کو مصر پر مسلط کرنا چاہتی ہے، جو اُن کے ملکی، مذہبی اور قومی روایات کے بالکل خلاف تھا، اور چونکہ کلیوپیٹرا کا تسلط اچھی طرح قائم نہ ہوا تھا اس لئے وہ سازش کرنے والوں کو پکڑ کر قید و بند میں بھی نہ ڈال سکتی تھی، اتفاق سے اسی زمانہ میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ سیزر نے مہم افریقہ کے دوران میں ملکۂ یونونیا سے تعلق پیدا کرلیا —— اس خبر نے ایک طرف تو اہل مصر کو اور زیادہ جری بنادیا کیونکہ اس سے اُن کو یقین ہوچلا کہ اب سیزر، کلیوپیٹرا کی حمایت نہ کرے گا۔ اور دوسری طرف خود کلیوپیٹرا کو بہت اضطراب پیدا ہوگیا کہ کہیں سیزر ہاتھ سے نہ نکل جائے

اس دوران میں سیزر اور کلیوپیٹرا کے درمیان باہم مراسلت قائم رہی اور ہمیشہ سیزر اس کو اپنی محبت و وفاداری کا یقین دلاتا رہا، لیکن کلیوپیٹرا اس کو محسوس کرتی تھی کہ اگر یہ مفارقت چند دن اور اسی طرح قائم رہی تو اس کا اثر سیزر پر بالکل مٹ جائے گا۔ اور پھر مصر کی حکومت کرنا محال ہوجائے گا —— اس نے کئی بار سیزر کو لکھا کہ وہ روم آنا چاہتی ہے لیکن سیزر اس خیال سے کہ اہل رومہ اس کو کبھی پسند نہ کریں گے، ہمیشہ ٹالتا رہا۔ آخر کار جب کلیوپیٹرا بالکل مجبور ہوگئی تو اس کے ذہین دماغ نے ایک تدبیر نکال ہی لی اور اس نے سیزر کو لکھا کہ جو دوستانہ معاہدۂ اتحاد

رومہ اور مصر کے درمیان ہوا ہے اور جس کے بعض شرائط موضِ بحث میں ہیں ان کو طے کرنے کے لئے وہ خود آنے والی ہے، حقیقتاً یہ ایک ایسا بہانہ تھا جس کے خلاف نہ سیزر کچھ کہہ سکتا تھا نہ اہل رومہ کو اعتراض کی گنجائش تھی، اس لئے سیزر نے اجازت دیدی اور کلیوپیٹرا روانہ ہوگئی

جون کا مہینہ ہے اور رومہ کا موسم بہار پورے شباب پر —— دربار کی عظیم الشان عمارت کھچا کھچ آدمیوں سے بھری ہوئی ہے اور سڑکوں پر ہر جگہ لوگوں کا ہجوم تبادلۂ خیال میں مصروف نظر آتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ کلیوپیٹرا، دربار کی رقاصہ ہے، جو ہر وقت طلائی زیور اور موتیوں سے آراستہ رہتی ہے، بعض نہایت سنجیدگی سے یہ خیال قائم کئے ہوئے ہیں کہ وہ کوئی ساحرہ ہے، کاہنہ ہے، جو ہر شخص کو مسحور و مرعوب کر لیتی ہے، بعض کہتے ہیں کہ اس کی آغوش میں ہر وقت ایک ناگن کھیلتی رہتی ہے اور جس کو چاہتی ہے ڈسوا لیتی ہے، بعض کا خیال ہے کہ اس کا حسن بہت غیر معمولی ہے۔ اور بعض اس کو قبیح ترین شکل وصورت والی عورت سمجھتے ہیں۔ الغرض اہل رومہ کلیوپیٹرا کے دیکھنے کے لئے بیتاب ہیں۔ اور چاروں طرف ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے ہیں

جلوس میں سب سے پہلے حبشی غلاموں کا ایک دستہ نظر آتا ہے۔ جن کے کانوں میں سونے کی بڑی بڑی بالیاں جھول رہی ہیں، اس کے بعد خواجہ سراؤں کی ایک جماعت سامنے سے گزرتی ہے جو لمبی عبائیں پہنے ہوئے ہیں، پھر امراء و وزراء کی قطار نظر آتی ہے ان کے پیچھے کاہنوں اور نجومیوں کی جماعت گزرتی ہے، جنکی لمبی لمبی مخروطی شکل کی ٹوپیوں کو دیکھ کر اہل رومہ حیرت کر رہے ہیں۔ اور پھر شکاریوں کا گروہ سامنے آتا ہے جو شیر کی کھال اپنے جسم پر لپیٹے ہوئے ہیں

جب یہ سب یکے بعد دیگرے گزر جاتے ہیں تو چمکیلے نیزوں اور سیاہ ڈھالوں کی جھرمٹ میں ملکۂ مصر کی زریں پالکی نظر آتی ہے، چاروں طرف سناٹا چھا جاتا ہے اور ہر شخص کلیوپیٹرا کو دیکھنے لگتا ہے جو اپنی آغوش میں چھوٹے سیزر کو لئے ہوئے مسکرا رہی ہے —— اس کے سر پر ایک طلائی تاج تھا جس کے پشت سے ایک طلائی ناگن جھانک رہی تھی، آنکھوں میں سرمہ کی تحریر اس کی آنکھوں کے سحر آگینی کو اور زیادہ نمایاں کر رہی تھی، غازہ کی سرخی سے اس کے چہرہ کی ملاحت پر ایک خاص صندلی رنگ پیدا ہو رہا تھا اور لباس اتنا باریک تھا کہ اس کے سینہ وشانہ کا شباب نگاہوں میں کھپا جا رہا تھا

الغرض اس شان و اہتمام کے ساتھ کلیوپیٹرا، رومہ کی سڑکوں سے گزرتی ہوئی اس قصر تک پہونچی جو سیزر نے دریائے ٹیبر کے ساحل پر حال ہی میں تعمیر کرایا تھا

کلیوپیٹرا کو روم آئے ہوئے ایک ماہ سے زیادہ زمانہ گزر گیا ہے اور جشن و مسرت کی جتنی صورتیں ممکن ہیں سب اختیار کی جارہی ہیں، پُرتکلف دعوتیں ہیں اور رقص و سرود کے جلسے، مردانہ کھیلوں کی نمائشیں ہیں اور علمی مجالس کے مظاہرے۔ لیکن باوجود اس کے کہ کلیوپیٹرا یہاں کے ذہین و علمی طبقہ کو اپنی ذہانت و قابلیت سے مسخر کر چکی ہے، باوجود اس کے کہ سیزر کے شاہانہ اقتدار و جبروت کی حمایت حاصل ہے، وہ اس کو اچھی طرح محسوس کرتی ہے کہ ایک جماعت ایسی بھی موجود ہے جو نہ صرف اُسے بلکہ سیزر کو بھی قہر و غضب کی نگاہوں سے دیکھ رہی ہے اور معلوم نہیں کس وقت یہ آگ بھڑک کر چاروں طرف مشتعل ہو جائے

جشن لیوپرکیلیا پورے انہماک کے ساتھ منایا جا رہا ہے سیزر، صدر کی حیثیت سے بیٹھا ہوا ہے اور کلیوپیٹرا اس کے پہلو میں طلائی کرسی پر متمکن ہے

جس وقت قربانیاں ختم ہو جاتی ہیں اور میدان خون سے کافی رنگین نظر آنے لگتا ہے تو مارک انطانی جو سیزر کا سب سے زیادہ معتمد علیہ افسر ہے۔ زریں تاج لئے ہوئے اٹھتا ہے اور سیزر کے سر پر رکھدینا چاہتا ہے۔ سیزر انکار کرتا ہے لیکن کلیوپیٹرا —— جو اصل محرک اسی تجویز کی تھی، پھر اصرار کرتی ہے اور جب انطانی دوبارہ تاج لیکر بڑھتا ہے تو سیزر پھر انکار کرتا ہے۔ کیونکہ سیزر جانتا تھا ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے اور مخالفین اس سے فائدہ اٹھا کر عام برہمی پیدا کردیں گے —— بعض لوگوں نے سیزر کے اس طرز عمل کو دیکھ کر اظہار مسرت کیا اور بعض جو اس کے مخالف تھے انھوں نے سرگوشیاں شروع کردیں کہ یہ سب مکر و فریب ہے۔ اور آج نہیں تو کل ضرور یہ اپنی ملوکیت کا اعلان کردے گا

صبح کا وقت ہے اور سیزر دارالامراء جانے کی طیاریاں کر رہا ہے، کلیوپیٹرا کہتی ہے کہ آج اسقدر جلد جانیکی کیا ضرورت ہے۔ لیکن وہ نہیں مانتا اور کام کی اہمیت کا ذکر کرکے کیسیس کے ساتھ ہو لیتا ہے جسے بروٹس نے بلانے کے لئے بھیجا تھا۔ وہ جانتا تھا۔ کہ بروٹس اس کے دشمنوں میں سے ہے، وہ واقف تھا کہ مخالف جماعت کی سازشیں بڑھتی جارہی ہیں لیکن اس نے اپنے اقبال و خوش بختی پر اعتماد کرکے کسی بات کی پرواہ نہیں کی اور دارالامراء کی طرف روانہ ہو گیا، لیکن اس کا اندر داخل ہونا تھا کہ دفعۃً ایک شور پیدا ہوا۔ اور پھر آناً فاناً شہر کے ایک ایک گوشہ میں یہ دہشت ناک خبر پھیل گئی کہ سیزر مار ڈالا گیا

دنیا انسانی دسترس سے دُور

یقیناً دورِ حاضر کی یہ نمایاں خصوصیت کبھی فراموش نہیں ہو سکتی کہ وہ دنیا کے غیر معروف و مجہول مقامات کے دریافت کرنے میں پوری جدوجہد سے کام لے رہا ہے

پھر یہ کشف و اکتشاف کا شوق کسی خاص مُلک اور خاص قوم کے مخصوص افراد پر منحصر نہیں بلکہ تمام ممالک اور جمیع اقوام و ملل اس سے متاثر ہیں۔ اور یہ اشتیاق بوڑھوں نوجوانوں مردوں اور عورتوں سب میں یکساں طور پر پایا جاتا ہے

جب ہم کرۂ ارض کے نقشہ پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ابتک بکثرت ایسے مقامات موجود ہیں۔ جہاں انسانی قدم نہیں پہونچ سکا اور وہ اپنے مکتشفین کے منتظر ہیں۔ ہر چند انسان قطب شمالی و قطب جنوبی تک پہونچ گیا اور اس نے دنیا کے چھ براعظموں میں سے بہت سے مجاہل کا اکتشاف کر لیا۔ چین، ہندوستان، تبت، سائبریا، جنوبی امریکہ، آسٹریلیا، نیوگنی، وغیرہ کے بہت سے غیر معروف مقامات کو اس نے دریافت کر لیا لیکن ہنوز بہت سے مقامات روئے زمین پر ایسے پائے جاتے ہیں جنکا علم انسان کو ابتک نہیں ہو سکا

چین میں کوہ این شان کے جوار اور تبت کے شمالی حدود میں بہت سے مجہول اور غیر معروف مقامات پائے جاتے ہیں۔ اور دنیا نہ تو وہاں کے حیوانات کے متعلق کچھ جانتی ہے نہ اس کو وہاں کے نباتات کا کچھ علم ہے۔ اگرچہ بہت سے سیاحوں نے وہاں تک پہونچنے کا ارادہ کیا مگر کامیاب نہ ہو سکے

بحر اوخوٹسک سے ملا ہوا حصۂ زمین اور ہمالیہ پہاڑ کی ایورسٹ چوٹی کا حال ابھی تک کسی کو معلوم نہیں ہوا۔ اسی طرح نیوگنی کے پہاڑی سلسلے جن کی بلندی ۱۸ ہزار فیٹ تک ہے اور جن کی چوٹیاں ہمیشہ برف سے ڈھکی رہتی ہیں، ان کا حال بھی دنیا سے پوشیدہ ہے۔ اور یہی حال بحر مرجان ایک غیر معروف آبی حصہ کا ہے جس کو ابھی تک کسی متمدن ملک کی کشتی نے عبور نہیں کیا

جزیرۂ بورنیو کے اندرونی حصے اور جزائر سلیبز و ملکولا بھی ابھی تک مجہول ہیں۔ لیبراڈور کے مجاہل، گرین لینڈ کے بعض اطراف، دریائے امیزن و اورنوک کے چشمے، الاسکا کے شمالی حصے اور قطب جنوبی کے مناطق یہ سب کے سب پردۂ خفا میں ہیں

تاریخ کا ایک صفحہ

کشف مجاہل کا خیال انسانی دماغ میں قدیم زمانے سے پایا جاتا ہے اس لئے جغرافی

الکتشافات کا بڑا حصہ تیرھویں اور اُنیسویں صدی کے درمیان ہی طے ہوگیا۔ اور امریکہ افریقہ، ہندوستان، اور چین کے بہت سے مجاہل کا حال معلوم ہوگیا۔ امریکہ اور اس کے مجاہل دریافت کرنے میں اونیسویں صدی سے قبل ارکسن، کولمبس، امریکو، کارٹیز، بیز یرو، وغیرہم نے شہرت پائی۔ ۱۲۴۵ء میں جمس کک نامی سیاح اور اس کے بعد دنیا کے مشہور سیاحین کا ایک گروہ جس میں خاص سیاح میگلن، واسکوڈیگاما، مارکو پولو، منگو پارک ہیں، مشہور ہوئے۔ یہ تمام سیاحین باوجود اتنی شہرت کے سیاحین روم و یونان اور عرب سے (جو ان سے کئی سو سال قبل مشہور ہوئے) زیادہ نہ تھے جنھوں نے اُس تیرہ و تار زمانہ میں بہت سے شہروں اور ملکوں کو معلوم کر لیا تھا

جغرافیائی انجمنیں یورپ اور امریکہ میں جغرافی سوسائٹیاں قائم ہونے سے بیشتر بڑے بڑے الکتشافات ظہور پذیر ہو چکے تھے۔ مگر یہ الکتشافات متحدہ اور اجتماعی مساعی کے نتائج نہ تھے۔ بلکہ انفرادی کوششوں کا ثمرہ تھے۔ لیکن انجمنوں کے قیام کے وقت سے لوگ الکتشافات مجاہل میں متحدہ طور پر بھی مشغول ہوئے۔ اس قسم کی سب سے پہلی انجمن پیرس کی جغرافی انجمن (Société de Géographie de Paris) ہے جو ۱۸۰۰ء میں قائم ہوئی، اس کے بعد ۱۸۲۸ء میں برلین کی جغرافی انجمن قائم ہوئی۔ پھر ۱۸۳۰ء میں لندن میں ایک انجمن رائل جغرافی سوسائٹی کے نام سے قائم ہوئی جو تمام یورپ میں اس قسم کی مشہور انجمن ہے۔ ۱۸۴۵ء میں روس نے بھی اسی طرح کی ایک انجمن بنالی۔ امریکہ نے بھی ان ممالک کی اتباع کرتے ہوئے ۱۸۵۲ء میں امریکن جغرافی سوسائٹی کی بنیاد ڈالی اور ۱۸۸۸ء میں ایک دوسری انجمن ملکی جغرافی سوسائٹی کے نام سے قائم کرلی۔ یہ انجمن تمام دنیا میں دیگر جغرافی انجمنوں سے زیادہ مشہور ہے

اٹلی میں بھی ایک جغرافی سوسائٹی ہے جو فلورنس میں امریکن ملکی جغرافی سوسائٹی کے قیام سے چار سال قبل یعنی ۱۸۸۴ء میں قائم ہوئی

ان انجمنوں نے جو گراں بہا علمی خدمات انجام دیں ان سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے سیاحین کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی اور ان کو جتنے روپیہ اور سامان کی ضرورت پیش آئی اس کو فراہم کرنے میں ان انجمنوں نے طرح طرح سے امداد کی۔ اور بہت سے کمیشنوں کی تنظیم کرکے انکو بڑی بڑی سیاحتوں پر آمادہ کیا

سیاحین دو طرح کے ہیں ایک تو وہ جنھوں نے اپنے ذاتی اغراض و مفاد کے لئے اجتماعاً یا انفراداً سفر کئے، دوسرے وہ جن کو علمی انجمنوں نے اطراف عالم میں بھیجا۔ اکثر سیاحین روم و یونان و عرب کی غرض تجارۃ اور تجارتی منڈیوں کی افتتاح اور اپنے معاملات کی توسیع تھی۔ ان میں بہت سے ایسے تھے جو تجارتی مال ایک ملک سے دوسرے ملک کو لے جاتے تھے۔ اور اس کو فروخت کرتے تھے۔ بہت سے معادن اور کانوں کی تلاش میں گھومتے تھے۔ اور ایسے بھی تھے۔ جو غلاموں لونڈیوں اور جواہرات وغیرہ کی تجارت کرتے تھے

لیکن وہ سیاح جو انجمنوں کی طرف سے بھیجے گئے ان کی غرض صرف علم و فضل کی ترقی تھی ——— ان انجمنوں کے متعلق کتب خانے بھی ہیں جن میں بکثرت علمی کتابیں، تصاویر اور نقشے موجود رہتے ہیں۔ بعض سوسائٹیاں اپنے ذاتی اخبار و رسائل بھی رکھتی ہیں۔ تاکہ پبلک کو ان کے کارناموں کی اطلاع دی جا سکے

دنیا میں جس وقت سے یہ انجمنیں قائم ہوئی ہیں اس وقت سے سیاحین کا مقصد صرف کسی غیر معروف مقام کا ہی دریافت کر لینا نہیں ہے بلکہ بہت سے علمی نظریات و قضایا کا اثبات ہے جو طبقات الارض، مسئلہ ارتقاء، تاپید حیوانات اور ظہور انسان کی تاریخ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اور جن کے متعلق علماء بحث و تمحیص کرتے رہتے ہیں

عصر جدید

یہاں ان چند اکتشافات کا ذکر کیا جاتا ہے جن کو سیاحین بلاد ۱۸۵۰ء سے لے کر بیسویں صدی کے ابتدائی حصہ تک پورا کر چکے ہیں

بہت سے سیاحوں نے وسط ایشیا میں پامیر پلیٹو اور بینچوریا (شرق ایشیا) کی سیاحت کر کے بکثرت غیر معروف مقامات کا پتہ لگایا جو اس سے پیشتر معرض خفا میں تھے۔ سر ولیم کونوائے نے ۱۹۰۹ء میں کراہورن کے مجاہل کو دریافت کیا جو اب السن لینڈ کے نام سے مشہور ہیں

۱۸۴۷ء میں جرمنی کے دو شخصوں نے افریقہ کے کلیمنگرو پہاڑ کا سلسلہ اور ملک کینیا دریافت کیا۔ اسی سنہ میں ہیٹیولنسن نامی سیاح نے نگیمی جھیل کا اکتشاف کیا اور دوران سیاحت میں وکٹوریہ اور دریائے زمبیزی کے آبشار و اور روڈیزیا کے شمال تک پہونچ گیا۔ ۱۸۵۸ء میں بنٹن و سبیک نے ٹینگینیکا جھیل کا پتہ لگایا۔ اس کے دوسرے سال سبیک نے نیانیزا جھیل کو معلوم کیا۔ ۱۸۷۸ء میں سرداہنٹو سیاح نے جنوبی افریقیہ کو طے کیا۔ اسی سنہ میں اوسکار لنز نے صحاری میں طنجہ سے ٹمبکٹو تک سفر کیا۔ اور سوتنی نامی سیاح نے مصر سے خلیج گنی تک سفر کیا۔ اسی سلسلہ میں پالگریو (Palgrave) کا سفر بلاد عرب ویمبرگ (Vambery) کا سفر ترکستان اور ویلینز ([illegible]) کی سیاحت اوسٹریلیا میں، خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں

اہل جرمنی کی ایک جماعت (Shlagintweit) نے مجاہل ہندوستان اور تبت کا سفر کیا نیز کوہستان ہمالہ، قراقرم و کوئنلن میں گھومی۔ ۱۸۹۸ء میں انگریز سیاحین کا ایک گروہ قطب جنوبی تک پہونچا۔ اور اس نے قطب جنوبی کے مقناطیسی مقام کا تعین کیا۔ (۱۸۴۲ء میں روس ایک انگریز سیاح منطقہ قطب جنوبی کے ۸۰ درجہ دقیقہ تک پہونچ چکا تھا) ۱۹۰۸ء میں شکلٹن نامی سیاح ایک ایسے مقام پر پہونچا جو قطب جنوبی سے ۹۷ میل کے فاصلہ پر تھا

منطقہ قطب شمالی کے اکتشاف میں بھی بہت سے لوگوں نے حصہ لیا چنانچہ ۱۸۸۸ء میں نینسن نامی سیاح نے بلاد گرین لینڈ کو طے کیا۔ اور ڈیوک ڈبروزی نے ۱۹۰۰ء میں ۸۶ درجہ ۳۳ دقیقہ تک شمال میں پہونچا

گزشتہ صدی کے ربع اخیر میں فرنکلن، کین، بینکس، گریلے، اور مکلسن نے قطب تک پہونچنے کے لئے بے انتہا کوششیں کیں تاکہ کوئی قریب ترین اور سہل راستہ دستیاب ہو

قرن سابق کے اخیر میں زور برگین نامی ایک سوئٹزرلینڈ کے سیاح اور اس کے ساتھی وین نے کوہستان انڈیز پر جانے کا ارادہ کیا اور وہ دونوں اکونگوا چوٹی تک (جس کا ارتفاع ۲۳۰۸۰ فیٹ ہے) پہنچ گئے یہ چوٹی کوہستان انڈیز کی کی بلند ترین چوٹیوں میں ہے اور کوہستان قراقرم کی بلند ترین چوٹی سے بھی کچھ زیادہ بلند ہے

۱۹۰۸ء میں پیرے امریکن سیاح قطب شمالی تک پہونچا اور اثنا سفر میں اس کو بہت زیادہ مصائب و تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے دو سال بعد سوئڈن کا ایک سیاح جس کا نام امنڈسن تھا قطب جنوبی پہونچ گیا۔ اسی زمانہ میں مویر واکن، ڈوسن، رسل وغیرہ نے بھی چند سفر کئے اور بلاد لبرادور۔ و۔ الاسکا میں سیاحت کرکے بہت سے ایسے غیر معروف مقامات کا پتہ چلایا جن کو دنیا اس سے قبل مطلق نہ جانتی تھی

اب کیا باقی رہ گیا؟ مندرجۂ بالا بیان کو پڑھنے کے بعد یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ اب کوئی مقام سطح ارضی پر غیر معروف باقی نہیں رہا جس کے انکشاف کی ضرورت ہو، کیونکہ ابھی تک زمین کا بڑا حصہ ایسا پڑا ہوا ہے جہاں انسانی قدم اس وقت تک نہیں پہونچ سکا اور سیاحوں کی جماعتیں ان کے انکشاف کی فکر میں لگی ہوئی ہیں ——

ہم اس وقت برقی قوت، اسٹیم اور ریڈیو کے زمانہ میں ہیں اُنھوں نے بعید مقامات کو قریب اور بہت سی اشیاء کے چہرہ کو بے نقاب کر دیا ہے۔ اب انسان آسانی کے ساتھ بحر و بر اور ہوا میں ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کر سکتا ہے —— موجودہ زمانہ میں کوئی سیاح کسی جگہ کی سیاحت کے لئے اس وقت تک آمادہ نہیں ہوتا۔ تاوقتیکہ اس کے ہمراہ بکثرت نقشجات، تصاویر، کتابیں اور آلات تصویر موجود نہوں اس کے علاوہ اور دیگر اشیاء (جن کے بغیر کامیابی دشوار ہے) کا ساتھ ہونا ضروری ہے

قدیم سیاحین کے سفرنامے اگرچہ رسوم و تصاویر سے خالی ہیں۔ مگر پھر بھی موجودہ زمانے میں ایک حد تک مفید ثابت ہوتے ہیں۔ آجکل کے سفرنامے قدیم سفرناموں سے بالکل مختلف ہیں۔ کیونکہ ان میں سرسری طور پر کسی غیر معروف مقام کا ہی ذکر نہیں ہے بلکہ وہ بڑے بڑے علمی مباحث پر مشتمل ہیں۔ ان میں نباتات و حیوانات کے فوٹو اور ان کے خصائص، جیولوجی، علم ارصاد جویہ وغیرہ کا بیان ہوتا ہے۔ یا دوسری طرح یوں کہنا چاہیئے کہ جدید سفرنامے فی الحقیقت علمی مولفات ہیں جن سے انسان بے شمار معلومات کا استفادہ کرتا ہے

اس وقت دنیا کے کتنے حصے ایسے ہیں جن کا حال ابتک معلوم نہیں ہو سکا۔ اسی کا جواب محال ہے اور ان تمام غیر معروف مقامات کا حصر ممکن نہیں، تاہم سیاحین بلاد کو قرن حاضر کے اختتام سے قبل ہی ان کے انکشاف کی امید ہے۔ اس

انکشاف سے دنیا کا نقشہ مکمل ہو جائے گا اور کوئی مقام کرۂ ارضی کی سطح پر مجہول نہ رہیگا۔ سائنس و اختراعات کی ترقی، فن پرواز کا کمال، برق و بخار سے حرکت پانے والی مشینیں اور لاسلکی کے آلات یہ تمام چیزیں عنقریب سیاحین کے لئے اُن کی کامیابی کا باعث ہوں گی۔ ذیل میں خاص خاص مجاہل بیان کئے جاتے ہیں

(۱) بلاد سائبیریا کا شمالی مشرقی حصہ جو ایک وسیع میدان ہے جہاں تمام سال برف گرتی ہے اور زمین برف سے ڈھکی رہتی ہے اس ملک میں ہوا کے بہت تیز بگولے اٹھتے ہیں۔ اس کے علاوہ انسان وہاں کا کچھ حال نہیں جانتا

(۲) افریقیہ میں جبال قمر کے گرد و پیش کے گھنے جنگل جہاں گوریلا بندر پایا جاتا ہے، یہ بندر اور بندروں کے بہ نسبت انسان سے زیادہ مشابہ ہے۔ علماء ان مقامات کا کچھ اور حال نہیں جانتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر علماء ایسے مقامات تک پہونچ سکے تو ان کو نظریۂ نشو و ارتقاء، اسرارِ وراثت اور مخلوقات حیوئیہ کی ترقی کے راز کے اثبات کے لئے بہت کچھ مواد فراہم ہو جائے گا

(۳) قطب جنوبی کے وسیع مجاہل جن میں کہ اب تک کسی سیاح نے بہ تمام و کمال سیاحت نہیں کی

(۴) دریائے اورونیکو اور امیزن کا منبع

(۵) نئی دنیا (امریکہ) کے قدیم متوحش باشندگان کے رہنے اور بسنے کے مقامات اور افریقیہ میں زنگی وحشیوں کے مسکن

(۶) جزیرہ گرینلینڈ (جو شمالی امریکہ کے مشرق و شمال میں واقع ہے) کا بہت بڑا حصہ

(۷) جنوبی امریکہ میں شمالی قطعہ کے بہت سے مقامات

(۸) شمالی اسٹریلیا کے چھوٹے چھوٹے حصے

(۹) جزیرۂ بورنیو جزائر نیوگنی اور جزائر فلیپائن کے وسطی حصے

(۱۰) بحرالکاہل میں شمالی اوسٹریلیا کے بعض جزائر

(۱۱) جنوبی امریکہ میں جنوبی مغربی ساحل کے بعض ٹکڑے

(۱۲) جزیرۂ آئسلینڈ کے شمالی اطراف

(۱۳) جزائر فرانسو جوزف کے بعض جہات

(۱۴) جزیرۂ سماترا کے بعض حصے

اس کے علاوہ بہت سے غیر معروف مقامات کرۂ ارضی پر موجود ہیں۔ اور وہ اپنے مکتشفین و سیاحین کے منتظر ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ موجودہ صدی کے اختتام سے قبل روئے زمین پر کوئی مجہول مقام باقی نہیں رہے گا

اور انسان دنیا کے جمیع اطراف کو آباد کرلے گا ۔ کیونکہ دنیا کی آبادی میں غیر معمولی اضافہ ہو رہا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یقیناً ایک روز ایسا آنے والا ہے جب کہ زمین اپنے رہنے والوں کے لئے کافی نہ ہوگی ۔ اور نباتات و حیوانات کی وجہ سے تنگ ہو جائیگی

اس نظریہ کا لحاظ کرتے ہوئے علماء کو چاہئے کہ وہ اپنی مساعی کشف و اکتشاف کو جاری رکھیں ۔ تاکہ آنے والی نسلوں کو وہ سخت دن نہ دیکھنا پڑے اور ان پر زمین باوجود اپنی گنجایش و وسعت کے تنگ نہ ہو جائے ۔ اور ان کی معیشت کے لئے کافی و وافی نہ ہو

لیکن کون جانتا ہے کہ اس وقت صعب تک پہونچنے سے قبل ہی انسان سائنس کی مدد سے بعض اجرام علویہ کو (جن میں مخلوقات حیویہ کے رہنے کی صلاحیت ہے) آباد کر سکے

سید عبد الحق نقوی سہوانی

آیندہ جنوری ۳۴ء کا نگار

(تقریباً دو چند ضخامت کا)

مخصوص ہوگا صرف ایک موضوع کیلئے جس پر اُردو میں اسوقت تک کسی نے قلم نہیں اٹھایا

یعنی

"لبوں کی داستان زبان قلم سے"

آپ کے "لب" ہر وقت متحرک رہتے ہیں اور سب سے زیادہ خدمت انھیں سے لیجاتی ہی، لیکن کیا آپکو معلوم ہی کہ جذبات کی دنیا میں، نفسیاتی حقایق میں، عالم شعر و تصوف میں "لب" کو کیا اہمیت حاصل ہی اور دنیا کی تاریخ میں کیسے کیسے انقلاب اسکی وجہ سے رونما ہوئے ہیں ——— جنوری ۳۴ء کا نگار ——— اِس کی مفصل داستان آپکو سنائے گا ۔ اور اس موضوع پر تحقیق و تدقیق کے وہ نقوش آپ کے سامنے پیش کرے گا کہ آپ حیران رہ جائیں گے

علاوہ اس کے

ایک حصہ حضرت نیاز کے اُن "مختصرات ادب" کے لئے بھی وقف ہوگا جنھیں "الہامات ادب" اور "معجزات انشاء" کہنا زیادہ موزوں ہے

اگر

آپ نے نگار کی خریداری جاری رکھی تو یہ مجموعہ آپ کو مفت مل جائے گا ۔ ورنہ یوں کسی قیمت پر بھی دستیاب نہیں ہو سکتا ———

منیجر نگار ۔ لکھنؤ

مسمریزم کی چند ابتدائی مشقیں

مسمریزم، جس کا دوسرا نام "تنویم مقناطیسی" بھی ہے اور جسے ہپناٹزم بھی کہتے ہیں کوئی علم روحانی تو نہیں ہے، لیکن "روحانیت" کو قریب الفہم بنانے کے لئے اس سے کچھ نہ کچھ کام ضرور لے سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ شخص جو مسمریزم کی قوت حاصل کر لیتا ہے، وہ یہ ضرور کہہ سکتا ہے کہ قوائے ظاہری کے علاوہ کوئی اندرونی قوت بھی انسان میں پائی جاتی ہے اور اس کا ارتقاء غیر معمولی اعمال روحانی پیش کر سکتا ہے

بہرحال حقیقت جو کچھ ہو اس میں شک نہیں کہ انسان کے قوا کا منبع خواہ وہ دماغ سے متعلق سمجھے جائیں یا روح سے (یہ صرف الفاظ کا اختلاف ہے) عجیب و غریب مظاہر کا باعث ہو سکتے ہیں اور زمانہ جسقدر ترقی کرتا جائے گا یہ حقیقت اور زیادہ روشن ہوتی جائے گی

دنیا میں بعض علوم تو ایسے ہیں جن کے اصول ہم نے مادی اشیاء کے تغیر و تبدل اور عناصر کے فعل و انفعال کو دیکھ کر متعین کئے ہیں اور بعض علوم ایسے ہیں جن کے نتائج کی ہم کوئی علمی یا عقلی تاویل اس وقت تک نہیں کر سکے ہیں — ان میں سے غالباً ایک مسمریزم بھی ہے

ہر چند بعض لوگ انسان کی دماغی ساخت اور اس کے اسباب اثر و تاثر سے بحث کرکے اس فن کو بھی علوم حکمیہ میں داخل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس وقت تک اس میں کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی

بہرحال مسمریزم ایک خاص دماغی مشق ہے جس سے عجیب و غریب کام لئے جاتے ہیں اور بغیر اسکے کہ اسکے اصول و اسرار سے بحث کی جائے چند ابتدائی مشقوں کا حال ہم بیان کرتے ہیں، جنھیں ہر شخص نہایت آسانی سے پورا کر سکتا ہے

اس مقالہ میں فی الحال پانچ مشقوں کا ذکر کیا جاتا ہے:-

(۱) کسی شخص کی آنکھیں بند کر دینا اس طور پر کہ وہ باوجود کوشش کے نہ کھول سکے

(۲) کسی شخص کو اس کے ارادہ کے خلاف پیچھے جھکنے پر مجبور کر دینا

(۳) کسی شخص کی مٹھیاں اس طرح بند کر دینا کہ وہ نہ کھول سکے

(۴) کسی شخص کو انگلیوں کو جنبش دینے پر مجبور کر دینا

(۵) بازو یا ٹانگ کو لکڑی کی طرح سخت کر دینا کہ وہ جھک نہ سکے

پہلا تجربہ

کسی ایسے شخص کا انتخاب کیجئے جو پورے خلوص کے ساتھ بغیر کسی خیال امتحان یا مخالفت کے اس تجربہ کا معمول بننا پسند کرے

ایک کرسی لیجئے اور پورے سکون و اطمینان کے ساتھ اس پر بٹھا دیجئے، دونوں پاؤں زمین پر ٹکے ہوں اور دونوں ہاتھ آگے ران پر رکھے ہوئے ہوں، بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا جائے اور کوئی خاص کوشش بیٹھنے میں ایسی نہ کی جائے جس سے اعصاب وغیرہ تن جائیں، مدعا یہ کہ معمولاً جس طرح انسان پورے آرام و سکون کے ساتھ بیٹھتا ہے اسے بھی بٹھا دیا جائے

پھر اس کے سامنے جا کر صاف آواز میں کہئے کہ "تمہاری آنکھیں تھکی ہوئی ہیں اور سونے کی طرف مائل ہیں" — بار بار اس کی تکرار کیجئے، لیکن لب و لہجہ میں ایک ایسی حاکمانہ شان ہونی چاہئے جس سے معمول پر یقین کی کیفیت طاری ہو بار بار تکرار کی ضرورت صرف اسلئے ہے کہ اس کے دماغ کو کسی اور بات پر غور کرنے کا موقعہ نہ ملے — یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ اس کے چہرہ کو دیکھتے رہیں یا اسکے چہرے پر ہاتھ پھیرتے رہیں

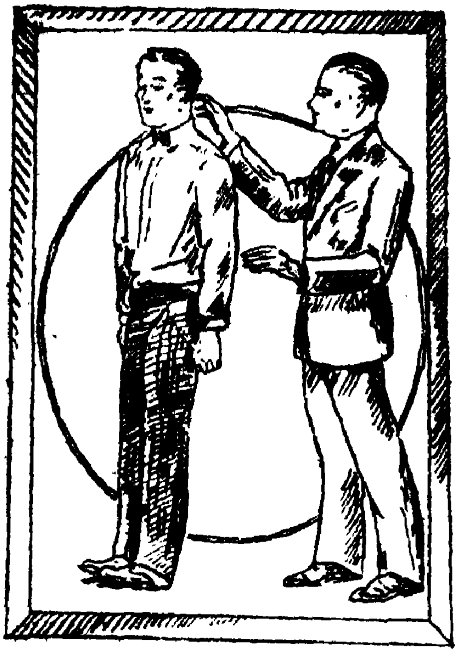


اسکی آنکھوں پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھرائیے

اس عمل کے بعد آپ نمایاں فرق معمول کی آنکھوں میں پائیں گے اور وہ یہ کہ ان میں ہلکی سی غنودگی پیدا ہو چلی ہے اور پپوٹے نیچے کی طرف مائل ہو چلے ہیں جب یہ کیفیت پیدا ہو تو آپ اس کی آنکھوں پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھرائیے۔ اور بآواز بلند بار بار کہئے کہ "اب آنکھیں بند ہو رہی ہیں"۔ اس کے بعد جب آنکھیں بالکل بند ہو جائیں تو کئی بار کہئے کہ "آنکھیں بند ہو گئی ہیں اور تم اب ان کو کسی طرح نہیں کھول سکتے"

چند منٹ تک اس حال میں رکھنے کے بعد اسکی آنکھوں کو اپنی انگلیوں سے مس کر کے کہئے کہ "اب جاگ جاؤ" اور وہ آنکھیں کھول دے گا

واضح ہو کہ اس تجربہ میں حقیقتاً نیند طاری نہیں ہوتی بلکہ معمول ایسا محسوس کرنے لگتا ہے اور جس وقت آنکھوں پر ہاتھ پھیر کر اس سے کہا جاتا ہے کہ "آنکھیں کھول دو" تو اس کا دماغ دوسرے خیال کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور وہ اثر زائل ہو جاتا ہے



جونہی وہ آپ کے ہاتھ کے لمس کو محسوس کریگا پیچھے کی طرف گرنا شروع کردے گا

دوسرا تجربہ ———

اس تجربہ میں بھی تجربۂ اول کی تفصیلات کو سامنے رکھنا چاہیے ——— ایک شخص کو سیدھا کھڑا کر دیا جائے اس حال میں کہ دونوں ہاتھ نیچے لٹکے ہوں۔ اور آنکھیں بند۔ آپ پشت کی طرف کھڑے ہو کر بار بار کہیے کہ "تم پیچھے کی طرف گر رہے ہو۔ اور میں تمھیں اپنے ہاتھ سے سنبھالے ہوئے ہوں"۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اپنے ہاتھ کو اس کی گدی کی طرف لے جائیے اور جونہی وہ آپ کے ہاتھ کے لمس کو محسوس کرے گا۔ پیچھے کی طرف گرنا شروع کر دے گا، یہاں تک کہ اگر آپ نہ سنبھالیں تو وہ واقعی گر جائے

تیسرا تجربہ ———

ایک شخص کو اپنے سامنے کھڑا کیجیے۔ اور کہیے کہ اپنے ہاتھ آگے پھیلا کر انگلیاں آپس میں اس طرح گانٹھ لے کہ ان میں خلا باقی نہ رہے

پھر اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر اس طرح دبائے کہ اس کی دونوں کلائیاں آپس میں مل جائیں اور یقین دلانے والے لب و لہجہ میں کہیے کہ "اب دونوں ہاتھ ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہو سکتے"۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ باوجود کوشش کے وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے گا



پھر اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر اس طرح دبائے کہ اسکی دونوں کلائیاں باہم مل جائیں



بلکہ آپ خود اپنی اونگلیوں کو حرکت دے کر بتائے

چوتھا تجربہ ———

معمول کو سامنے کھڑا کر کے کہئے کہ اپنے دونوں ہاتھ آگے کر کے ان کی اونگلیاں آپس میں گانٹھ لے۔ اور دونوں انگوٹھے سامنے رکھ کر ایک کو دوسرے کے گرد چکر دے بلکہ آپ خود اپنے انگلیوں کو حرکت دے کر بتائے کہ "دیکھو تمہاری اونگلیوں میں کیسی تیز حرکت پیدا ہو رہی ہے اور تم اُن کو کسی طرح نہیں روک سکتے"

اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب تک آپ اس کی قوت خیال کو دوسری طرف مائل نہ کریں گے برابر اونگلیاں چلتی جائیں گی

پانچواں تجربہ ———

معمول کو کرسی پر بیٹھا کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غور سے دیکھئے تاکہ اس کی توجہ بالکل آپ کی طرف مائل ہو جائے۔ پھر اپنے داہنے ہاتھ سے اس کا بازو یا اس کی ٹانگ پکڑ کر آگے پھیلا دیجئے اور کہئے کہ "دیکھو تمہارا بازو یا ٹانگ کس طرح لکڑی کی طرح سخت ہو گئی ہے اور تم اب اسکو کسی طرح حرکت نہیں دے سکتے"۔ یہ کہتے ہوئے اس کے بازو پر اپنا بایاں ہاتھ آہستہ آہستہ چلاتے رہیئے تاکہ اسکو پوری طرح اس کا یقین آجائے

اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اپنے بازو کو بالکل حرکت نہ دے سکے گا



وہ اپنے بازو کو بالکل حرکت نہ دے سکے گا

باب الاستفسار

حاجی شریعت اللہ

(جناب مولوی احمد کریم صاحب۔ رنگپور۔ بنگال)

کیا آپ مہربانی فرما کر حاجی شریعت اللہ اور اُن کے مسلک پر کوئی مضمون لکھیں گے۔ چونکہ بنگال و بہار میں اب بھی اس مسلک کے پیرو پائے جاتے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ان کے صحیح حالات معلوم کئے جائیں۔ میں بہت شکرگزار رہوں گا

(نگار) حاجی شریعت اللہ ایک گمنام خاندان کے فرد تھے اور غالباً ۱۷۶۴ء میں یا اسی کے قریب کسی سنہ میں پیدا ہوئے۔ ضلع فرید پور (بنگال) میں ایک گاؤں بہادر پور ہے، وہیں ان کے آبا و اجداد رہا کرتے تھے اور یہیں ان کی ولادت ہوئی ـــــ اٹھارہ سال کی عمر میں یہ حج کی غرض سے مکہ گئے اور شیخ طاہر السنبلی المکی کے مرید ہوگئے۔ شیخ اس وقت وہاں شافعی جماعت کے سردار تھے ـــــ کامل بیس سال تک ان کی درس و تدریس سے فائدہ اٹھا کر حاجی شریعت اللہ ہندوستان واپس آئے

اس زمانہ میں ریل تو تھی نہیں کہ آسانی سے گھر پہونچ جاتے، منزل بہ منزل سفر طے ہو رہا تھا کہ راہ میں قزاقوں کی ایک جماعت نے ان کو لوٹ لیا۔ نقد رقم تو خیر اتنی نہ تھی، لیکن کتابوں اور مخطوطات وغیرہ کا نادر ذخیرہ ان کے پاس بہت کافی تھا، وہ بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ یہ واقعہ ان کے لئے اسقدر سخت تھا کہ انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ جہاں سب کتابیں ہیں، وہیں وہ بھی رہیں گے، اور قزاقوں کے گروہ میں شامل ہوگئے

چونکہ آدمی بہت فاضل، نیک اور مخلص تھے اس لئے قزاقوں پر بھی ان کی تعلیمات کا اثر ہوا اور سب کے سب ان کے مُرید ہوگئے۔ یہ گویا پہلا قدم تھا جو انھوں نے اپنے مسلک کی تبلیغ و اشاعت کی طرف اٹھایا

اس کے بعد کئی سال تک وہ اپنے وطن و جوار وطن میں لوگوں کو سمجھاتے رہے اور باوجود مخالفت کے وہ ایک جماعت

اپنی ہم خیال بنانے میں کامیاب ہو ہی گئے

ان کی تبلیغ یہ تھی کہ نماز جمعہ و نماز عیدین ہندوستان میں نہ پڑھنا چاہئے کیونکہ یہ دار الحرب ہے اور بجائے لفظ پیر و مرید کے آیندہ اُستاد و شاگرد کے الفاظ استعمال کرنا چاہئے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے بیعت کے وقت ہاتھ میں ہاتھ لینے کے طریقہ کو بند کر کے صرف توبہ کو جاری کیا۔ ان مسائل میں تو خیر ان کی مخالفت زیادہ نہیں ہوئی، لیکن جس وقت انھوں نے یہ اعلان کیا کہ نوزائیدہ بچہ کی نال دائی سے کٹوانا ہندوؤں کی رسم ہے اس لئے اس کو ترک کرنا چاہئے اور خود باپ کو نال کاٹنا چاہئے، تو سخت برہمی لوگوں میں پیدا ہوئی اور ان کے بہت سے مرید پھر گئے۔ چونکہ کاشتکاروں کی بڑی جماعت پر ان کا اثر قائم ہو چکا تھا۔ اور وہ اس جماعت میں اتحاد پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے زمیندار بہت خالف تھے اور اس موقعہ سے فائدہ اُٹھا کر وہ بھی درپئے آزار ہو گئے، یہاں تک کہ ان کو نوا باری (ضلع ڈھاکہ) چھوڑ کر، جہاں وہ مقیم تھے اپنے وطن چلا جانا پڑا

وطن پہونچ کر پھر انھوں نے اپنا سلسلۂ رشد و ہدایت قائم کیا اور جہلا کی کثیر جماعت ان کی مُرید ہو گئی۔ رفتہ رفتہ ان کا اثر اسقدر وسیع ہو گیا کہ کسی کو مخالفت کی ہمت نہ ہوئی۔ اور وہ پورے جوش و خروش کے ساتھ اپنا حلقہ بڑھاتے رہے

ان کے بعد ان کے بیٹے محمد محسن جانشین ہوئے، جو "ددُھومیاں" کے نام سے مشہور تھے اور اب بھی اضلاع فرید پور، پبنا، باقر گنج، ڈھاکہ اور نواکھالی میں کوئی شخص ایسا نہیں جو "ددھومیاں" سے نا واقف ہو۔

ددُھومیاں ۱۸۱۹ء میں پیدا ہوئے اور بہت کمسنی میں مکہ چلے گئے۔ جب واپس آئے تو انھوں نے بیان کیا کہ انکو خواب میں بشارت ہوئی ہے اور وہ خدا کی طرف سے لوگوں کی ہدایت کے لئے مامور کئے گئے ہیں۔ چونکہ باپ کا انتقال ہو چکا تھا اس لئے انھوں نے ان کی جگہ لے لی۔ اور بعض نئی تعلیمات بھی لوگوں کے سامنے پیش کیں ــــ مثلاً یہ کہ بھنگا (ایک کیڑا جسے بوٹے بھی کہتے ہیں اور جو اُچک کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچتا ہے) کو انھوں نے حلال قرار دیا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ ٹڈی عرب میں عام طور پر کھائی جاتی ہے اور ہندوستان کا بھنگا بھی بالکل وہی چیز ہے۔ پھر یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی چیز وہاں حلال ہو اور یہاں حرام

ددُھومیاں کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے باقاعدہ اجتماعی زندگی کی روح لوگوں میں پیدا کی اور ویشنوئی ہندوؤں کی طرح انھوں نے بھی مشرقی بنگال کے کئی حصہ کر کے ہر جگہ اپنا ایک خلیفہ مقرر کیا۔ خلیفہ کا فرض ہوتا تھا کہ وہ مرکزی تعلیمات کی اشاعت کر کے لوگوں کو منظم طور پر ایک رشتہ سے وابستہ رکھے اور ہر شخص سے چندہ فراہم کر کے صدر مقام پر ددُھومیاں کے پاس بھیجتا رہے جو اس جماعت کی تنظیم کے تنہا ذمہ دار تھے

اس جماعت کے اتحادِ عمل کا یہ عالم ہو گیا کہ اگر کوئی زمیندار اس جماعت کے کسی کاشتکار کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کرتا مرکزی فنڈ سے مقدمہ لڑنے کے لئے روپیہ دیا جاتا اور بعض دفعہ اگر ضرورت ہوتی تو آدمی بھیجکر زمیندار

کی زدوکوب کی جاتی اور اس کا گھر لوٹ لیا جاتا۔

حاجی شریعت اللہ کی زندگی میں یہ جماعت نہ زمینداروں کے طبقہ سے برسرپیکار ہوتی تھی نہ قانون کی مخالفت کرتی تھی، لیکن جو باپ سے نہ ہوسکا وہ بیٹے نے کر دکھایا اور دودھو میاں نے گویا علانیہ زمینداروں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا ——

چونکہ زمینداروں کو اس جماعت کی تنظیم نے سخت نقصان پہونچ رہا تھا اس لئے وہ اپنے کاشتکاروں کو جسمانی ایذا دے دیکر اس جماعت میں شرکت سے باز رکھنا چاہتے تھے اور ادھر دودھو میاں بھی ہر اس کاشتکار کو جو ان کی جماعت میں شریک نہ ہوتا تھا سخت سزائیں دیدیکر اپنی طرف کر لیتے تھے۔ سزا کا خاص طریقہ یہ تھا کہ جو لوگ کہنا نہیں مانتے ان کو باندھ کر سرخ مرچ کا سفوف ناک میں ڈال دیا جاتا تھا۔ الغرض اس جنگ میں زمینداروں کو شکست ہوئی اور دودھو میاں کی جماعت روز بروز بڑھتی رہی

دودھو میاں کی تبلیغ یہ تھی کہ تمام انسان ایک ہیں اور غریب و امیر میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔ جس طرح ایک امیر اپنی فلاح چاہتا ہے اسی طرح ایک غریب کو بھی اپنے مصالح کے تحفظ کا اختیار حاصل ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی ایک شخص جماعت کا کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائے تو سب کا فرض ہے کہ وہ اس کی مدد کریں اور اس مقصد کے حصول کے لئے مخالف جماعت پر ہر ممکن ظلم روا ہے

زمینداروں کی طرف سے جو بے ضابطہ ٹیکس کاشتکاروں پر عائد ہوتے تھے، ان کے وہ سخت مخالف تھے۔ وہ کہتے تھے کہ درگا دیوی کے مندر کے لئے ایک مسلمان کاشتکار پر کیوں ٹیکس عاید کیا جائے یا رام لیلا کے جشن کے لئے کیوں اس کو چندہ دینے پر مجبور کیا جائے

اس کے بعد دودھو میاں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا، یعنی اب انھوں نے یہ اعلان کیا کہ زمین خدا کی ہے اور کسی کو حق حاصل نہیں کہ وہ وراثتاً اس پر قابض رہے اور لگان وصول کرے۔ چنانچہ ایک بڑی جماعت اُن کے مریدوں کی زمینداروں کی زمینیں چھوڑ بیٹھی اور خالصہ کی زمین کاشت کرنے لگی جہاں انھیں مالگزاری براہ راست گورنمنٹ کو دینا پڑتی تھی اور درمیان میں زمیندار حائل نہ تھے

زمینداروں نے مجبور ہو کر آخرکار دودھو میاں کے خلاف بہت سے جھوٹے مقدمے بنائے۔ ۱۸۳۸ء میں ان پر لوٹ مار کا الزام قائم کیا گیا، ۱۸۴۱ء میں قتل میں ماخوذ کیا گیا، لیکن دونوں مرتبہ ثبوت فراہم نہ ہونے کی وجہ سے چھوٹ گئے۔ ۱۸۴۴ء میں مداخلت بیجا کا مقدمہ چلایا گیا، ۱۸۴۶ء میں بلوہ کا، اور ۱۸۴۸ء میں سرقہ بالجبر کا لیکن کسی میں کامیابی نہ ہوئی۔ ۳۸ء میں جب ان پر مقدمہ چلایا گیا تو حالت زیادہ نازک ہو گئی تھی اور حکومت کو فوجی دستہ بھیجنا پڑا —— تمام مشرقی بنگال میں ان کے جاسوس متعین تھے اور تمام خبریں پہونچایا کرتے تھے۔ حالت یہ ہو گئی تھی

کہ اس جوار کے تمام جھگڑے یہی طے کیا کرتے تھے اور کوئی شخص عدالت میں مقدمہ لیجاتا تھا تو اس کو سخت سزا دیتے تھے۔ یہ لوگوں کے نام احکام بھی صادر کیا کرتے تھے جن پر " احمد نام نامعلوم " کے دستخط ثبت ہوا کرتے تھے۔ جن لوگوں کے پاس اس دستخط کے احکام پہونچتے تھے وہ کانپ اٹھتے تھے اور خاموشی کے ساتھ بلا چون وچرا تعمیل کر دیا کرتے تھے

بتاریخ ۲۴ ستمبر ۱۸۶۱ء بہادر پور میں ان کا انتقال ہوا اور وہیں دفن ہوئے، لیکن دریائے اریل نے اب ان کے مکان و مزار دونوں کو بے نشان کر دیا ہے۔ انھوں نے تین لڑکے اپنے بعد چھوڑے، لیکن ان میں سے کوئی بھی اس قابل نہ تھا کہ اپنے باپ کی اس تنظیم کو قائم رکھ سکتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ یہ جماعت کمزور ہوگئی۔ اب بھی بعض افراد اس مسلک کے پائے جاتے ہیں۔ جو جمعہ اور عیدین کی نماز نہیں پڑھتے۔ اس مسلک کا نام اہل الفرائض یا فرائضی تھا۔

آہ طباطبائی

گلشنِ ماضی کو ویراں کر چکی اے ہمصفیر!
انقلاب افگن ہوائے عہد نو کی دار و گیر

عہد حاضر نے بدل دی علم و دانش کی فضا
کوئی تہذیب کہن کا اب نہیں منت پذیر

مٹ رہا ہے رفتہ رفتہ اضطراب خاکِ نجد
اُٹھ رہے ہیں پے بہ پے گیسوئے لیلیٰ کے اسیر

مدتیں گزریں کہ دنیا کر چکی ان کو تباہ
اب نہ وہ ایوانِ شیریں ہے نہ رقصِ جوئے شیر

پھر بھی ہیں اک چیز عہد رفتہ کے اہل کمال
کر نہیں سکتا جنھیں مجروح دورِ چرخ پیر

ان کا ذوقِ علم تھا پابندِ تحقیق و تلاش
کھو کھلے پندار کے مجرم نہ تھے ان کے ضمیر

صاف باطن، نیک دل، شائستہ خو، سادہ مزاج
عہد عشرت کے ندیم، ایام غم میں دستگیر

ہے کہیں ای عہد نو! ان کی محبت کا جواب
ان کی دانش کی مثال، انکی صداقت کی نظیر

پھول اس گلشن میں اب اس رنگ کے کھلتے نہیں
بے ریا دل ڈھونڈھنے پر بھی کہیں ملتے نہیں

آہ ای نظم، اے فروغ مجلس اہل کمال
تھا سراپا درسِ بینش تیری فطرت کا جلال

تجھ سے روشن تھا چراغِ محفل داغ و امیر
تجھ سے رخشاں تھی بساطِ گلشنِ رشک و جلال

بے تکلف اوجِ گردوں سے گزر جاتا تھا تو
کس قدر یعنی سبک تھی تیری پروازِ خیال

عظمتِ عہدِ کہن جی کھول کر آنسو بہا
اب کہاں ایسے ادیب و شاعرِ شیریں مقال

دے چکے دنیا کو داغِ ہجر شادِ نکتہ سنج
ہو چکے رخصت جہاں سے اکبرِ نازک خیال

نظم نے بھی اب سنبھالا ایک بیک رخت سفر
نظم تھا جو بالیقیں سر حلقۂ اہلِ کمال

کون اب بخشے گا روحِ عشق کو احساس درد
کون اب کھولے گا اہلِ شوق پر رازِ جمال

کیا مگر کیجیے، اٹل آئینِ قدرت ہے یہی
بدر کی صورت چمکنے پر بھی لازم ہے زوال

حیف اب یہ گلشن بر باد کھل سکتا نہیں
دہر میں ان کا جواب آئندہ مل سکتا نہیں

علی اختر (حیدر آباد دکن)

دَورِ جدید

فلسفہ ہے زندگی کا آج کل بدلا ہوا　　نشۂ عیش وطرب میں ذہن ہے ڈوبا ہوا
موسمی آثار میں ہیں جذب تنویریں تمام　　توڑ ڈالیں عشق نے مستی میں زنجیریں تمام
رخصتِ پرواز ہے تخئیل بے زنجیر کو　　جس طرح کیوپڈ ہوا میں چھوڑ دے اک تیر کو
ہے فضائے بزمِ حسن وعشق سے لبریز آج　　آتشِ جذبات ہے حد سے زیادہ تیز آج
بھر دئے رنگیں پیالے وقت نے حسبِ مراد　　ہر زباں پر آج ہے "عہدِ جوانی زندہ باد"

عمر میں اک وقت خود آتا ہے ایسا خوشگوار　　زندگی انسان کے قدموں پہ ہوتی ہے نثار
خود پرستی ہے شرابِ لالہ فامِ زندگی　　اور پی لیتا ہے اس کو تشنہ کامِ زندگی

بادلو آؤ کہ چھا جائیں فضائے مست پر　　بارشِ کیف ومسرت ہو بلند وپست پر

بیخودی دل کو رباب و چنگ کا پیغام دے　　لا مجھے لرزیدہ ہاتھوں سے چھلکتا جام دے

سوچ رکھا ہے کہ سارے میکدوں کو توڑ کر

دل بناؤں مست و آوارہ سا ان کو جوڑ کر

صبحِ عشرت زندگی کی ہو مری ہر ایک شام　　ہے ضیائے جلوۂ خورشید تاروں کا پیام

ساری دنیا سے الگ اک کیف میں ڈوبا ہوا　　گا رہا ہوں اپنے نغمے آپ ہی بیٹھا ہوا

منزلِ عشرت پہ آکر رُک گیا ہی کارواں　　ان مناظر سے اب آگے ہیں شکستہ وادیاں

چاہتا ہوں ختم ہو جائے مری منزل یہیں　　دیں یہیں، دنیا یہیں، محشر یہیں، محفل یہیں

بڑھ سکے اس سے نہ آگے کاروانِ زندگی　　ساز اپنا توڑ دے ای نغمہ خوانِ زندگی

زندگی کا مل گیا رنگین تر حاصل مجھے　　میری موجیں کھینچ لائی ہیں سرِ ساحل مجھے

صبحِ حسنِ زندگی، راتیں جمالِ زندگی

میں سمجھتا ہوں یہ ہی حدِ کمالِ زندگی

محمد صادق ضیا (بی۔اے)

جانِ تغزل :—

جو ہدف ہو تیری نگاہ کا گلۂ ستم وہ کرے گا کیا — جسے تو سکوت کا درس دے وہ زبان سے اپنی کہے گا کیا

مجھے اے نسیمِ بہار تو نہ سنا ترانۂ سرخوشی — کہ گراں ہو جس پہ ہر اک نفس وہ یہ جامِ عیش پیے گا کیا

جو سکونِ دل سے ہو بے خبر اسے بزمِ عیش سے کیا غرض — جسے آہ و اشک ہو زندگی وہ رہینِ درد ہنسے گا کیا

کوئی تجھ سے بلبلِ خوشنوا، مجھے دشمنی تو نہیں مگر — جو خزاں کی زد میں ہو مضمحل، وہ چمن کھلا تو کھلے گا کیا

جسے عشق لذتِ غم نہ دے، اسے کیوں حیات گراں نہ ہو — جو پیامِ دل بھی نہ سن سکے وہ نوائے روح سنے گا کیا

رگ و پے میں صبر شکن خلش، جسے دو گھڑی بھی سکوں نہ دے
وہ مریضِ اختر بے نوا، کوئی دن جیا تو جیے گا کیا

علی اختر

(حیدرآباد دکن)

جذبات جاذب دہلوی :—

کون جاتا ہے گلستاں کی طرف؟ جا رہا ہوں میں بیاباں کی طرف
دشت میں کانٹے ہیں اسکے منتظر کسنے دیکھا ہی گلستاں کی طرف؟
کیا بلندی اور پستی میں ہی فرق؟ دیکھنا گورِ غریباں کی طرف

کہہ رہا ہی کون محفل میں یہ پرانی داستاں یہ تو خود پہلے ہی سے مستِ خمارِ دوش ہی
وقت جب تاثیر کا آیا تو نالے تھم گئے کارواں بیدار ہی بانگِ درا خاموش ہی

مجھے آتا ہی سب کچھ ایک خاموشی نہیں آتی میں دانا ہوں اگرچہ مجکو دانائی نہیں آتی
کبھی جاتے تھے نالے آسماں پر اب یہ حالت ہے تمنا ایک ہی دلمیں جو لب تک بھی نہیں آتی

آنکھوں سے میری پردۂ غفلت اٹھا دیا کس نے مرے بجھے ہوئے دل کو جلا دیا ؟
میرے مٹائے سے نہیں مٹتی مگر خودی ایسا تو ہو چکا ہی کہ خود کو مٹا دیا
اپنی نظر سے میں نہ گرا ایک بار بھی گو اس نے لاکھ بار نظر سے گرا دیا

فرض انجم ملا ہے آنکھوں کو ان کو دامانِ شب بھگونا ہے
ہاں ذرا اور تیز ہوں آنسو زندگی کو مجھے ڈبونا ہے

"گریۂ یتیم"

(۱)

کوئی حسین نہیں جو دلمیں جلوہ گر نہ ہوا قرارِ جاں نہ ہوا راحتِ جگر نہ ہوا
سوادِ دیدہ میں جو تابشِ نظر نہ ہوا مگر ہوا نہ مرے قلب پر اثر نہ ہوا

(۲)

مری نظر میں جمالِ حریمِ ناز رہا ہجومِ عیش و مسرت سے ساز باز رہا
ہمیشہ دور میں پیمانۂ مجاز رہا مگر ہوا نہ مرے قلب پر اثر نہ ہوا

(۳)

فسانے عشق و محبت کے عیش کوش رہے ترانے محفلِ خلوت کے وقفِ گوش رہے
بہارِ عیش خیالات نائے دلنوش رہے مگر ہوا نہ مرے قلب پر اثر نہ ہوا

(۴)

گئی نہ کشمکشِ ہائے ہوئے رنج و ملال مٹی نہ کاوشِ اندوہ و یاس و اضمحلال
وفورِ غم سے رہا سینہ صورتِ غربال مگر ہوا نہ مرے قلب پر اثر نہ ہوا

(۵)

کھلا نہ دل پہ کبھی رازِ کارزارِ حیات الم فزا ہے اسرارِ حشر و نشر و ممات
عذابِ جاں ہی ہر لحظہ آرزوئے نجات مگر ہوا نہ مرے قلب پر اثر نہ ہوا

(۶)

کبھی نہ بند ہوا بابِ فتنۂ دوراں رہا تسلسلِ سیلابِ فتنۂ دوراں
الم نواز رہی مضرابِ فتنۂ دوراں مگر ہوا نہ مرے قلب پر اثر نہ ہوا

(۷)

جگر گداز تھا دردِ نہانِ گریۂ شمع حدیثِ ناز تھی شرحِ بیانِ گریۂ شمع
زبانِ راز تھا اشکِ روانِ گریۂ شمع مگر ہوا نہ مرے قلب پر اثر نہ ہوا

(۸)

صدائے صورِ قیامت تھا نالۂ بلبل فراقِ گل کی حکایت تھا نالۂ بلبل
نمک فشانِ جراحت تھا نالۂ بلبل مگر ہوا نہ مرے قلب پر اثر نہ ہوا

(۹)

فغانِ قمریِ حسرت زدہ وہ غم آموز چکور کا غمِ مرمیں وہ نالۂ دلدوز
وہ "پی کہاں" کی صدا جانگداز و ہائے سوز مگر ہوا نہ مرے قلب پر اثر نہ ہوا

(۱۰)

کیا نہ قلب کو آہِ لئیم نے ٹکڑے کیا نہ قلب کو خوفِ جحیم نے ٹکڑے
کیا نہ قلب کو حالِ سقیم نے ٹکڑے کیا تو گریۂ طفلِ یتیم نے ٹکڑے

غلام جیلانی عاصی

ذوق بے نیازی

وہ زندگی کا موسم — زندہ دلی کا موسم
وہ عہدِ کامرانی — وہ دورِ شادمانی
اب ختم ہو چکا ہے — نشتر چبھو چکا ہے
ارمان مٹ گئے ہیں — ہیجان مٹ گئے ہیں
وہ سرخوشی کہاں اب — وہ بے خودی کہاں اب
ارمان خیز دل پر — طوفان خیز دل پر
افسردگی ہے طاری — آزردگی ہے طاری
دنیا کی کلفتوں نے — ظاہر کی الفتوں نے
ناشاد کر دیا ہے — برباد کر دیا ہے

لیکن جہاں کے والی — کون و مکاں کے والی
ہر تلخ امتحاں میں — جینا تو ہے جہاں میں
پھر یہ عذاب کیسا ؟ — یہ اضطراب کیسا ؟
آہ و فغاں سے حاصل؟ — رنجِ زیاں سے حاصل؟
ہے مضمحل تو کیا غم — ٹوٹا ہے دل تو کیا غم
اک اور دل بنا دے
سب رنج و غم مٹا دے

عدم

درس حیات

تذبذب ایک دردِ لا دوا ہے — امید و بیم کی کیا انتہا ہے
نتیجہ کیا ہراسِ مستقل کا — تفکر خون پی لیتا ہے دل کا
یہ عقلِ روح آشام اک بلا ہے — مجسم موت، سرتا پا قضا ہے
خدارا چھوڑ شغلِ سینہ کاوی — کہ ہو جائے نہ تجھ پر موت حاوی
شعارِ بے نیازی زندگی ہے — خمارِ سرفرازی، زندگی ہے
حوادث خیز ہیں دورِ آسماں کے — حوادث تھم نہیں سکتے جہاں کے
دلِ بیتاب کو سیماب خو رکھ — تبسم سے لبوں کو سرخرو رکھ
دعا کو ہاتھ اٹھانا بزدلی ہے — شکستِ زندگی ہے، بیکسی ہے
جفاکش بن، جفا آشام ہو جا — فگارِ لذتِ آلام ہو جا !
نہ کر توہین لیکن زندگی کی — کہ یہ خوگر نہیں شرمندگی کی
ارادوں میں عمل کی آگ بھر دے
اُجالا محفلِ ہستی میں کر دے

عدم

معلومات

یوروپ کے عہدِ وسطیٰ کی حماقتیں

اس وقت یوروپ و ایشیا ہر جگہ قانون کی دسترس صرف انسانوں تک ہے اور جانور اس سے مستثنیٰ سمجھے جاتے ہیں، لیکن قرونِ وسطیٰ کے یوروپ میں جانوروں کے خلاف بھی بالکل اسی طرح مقدمے چلائے جاتے تھے جس طرح انسانوں کے خلاف دائر کئے جاتے ہیں۔ باقاعدہ استغاثہ کیا جاتا تھا، شہادت طلب ہوتی تھی، جانور گرفتار کرکے قید و بند میں ڈالا جاتا تھا۔ اور اس کے خلاف یا موافق فیصلہ صادر کیا جاتا تھا

سنہ ۱۱۲۰ء اور سنہ ۱۷۴۰ء کے درمیان فرانس میں ۹۲ جانوروں کے خلاف فیصلے صادر کئے گئے اور ان کو قتل کی سزا دی گئی۔ ایک کسان کو کسی بیل نے اتنا زخمی کر دیا کہ وہ مر گیا، مقتول کے ورثا نے اس بیل کے خلاف مقدمہ چلایا اور عدالت سے حکم صادر ہوا کہ جلسۂ عام میں اس کو پھانسی دی جائے۔ اسی طرح سنہ ۱۴۹۹ء میں چودہ سال کے ایک لڑکے کو کسی بیل نے مار ڈالا اور اس کو بھی پھانسی کی سزا دی گئی۔ پھر یہ رواج صرف فرانس ہی تک محدود نہ تھا بلکہ دوسری مغربی سلطنتوں میں بھی پایا جاتا تھا

تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رواج صرف اس خیال کی بنا پر قائم ہوا تھا کہ ایک جانور اسی وقت ایسی حرکتیں کرتا ہے جب اس کے اندر کوئی عفریت حلول کر جاتا ہے اور یہ سزا فی الحقیقت جانور کو نہیں بلکہ اس عفریت کو دی جاتی ہے جو اس کے خون میں دوڑ رہا ہے

چنانچہ امریکہ کے کسی شخص کے پاس ایک سؤر تھا جسے اس نے سدھا کر بہت سے کھیل تماشے کرنا سکھایا تھا۔ یہ شخص اطرافِ ملک کا دورہ کیا کرتا تھا۔ اور تماشہ دکھا دکھا کر لوگوں سے انعام وصول کیا کرتا تھا۔ جب یہ شخص ہوآنا میں پہونچا تو یہ خیال کیا گیا کہ ضرور اس کے اندر کوئی عفریت کام کرتا ہے اور آخرکار اس کے خلاف مقدمہ چلا کر ہلاک کر دیا گیا

سنہ ۱۴۷۴ء میں سوئٹزرلینڈ کے شہر بادل میں ایک مرغ نے انڈا دیا۔ اس پر مقدمہ چلایا گیا۔ اور حاکم نے اپنے فیصلہ میں لکھا کہ ضرور اس مرغ کے اندر عفریت پایا جاتا ہے اس لئے مجمع عام میں اس کو جلا دیا جائے

ایسے تمام جانور دورانِ مقدمہ میں حوالات کے اندر رکھے جاتے تھے اور جو صرف ان کے خلاف مقدمہ چلانے میں ہوتا تھا اسے درج کاغذات کیا جاتا تھا۔ چنانچہ سنہ ۱۳۹۴ء کے کچھ کاغذات جو حال ہی میں دستیاب ہوئے ہیں ان کے دیکھنے سے

معلوم ہوتا ہے کہ ایک سُور کے خلاف مقدمہ چلانے اس کو غذا دینے اور جلاد کو اُجرت دینے میں کیا صرف ہوا ان مقدموں میں سب سے زیادہ مشہور مقدمہ وہ ہے جو سانٹ جولیان کے باشندوں نے چوہوں کے خلاف دائر کیا تھا۔ اور جو ۴۳ سال تک چلتا رہا۔ چوہوں کا وکیل مارٹولیو شاستنی تھا جو فرانس کی تاریخ عدلیات میں غیر معمولی شہرت رکھتا ہے ــــ

جس وقت چوہوں کے خلاف استغاثہ دائر ہوا تو حاکم نے ملزموں کی حاضری کا حکم دیا، تاریخ مقررہ پر چوہوں کے وکیل نے عذر کیا کہ ملزمین کی تعداد بہت زیادہ ہے اور کافی اعلان تاریخ مقررہ کا نہیں ہوا اس لئے وہ حاضر نہیں ہو سکے عدالت نے اس عذر کو معقول سمجھ کر دوبارہ نہایت وسیع پیمانہ پر اعلان کرنے کا حکم دیا اور دوسری تاریخ سماعت مقدمہ کی مقرر کی۔ جب اس تاریخ پر بھی چوہے حاضر نہ ہوئے تو ان کے وکیل نے کہا کہ بہت سے مدعیوں نے اپنے اپنے کھیتوں میں بلیاں پال رکھی ہیں اس لئے اس کے موکل جان کے خطرہ سے حاضر نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ اس پر مہینوں تک بحث رہی کہ آیا قانوناً مدعیوں کو یہ حق حاصل ہے یا نہیں کہ وہ ملزمین کی ہلاکت کے لئے باختیار خود یہ طریقہ اختیار کریں۔ الغرض جب تاریخ مقررہ آتی تھی تو چوہوں کا وکیل اسی طرح کا کوئی عذر پیش کر دیتا تھا۔ یہاں تک کہ ۴۳ سال تک اس کی کارروائی جاری رہی

دواؤں کے استعمال کا خبط

ڈاکٹر ہوکیارڈ نے ایک کیمیائی نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے بیان کیا کہ گزشتہ سات سال کے اندر اس نے ۲۳ ہزار ٹکیاں دواؤں کی استعمال کی ہیں۔ لیکن ایک شخص سموئیل جیسپ اس سے بھی بڑھا ہوا تھا جس کا انتقال ۱۸۱۷ء میں ہوا۔ اس نے ۱۷۹۱ء اور ۱۸۱۶ء کے درمیان ۲۲۶۹۲۱ ٹکیاں دواؤں کی استعمال کیں یعنی سالانہ تقریباً ۱۰۸۰۶ ٹکیاں کھائیں لیکن اپنی عمر کے آخری پانچ سال میں یہ اوسط ۵۰۴ فی ہفتہ تک پہونچ گیا تھا۔ ان ٹکیوں کے علاوہ یہ ۴۰ ہزار بوتلیں رقیق دواؤں کی بھی پی گیا۔ جب وہ ان کی قیمت ادا کرنے سے عاجز آگیا تو دوا ساز نے اس کے خلاف دعویٰ دائر کر دیا اور دواؤں کا جو حساب اس نے پیش کیا وہ ۵۵ صفحات کو محیط تھا

دُنیا کی ایک فضول خرچ عورت

تاریخ میں شاید ہی کوئی عورت اتنی فضول خرچ نکلے جتنی جوزفین (نپولین کی بیوی) تھی۔ ایک سال میں ۱۴۰ اشرفیاں صرف چہرہ کے سُرخ غازہ پر صرف ہو جاتی تھیں۔ اور جو اُجرت سال میں اس کے حجام کو دی جاتی تھی وہ کسی بڑے سے بڑے جنرل کو بھی نہیں ملتی تھی اس کے پاس ۵۰۰ قمیصیں تھیں اور دو سو جوڑیاں ریشمی موزوں کی روزانہ تین مرتبہ لباس بدلتی تھی۔ اور جس لباس کو ایک بار پہن لیتی تھی پھر دوبارہ استعمال نہیں کرتی تھی۔ ایک مہینے میں ۳۸ ٹوپیاں نئی خرید لی تھی اور سال میں ۹۸۰ دستانے اور ۵۰۰ جوڑے جوتیوں کے ــــ ہر سال ۴۰ ہزار گنی وہ اپنی زینت میں صرف کر دیتی تھی نپولین اس کو خرچ کے لئے بہت کافی رقم دیتا تھا لیکن اس کے مصارف کسی طرح پورے نہ ہوتے تھے، چنانچہ

۲۰ ہزار گنی سالانہ جو بطور رشوت کے وہ لوگوں سے حاصل کرتی تھی اسے بھی صرف کر ڈالتی تھی اور پھر بھی یہ حال تھا کہ ایک بار نپولین کو اس کا قرض ادا کرنا پڑا جس کی مقدار ایک لاکھ پچاس ہزار گنی تھی

چاند کی روشنی بڑھ رہی ہے اس وقت علماء فلکیات کی رائے یہ ہے کہ چاند کی روشنی آہستہ آہستہ کم ہو رہی ہے، لیکن پروفیسر فوربس کی تحقیق یہ ہے کہ چاند بڑھتا جا رہا ہے اور اس کی روشنی میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ کیونکہ چاند کے اندر ریڈیم کی مقدار کثرت سے پائی جاتی ہے جو اس کی حرارت کو قائم رکھے ہوئے ہے اور اس کے حجم کو بڑھا رہی ہے۔ پروفیسر مذکور کا خیال ہے کہ چاند کی روشنی و حرارت صرف سورج ہی سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ خود اس کے اندر کا ریڈیم بہت کچھ معاون ثابت ہوتا ہے

ایک حاکم کا فیصلہ خود اپنے خلاف نیوجرسی (امریکہ) کا ایک مجسٹریٹ سائکل پر سوار چلا جا رہا تھا لیکن جب لوگوں کا ہجوم سڑک پر زیادہ ہوا تو وہ فٹ پاتھ پر ہو لیا (جو امریکہ میں مخصوص ہے صرف پیدل چلنے والوں کے لئے) یہ دیکھ کر سپاہی نے ان کو پکڑ لیا اور قریب کی عدالت گاہ میں پیش کیا جہاں کا خود ہی حاکم تھا ـــــ عدالت گاہ میں پہونچ کر یہ اجلاس کی کرسی پر بیٹھ گیا اور سپاہی سے کہا کہ الزام کی نوعیت بیان کرو، جب سن چکا تو اس نے بحیثیت ملزم کے جرم کا اعتراف کیا۔ اور اپنے اوپر ۳ ڈالر ۵، سنٹ جرمانہ کرکے حکم دیا کہ اس رقم میں سے ۸۰ سنٹ کانسٹبل کو انعام کے طور پر دیا جائے، ایک ڈالر میونسپلٹی کے فنڈ میں جمع کیا جائے اور ۹۵ سنٹ مجسٹریٹ کو فیصلہ کرنے کی اجرت دی جائے۔ چنانچہ یہ فیصلہ سنا کر جرمانہ کی رقم اس نے اپنی جیب سے نکالی اور ۸۰ سنٹ کانسٹبل کو دے کر ایک ایک ڈالر میونسپلٹی میں جمع کرنے کیلئے علیحدہ کر دیا اور ۹۵ سنٹ پھر اپنی جیب میں رکھ لئے کیونکہ یہ معاوضہ بحیثیت مجسٹریٹ ہونے کے خود اسی کا تھا

چڑیاں کیوں ہجرت کرتی ہیں یہ امر غالباً اکثر لوگوں کو معلوم ہوگا کہ بعض چڑیاں (مثلاً قاز وغیرہ) ہر سال شمال سے جنوب کی طرف ہجرت کرتی ہیں اور ہزاروں میل طے کرنے کے بعد اون مقامات میں پہونچ جاتی ہیں جو نسبتاً زیادہ گرم ہوتے ہیں ـــــ عرصہ سے ماہرین اس کی جستجو میں تھے کہ اس کا کیا سبب ہے۔ آخرکار فرانس کے ایک ڈاکٹر نے اس راز کو معلوم کر لیا اور وہ یہ ہے کہ ان طیور کے خون میں ایک خاص قسم کا کیمیاوی مادہ پایا جاتا ہے جو دن کی لمبائی کے ساتھ ہیجان میں آتا ہے اور اسی لئے وہ خریف میں جنوب کی طرف اور ربیع میں شمال کی طرف چلی جاتی ہیں

اس کی تحقیق اس طرح کی گئی کہ جب غیر موسم میں بنفشئی شعاعیں ان پر ڈالی گئیں اور اس کیمیاوی مادہ میں ہیجان پیدا ہوا تو فوراً انھوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور اُڑ کر دوسری جگہ چلی گئیں

دیوارِ چین عجائب عالم میں کسی چیز کو اتنی اہمیت حاصل نہیں جتنی دیوار چین کو حاصل ہے۔ یہ دیوار بحر اصغر

شروع ہوتی ہے اور چین، منچوریا و منگولیا سے گزرتی ہوئی صحرائے گوبی تک پہونچ جاتی ہے۔ اس کی لمبائی ۲۵۰۰ میل ہے اور ۲۵۰ ملین ٹن پتھر اس کی تعمیر میں صرف ہوئے ہیں۔ لیکن باوجود اس کے صرف دس سال میں اسکی تعمیر ختم ہوگئی کیونکہ تین لاکھ آدمی شب و روز اس میں کام کرتے رہتے تھے

اس کی بلندی ۲۰ فٹ سے لے کر ۴۰ فٹ تک ہے۔ اس میں جا بجا ۲۵ ہزار برج بنائے گئے ہیں۔ جن میں کافی فوج رہ سکتی ہے۔ یہ دیوار شرق سے غرب کی طرف گئی ہے اور ۲۵۰ قبل مسیح میں مغلوں کا حملہ روکنے کے لئے طیار کی گئی تھی۔ اس کے برجوں میں اب بھی قدیم وضع کی توپیں لوہے اور تانبے کی رکھی ہوئی ہیں۔ کیونکہ چینی ہزاروں سال قبل بارود کا استعمال جانتے تھے

دنیا کا سب سے بڑا مینار جرمنی کے ایک مہندس نے جس کا نام ہرمان ہونیف ہے ایک مینار طیار کرنا شروع کیا ہے جس کی بلندی ۱۲۰۰ فٹ ہوگی۔ اس کی چوٹی پر پانچ چکر قائم کئے جائیں گے جو ہوا کے ساتھ گردش کریں گے اور جن میں سے ہر ایک کا قطر ۴۰۲ فٹ ہوگا۔ اس سے مقصود کہربائی قوت حاصل کرنا ہے اس برج کی تعمیر اس سال ختم ہو جائے گی اور اسکی بلندی فرانس کے برج ایفل سے بھی ۲۰۰ فٹ زیادہ ہوگی

جراحی کا معجزہ شہر پیٹرس برگ میں ایک طالب علم موٹر سے ٹکرا گیا اور اسقدر خون اس کے جسم سے نکل گیا۔ کہ زندگی کی کوئی امید باقی نہ رہی۔ فوراً ایک ڈاکٹر (فریڈرک مارس) بلایا گیا۔ اس نے ضائع شدہ خون کو ایک برتن میں لے کر اس کا درجۂ حرارت وہی باقی رکھا جو جسم انسانی کا ہوا کرتا ہے۔ اور پھر بازو کی شریان کاٹ کر یہ خون اس کے جسم میں پہونچا دیا جس سے طالب علم کی جان بچ گئی

کاغذ کا خرچ اندازہ کیا گیا ہے کہ اس وقت دنیا میں ہر سال ۷۰۸۰۰۰ ٹن کاغذ صرف ہوتا ہے جس میں سے ۶۰ لاکھ ٹن اخباروں کے کام آتا ہے۔ ذیل کے نقشے سے معلوم ہوگا کہ کس ملک میں کتنا کاغذ صرف ہوتا ہے اور اسی سے وہاں کی صحافت کی ترقی کا اندازہ ہو سکتا ہے

امریکہ ۔۔۔ ۳۷۴۰۰۰ ٹن	فرانس ۔۔۔ ۴۱۱۰۰۰ ٹن
انگلستان ۔۔۔ ۹۳۱۰۰۰ ٹن	جاپان ۔۔۔ ۲۲۹۰۰۰ ٹن
جرمنی ۔۔۔ ۴۵۱۰۰۰ ٹن	کناڈا ۔۔۔ ۲۱۸۰۰۰ ٹن

تبسم کا عاشق حال ہی میں روس کا ایک شخص سرناف نامی مرا ہے جو قبل جنگ وہاں کے لکھ پتی آدمیوں میں شمار ہوتا تھا۔ اسکو خبط تھا کہ لوگوں کے فوٹو لے اس حال میں کہ وہ مسکرا رہے ہوں، چنانچہ وہ دور دراز مقامات کا سفر کرتا تھا اور گھنٹوں کیمرا لئے ہوئے کھڑا رہتا تھا کہ کوئی مسکرائے اور یہ اسکی تصویر لے لے۔ اس نے اپنی تمام عمر میں لاکھوں روپیہ صرف کر کے چار ہزار نمونے تبسم کے فراہم کئے تھے۔ لیکن جنگ کے بعد یہ روس سے نکال دیا گیا۔ اور حد درجہ عسرت و افلاس کی حالت میں مر گیا۔ کاشکے یہ شخص لاکھوں روپیہ تبسم کی تصویروں میں صرف کرنے کے بجائے لوگوں کو متبسم بنانے میں صرف کرتا

ہوگی معشوق اُس کو پورا کرے گا۔ چنانچہ تشبیہی کاشی اسی قسم کا ایک شعر کہتا ہے ؎

در رضائے یار تشبیہی حصول مدعا است　　کام دل حاصل شود خاطر بدست آورد مدا

یا

یار و غیر و چشم من کردند باہم اختلاط　　آفتاب و ذرّہ و روزن بدست آمد مرا

اگرچہ آفتاب اور ذرہ اور روزن ایک ساتھ حاصل کرنا اور ہاتھ میں رکھنا خرق عادت سے کم نہیں ہے۔ تاہم معنے کا لطف لف و نشر مرتب کے سوائے اس شعر میں موجود ہے

(مؤلف) مرزا نے ایک منطقی اعتراض پیش کر دیا ہے ہرچند کہ شعر ایک لطف شاعرانہ کیلئے کہا گیا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ مدارا سے کوئی کام اپنا تو نہیں بنا پھر بھی اتنا تو فرور ہوا کہ دوست دشمن سب اپنے ہو گئے۔ غضب یہ ہوا ہے کہ مرزا نے شاید مدارا کے معنے صلح کیلئے ہیں۔ اور یہاں رعایت کرنے کے معنی ہیں یہ شعر بالکل ایسا ہے جیسے حافظ کا یہ شعر

آسائش دو گیتی تفسیر این دو حرف است　　با دوستان تلطف با دشمنان مدارا

مدارا کے معنے رعایت کے مولانا روم کے اس شعر میں بھی ہیں

لطف حق با تو مدارا ہا کند　　چونکہ از حد بگزرد رسوا کند

یا صائب کے اس شعر میں ؎

شکستن کمر کوہ قاف چندان نیست　　بمور ہر کہ مدارا کند سلیمان است

مرزا فاخر مکین ؎　　پا بہر جانب نہادم در شہادتگاہ عشق　　از تو شمشیر و زخود گردن بدست آمد مرا

اعتراض میرزا سودا۔ میرے خیال میں مرزا صاحب کا یہ شعر کہنے سے منشا کچھ اور ہے۔ بہرحال معنی تحت لفظی یہ ہیں کہ مرزا صاحب نے جہاں قدم رکھا چند گردنیں اور چند تلواریں ہاتھ میں آئیں۔ اور یہ نہیں سمجھے کہ یہاں بدست آمد مرا کا موقع نہیں ہے۔ بلکہ نظر آنے کا محل ہے

(مؤلف) میرے نزدیک یہ اعتراض صحیح ہے۔ بدست آمد مرا کے معنے اگرچہ مرزا فاخر نے بنظر آمد مرا کے لئے ہیں مگر صحیح نہیں ہیں کسی بزرگ کا یہ شعر اسی مضمون کا ہے اور انہوں نے بہت صحیح طور سے کہا ہے ؎

گزر بکوچہ سفاک مشکل افتاد است　　بہر کجا کہ قدم مے نہم دل افتاد است

اُردو میں بھی شاید منشی امیر احمد صاحب کا ایک شعر ہے جس کا مصرع ثانی یہ ہے

. . . .　　قدم کوئی کہاں رکھے جدھر دیکھو ادھر دل ہے

مرزا فاخر مکین ؎　　گرفتہ بود دریں بزم چوں قمچ دل من　　شگفتہ روئے صبا شگفتہ کرد مرا

اعتراض مرزا سودا۔ اگر در اصل قدح میں گرفتگی کی صورت ہوتی تو دل کی گرفتگی کو اُس کے ساتھ تشبیہ دیتے شعراء میں قدح کی تشبیہ گل کے ساتھ دی جایا کرتی ہے اور گل کی قدح کے ساتھ اور غنچہ کی صراحی کے ساتھ صراحی کی غنچہ کے ساتھ۔ اور اس کے علاوہ بھی۔ مرزا صاحب کو اساتذہ کے دواوین پر عبور رہے بہ ظاہر اصل قدح کو کہیں گرفتگی کے ساتھ بندھا ہوا دیکھا ہوگا۔ اور اگر باذل کے اس شعر کو سند میں پیش کیا جائے

چہ انشاط بادہ بخشد بمن خراب بے تو　　بدل گرفتہ مانند قدح شراب بے تو

تو اس شعر کا آل مبالغہ ہے۔ یعنی باوصفیکہ قدح بہرصورت شگفتہ ہے تاہم بغیر تیرے دلِ گرفتہ معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر مرزا کا ارادہ یہ ہو کہ میرا دل اس بزم میں گرفتہ تھا اور شگفتہ روئی صہبا نے مانند قدح کے اُس کو شگفتہ کر دیا۔ تو اس صورت میں لفظ مرا بیکار ہے۔ اور اگر ارادہ اپنی ذات کی طرف ہے یعنی شگفتہ روئی صہبا نے مثل قدح کے مجھکو شگفتہ کر دیا تو اس حالت میں دل من بیکار رہے بہرصورت

بندش عجیب دارد و مضمون تازہ است　　ایں شعر نیست میت ملا دو پیازہ است

(مؤلف) میرے نزدیک قدح کی تشبیہ دل گرفتہ کے ساتھ کہیں نہیں آئی ہے۔ باذل کے شعر میں تشبیہ نہیں ہے بلکہ اس میں تو یہ کہا گیا ہے کہ قدح شراب جو اسقدر شگفتہ ہوتا ہے وہ بھی مجھے دل گرفتہ کی طرح معلوم ہوتا ہے

مرزا فاخر مکین ؎ مکن پنہاں زمن گردسرت گردم بگو قاصد　　کہ از بہر رقیب آں مہ چہ پنہانی نوشت امشب

اعتراض سودا۔ کیا خط قاصد کے مشورے سے لکھا گیا ہے جو اس سے پوچھتے ہیں۔ وہ کیا بتا سکتا ہے۔ اگر پیام زبانی قاصد کو دیا جاتا تو پوچھنا صحیح ہوتا۔ نامے کے مضمون کی قاصد غریب کو کیا خبر ہے کہ وہ بتا دے کسی کا یہ شعر ہے ؎

چوں نامہ براں میروم از شہر بہ شہرے　　بامن خبرے ہست و مرا ہیچ خبر نیست

(مؤلف) سودا کا یہ اعتراض بھی درست ہے۔ قاصد صرف قاصد ہوتا ہے اوس کی صلاح و مشورہ سے کوئی خط نہیں لکھا جاتا

مرزا فاخر ؎　　طریق اہل خرابات و خانقاہ یکے است　　دو جادہ گر بہ بیاباں فتادہ راہ یکے است

اعتراض مرزا سودا۔ اہل خرابات کے طریقوں کو معتکفان خانقاہ کے ساتھ کوئی ربط نہیں ہے۔ مصرع اولیٰ میں جو لفظ طریق ہے اس نے دوسرے مصرع کو بھی ضایع کر دیا۔ اہل خانقاہ نماز پڑھتے ہیں اور ساکنان خرابات شراب پیتے ہیں حلال و حرام شرعی کی اہل خرابات کو نزدیک کوئی قدر و منزلت نہیں ہے۔ اس شعر میں اگر طریق کی بجائے مآل اور راہ کے بجائے منزل ہوتا تو شعر درست ہو جاتا۔ چنانچہ مرزا معز فطرت کا یہ شعر ہمارے دعوے کی تصدیق کرتا ہے

تواں دیدار چراغاں ہائے کثرت وحدت اول را　　بود توحید صوری رنگ کفر آئینہ کیشاں را

(مؤلف) مرزا سودا کا اعتراض صحیح ہے۔ اور اصلاح بھی درست ہے۔ مگر مرزا معز فطرت کا جو شعر نظیر میں پیش کیا ہے یہ ہرگز
اون کے لئے مفید مطلب نہیں ٹھیر سکتا

مرزا فاخر ؎ مردم و خوں میخورم از غیرت دشنام او جان شیریں رفت و حرف تلخ او از دل نرفت

اعتراض مرزا سودا۔ اس شعر کی بنا شیریں اور تلخ کے الفاظ پر رکھی گئی ہے۔ اور یہ نہیں دیکھا کہ شعر اس سے بے مزہ ہوا جاتا ہے۔ وہ عاشق تو اصل میں بڑا خوش نصیب ہے جس کو اس کا معشوق گالیاں دے۔ ہلالی کا یہ شعر دیکھو ؎

پیش تو دعا گفتم و دشنام شنیدیم ہرگز اثرے بہتر ازیں نیست دعا را

(مؤلف) یہ مرزا سودا کی زبردستی ہے کہ اگر ایک مضمون سب کہتے چلے آرہے ہیں وہی کہا جائے۔ مانا کہ سب شعرا یہ کہتے ہیں۔ کہ معشوق کی گالی عزیز ہوتی ہے مگر ایک شخص یہ کہتا ہے کہ ہم مرتے مرگئے مگر اوس کی گالی کی جو غیرت چڑھی تھی وہ آخر تک رہی۔ آخر اس میں اس نے کیا غلطی کی اور وہ کیوں مستوجب جرم و سزا قرار دیا گیا

مرزا فاخر ؎ ہمچو صبح و شفق از ذوق شہادت دل من بر سر کوئے بتاں تیغ و کفن را برداشت

اعتراض مرزا سودا۔ کفن کی تشبیہ صبح کے ساتھ مسلمات سے ہے۔ مگر تیغ کی تشبیہ شفق کے ساتھ درست نہیں ہے چونکہ مرزا فاخر مکین اپنے آپ کو بڑا اہل نظر جانتے ہیں اس واسطے ممکن ہے کہ انھوں نے کہیں ایسی تشبیہ دیکھی ہو۔ ہمارے نزدیک خون آلودہ تلوار کی تشبیہ شفق سے دی جاسکتی ہے اور اس شعر میں تلوار کی خون آلودگی کہیں ثابت نہیں ہوتی۔ لہذا یہ تشبیہ غلط ہے۔ ممکن ہے کہ تلوار کے سرخ مخمل کے غلاف سے مراد لی گئی ہو

(مؤلف) اعتراض اس لحاظ سے صحیح ہے کہ یہاں خون آلودگی تیغ کا پتہ نہیں چلتا۔ مگر اگر ادنےٰ تعلق اور ملابست کی وجہ سے اس تشبیہ کو درست کہا جائے تو چنداں مضائقہ نہیں ہے

مرزا فاخر مکین ؎ در فقر و فاقہ میگزرد بے تو زندگی دور از تو عمر من ہمہ ماہ صیام گشت

اعتراض مرزا سودا۔ ماہ صیام میں روزہ رکھا کرتے ہیں۔ روزے کو کوئی فاقہ نہیں کہتا۔ عاشق کو بے خواب و خوری سے نسبت دیتے ہیں نہ کہ فقر و فاقہ سے۔ فقر و فاقہ فقرا کے لئے مستعمل ہے۔ عاشق کچھ بھی نہیں کھاتا پھر بھی خون جگر کھاتا ہے اس جگہ ماہ صیام سے بھی کوئی مطلب نہیں نکلتا

(مؤلف) میرے نزدیک بھی مرزا فاخر مکین کا یہ شعر مضحک ہے۔ اور سودا کے تمام اعتراضات صحیح اور درست ہیں۔

مرزا فاخر ؎ دست و پائے غیر را از گریہ رنگیں کردہ ام   گل زدم امروز بر سر خار راہ خویش را

اعتراض مرزا سودا۔ اس شعر سے جو کچھ کہ مدعا معلوم ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ ناچاری کے سبب سے غیر کے ہاتھ پاؤں کو گریۂ خونی سے رنگین کیا۔ اور رقیب گو خار راہ ہے مگر اس کے سر پر بھی پھول لگائے۔ یعنی خوشامد کی۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ عالم عجز میں پاؤں پر گرا کرتے ہیں ہاتھوں پر گرنا کہیں نہیں سنا۔ پھر جب یہ بات ہے تو ہاتھ کیونکر رنگین ہوگئے۔ یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اپنی آمد و رفت کے راستہ میں چونکہ میں خون رویا اور اس راہ سے غیر بھی گزرتا ہے تو اس واسطے اُس کے ہاتھ پاؤں رنگین ہوگئے۔ اس صورت میں بھی غیر کے پاؤں رنگین ہونا درست نہیں ہاتھوں کا رنگین ہونا اب ثابت نہیں ہے سوائے اس کے کہ کوئی چوپایوں کی طرح رستہ چلے۔ مگر یہ طریقہ ہی جدا ہے۔ اور اگر ہندی محاورہ نظم کیا ہے تو بات ہی دوسری ہے

(مؤلف) دست و پا یہاں زاید ضرور ہے مگر بُرا نہیں معلوم ہوتا۔ اس قسم کے تصرفات شعرا کے یہاں پائے جاتے ہیں

مرزا فاخر ؎ گرچہ دارد لکنت اما حرف میگوید درست   دل شکستن خاطر آزردن نمیداند کہ چیست

اعتراض مرزا سودا۔ یہ شعر اوس غزل میں کا ہے جس میں معشوق کو عالم طفلی میں قرار دیا ہے۔ اور تمام غزل میں یہی روش ہی ہے۔ ہم کو اس شعر کے مصرع اولے پر اعتراض ہے۔ صحیح بات ادا کرنے کو لکنت سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ جب کہ زبان سے درست بات نکلے تو لکنت کہاں رہے گی۔ اور اگر شاعر کی مراد لفظ درست سے یہ ہے کہ اوس کا قول و فعل درست ہے تو اس صورت میں یہ اعتراض پڑتا ہے کہ جس کو ایسا نادان کہا گیا ہے اور مصرع ثانی میں اوس کی نادانی کا اس قدر اظہار کیا ہے کہ بسبب کمی عمر کے آزردہ کرنا اور دل توڑنا نہیں جانتا تو اس کا قول و فعل درست کیونکر ہوگا۔ اسی قسم کے مضامین دوسرے اساتذہ کے یہاں بھی ملتے ہیں۔ شاپور

طفل است و بہ عاشق روش زیست نداند   صد جاں اگر از کس طلبد نیست نداند
دلدار نداند دل ما از دل اغیار   داند کہ دل است این و دل کیست نداند
شاپور بہ محشر چہ حساب است و کتاب است   با ہیچمدانی کہ دہ از بیست نداند

(مؤلف) مرزا سودا کا اعتراض لغو تو نہیں ہے مگر تاہم نہایت کمزور ہے۔ غرض مرزا فاخر مکین کی یہ ہے کہ اگرچہ اُس کی زبان میں لکنت تو ضرور ہے مگر اس لکنت پر بھی جو بات کہتا ہے وہ صحیح کہتا ہے۔ وہ بات جو کہتا ہے اس سے دل ٹوٹتا ہے اگرچہ بذات خود اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ کسی کا دل ٹوٹے۔ مگر اس کے الفاظ میں خاصیت ہی یہ ہے

مرزا فاخر مکین ؎ تقصیر چیست مشت مزن پنجہ ام مپیچ   قرباں شوم بزور از یں ناتواں مرنج

اعتراض مرزا سودا۔ مشت زنی اور پنجہ پھیرنا پہلوانوں کا کام ہے۔ معشوق کا کام غمزہ و ناز و ادا کا ہے کہ عاشق کا دل

فریفتہ ہو۔ اور عاشق کی حالت پر افسوس آتا ہے جو ناتوان ہو۔ اگرچہ شعراء نے پنجہ مروڑنا اور مشت زنی معشوق کے لئے باندھا ہے۔ مگر اس صورت سے جیسا کہ مرزا صائب کہتے ہیں ؎

دست پیچیدن و دل بردن و پنہاں کشتن ٭ ہرچہ میگوئی ازاں موئے میاں مے آید

(مؤلف) غالباً مرزا سودا کو اعتراض کرنے کے بعد یاد آیا ہے کہ پنجہ مروڑنا اور مشت زن ہونا شعراء صفات معشوق میں لاتے ہیں مگر پھر بھی مشت زن ہونا اس سے ثابت نہیں ہوا۔ اور یہاں موئے کمر کے پنجہ مروڑنے کا ذکر ہے جو موزوں ہے۔ میں سعدی کا ایک شعر سناتا ہوں جس میں انھوں نے مشت زن کو صفات نازنیں سے قرار دیا ہے

غلام آب کش باید و خشت زن ٭ بود بندہ نازنیں مشت زن

مرزا فاخر مکین ؎ شہادت از کف او بہتر است بسم اللہ ٭ کند شروع بخیرے کہ بہتری داند

اعتراض سودا۔ دوسرے مصرع میں لفظ شروع بہت برا ہے لفظ شروع اس کام کیلئے لکھتے ہیں جو طویل ہو جائے۔ یہاں پر محض حشو اور زائد ہے اور وہ بھی نہایت بے ربط ہے۔ شہادت ایسا کام ہے کہ ایک تلوار کی ضرب سے پورا ہوتا ہے اوس میں نہ صعوبت کشی کی ضرورت ہے اور نہ اس کی کہ معشوق روزانہ ایک ضرب لگاتا رہے۔ آج خنجر سے حملہ کیا اور کل تیر سے حملہ کیا۔ اور اس طرح حملہ کرتا رہا۔ اگر شہادت اسی طریقہ سے ہوتی ہو تو خیر کوئی مضائقہ نہیں ہے

(مؤلف) مرزا سودا کا یہ اعتراض بھی کوئی وزن نہیں رکھتا۔ اس واسطے کہ ان کا بڑا ایراد یہ ہے کہ شروع وہاں استعمال کیا جاتا ہے جہاں وقفہ ہو۔ میں کہتا ہوں کہ وقفہ میں یہ ضرورت نہیں ہے کہ وہ زیادہ ہو جب قتل کے لئے تلوار اٹھائی وہی شروع ہے اور جب قتل ہو چکا وہ ختم ہے۔ اس میں طول مدت کی کیا ضرورت ہے۔ ہمیشہ کہا جاتا ہے کہ پھر اب اس کام میں دیر کیا ہے شروع کیجئے۔ ایسے بہت سے شعرا اساتذہ کے یہاں ہیں اردو کا ایک شعر مجھے بھی یاد ہے ٭ امیر ؎

شروع عشق ہے اور ابتدائے آہ ہوتی ہے ٭ مبارک طفل دل کی آج بسم اللہ ہوتی ہے

مرزا فاخر مکین ؎ بلبل ز رشک سوخت کہ از شور نالہ ام ٭ ہر نیش خار بر سر دیوار روشن است

چوں مجمر و سپند ز شور صفیر من ٭ صیاد غافل و قفس و دانہ روشن است

اعتراض مرزا سودا۔ ان دونوں شعروں میں لفظ روشن آیا ہے اور سوختن کے معنے نکلتے ہیں۔ ہم نے سوائے شمع اور آتش اور چراغ کے روشن کا اطلاق دوسرے پر نہیں دیکھا۔ اس کی سند کی ضرورت ہے اگر شمع کی تشبیہ کے ساتھ لایا جاتا تو بھی کوئی مضائقہ نہ تھا

(مؤلف) مرزا سودا کے اس اعتراض سے مجھے بھی اتفاق ہے کہ فارسی میں روشن، شمع اور آتش اور چراغ کے سوائے دوسرے

لفظوں کے ساتھ جلانے کے معنے میں نہیں آتا۔ مگر اس کا کیا علاج ہے کہ مکین کے شعروں کے یہ معنے ہی نہیں جو دہ مجھے۔ پہلے شعر کے معنے یہ ہیں۔ کہ بلبل اس رشک سے جل رہی ہے کہ میری آہ سے ہر کانٹا روشن ہو گیا ہے۔ روشن کے معنے یہاں یہ ہیں کہ ضیا دینے لگا اور اس کے رشک کی وجہ یہ ہے کہ وہ عمر بھر نالہ و فریاد کرنے کے باوجود کبھی ایک خار کو بھی نہ جلا سکی۔ دوسرے شعر کے یہ معنے ہیں کہ صیاد کو خبر بھی نہیں ہے اور حالت یہ ہے کہ میری آہ سے مجمر اور سپند کی طرح دانہ اور قفس روشن ہو رہے ہیں۔ یہاں بھی روشنی کے معنی محض جلنے کے نہیں ہیں۔ اور یوں تو لفظ روشن ہمیشہ سوختن کے مفہوم کو اپنے ساتھ لئے ہی رہتا ہے

مرزا فاخر مکین ؎ نیارد تاب شوخ من ہجوم عشقبازاں را ｜ شہے از کثرت خیل و حشم رنجیدہ را ماند

اعتراض مرزا سودا ۔ سلطنت کا کام خیل و حشم کی فراوانی سے درست ہوتا ہے۔ اور بادشاہ سپاہیوں کے جمع ہونے پر ناز کرتے ہیں نہ کہ رنجیدہ ہوتے ہیں۔ یہ تمثیل درست نہیں ہے

(مؤلف) مرزا فاخر مکین کا مقصد یہ ہے کہ جیسے کوئی بادشاہ نوکروں چاکروں کی کثرت سے گھبرا جاتا ہے بالکل اسی طرح وہ بھی ہجوم عشاق سے گھبرا گئے ہیں۔ سودا کا اعتراض جس خیال کو دامن میں لئے ہوئے ہے اوس لحاظ سے درست ہے

مرزا فاخر مکین ؎ در خیال باغ خلد و شاخ طوبیٰ شیخ خفت ｜ کوئے او را با قد دلجوئے او در خواب دید

اعتراض مرزا سودا ۔ جو چیز کہ آدمی کی ہم جنس ہو یا اُس کی ذات کے ساتھ تعلق رکھتی ہو اوس کو خواب میں دیکھ سکتے ہیں یعنی جیسے کہ کوئی کہے کہ فلاں کو پر تکلف لباس پہنے دیکھا۔ یا زید کو عمر کے ساتھ خواب میں دیکھا تو یہ درست ہے۔ لیکن گلی یار دوازہ کو قد کے ساتھ کیا مناسبت ہے گلی کو قد کے ساتھ دیکھنا نیا مضمون ہے

(مؤلف) اعتراض دُرست ہے اگرچہ مصنف کا مطلب یہ ہے کہ معشوق کو اس کی گلی میں دیکھا

میر و سودا

دلّی کی آبادی اور سرسبزی کے زمانے میں جب فرد فرد مئے عشرت سے مست اور بادۂ سرور سے ساغر بدست تھا۔ یہ دونوں استاد فن دہلی ہی میں مقیم تھے۔ سودا تو دلی کے رہنے والے ہی تھے ان کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ رہے میر صاحب۔ انھوں نے بھی اپنے مولد و مسکن کو دلی کی بود و باش کے خاطر تج دیا تھا۔ یہیں آرہے تھے۔ اور یہ رہنا وہ رہنا تھا جس نے وطن اور وطن کی یاد۔ اعزا اقربا احبا سبھی کو دیسے بھلا دیا تھا۔ میر صاحب کی شاعری کو جو کچھ عروج ہوا جتنا عروج ہوا دلی ہی کے گلی کوچوں میں ہوا۔ اور یہیں وہ مشہور ہوئے یہیں ان کا کلام مشہور ہوا۔ محفلیں۔ مجلسیں۔ جلسے۔ مجمعے ان کے کلام سے مستفیض ہوئے۔ امرا اور رؤسا۔ ارباب ذوق اہل ذوق نے ان کی قدر کی۔ وہی دن۔ وہی زمانہ وہی عالم۔ وہی وقت اور وہی موسم مرزا کی شہرت کا تھا۔ ان کی شعر گوئی

سے بھی محفلیں گونج اٹھی تھیں ارباب ادب مست ہو گئے تھے۔ اہل دل کے کان ان کی طرف لگے ہوئے تھے۔ ارباب دول اہل ہمت انھیں اپنے یہاں بُلاتے اور سر آنکھوں پر بٹھلاتے تھے۔ زمانہ کا دستور ہے کہ جب دو کامل فن کہیں ہوتے ہیں۔ اور دونوں ایک دوسرے سے بڑھے چڑھے سمجھے جاتے ہیں تو ان میں موازنے شروع ہو جاتے ہیں۔ جاننے والے تو جاننے والے نا آشنائے فن تک میزان تقابل ہاتھ میں عقل و ہوش کے پلوں میں دونوں کے کمالوں کو تولتے رہتے ہیں۔ جانچتے ہیں۔ بانچتے ہیں۔ ہنستے ہیں قہقہے لگاتے ہیں۔ کبھی اس کو اُس سے بڑھاتے ہیں اور کبھی اوس کو اس سے آگے پہونچاتے ہیں۔ یہی ہوتا رہتا ہے۔ یہ دونوں سنتے رہتے ہیں، پہلے کچھ دنوں اونھ کہکر ہنستے ہیں۔ ٹالتے ہیں۔ اور ہوتے ہوتے آخر کار اپنے کمال پر خودی اور خود بینی کی نگاہ ڈالتے ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ دن آجاتا ہے کہ ایک دوسرے کو اپنا حریف اور مدمقابل ٹھیراتا ہے۔ یہی سودا اور میر میں بھی ہوا۔ اوّل اوّل میں دونوں دوست تھے اور ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔ جیسے میر سودا کو پورا شاعر مانتے تھے ایسے ہی سودا بھی میر کو یکتائے فن جانتے تھے مگر بھڑکانے والوں نے دونوں کو بھڑکا دیا۔ منھ دیکھے کی باتیں تو خیر آداب شرافت میں داخل تھیں وہ کہاں جاتیں۔ مگر اتنا ضرور ہوا کہ دونوں نے اپنی اپنی جگہ پر ایک دوسرے کی طرز و روش پر ایک نگاہ گرم ایسی ڈالی کہ خوبیاں تو دھواں بنکر اُڑ گئیں۔ خامیاں اور بُرائیاں رہ گئیں جو نظر آنے لگیں۔ دبی دبی زبان سے ایک نے دوسرے کو کہا جو کچھ کہا۔ اور اڑتا اڑتا ایک نے دوسرے کی بابت سنا جو کچھ سنا۔ سودا کی رائے مسلم ہم تک نہیں پہونچی مگر ضمیر متکلم کی طرح اسی اعتراض میں آپ اُس کو پائیں گے اور اُس سے حظ اٹھائیں گے۔ مگر میر کی سودا کی بابت جو رائے تھی وہ سودا ہی کی زبانی ہم تک پہونچی ہے جو بجنسہ آپ کو سناتے ہیں۔ سودا میر صاحب کو ایک خط لکھتے ہیں اور اسی کے ذریعہ سے اپنی بابت میر کے خیال و رائے کا اظہار کرتے ہیں سنئے

میر صاحب مرے کرم فرما — مبدع عقل دکان و فہم و ذکا
عرض رکھتا ہوں اے کرم گستر — اعتراضی سے پر مجھے ہے ڈر
کھول سکتا نہیں میں اپنے لب — اس سبب سے کہ ہے یہ جائے ادب
جو سخن آپ کی زباں سے سنا — کچھ نہ بولا سوائے امنّا
لیکن اب آپ سے کئی اک عرض — کرنی مجکو ہوئی ہیں واجب و فرض
آپ کے ہوتے جب کسی کے حضور — مرثیہ کہنے کا ہوا مذکور
وہاں یہ بولی زبان سحر طراز — حق میں اس بے نوا کے بندہ نواز
ریختے کی وہ جو کہے ہے غزل — لفظ و معنی میں اس کے کم ہے خلل
مرثیوں کے سنے جو کتنے بند — بندش اون کی نہ آوے اپنی پسند
معنی اون کے تب آئیں فہم کے ہاتھ — شرح لکھ دے جو مرثیے کے ساتھ

سودا کے اس بیان سے یہ معلوم ہوا کہ میر صاحب سودا کے مرثیے کی نسبت کوئی اچھی رائے نہ رکھتے تھے اور غزل گوئی

میں ان کو مسلم جانتے تھے۔ اسی پر سودا برہم ہوئے پہلے کچھ دبے دبے الفاظ لکھے۔ پھر اسی کے ساتھ ساتھ میر صاحب کے سلام اور مرثیے پر اعتراض بھی کر دئے۔ پہلے اعتراض کرنے کے عنوان دیکھئے اور پھر اعتراض دیکھئے کہتے ہیں کہ ؎

جب یہ تکرار میں سنے یہ سخن
دل میں گزرا کہ مرثیے کا فن

ہوئیگا فن شعر سے باہر
میر کی گفتگو ہے دال اس پر

اس کا آگاہ جو کوئی ہو خوب
سیکھئے اوس سے کہنے کا اسلوب

ماہر اس فن کے جب کئے میں غور
دل میں تم سا کوئی نہ ٹھہرا اور

آپ کے مرثیوں کو تب اکثر
ڈھونڈھنے میں لگا ہر اک کے گھر

ہاتھ آیا مرے بہ سعئ تمام
غرض اک مرثیہ اور ایک سلام

فہم میرا جب اُن میں در آیا
واہم اپنا بہت بجا پایا

مرثیہ کہنے کا ہے جو آئیں
واقعی فنِ شاعری میں نہیں

بلکہ وہ چیز جس سے شعر ہو رد
مرثیے میں روا رکھے ہے یہ کد

مطلب اس کام کی جُدی ہے راہ
شاعر اس راہ سے نہیں آگاہ

ضد کے مارے تو یوں وہ کچھ ہی کہے
چاہے ایسا کہے تو کہہ نہ سکے

شعر کے قاعدے کی موجب ہم
کہنے لاگے تھے مرثیہ کم کم

سوز بانی تمھاری اے مخدوم
ہوا اپنے تئیں کو یوں معلوم

مرثیہ وہ ہے جسے عوام الناس
روئیں سُن سُن پڑا ہیں جب انکے پاس

اور سودا کا مرثیہ سُن کر
چپ ہی رہ جاؤں ہوں میں سر دھنکر

کیسی ہی طرح کوئی اس کو بنائے
لیکن اس پر کبھو نہ رو تا آئے

بارہا یہ سخن ہوا ظاہر
حق میں بندے کے غائب و حاضر

سچ ہے یہ مجکو مرثیے کا ڈھب
نہیں آتا وہ جس سے رو دیں سب

آپ کے مرثیہ کا ہوں قائل
خون جس سے عوام کا ہے دل

سنکے بجا ہے جس پہ بُد ہو تک
شام سے کوٹیں سینہ صبح تلک

لیکن افسوس صد ہزار افسوس
یہی آتا ہے بار بار افسوس

بُد ہو جتا سمجھ جسے رو دیں
معنے اُس کے نہ مجھ سے حل ہو دیں

جب یہ صورت خیال کرتا ہوں
اسی غیرت کے مارے مرتا ہوں

غرض اس امر میں کہوں اک بات مانوں تو جانیں گے ہے اپنی نجات
وہ جو اک مرثیہ اور ایک سلام دستخط خاص سے رکھے ہے غلام
مَن بکُاکے حدیث پر کیجئے عمل اور معنے اُس کے رکھ لیجئے
میں بھی آگاہ اس سے تا ہوؤں چھوٹی امت میں بیٹھ کر رو دوں
شعر میر سے اعتراض سودا۔
اے نبی کے باطناً رُتبے کے والی السلام ظاہراً اُن سے بھی ہو اک نوع عالی السلام
پہلے یہ کہئے اسے کرم فرما باطنی رتبہ ہے نبی کا کیا
آپ پر جس طرح سے ہو تحقیق اپنے مخلص سے بھی کہو تحقیق
دوسری بات یہ جو کہہ ڈالی ہو تم اک نوع ان سے بھی عالی
اور اُس نوع کو بیاں کیجے مجھ کو آگاہ اس سے کر دیجئے
یا وہ جس طرح مجھ پہ ہے اثبات کہو تو عرض میں کروں وہ بات
گرچہ وہ شخص ہے امام حُسین ایک دن جس کو سید الثقلین
لگے فرمانے مجھ کو بتلا تو مرتبہ میں بڑا ہوں میں یا تو
تب یہ بھائی پہ لوٹ کر بولا کیوں یہ سررشتہ بات کا کھولا
عرض کرتا ہوں مجھ کو کیجئے معاف دل میں کر لیجیو سنکے یہ انصاف
ماں مری فاطمہ علی ہے باپ والدین اپنے اب بتا دیں آپ
اور جس شخص کا نواسا ہوں امر ہو تو اُسے بھی بتلا دوں
حق میں جس کے ہے آیۂ لولاک بزبانی خالق افلاک
سب نبی جان اس کو مانیں ہیں اپنے نانا کو آپ جانیں ہیں
یہ لطیفہ ہوئے خوش آں سرور نور چشم اپنے سے عرض سُن کر
متبسم ہو تب یہ فرمایا سخن راست حق کو بھی بھایا
اُن کے رُتبے کے ہے بہم یہ نمط لیک جو آپ سمجھے ہیں سو غلط
ظاہراً تم کو ہے یہ قصہ یاد جس کے رد سے کی فہم کو برباد
رُتبۂ باطنی پیغمبر اپنے نزدیک ایک ٹھیرا کر
نسبتی مرثیہ کو تم فایق اس پہ سمجھے ہو یہ نہ تھا لایق
باطنی رُتبہ جو نبی کا ہے اُس کے مافوق ہے سو بیجا ہے

موجب اس رتبہ کے نبیٔ کریم　　آپ کو بولے احمدِ بے میم
میم احمد سے کر دیا جب رد　　تھا جو احمد سو ہو گیا وہ احد
احدیت سے ہے مرتبہ بالا　　سمجھے گا تب ہی پوچھنے والا
فہم یوں، باطنی سے ماہر ہے　　اُس سوا رتبہ جو ہے ظاہر ہے
کس طرح سے کہو تو سبطِ نبی　　رتبۂ باطنی سے ہو عالی
حرف میرا نہیں ہے لایعنی　　فہم کے معترض ہیں یہ معنی
غش نہیں صرف اس کے مضموں میں　　خلل اس سے زیادہ موزوں میں
کہو تقطیع شعر کو کر دوں　　بندش الفاظ کی ہے ناموزوں
مصرعِ ثانی سے بھی ہو آگہ　　نوع کے عین کو نہیں جاگہ

(مؤلف) سودا نے جو اعتراض مذہبی کیا ہے وہ تو عقاید کے متعلق ہے۔ اور اس کا باز پُرس کرنے والا وہی ہو سکتا ہے جس کی شان میں یہ سب کچھ کہا ہے۔ یا پھر اس سے بھی آگے بڑھئے تو احکم الحاکمین کے دربار کے فیصلہ کا انتظار کرنا چاہئے۔ اور ظاہر ہے کہ ایک جلا در بار قیامت ہی میں منعقد ہوگا۔ وہاں جو کچھ بھی ہو۔ سودا حق بجانب رہیں یا میر اب رہا عین کے گرنے کا معاملہ وہ میر صاحب کی عین الکمال کے لئے چشم زخم سے کم نہیں۔ اور سودا کا اعتراض کرسی نشین ہے۔ رہی بندش شعر وہ یقینی میر کے مرتبہ سے بہت پست اور بہت گری ہوئی معلوم ہوتی ہے

میر ؎
اعتراض۔

اے تصدق یہ پدر یہ مادر اور یہ جدِ پاک　　ختم ہے تم پر یہ سب صاحب کمالی السلام
گر نہیں جانتے تو سُن لو اب　　ساتھ اس کے ہے جس کا نام نسب
گر تعلق کمال کا ہوتا　　پسر نوح باپ سا ہوتا
منحصر کچھ نہیں نسب پہ کمال　　جس پہ ہو فضل ایزدِ متعال
بندش الفاظ کی غلط اس کی　　بُری ہے معنی کی نمط اس کی
پیش مصرع میں لفظ یہ سے مراد　　آپ کو ہے بزرگیٔ اجداد
پر نکلتا ہے اس سے یوں یہ کہ　　سب تصدق پدر سے لے تا جدّ

(مؤلف) اس میں شک و شبہ کی گنجایش نہیں ہے کہ میر صاحب کے شعر کی بندش نہایت سست ہے

میر ؎　　لامکاں بھی ایک بازی گاہِ طفلی ہے ترا　　کوئی مکان تم سے نہیں پایا میں خالی السلام

اعتراض سودا ؎ عوض کوئی مکاں جو لفظ فصیح   بولتے کوئی جا تو تھا یہ صحیح

(مؤلف) اعتراض و اصلاح دونوں درست ہیں

میر تقی ؎ ہے گریباں گیر گردوں تیرے لشکر کا لہو   تا قیامت کم نہیں ہوتی ہے لالی السلام

اعتراض سودا۔ خوں سوا ایسی جا میں لفظ لہو   نہیں آیا محاورے میں کبھو

اور لالی کا حرف کرو حک   ہو نہ ثابت شفق سے یہ جبتک

تا نہ تشبیہ ہو شفق کی یہاں   معنی جو جا ہو اس میں تم سو کہاں

(مؤلف) دونوں اعتراضات مہمل ہیں۔ ایسی جگہ جو لفظ لہو نہ آنے کی شرط لگائی ہے اس کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی۔ لالی کے ساتھ شفق کی شرط لازمی لگانا بھی تناسب الفاظ کی جکڑ بندے آگے نہیں بڑھنا

میر تقی۔ اے ہو الاول ہو الآخر کے مالک بالیقین   وے ہو الظاہر ہو الباطن کے والی السلام

اعتراض سودا کیا ہو الاول و ہو الآخر   کیا ہو الباطن و ہو الظاہر

حق کی جانب پھری ہے انکی ضمیر   اس سوا جس پہ کہیئے ہے تکفیر

کیا یہ خاطر میں آپ کی آیا   مالک اس کا حسین ٹھیرایا

(مؤلف) یہ اعتراض بھی شرعی نقطۂ نظر سے ہے اور جو فتوے دیا گیا ہے درست ہے

میر تقی ؎ یہ شہادت تیری تائید انا بشر کی تھی   کیا حدیث مثلکم تم نے نبھائی السلام

یہ شہادت تیری کلمے کی شہادت ہی تمام   عبد ہو کے بات تم نے ساری پائی السلام

ورنہ تم بے شبہ و بیشک احمد بے میم ہو   لی مع اللہ کے ہو تم ہر وقت حالی السلام

اعتراض سودا۔ کرتے ہو تم خطاب یوں با امام   ہے تمھارا یہ مدعائے کلام

ہے نبی و امام حق کی ذات   حق کو کیا کام از حیات و ممات

انا بشر جو بولے پیغمبر   اس کے اثبات پر دیا تیں سر

رتبہ تیرا ہے جوں خدا عالی   عبد تیں ہو کے بات سب پالی

تو بلاشک ہے احمد بے میم   لی مع اللہ میں ہر زماں ہے مقیم

ہے تصوف کی راہ سب یہ درست   بندش الفاظ کی پر اتنی سست

نہیں لفظوں سے معنی کو کچھ ربط — سمجھے وہ ہی جسے ہو کچھ سا خبط
اور ہے راہ جو شریعت کی — وہاں خدا ہے خدا نہیں ہے نبی
انا بشر ہے آیۂ قرآں — وحی بہرِ پیمبرِ دوجہاں
مثلکم جزو ہے اس آیت کا — منفصل باندھنا نہ میں سمجھا
کس کے اس کا بیاں ہو شانِ نزول — جس طرح چاہیئے سوائے رسول
میں سُنتے ہیں سلام تو اکثر — لفظ و معنی میں بہتر از بہتر
لُطف ہے اس سلام میں اک اور — کہ نہیں اس میں السّلام کو محصور
بس جو بے ربط اسقدر ہو سلام — بھیجے تم سا اُسے بہ نذرِ امام

(مؤلف) اعتراض درست ہے۔ دو شعروں میں ایک آیت کے ٹکڑے کرکے باندھنا کسی صورت میں صحیح نہیں معلوم ہوتا

اعتراضات بر مرثیہ میر تقی از سودا

قبل اس کے کہ اعتراضات قلم بند کئے جائیں بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سودا کا مرثیہ اور اعتراضات کے متعلق جو کچھ خیال ہے وہ لکھ دیا جائے۔ تاکہ دیکھنے والوں کو یہ معلوم ہو سکے کہ وہ کیا کہتے ہیں اور کون کون سی چیز مرثیہ میں اون کی نظر میں کھٹکتی ہے۔ وہ کہتے ہیں

" اگر حق تعالےٰ نے صبح کاغذ سپید کے مانند شام سیہ کرنے کو یہ خاکسار خلق کیا ہے۔ تو ہر انسان کے دماغ میں چراغ ہوش دیا ہے۔ چاہیئے کہ دیکھ کر نکتہ چینی کرے۔ ورنہ گزند زہر آلود سے بے اجل کاہے کو مرے۔ ہر چند کلام استادان سلف پر بھی غلطی کا گمان ہے۔ کس واسطے انسان مرکب من الخطاء والنسیان ہے۔ لیکن خدائے تعالےٰ نے جنھیں شعور کرامت کیا وہ سمجھتے ہیں۔ ناگاہ اگر لکھ پتی کے بدرہ سے زر قلب نکل آوے تو اس پر کسی کو غور و خوض نہیں اور جو خریطۂ صراف سے ایسا کچھ پائیے تو اُسے کہیں ٹھور نہیں۔ پس لازم ہے ذی ہوش کو ربط الفاظ سے معنی کو سمجھ کر دے۔ تا وبال فیضان ناطقہ اپنی گردن پر نہ لے چنانچہ شیخ سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں۔

اوّل اندیشہ وانگہے گفتار — پائے پیش آمدست پس دیوار

انسان جس فن سے آپ کو کما ینبغی ماہر نہ کرے۔ چاہیئے کہ اوس میں اپنی حد سے سخن باہر نہ کرے۔ گفتگوئے جاہل پیش عالم مورد انفعال بلکہ خموشی ہے۔ اوس کی برابر صد فضل و کمال ؎

بات آوے نہ تو چُپ رہ کہ گماں کے نزدیک — سو طرح کا ہے سخن پردۂ خاموشی میں

اگر ناگاہ جس فن کا آگاہ ہے اوس فن کی بولی بولے۔ گویا ہر دو لب اس کے دروازہ رسوائی کے پاٹ ہیں کہ خود آپنے

منھ پر کھولے ؎

طرفہ میوہ ہے یہ سخن اے دوست مغز شیریں و تلخ جس کا پوست

مخفی نہ رہے کہ عرصۂ چالیس برس کا بسر ہوا ہے۔ کہ گوہر سخن عاصی زیب گوش اہل ہنر ہوا ہے اس مدت میں مشکل گوئی دقیقہ سخن سنجی کا کام رہا ہے۔ اور سدا مرغ معنی عرش آشیاں گرفتار دام رہا ہے۔ باوصف اس کے قول خذ ما صفا دع ما کدر پر عمل کیا ہے۔ بلکہ تمام عالم کے سخن انصاف پر تلمیذانہ گوش دیا ہے۔ جس کی زبان پر انصاف قبیل اعدات سے حرف واقعی اور منصفانہ جاری ہوا ہے۔ باللہ کہ مرتبہ من تعلم دفاً فھو مولاہ طاری ہوا ہے۔ اور بے اختیار زبان سے یہ مصرع سرزد ہوا ہے

وائے بر جان سخن گر بہ سخنداں نرسد

لیکن مشکل ترین دقایق طریقہ مرثیہ کا معلوم کیا۔ کہ مضمون واحد کو ہزار رنگ میں ربط معنی سے دیا۔ چنانچہ اس کام میں محتشم سا کسو نے عز قبول نہیں پایا ہے۔ اُسی مرحوم مغفور نے یہ فرمایا ہے ؎

جمعے کہ پاس محفل شاں داشت جبرئیل گشتند بے عماری و محمل شتر سوار

بس چاہیئے کہ مرتبہ در نظر رکھ کر مرثیہ کہے نہ کہ برائے گریۂ عوام اپنے تئیں ماخوذ کرے۔ تا در مقالہ ہے کہ عقلا جو نہ سمجھیں اور خبط تضحیک و قصد بُکا میں رہیں اوس کا سیاق و سباق بھلا دریافت کریں اور بہوٹ بہیں ؎

معنی لفظوں سے ہوتے ہیں روپوش یہاں تلک رتبۂ سخن پہونچا

اس قدر لکھنے کے بعد سودا نے میر صاحب کے مرثیہ پر اعتراضات شروع کیے ہیں۔ جن میں سے سب تو نہیں مگر چیدہ چیدہ چند اعتراضات یہاں لکھے ہیں

میر تقی ؎

دلوں پہ محبوں کے حالت عجب ہے مصیبت ہے ماتم ہے غم ہے تعب ہے
غرض کیا کہوں کس روش کا غضب ہے حسین علی کی شہادت کی شب ہے

اعتراض سودا ؎

یہ مطلع جو ہے آپ کا تو عجب ہے کہ یہ ریختے کہنے والوں کا ڈھب ہے
و لے فیض کا ناطقے کے سبب ہے نہ جانو کہ یہ مرثیہ یو نہیں سب ہے

(مؤلف) اعتراض کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی

میر تقی ؎

محبوں نے دل سے خوشی سب تجی ہے ہر اک گھر میں ماتم کی مجلس رچی ہے
عجب طرح کی وائے ویلا مچی ہے کہ روز قیامت کی گویا یہ شب ہے

اعتراض سودا ؎

تجی کا رچی قافیہ شائگاں ہے سو وہ ہر سہ مصرع میں صورت کہاں ہے
رچی اور مچی قافیہ جبکہ یہاں ہے تو یہ قافیہ ہر طرح سے کہ ڈھب ہے

(مؤلف) سودا نے اس قافیہ پر پہلے یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ شائیگاں ہے۔ تجی اور رچی میں بے شک شائیگاں کا عیب موجود ہے
دوسرا اعتراض یہ ہے کہ رچی اور پچی قافیہ کہنے کے بعد یا پہلے تجی کا قافیہ نادرست ہے۔ یہ اعتراض بھی غلط نہیں ہے۔ اس قسم کے قافئے
لانا قافیہ کا ایک بہت بڑا عیب ہے۔ اس کو اکفا کے عیب سے متعلق کیا جا سکتا ہے۔ اکفا عیوب قافیہ میں سے ایک عیب کا نام
ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ حرف روی مختلف ہو یعنی مطلع کے دونوں مصرعوں یا رباعی کے تینوں مصرعوں میں دو حرف یا تین حروف
روی مختلف آئیں اور یہ حروف مختلف ایسے ہوں جن میں باہم قافیہ ہونے کی صلاحیت موجود ہو۔ مثلاً رباعی کے ایک مصرع
میں حروف روی (ز) ہو دوسرے میں ذال۔ تیسرے میں (ظ) اگلے لوگوں نے اس کو بہت زیادہ معیوب بنایا ہے۔ اور
اسی قبیل سے حروف عربی و فارسی و ہندی کا جمع کرنا عیب سمجھا ہے۔ مثلاً تپ اور کب۔ ناچ اور تاج۔ آخرالذکر کو میں بھی مذموم
جانتا ہوں۔ مگر اول الذکر یعنی ض۔ اور ذال کو ہم قافیہ کرنا اس زمانہ میں میرے نزدیک اس وجہ سے عیب نہیں ہے کہ ایسے حروف
کا ہم قافیہ کرنا اس لئے عیب ہے کہ عرب کے لہجہ میں ان سب کے مخارج جدا جدا ہیں۔ اور وہ سب کو اس طرح ادا کرتے ہیں کہ سننے
والا دونوں حروف کی علیحدگی کی تمیز کر لیتا ہے۔ اور اسی کی تقلید اہل فارس نے کی ہے۔ پھر اہل فارس کا اتباع تو گویا اُردو کے بانیاں
شعر کا ایک ضروری اور لابدی فرض تھا وہ بھلا کیوں اس کو جائز رکھتے۔ فارس والوں کی دیکھا دیکھی انہوں نے بھی آنکھ بند کر کے یہ
فتوے دیدیا کہ ایسے حروف کا جمع کرنا حرام قطعی ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ ہندوستان کے لہجے میں نہ تو قاریوں کو شعر پڑھنا پڑتا
ہے اور نہ ض۔ ظ۔ ذ۔ ز۔ س۔ ث۔ ص۔ وغیرہ کے لہجے علیحدہ رہ گئے ہیں یکساں مخارج ہیں۔ یکساں طرز ادا ہے۔ یکساں
تلفظ ہے پھر اس قید و بند سے آزاد خیالات کی گردن جکڑنا کیا معنی رکھتا ہے

اب لیجئے حروف ہندی کے اختلاف کا جھگڑا وہ بہت بڑا ہے۔ رچی اور تجی کا قافیہ صحیح نہیں مگر غور کرنے اور دیکھنے پر یہ
معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُردو شعر گوئی کے ابتدائی دور کی ناواقفیت یا عدم پابندی نے جہاں شعراء کے لئے اور آزادیاں دے رکھی
تھیں۔ وہاں ایک یہ بھی تھی۔ ان کو زیادہ تر ادائے خیال اور حسن بندش۔ گداز جذبات سے کام تھا۔ اس کے علاوہ وہ کسی بات
کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ لفظوں میں انھوں نے اصلاحیں دیں۔ مخفف کو مشدد۔ مشدد کو مخفف انھوں نے باندھا۔ ساکن کو متحرک۔
متحرک کو ساکن انہوں نے کیا۔ محاوروں میں تصرفات سے انہوں نے کام لیا۔ تذکیر کو تانیث اور تانیث کو تذکیر کہہ جاتے ہیں وہ لائے
جہاں یہ سب ہوا وہاں ایک یہ معمولی سی بات بھی ہو گئی۔ سودا کا اعتراض درست اور بجا۔ مگر وہ میر صاحب کے معاصرین میں سے
کس کس کو روکیں گے۔ اور اس غلطی پر کسے کسے ٹوکیں گے میں اس کی مثالیں کچھ خود تلاش کر کے لکھتا ہوں۔ کچھ جا بجا سے نقل کر
دیتا ہوں۔ یہ عیب ہے تو یوں سمجھئے کہ آپ عیبوں کے ایک جنگل میں گھوم رہے ہیں۔ اور سب کی اس بھول بھلکڑی کو دیکھ رہے
ہیں۔ میر صاحب کے ایک معاصر میر حسن کو لیجئے وہ کہتے ہیں۔

میر حسن (۱) لئے بیٹھے ہاتھ میں مالنیں — چمن کو لگیں دیکھنے بھالنیں
(۲) لگا پھرنے وہ سرو جب پاؤں پاؤں — لگے بڑھنے آداب اُس کے ناؤں

عشرت (۳) سوائی بانسے پردہ رالے چتوڑ غرض اب مستعد بیٹھا ہی ہر طور

یار محمد خاں شوکت (۴) عناں سمند صبا دم پکڑ جو کاوے پہ ڈالا کمر راست کر

ایسے شعر ڈھونڈھیں تو بہت سے ملیں گے۔ مگر کیا فائدہ۔ انہوں کو دیکھئے اور سوچئے کہ غریب سودا کس کس پر اعتراض کرتے اوروں کو جلانے دیکھئے، وہ خود کو بھی اس عیب سے محفوظ نہیں رکھ سکے۔ اور ایک جگہ چھوڑ دو دو جگہ اس غلطی میں مبتلا ہوئے کہتے ہیں

سودا ؎ ستوں اس کے تلے یہ پاؤں ہیں چار رہے دو دانت آگے سو ہیں اڑواڑ

" الغرض اس طرح سے کشتی لڑ ڈال ہنکا گلے کا پاؤں پر

اگر میر صاحب ہی سودا سے پوچھ بیٹھتے کہ کیوں میاں۔ یہ چار کا قافیہ اڑواڑ۔ اور لڑ کا قافیہ پر۔ کیا ہے تو میں جانتا ہوں سودا جواب دینے کے بجائے یہ کہکر گردن جھکا لیتے کہ حضرت خطا ہوئی۔ یا بہت ہٹ دھرمی پر آتے تو کہدیتے کہ سب کہتے ہیں ہم نے کہا تو کیا بگڑا

اس سے بھی زیادہ لطیفہ سنئے مولانا حالی نے اپنے مقدمہ میں نواب مرزا شوق لکھنوی کی مثنوی کا یہ شعر جہاں نقل کیا ہے ؎

کوئی مرتا ہے کیوں بلا جانے ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

وہاں لکھا ہے ردیف وقافیہ میں عروضیوں کی بیجا قیدوں کی چنداں پابندی نہیں کی مگر جو اصل مقصود ردیف قافیہ سے ہوتا ہے اوس کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ مثلاً شعر مذکورۂ بالا۔ اس ردیف کو ہمارے شعراء ضرور غلط بتائیں گے مگر ردیف کا جو اصل مقصد ہے وہ اس سے بخوبی حاصل ہوتا ہے کیونکہ سامع کو یہ شعر سنکر واحد اور جمع کا فرق مطلق محسوس نہیں ہوتا اور یہی ردیف کا ماحصل ہے

میر تقی ؎ کوئی دل نہیں جس کو ماتم نہوے گا قیامت میں یہ کچھ نہوئیگا جواب ہے

اعتراض سودا ؎ جو تقطیع سے شعر کی تم ہو ماہر تو افزودئی ہمزہ دیا ہے ظاہر

مگر صاحب اس بحر کے رکن آخر نہوگا ہے موزوں نہوئیگا وہ کیے

(مؤلف) میر صاحب کے یہاں نہوے گا ہے۔ اور سودا کہتے ہیں کہ نہوگا ہونا چاہئے۔ اس میں میر صاحب کی غلطی کا خیال نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس وقت کی رسم کتابت ہی ایسی تھی۔ سے۔ کی بجائے۔ سیں۔ اور۔ کو۔ کی بجائے۔ کون۔ سبھی لکھتے تھے۔ رہا تقطیع کا معاملہ تقطیع میں جب نہوے گا کی بجائے نہوگا بھی موزوں ہے۔ تو پھر شکایت بیکار۔ اور اعتراض لاحاصل ہے

میر تقی سے

یہ پیار دن طرف ہوا شور محشر — زمیں آسماں ہو رہا ہے تل اوپر
حسین علی پر چلایا ہے خنجر — ہر اک جان اس غم سے خنجر طلب ہے

اعتراض سودا

کہو پہلے مصرع کو یوں مجھ سے سنکر — زمانے میں ہر سمت ہو شور محشر
یہ تقطیع ناموزوں اے بندہ پرور — زباں پر فصیحوں کو لانا غضب ہے

(بلاغت) معلوم نہیں سودا نے یہاں تقطیع کی ناموزونی کا اعتراض کس بنا پر کیا ہے۔ یہاں تعقید کا اعتراض البتہ ہو سکتا تھا جو سودا کی اصلاح سے دُور ہو گیا۔ اور لطف یہ ہے کہ اعتراض کی قابل باتوں پر اعتراض بھی نہیں کیا۔ مثلاً حسین علی جو بجائے حسین ابن علی کے لایا گیا ہے۔ یہ ترکیب اُردو کے لحاظ سے مستند اور وقیع نہیں ہے اگرچہ عربی میں درست ہو ایسے ہی۔ تل اوپر۔ بجائے تلے اوپر کے غلط ہے اور اس کو اگر صحیح پڑھیں تو شعر ناموزوں ہوا جاتا ہے

میر تقی سے

بجا ہے کہ لوہو کے دریا بہائے — یہ کشتی فلک کی لہو میں ڈبائے
شہ تشنہ لب کا کسے غم سنائے — یہ کس مُنہ سے کہئے کہ وہ خشک لب ہے

اعتراض سودا۔

کسے کہتے ہو کون ہے وہ کہاں ہے — کہیں ہر سہ مصرع میں اس کا نشاں ہے
جو اپنے تئیں اس گفتگو کا گماں ہے — تو یوں کہئے کہنے کا اسکے یہ ڈھب ہے
بجا ہے کہ لوہو کے دریا بہاؤں — یہ کشتی فلک کی لہو میں ڈباؤں
شہ تشنہ لب کا کسے غم سناؤں — یہ کس مُنہ سے بولوں کہ وہ خشک لب ہے

(بلاغت) سودا کا یہ اعتراض بھی صحیح نہیں ہے۔ اور جب اعتراض درست نہیں تو پھر اصلاح کیوں درست ہو گی۔ اس واسطے کہ میر صاحب نے اس بند کو پہلے بند سے متعلق رکھا ہے۔ کہ اوس میں وہ کہہ چکے ہیں "ہر اک جان اس غم سے خنجر طلب ہے" اور وہ یہ سب کچھ جان ہی کے متعلق کہہ رہے ہیں۔ کہ جان کے لئے یہ زیبا ہے اور یہ زیبا ہے وغیرہ

میر تقی سے

لعینوں نے اسکو وطن سے بُلایا — بمعہ اقربا لا کے بن میں بسایا
پھر اُس جور سے اس کو مارا ہی پیاسا — کہ جس غم سے خورشید کے تئیں تب ہے

اعتراض سودا۔

بمعہ اقربا نے زافزودنی ’’ با — کیا غیر موزوں یہ مصرع سراپا
نہیں اس میں ہرگز مرا حرف بیجا — کہ اوزان اشعار میرے بجب ہے

(بلاغت) سودا کا اعتراض بالکل صحیح ہے۔ میر صاحب سے تعجب ہے کہ انہوں نے کیونکر جاہلوں کے فقرے سے کام لیا ہے۔ ... وغیرہ

خواتین کے مطالعہ کی کتابیں

گوڈری کا لال ؏ہ۸ر
شوکت آرا بیگم حصہ ۱ و ۲ ۔۔ سے
〃 حصہ سوم سے ر
سعیدہ کے خطوط عہ ر
پیاری سہیلی ۱۰ر
نئی نویلی پیاری سہیلی ؏ہر
عورتوں کی انشاء عہ ر
انشاء نسواں ۸ر
سیرۃ الکبریٰ ؏ہ ر
طرز زندگی حصہ ۱ و ۲ عہ ر
تحریرات تیموریہ عہ ر
ازواج النبی ۱۲ر
ازواج الانبیاء ؏ہ ر
سیرۃ عائشہ صدیقہ ۱۰ر
عفت المسلمات ؏ہ ر
سبیل الجنان ؏ہ ر
بچوں کی پرورش ؏ہ ر
حرز طفلاں عہ ر
تہذیب نسواں عہ ر
بیوی کی تعلیم ؏ہ ر
بیوی کی تربیت عہ ر
تربیت اطفال ۱۰ر

فرائض مادری ۱۲ر
افسانہ نادر جہاں ؏ہ ر
اقبال دلہن ؏ہ ر
حسن معاشرت ؏ہ ر
ایامیٰ ؏ہ ر
سولہ کہانیاں ۱۲ر
سترہ کہانیاں ۱۲ر
سولہ قصے ۸ر
مراۃ العروس ۸ر
بنات النعش ۸ر
توبۃ النصوح ۱۲ر
کنیز فاطمہ ۸ر
پنکھڑیاں ۸ر
نصیحت کا کرن پھول ۸ر
برکات سلطانی ۸ر
ابن الوقت ؏ہ ر
چند پند ۴ر
منتخب الحکایات ۴ر
تندرستی عہ ر
حفظ صحت عہ ر
طبیب نسواں ؏ہ ر
رہبر صحت ۸ر

ناول، ڈرامے اور افسانے

قطرات اشک ؏ہ ر
جتندر ناتھ عہ ر
بس کا روگ عہ ر
فسانہ سعید ۸ر
خوفناک ڈکیتی ؏ہ ر
سیلاب اشک با تصویر ؏ہ ر
بے زبان دوست ۶ر
جمال ہم نشیں عہ ر
تفسیر عصمت عہ ر
جوہر قدامت ؏ہ ر
نائٹ غیبی ۸ر
پُراسرار قتل عہ ر
اعلان آزادی ۵ر
سرگزشت ہاجرہ ۱۰ر
نوحہ زندگی ۱۲ر
قلب حزیں ۸ر
عروس کربلا ؏ہ ر
شہید مغرب عہ ر
ماہ عجم ؏ہ ر
شمع کمال ؏ہ ر
سراب مغرب ۸ر
منازل السائرہ کامل عہ ر

سوہنی ۱۲ر
وداع ظفر ؏ہ ر
یاسمین شام ؏ہ ر
طوفان اشک عہ ر
شاہین و دراج ۸ر
درس عشق ؏ہ ر
گرد پتی چور ؏ہ ر
تین بندوق باز ؏ہ ر
کرشمۂ رقابت ۸ر
انقلاب قسطنطنیہ ۸ر
شاہد رعنا ؏ہ ر
وڈیا کی سرگزشت ۴ر
شگوفۂ محبت ۶ر
نسوانی زندگی ۸ر
ولایتی نتھی ۸ر
شمع خاموش ۸ر
شب زندگی کامل عہ ر
موودہ ۸ر
چندر کلا ۸ر
گلستان خاتون ؏ہ ر
صبح زندگی ؏ہ ر
شام زندگی عہ ر

تاریخ و سوانحعمریاں

تاریخ مغرب ؏ہ ر
مختصر تاریخ اسلامی ۸ر
〃 〃 〃 حصہ ۲ ۹ر
〃 〃 〃 حصہ ۳ ۱۰ر
〃 〃 〃 حصہ ۴ عہ ر
الصالحات ؏ہ ر
امت کی مائیں عہ ر
الزہرا ۱۲ر
اسوۂ حسنہ ۸ر
ہندو شعراء ؏ہ ر
شوہر نہار ؏ہ ر
سوانح اکبر الہ آبادی عہ ر
سفرنامہ عراق عہ ر
تاریخ افاغنہ ؏ہ ر
اسلام اور غیر مسلم ۹ر
سیر المصنفین حصہ ۱ عہ ر
〃 〃 حصہ ۲ سے
تاریخ اسلام ۵ جلد صہ ر
اخبار الاندلس ۳ جلد عہ ر
خلافت مرصدیین ؏ہ ر
خلافت مولدین عہ ر
عرب اور اسکا مستقبل ؏ہ ر

لغات و ادب

ہماری زبان ۸ر
لغات سعیدی للعہ ر
لغات کشوری سے ر
گنجینۂ تحقیق مجلد للعہ ر
منتخب اللغات فارسی عہ ر
محاورات نسواں ۸ر
جواہر اللغات ۱۲ر
گوہر اللغات ۱۲ر
چراغ سخن عہ ر
دکھنی لغت ۸ر
جواہرات کلیات نظیر ؏ہ ر
عزیز اللغات عہ ر
تذکرہ ریختی عہ ر
تاریخ اردو مع قدیم ؏ہ ر
دکن میں اردو عہ ر
منتخب کلام ہندی عہ ر
رباعیات عمر خیام عہ ر
منتخب کلام ہندی عہ ر
اردو کے اسالیب بیان ؏ہ ر
تصریح الاغلاط ۴ر
مخفف اردو ۵ر
نور اللغات ۴ جلد للعہ ر

دواوین فارسی

دیوان شمس تبریز ؏ہ ر
کلیات عراقی ۱۲ر
دیوان حافظ ؏ہ ر
دیوان بیدل ؏ہ ر
دیوان عرفی ۱۲ر
کلیات جامی عہ ر

کلیات غالب ؏ہ ر
کلیات صائب ؏ہ ر
دیوان ناصر علی ۶ر
کلیات سعدی ؏ہ ر
کلیات حزیں ؏ہ ر
دیوان عنصری ۱۲ر

دیوان غنی کشمیری ۶ر
دیوان ہلالی ۶ر
اسرار خودی و رموز بے خودی سے ر
زبور عجم سے
پیام مشرق سے
قصائد عرفی مجلد سے

دواوین اردو

کلیات ظفر عہ ر
کلیات مومن ؏ہ ر
دیوان ناسخ ؏ہ ر
کلیات میر ؏ہ ر
کلیات سودا ؏ہ ر
کلیات انشاء ؏ہ ر

کلیات نظیر اکبر آبادی عہ ر
گلزار داغ ؏ہ ر
دیوان درد ۱۲ر
دیوان ذوق ۱۲ر
گلکدۂ عزیز عہ ر
مراۃ الغیب عہ ر

صنم خانۂ عشق عہ ر
فریاد داغ ؏ہ ر
عالم خیال با تصویر عہ ر
دیوان شہیدی ۴ر
کلیات اکبر الہ آبادی ؏ہ ر
نغمۂ دل شاہجہانپوری ؏ہ ر

قیمت ۸/

نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شائع ہوتا ہے

رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا

سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (سے)

بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۴	فہرست مضامین دسمبر سنہ ۱۹۳۳ع	شمارہ ۶

نگار

اڈیٹر:۔ نیاز فتحپوری

جلد ۲۴	دسمبر ۱۹۳۳ء	شمار ۶

ملاحظات

عیش یا مسرت

فرمانروائے خلد آباد کا خزانہ لعل و گہر سے لبریز ہے، اس کی حکومت لاکھوں مربع میل تک پھیلی ہوئی ہے، لطف و تفریح کے جتنے اسباب دولت سے فراہم ہو سکتے ہیں وہ سب مہیا ہیں۔ اسی کے ساتھ دولت حُسن بھی موجود ہے، رنگینی شباب کی بھی کمی نہیں۔ ظاہر ہے کہ اُس سے زیادہ مسرور اور کون ہو سکتا ہے۔ دفعۃً قصر کے اندر ایک ہنگامہ برپا ہوتا ہے، طبیبوں کے چہرہ سے سخت فکر کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں۔ کیونکہ بادشاہ جو ایک زمانہ سے بیمار ہے، اس وقت نہایت شدید قسم کے درد قلب میں مبتلا ہو جاتا ہے اور کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔ بادشاہ تڑپ رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ کوئی میری سلطنت لے لے میری تمام دولت پر قبضہ کرلے، لیکن اس عذاب سے لمحہ بھر کے لئے کسی طرح نجات دلادے"۔۔۔۔۔ ایک غریب لکڑہارا باہر سڑک پر قصر کے پاس سے گزرتا ہوا دل ہی دل میں کہتا ہے کہ " دولت بھی کیا چیز ہے، کاشکے مجھے بھی حاصل ہوتی اور میں بھی ایسی ہی مسرور زندگی بسر کرتا جیسی بادشاہ بسر کر رہا ہے۔۔۔۔"

ملکۂ نسریں جو دولت کے لحاظ سے موتیوں کی ملکہ اور حُسن کے لحاظ سے پھولوں کی رانی مشہور ہے، اپنے پاس کیا کچھ نہیں رکھتی۔ وہ ہمیشہ مخمل و حریر کی نرمی میں سوئی، اور لعل والماس کی روشنی میں بیدار ہوئی۔ اس نے ہمیشہ پھولوں کی چادروں پر قدم رکھا، اور نغمہ و رنگ میں لب کھولے ـــــ حُسن و جمال کا یہ عالم کہ

جو در پر آگیا اُسے دیوار کر دیا

شباب کا یہ رنگ کہ جس نے ایک بار دیکھا جی سے بیزار ہو گیا ـــــ

سنگ مرمر کے حوضوں میں بلوریں فوارے چاروں طرف موتی بکھیر رہے ہیں، باغ کے کنجوں میں ہر جگہ تلاطم نکہت برپا ہے، پھولوں کی کثرت نے قصر کے گوشہ گوشہ کو سیلاب رنگ سے لبریز کر رکھا ہے، بربط و رباب کے تاروں سے راگنیاں بلند ہو ہو کر فضا میں مستی کی کیفیت پیدا کر رہی ہیں ـــــ مگر ـــــ

ملکۂ نسریں ایک کمھلائے ہوئے پھول کی سی افسردگی لئے ہوئے سیج پر پڑی ہوئی ہے اور ریشمی تکیے اس کے نہ تھم سکنے والے آنسوؤں سے تر بتر ہو رہے ہیں۔ کنیزیں التجائیں کر رہی ہیں، سمجھا رہی ہیں۔ لیکن اس کی ہچکیاں بند نہیں ہوتیں۔ کیوں ؟

صرف اس لئے کہ شاہزادۂ نیلوفر جس کے عشق میں وہ برسوں سے مبتلا تھی کسی اور سے محبت کرنے لگا ہے ـــــ

ٹھیک اسی وقت ایک غریب کسان کی بیوی ٹھنڈی سانس بھر کر قصر کے سامنے سے یہ کہتی ہوئی گزر جاتی ہے کہ ـــ

" ملکۂ نسریں بھی کیسی خوش نصیب عورت ہے، کاشکے میں بھی ایسی ہی مسرور زندگی بسر کر سکتی "

حقیقتوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور پردوں کے نقش و نگار کو حقیقت باور کیا جاتا ہے ـــ یہ ہے انسانی تمناؤں کی ذہانت اور یہ ہے ہماری آرزوؤں کی انتہائی فراست ـــــ ایک غریب تمنا کرتا ہے۔ کاشکے وہ دولتمند ہوتا، ایک دولتمند اپنے بہت سے روحانی آزار دور کرنے کے لئے غریب ہونے کی آرزو کرتا ہے، ایک فقیر بادشاہ کی جاہ و ثروت کو رشک کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ اور ایک بادشاہ اُس آزادی کے لئے تڑپ رہا ہے جو فقیر کو حاصل ہے

سوال یہ ہے کہ انسان عیش کا خواہشمند ہے یا مسرت کا کیونکہ سامانِ عیش، سامانِ مسرت نہیں، اور اسباب مسرت اسبابِ عیش نہیں ـــــ پھر اکثر ایسے ہیں جو عیش کو مسرت جان کر اُسی کی تمنا کرتے ہیں اور کمتر ایسے ہیں جو صرف مسرت کے طلبگار ہیں اور عیش کے خواہشمند نہیں

عیش نام ہے جسم کی آسایش کا اور خواہش ظاہری کی لذت کا ـــ مسرت نام ہے نفس کے اطمینان اور روح کی راحت کا ـــ پھر یہ تو ٹھیک ہے کہ اسباب عیش حاصل ہونے کے بعد انسان مسرت روح کے لئے تڑپتا رہے لیکن

راحتِ رُوح سے آشنا ہونے کے بعد سامانِ عیش کی جستجو کرنا کیا معنی ؟

اس وقت جبکہ دنیا میں مادہ رُوح سے برسرِ پیکار ہے، عیش کی خواہش، مسرت کے صحیح مفہوم کو دنیا سے محو کر دینا چاہتی ہے، یعنی اس وقت جبکہ زر و دولت کی محبت نے دنیا کے اقتصادی و معاشی مسایل کو یکسر آئین درندگی بنا رکھا ہے، کیا یہ سوچنے کی بات نہیں کہ اس کا نتیجہ کیا ہونے والا ہے اور جس عمیق غار کی طرف "انسانیت" کو ڈھکیلا جا رہا ہے اس سے بچنے کی کوئی تدبیر ہے یا نہیں ؟

امریکہ بیتاب ہے کہ ساری دنیا کی دولت اس کے قبضہ میں آجائے، فرانس مضطرب ہے کہ جرمنی پر اس کا تسلط قائم ہوجائے، جرمنی بیقرار ہے کہ فرانس کو فنا کردے، اٹلی بے چین ہے کہ رومہ کی قدیم سطوت استبداد کو پھر زندہ کردے، جاپان کوشش کر رہا ہے کہ وہ ایشیا کو اپنا محکوم بنالے ——— لیکن کیا کوئی ایسی قوم بھی ہے جس نے اس جغرافی وملکی امتیاز کو مٹا کر صرف "انسانیت" کی خدمت کو اپنا مقصود قرار دیا ہو ؟

یہ ہے مادی ترقی کا وہ پہلو جس پر آج فخر کیا جاتا ہے اور یہ ہے علم وحکمت کی کاوشوں کا وہ منظر جسے انسان کا منتہائے نظر قرار دیتے ہیں ——— پھر آج تو نہیں لیکن کل وہ وقت آئے گا جب انسانیت کا خون آلود چہرہ لوگوں کی نگاہ سے اس حجاب کو دور کرے گا اور بتائے گا کہ عیش کی راہیں، مسرت کی راہوں سے ..... بالکل مختلف ہیں اور وہ جسم جو عرصہ تک پھولوں پر لوٹتے رہتے ہیں ان کے لئے آخر کار پنکھڑیاں بھی خار ہو جایا کرتی ہیں

یقیناً حصولِ مسرت، حصولِ عیش کا منافی نہیں بشرطیکہ "عیش" انفرادی حیثیت نہ اختیار کرلے، لیکن انسان کی اس خود غرضی کو مٹانے والا کون ہو سکتا ہے ؟ - کیا وہ انسانی قانون جو صرف تیغ وتفنگ کی مدد سے ایک کو غالب اور دوسرے کو مغلوب قرار دیتا ہے ؟ - کیا مادی علوم وفنون کی وہ ترقی جو سب سے زیادہ مہلک گیس طیار کرکے انسان پر عرصۂ حیات تنگ کر دینا چاہتی ہے ؟ - کیا سرمایہ و دولت کا وہ نظامِ استعماری جو کمزور وضعیف انسانوں کا صرف خون نچوڑ سکتا ہے ؟ ——— نہیں ——— بلکہ صرف وہ بلند تعلیم جو تمام نوعِ انسان کو ایک رشتۂ اخوت سے وابستہ کرنا چاہتی ہے، وہ نظامِ اخلاق جو رنگ ونسل کے امتیاز کو مٹا کر جملہ افرادِ انسانی کو ایک سطح پر لانا چاہتا ہے، وہ اُصولِ حیات جو اسپارٹا والوں کی طرح ضعیف وکمزور کو ہلاک کر دینے کا حامی نہیں ہے، وہ طریقِ ہدایت جو ترقی کا مفہوم زر ودولت کا انبار نہیں بلکہ صرف دنیا کا امن وسکون قرار دیتا ہے ———

کہا جاتا ہے کہ ایسی بلند تعلیم صرف ایک ہے، ایسا نظامِ اخلاق صرف ایک ہے، یہ اصولِ حیات صرف ایک مسلک نے بتایا، یہ طریقِ ہدایت صرف ایک مذہب نے پیش کیا ——— لیکن اب اس تعلیم ومذہب کی جستجو کہاں کی جائے

کتابوں میں ؟ - مگر عمل کو کتابوں سے کیا تعلق ـــ اُن انسانوں میں جواب موجود نہیں ہیں ؟ مگر اس سے نتیجہ !ـــ اُن مُدعیان بلند بانگ کی زندگی میں جو اس وقت موجود ہیں ؟ ـــ ہاں، مگر اس لئے نہیں کہ ان سے کوئی درس حاصل کیا جائے۔ بلکہ صرف اس لئے کہ اُس تعلیم پر آنسو بہایا جائے جس کے یہ علمبردار ہیں اور اُس مذہب کے جنازہ پر ماتم کیا جائے جس کو دفن کرنے کے لئے یہ نہایت تیزی سے اپنے شانوں پر اٹھائے لئے جا رہے ہیں

امن وسکون کا واحد ذریعہ

امن وسکون کی جستجو دنیا کو آج ہی پیدا نہیں ہوئی ہے، بلکہ ہمیشہ سے تھی اور ہمیشہ رہے گی، لیکن اس وقت تک یہ جوہر گرانمایہ دستیاب نہیں ہو سکا ـــ سب سے پہلی کوشش اس باب میں "مذہب" کی وساطت سے کی گئی پھر اس سے یہ تو ضرور ہوا کہ اوّل اوّل ایک محدود رقبہ یا مخصوص عقائد کے لوگوں میں باہم رابطۂ اتحاد پیدا ہو گیا لیکن جس حد تک دنیا کا تعلق تھا اور تمام بنی نوع انسان کا سوال تھا اس نے خونریزی و خون آشامی کے سوا کوئی خدمت انجام نہیں دی۔ اور جس حد تک عقائد کا تعلق تھا، اُن میں بھی اختلاف پیدا ہو کر اس نے گوشت کو ناخن سے جدا کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی ـــ یہودیوں نے مسیح کے ساتھ کیا سلوک کیا، عیسائیوں نے یہود کو کس طرح پامال کیا، صلیب و ہلال کی جنگ نے کتنے انسانوں کا خون بہایا اور اس کو بھی چھوڑئیے، خود رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کلیسا میں باہم کس کس طرح آگ اور خون کا کھیل کھیلا گیا، خود امویین و علویین کے درمیان کیسے کیسے دردناک واقعات قتل و ذبح رونما ہوئے۔ اور آج بھی شیعہ سنیوں کے جو تعلقات ہیں کسی سے مخفی نہیں ـــ کیا مذہب کی ناکامی کا ثبوت اس سے زیادہ کوئی اور پیش کیا جا سکتا ہے ـــ یہی وجہ تھی کہ رفتہ رفتہ لوگوں کے دلوں سے مذہب کی عزت و وقعت کم ہو گئی۔ اور آج دنیا اس کی مخالفت پر کمربستہ نظر آتی ہے ـــ مگر ـــ سوال یہ ہے کہ کیا مخالفین مذہب نے کوئی راستہ امن وسکون کا ڈھونڈھ نکالا ہے ـــ کہا جاتا ہے کہ مذہب کے بجائے وطنیت و قومیت " کو اختیار کیا جائے، یعنی ملک وملت کی محبت ہی اساس مذہب و مذہبیت ہے۔

ـــ اچھا یوں بھی سہی ـــ لیکن خدا را کوئی بتائے کہ ان مدعیانِ وطنیت و پرستارانِ قومیت نے کیا کیا

کیا موجودہ ہنگامۂ مسابقت اسی وطن پرستی کا لازمی نتیجہ نہیں ؟ کیا مادی تفوق و برتری کے لئے ایک کا دوسرے کو ہلاک کرنے کے لئے آمادہ رہنا اسی " حبِّ قومیت " کا اقتضا نہیں ؟ کیا استعماری خواہش اور استہلاک بازاری کی طلب اسی " ملت نوازی " کا دوسرا نام نہیں ؟

کہا جاتا ہے کہ یہ دور ہے علوم و فنون کی ترقی کا، عقل و فراست کی ارزانی کا، ہوش وگوش کی فراوانی کا، لیکن یہ حقیقت کسی سے مخفی ہے کہ ترقی علوم کی غایت کیا ہے، عقل و ذہانت کا مصرف کیا ہے اور فہم و تدبر کی کارفرمائیاں کیا ہیں ـــ انسان، عناصر کو مغلوب کر رہا ہے صرف اس لئے کہ اُن سے خون بہانے کے زیادہ مؤثر ذرائع حاصل

کرسکے، برق و شعاع پر متصرف ہو رہا ہے محض اس خیال سے کہ موت کے دیوتا پر اس کا اقتدار قائم ہو جائے، عالم ایجاد و اختراع میں وہ بے پناہ اقدامات سے کام لے رہا ہے، مگر صرف اس اصول کو سامنے رکھ کر کہ ایک قوم کی حیات دوسری قوم کی موت پر منحصر ہے —— انسانی ارتقا، جو یزداں پر کمند ڈالنے چلا تھا صرف اہرمن پر قابو حاصل کرسکا۔ آج انسان سے قیام امن کے پردہ میں توپیں ڈھلوا رہا ہے، تلواروں پر زہر آلود صیقل کرا رہا ہے اور جینے عرصۂ حیات کو تنگ کرنے کے لئے انسان کے سینوں کو ہر مہلک حوصلہ کے لئے غیر معمولی طور پر وسیع کر دیا ہے ——

یہی وجہ ہے کہ ٹھیک اسی وقت جبکہ زبان سے لوگوں کو "دعوتِ امن" دی جا رہی ہے، دل فتنہ و فسا کی آگ سے معمور نظر آتے ہیں اور ہر شخص اپنی جگہ سمجھ رہا ہے کہ ایک عالمگیر دامن سوز جنگ کا ہونا ناگزیر ہے

پھر ظاہر ہے کہ کرۂ ارض کے باشندوں کا یہ خوف بے وجہ نہیں ہے، اور زبانِ خلق کی یہ ہم آہنگی ایک ایسا "اعلان خداوندی" ہے جس کو آج نہیں تو کل پورا ہو کر رہنا ہے —— جب مذہب و قومیت دونوں سے "نجات و سکون" کی برکت دنیا کو حاصل نہ ہوسکی تو سوچنا چاہئے کہ کیا کوئی اور صورت اس کے حصول کی ذہن میں آسکتی ہے یا نہیں؟ ——

دنیا میں اختلاف دو قسم کے ہوا کرتے ہیں، ایک متعلق بہ "مزعومات" دوسرا متعلق بہ "اغراض"۔ یعنی ایک صورت تو اختلاف کی یہ ہے کہ میں ایک چیز کو سنہرا بتاتا ہوں آپ اُسے روپہلا کہتے ہیں درانحالیکہ اس کے سنہرے یا روپہلے ہونے سے ہماری زندگی یا ہمارے اعمال پر کوئی اثر نہیں پڑتا، دوسرا اختلاف یہ ہے کہ سامنے ایک اشرفی پڑی ہوئی ہے اور ہم آپ دونوں اپنے آپ کو اس کا مستحق ظاہر کرتے ہیں —— یقیناً اوّل الذکر اختلاف ایسا ہے جس پر باہم جنگ کرنے کی ضرورت نہیں اور مؤخر الذکر اختلاف میں مقاومت و مقابلہ ناگزیر ہے

اوّل الذکر اختلاف میں دنیا کے وہ تمام اختلافات شامل ہیں جو مذہب و مذہبیات کے سلسلہ میں پیدا ہوتے ہیں، اور ان پر لڑنے جھگڑنے کی کوئی ضرورت نہیں اگر ایک شخص پتھر کے سامنے سر جھکا دیتا ہے تو ہمارا کیا نقصان ہے اور اگر کوئی کعبہ کا طواف کرتا ہے تو کسی کو کیوں ناگوار ہو —— عبادت و طاعت کی غایت تمام مذاہب و مسالک میں ایک ہے اور جب ذریعہ و اسلوب کے تغیر سے مقصود میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوتا تو باہم گرآویزش کیسی؟ اس لئے وہ لوگ جو صرف اختلاف عقیدہ و مذہب کی بنا پر ایک دوسرے کے دشمن ہو جاتے ہیں، اُن سے زیادہ احمق دنیا میں کوئی نہیں اور اگر ہر شخص اپنی جگہ اس مسئلہ پر ٹھنڈے دل سے غور کرے تو بہ آسانی اس لعنت سے آزاد ہوسکتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ عوام اس پر توجہ نہیں کرتے اور ہمارے علماء جو ہمارے قائد و رہبر بنے ہوئے ہیں قصداً اس طرف آنا ہی نہیں چاہتے، کیونکہ ان کا اثباتِ وجود اور ان کا اقتدار تو صرف اسی عقیدہ پر قائم ہے

کہ اُن کے سوا دنیا میں جو کچھ ہے وہ حرف غلط ہے اور خدا کی تمام برکتیں انھیں کے لئے مخصوص ہیں۔

بہرحال اس وقت خصوصیت کے ساتھ ہندوستان میں اختلافِ مذہبی کے محو کرنے کی سخت ضرورت ہے لیکن افسوس ہے کہ علماءِ مذہب یوں تو اتفاق و اتحاد کی زبردست حمایت کرتے ہیں لیکن جو اصل پھانس ہے اس کے نکالنے کی کوشش کبھی نہیں کرتے

ظاہر ہے کہ جب تک ایک مسلمان، ہندو کو کافر سمجھتا رہے گا اور ایک ہندو، مسلمان کو ملکش و ناپاک باور کرتا رہے گا، دونوں کے دل کیونکر صاف ہو سکتے ہیں، خلوص کس طرح پیدا ہو سکتا ہے اور جب تک صداقت اور سچائی سے عصبیت دور نہ ہو جائے، حقیقی اتحاد کا پیدا ہونا بالکل محال ہے

دوسرا اختلاف جو مادّی اغراض سے متعلق ہے، وہ صحیح معنی میں وہ ہے جس میں اس وقت دوَلِ مغرب مبتلا ہیں۔ بظاہر صلح جوئی کے لئے کانفرنسیں منعقد ہو رہی ہیں، اسلحہ کی تخفیف کے لئے بحث و تمحیص ہو رہی ہے، لیکن حقیقتاً ہر ملک اس فکر میں ہے کہ دوسرے کو کھا جائے اور سوائے اس کے کسی اور قوم کی تجارت و صنعت کو فروغ نہ ہو

اس کا علاج بھی صرف ایک ہے اور وہ یہ .... کہ جس طرح اختلافِ مذہبی، مذہبیت کی عصبیت محو کرنے سے دور ہو سکتا ہے، اسی طرح قومیت کی تفریق کو بھی مٹا دینا چاہئے، اور کرۂ ارض کے تمام ملکوں کو خواہ وہ ایشیا میں ہوں یا یوروپ میں، افریقہ میں ہوں یا امریکہ میں صرف ایک مرکزی نظام حکومت سے وابستہ کر دینا چاہئے

کس قدر حیرتناک منظر ہے کہ ایک طرف تو علوم و فنون کی ترقی مکان و زماں کے بُعد کو اس حد تک محو کر دے کہ وقت و فاصلہ کا گویا کوئی مفہوم ہی باقی نہ رہے اور دوسری طرف انسانی دلوں میں جو احساس کے لحاظ سے ایک ہی چیز ہیں، آسمان و زمین کا بُعد پیدا کر دے

اگر دُنیا کو واقعی امن و سکون کی ضرورت ہے تو اس کا حصول نہ تجارتی مفاہمت سے ہو سکتا ہے، نہ تخفیف اسلحہ کی کوشش سے، بلکہ صرف اس طرح کہ تمام ممالک کے اہل الرائے ایک جگہ جمع ہو کر، حکومتوں کے اختلاف کو مٹائیں اور تمام ممالک کو اصول فیڈریشن پر ایک نظام حکومت سے وابستہ کر دیں۔ لیکن اگر ایسا نہ کیا گیا۔ اور واقعی نہیں کیا جائے گا تو یقین رکھنا چاہئے کہ دنیا کو ایک بار ضرور تباہ ہونا ہے خواہ وہ تباہی اس کو پھر عہدِ وحشت کی طرف لیجا کر نئی اور تہذیب و تمدن کی بنیاد ڈالنے پر مجبور کرے، یا "قیامت کبریٰ" قائم کر کے نظام شمسی میں ایک اور ویران و غیر آباد کرہ کا اضافہ کرنے والی ثابت ہو

فرقہ پرستی یا مذہب پرستی

اس وقت سیاسیات ہند کا سب سے زیادہ پیچیدہ مسئلہ وہ ہے جسے اخباری اصطلاح میں "فرقہ وارانہ اختلاف" کہتے ہیں۔ اور باوجود کوشش کے یہ تفریق مٹتی نظر نہیں آتی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ لوگوں نے مرض کی

تشخیص ہی غلط کی ہے اور اس لئے قدرتاً اس کا علاج بھی غلط ہونا چاہیئے

سب سے پہلے " فرقہ پرستی " کا تجزیہ کرکے دیکھنا چاہیئے کہ اس کے اجزا ترکیبی کیا ہیں ؟ کیا ہندو کا اپنے آپ کو ہندو اور مسلمان کا اپنے آپ کو مسلمان کہنا مذہبی تفریق کے علاوہ کسی اور خیال کا نتیجہ ہے ، کیا دونوں جماعتوں کا باہمی اختلاف اس بنا پر قائم نہیں ہے کہ ایک کے عقائد و شعائر ، دوسرے سے علیحدہ ہیں اور جن عوائد و مراسم کی ایک قوم پابند ہے انھیں دوسرا بُری سمجھتی ہے

پھر جب حقیقت یہ ہے تو کیوں " فرقہ پرستی " کو صاف صاف " مذہب پرستی " نہیں کہا جاتا اور کیوں دل کی اس پھانس کو چھپایا جاتا ہے جو اتحاد و اتفاق کے بڑے بڑے حامیوں کے سینوں میں بھی کھٹک رہی ہے

اگر مالویہ جی فرقہ دارانہ اختلاف کے دشمن ہیں تو سب سے پہلے انھیں ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے کہ کیا وہ خود اسلام کو جھوٹا مذہب نہیں سمجھتے ۔ اور اگر مولانا احمد سعید صاحب مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ اتحاد کی تعلیم دیتے ہیں تو انھیں اپنے گریبان میں منہ ڈال کر فیصلہ کرنا چاہیئے کہ کیا وہ ہندوؤں کو کافر و مشرک سمجھ کر ایک مخفی جذبۂ نفرت و استکراہ اپنے اندر محسوس نہیں کرتے ؟

اتفاق و اتحاد نام ہے صرف خلوص و صداقت کا ، انتہائی سچائی کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل جانے کا اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک " مذہب پرستی " باقی ہے ۔ ہندو سمجھتے ہیں کہ اگر مسلمان غالب آگئے تو ہندوستان میں اسلام پھیل جائے گا جو اُن کے نزدیک بدترین مذہب ہے اور مسلمان یقین کرتے ہیں کہ اگر ہندو غالب آگئے تو رفتہ رفتہ ہندوستان سے کلمۂ توحید مٹ جائے گا ۔ اور یہی وہ خلش ہے جو اندر ہی اندر اپنا کام کر رہی ہے ، لیکن صاف صاف کہنے کی کسی کو جرأت نہیں ہوتی

کاش لوگ سمجھتے کہ دنیا میں مذہب کا حقیقی مفہوم صرف " عام رشتۂ اخوت " قائم کرنا ہے اور اگر کوئی مذہب دنیا میں ایسا ہے جو انسان سے نفرت کرنیکا درس دیتا ہے تو یقیناً وہ مذہب مٹ جانے کے قابل ہے کیونکہ وہ انسان کو " انسانیت " سے جدا کرکے " نفسانیت " کے عذاب میں مبتلا کرنے والا ہے اور ہندوستان کبھی اس وقت تک آزاد نہیں ہو سکتا جب تک اس کے فرزند پہلے اپنے دماغوں کو اس لعنت سے آزاد نہ کرلیں

ایران جدید

یہ جز از معلومات مقالہ ڈاکٹر سید ہادی حسن صاحب پی۔ ایچ۔ ڈی۔ اور پروفیسر سید نفیسی کے مضامین سے اخذ و ترجمہ کیا گیا ہے

فاضل مترجم نے خود بھی اپنی تحقیق "احراری جماعت" اور "نسائیت ایران" کے متعلق اضافہ کی ہے

(اڈیٹر)

(ڈاکٹر سید ہادی حسن)

میں ایران میں ۲۸ رمئی سے ۱۲ راگست ۱۹۳۱ء تک رہا۔ اس لحاظ سے ایران میں میرا قیام بہت مختصر رہا لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ جسقدر یہ قیام مختصر تھا اسی قدر دلچسپ اور لطیف تھا۔ ایران جدید کو آپ جنگِ عظیم کے بعد کا ایران یا پہلوی ایران بھی کہہ سکتے ہیں اور یہ ایک بہت ہی حیرت ناک واقعہ ہے کہ ایران قدیم جس کی تہذیب اور مدنیت رومۃ الکبریٰ اور یونان کے ہم پایہ تھی۔ بلکہ جن ممالک کی تہذیب ایران قدیم سے معاصرانہ حیثیت رکھتی تھی وہ آج تباہ و برباد ہوچکی ہیں اور ایرانی تہذیب اب بھی اپنے قدیم وقار کو قائم کئے ہوئے ہے اور اُسکی علمی اور ادبی دھاک اب بھی برّاعظم ایشیا میں مسلم ہے

دَورِ حاضر کی فارسی حقیقتاً وہ قدیم ادبی (کلاسیکل) زبان نہیں ہے، جس سے ہمارے مُلک کے افراد آشنا ہیں، اوس کی وجہ یہ ہے کہ بہت سے الفاظ جو زبان قدیم میں نہ تھے اور مُلک کی صنعتی اور کیمیاوی ضروریات کو پورا نہ کرسکتے تھے وہ وضع کئے گئے مثلاً

انگریزی	فارسی	انگریزی	فارسی
ٹیلس کوپ	دوربین	مائکرسوپ	خوردبین
ٹیلیفون	دورگو	مائکروفون	خوردگو
ٹیلیگراف	دورنویس	مائکروگراف	خوردنویس

اکثر ممالک غیر کے جملوں کو بھی معرّب کر لیا گیا ہے مثلاً عدالتوں دفتروں وغیرہ میں ہمارے مُلک میں یہ عبارت بھی لکھی جاتی ہے (The necessary steps will be taken in the matter) اس کا ترجمہ وہ یوں کرتے ہیں " اقدامات لازمہ دراین امر استخاذہ کردہ آید " بعض حالات میں اجنبی ممالک خارجہ کے (روسی اور فرانسیسی) الفاظ بجنسہ ایران جدید میں قائم رکھے گئے ہیں ان وجوہ کی بنا پر ایران جدید کی زبان ضروریات حاضرہ کے لئے بالکل مناسب ہے۔ اور میرے لئے انتہائی مسرّت تھی جب میں نے ابوالقاسم کی نادر الوجود کتاب Modern physics (ماڈرن فزکس) مطبوعہ تبریز (۱۳۱۲ھ) دیکھی جو ضروریات کے لحاظ سے ایرانی دماغ اور ایران جدید کی کیمیادی اختراع کا بے نظیر نمونہ ہے۔ اور میرے خیال میں یہ اس قدر اعلیٰ وارفع ایرانی شاہکار ہے کہ اس کتاب کو دیکھ کر جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد کے شعبۂ دارالترجمہ کو بھی رشک آئیگا۔ ان متذکرۂ بالا اسباب نے ایران جدید کی زبان کو اس مرتبہ تک پہونچا دیا ہے کہ آج طبی ۔ کیمیاوی ۔ معاشرتی ۔ عمرانی مجلسی ۔ تہذیبی ۔ مدنی ۔ اقتصادی اور صنعتی ضروریات کے لحاظ سے کسی زندہ زبان کے مقابلہ میں وہ کسی طرح بھی پست نہیں کہلائی جا سکتی اور مرزا عبدالوہاب قزوینی کے بے نظیر مجموعۂ مضامین اور آغا کاظم زادہ سابق رئیس التحریر ایران شہر (برلن) یا آغا دشتی (شفق سرخ طہران) کے مقالات سند میں پیش کئے جا سکتے ہیں

میں ایران میں کویٹہ ۔ دُزداب کی شاہ راہ سے داخل ہوا ، مرجادہ ایرانی چھاؤنی ہے ۔ ایرانی سرہنگوں کا ایک دستہ وہاں مقیم ہے اور ریلوے اسٹیشن کے قریب ہی اون کے نفیس بارکیں بنی ہوئی ہیں

یہ سرہنگ بہت مہذب اور ہوشیار ہیں ۔ اور اون کی بارکیں بہت صاف ستھری ہیں ان کا ایک دستہ مرجادہ میں مقیم تھا ۔ یہ لوگ نوجوان اور محنتی ہیں ، کسی قسم کا انتشار ان کے چہروں سے رُونما نہیں ہے اور قانون کی پابندی اپنا فرض سمجھتے ہیں ۔ پھر انھیں پر موقوف نہیں بلکہ صفائی ، چستی اور اطمینان میں نے ہر جگہ ایران میں پایا اور یہ رضا شاہ پہلوی کا سب سے بڑا کارنامہ تصور کیا جا سکتا ہے ۔ آج ایرانی صحرا بالکل اوسی طرح خطرات سے پاک ہیں جس طرح ہندوستانی شہر ، جب برجند کے آگے تھوڑی دور جا کر ہمارا موٹر بگڑ گیا تو ہم کو اونٹوں پر کچھ دُور جانا پڑا ۔ اور اس وقت ہم لوگوں نے محسوس کیا کہ گویا امن و امان اوس ہوا میں بھی سرایت کر گیا تھا جس میں ہم لوگ سانس لے رہے تھے

مرجادہ سے دُزداب کا فاصلہ ریل سے ۳ گھنٹہ کا ہے ، دُزداب جس کا آجکل نام زاہدان ہے ایک چھوٹی سی بستی ۴۰۰۰ نفوس کی آبادی پر مشتمل ہے ، جس میں زیادہ تر تاجر ہیں ۔ چنگی کے افسران نہایت ذی خلق ہیں اور یہ سمجھ لیجئے کہ اگر اس محکمہ کے لوگ خلیق ہو سکتے ہیں تو میرے خیال میں اخلاق کی حد ہے ۔ اسٹیشن سے گزر کر ہم لوگ پھر شہر

میں داخل ہوئے ـــــ دُزداب دوسرے ایرانی شہروں کی طرح بہت خوبصورت، خوش قطع اور صاف ستھرا ہے۔ یہاں بنک۔ ڈاک خانہ۔ تار گھر۔ ہوٹل۔ موٹر خانے۔ اور چوڑی سایہ دار سڑکیں ہیں

یہاں ہر جگہ نکیلی پہلوی ٹوپی نظر آتی ہے جو ہندوستان کی گاندھی ٹوپی کی طرح مقبول و رائج ہے۔ دزداب میں مجھ کو یہ بھی شرف حاصل ہوا کہ وہاں گورنر اور پولس کے افسر اعلیٰ دونوں سے میری ملاقات ہوئی۔ گورنر معمر، فاضل سنجیدہ و متین تھا۔ اور پولس کا افسر اعلیٰ نوجوان، محنتی، مضبوط اور شکیل تھا۔ سول اور ملٹری انتظام کے لئے ان دونوں کا اتحاد یقیناً قابل رشک ہے ـــــ

دُزداب میں ہم لوگ ۳ دن مقیم رہے۔ یہاں ۶۱۴ میل کے فاصلہ پر مشہد (مقدس) کا مشہور شہر ہے۔ پہلے ۱۵۰ میل تو دشت لوط کے نام سے مشہور ہیں جہاں رات ہی کو سفر کیا جاتا ہے۔ صحرا کی سڑکیں نہایت صاف و ہموار موٹر عمدہ اور کرایہ بہت سستا ہے۔ مشہد تک ایک طرف کا کرایہ ۲۰ تومان ہے (ایک تومان = ۱۲؍) اور پورا موٹر پانچ آدمیوں کے لئے ۱۰۰ تومان میں مشہد جا سکتا ہے۔ ۴۸ گھنٹے کے اندر ہم لوگ مشہد سے جو نصف راہ میں ہے۔ برجند پہونچے

نواب شوکت الملک نے مہربانی فرما کر مجھ کو اور پروفیسر حبیب کو اپنی محل سرا قیام کے لئے پیش کی۔ یہ طویل القامت مہذب اور متین انسان ہیں۔ اون کی سخاوت اور میزبانی کا شکریہ میں علی الاعلان کرتا ہوں۔ اور اس صوبہ (ممالک متحدہ آگرہ اودھ) کے لوگ یہ سُن کر متحیر ہوں گے کہ وہ اپنے تعلقہ میں بہت محبوب وعزیز ہیں۔ انھوں نے برجند میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے علیحدہ علیحدہ مدارس قائم کئے ہیں۔ اور یہاں کے بعض طلبہ مدرسۃ العلوم علیگڈھ میں بھی تعلیم پا رہے ہیں

مشہد مقدس کا پہلا تجربہ ـــــ امام علی رضاؑ کے درخشاں گنبد کا ہمیشہ میرے دماغ میں ثبت رہے گا اور اس کو اپنے معلومات کا ہمیشہ بیش قیمت خزانہ تصوّر کرتا رہوں گا۔ مشہد کا شمار اُن ایرانی بڑے شہروں میں ہے۔ جس کا ماضی بہت تاریخی اور عظیم المرتبت تھا۔ اور جس کا مستقبل بھی بہت ہی شاندار اور ارفع ہے۔ اس لئے اس شہر یا آستانۂ عالیہ کا تذکرہ اس جگہ کرنا فضول ہے کیونکہ کافی شہرت اوس کو حاصل ہے۔ میرا مقصد اس جگہ صرف اون افراد کا تذکرہ کرنا ہے جن سے مجکو مشہد میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے۔ سب سے پہلے میں آغا اسدی سے ملا جو مالیات کے مہتمم ہیں۔ یہ آمدنی پہلے کسی اصول کے ماتحت خرچ نہ ہوتی تھی۔ لیکن اب مفادِ عامہ پر خرچ ہو رہی ہے۔ اور مستقبل قریب میں مشہد میں بہت ہی بڑا شفاخانہ قائم ہونے والا ہے، جس کی نظیر براعظم ایشیا میں کسی دوسری جگہ نہ ملے گی، اس میں سرجکل اور کلینکل بلاک، علیحدہ علیحدہ خوش وضع اور خوش قطع بہت اعلیٰ پیمانہ پر قائم ہونے والے ہیں جس میں مختلف امراض کیلئے مختلف

بلاک ہوں گے۔ جو شعبہ جات اس شفاخانہ کے فی الحال کھل گئے ہیں، وہ اپنی صفائی، طبی ضروریات اور اپنے اسٹاف کی کارگزاریوں کی بنا پر یقینا قابل ستایش ہیں۔ میں نے اون سے بہتر ہندوستان میں کوئی اسپتال نہیں دیکھا۔ آستان کی مالیات کا ایک حصہ تعلیم پر بھی صرف ہوتا ہے، ابتدائی تعلیم تمام ایران میں جبریہ رائج ہے اور اعلیٰ تعلیم، فنون لطیفہ، سائنس، طب، تجارت، زراعت، انجنیرنگ وغیرہ سے بھی آگے بڑھ گئی ہے۔ تعلیم کا مرکزی مقام یقیناً طہران ہے لیکن اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ صوبجات کے مرکزی مقام اس سعی میں پیچھے ہیں بلکہ اس کے اثرات ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ اور ہر سال ایک کافی تعداد ایرانی طلبہ کی اعلیٰ تعلیم میں مخصوص امتیازات حاصل کرنے کے لئے بلاد ارد یا جاتی ہے۔ ایسے فارغ التحصیل طلبہ میں آغا فرخ مشہدی ڈاکٹر قاسم غنی مشہدی سے مجکو شرف نیاز حاصل ہوا، جن میں اوّل الذکر شاعر ہیں اور جمالیات کے ماہر، موخر الذکر مصنف ہیں اور اناطول فرانس کی تصانیف کا ترجمہ کر چکے ہیں

مشہد سے طہران ۶۰۰ میل ہے اور موٹر سے دو دن کا راستہ ہے۔ درمیان میں نیشاپور، سبزوار اور دمغان بڑے بڑے شہر پڑتے ہیں جو دوسرے ایرانی شہروں کی طرح بجلی سے آراستہ ہیں۔ عمر خیام کا مقبرہ عام شاہراہ سے بہت دور نہایت اچھی حالت میں ہے اور مرجع خلائق ہے۔ ایرانی شہر بالعموم وادیوں میں آباد ہیں اسی لئے شان دار پہاڑوں کا لامتناہی سلسلہ ہمیشہ آپ کے سامنے ہوگا۔ جن کے خم (S) اور (Z) کی شکل کے آپ کو نظر آئیں گے۔ اسی طرح مشہد ہے اور اسی طرح طہران جو ایران جدید کا پایۂ تخت، اور تہذیب و تمدن کا مرکز ہے۔ یہ چاروں طرف پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ جس میں خصوصیت سے قلہ دماوند کی برف آلود چوٹی ہمیشہ بہت نمایاں رہتی ہے۔ آبشارین بھی کثرت سے ہیں جنھوں نے طہران کو نہایت ہی خوبصورت شہر بنادیا ہے۔ یہاں کے باشندے بہت حسین ہیں لیکن یہاں کی خواتین مردوں سے زیادہ جمیل اور قبول صورت ہیں

میرا مقصد وحید ایران کے سفر سے دیوان قطران کے قدیم نسخہ کی تلاش تھا۔ اور چونکہ اس مخطوط کو حاصل کرنا بغیر وہاں کے تعلیم یافتہ افراد کی شناسائی کے مشکل تھا، اس لئے اس سلسلہ میں طہران کے اکثر ادبا سے ملاقات کا موقع ملا۔ ہز اکسلنسی حسن تقی زادہ (وزیر مالیات) سے بھی جو بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں۔ اور تمام مصنفین باکمال نے اُن کی ادبی تحقیقات کو بہ نظر استحسان دیکھا ہے۔ ہز اکسلنسی ایران جدید کے گاندھی بھی ہیں اور ٹیگور بھی وہ بہ یک وقت عالم و فاضل، مصنف، محقق، مدبر، ماہر لسانیات، زبان داں، اور ماہر مالیات بھی ہیں۔ اور اون کی خدمات ملک و ملت کے لئے خواہ وہ ایرانی دستور اساسی سے متعلق ہوں خواہ ادبیات سے ہر آئینہ قابل ستایش ہیں۔ وزیر دربار، وزیر تعلیمات اور وزیر امور خارجہ بھی بہت ہی شریف الطبع،

اور محنتی ہیں لیکن آج ایران میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہے جو ہز اکسلنسی تیمورتاش وزیر دربار سے زیادہ محنتی ہو۔ ہز اکسلنسی نے انتہائی اخلاق سے پوری ایک صبح دیوان قطران کے مخطوط کے تلاش کرنے میں صرف کردی جو ان کے پاس تھا گو میری بدنصیبی سے وہ مخطوط دستیاب نہ ہو سکا

میں ملک الشعرا بہار مشہدی سے بھی ملا جو اس وقت — طہران میں مقیم تھے۔ وہ اسلامیات کے ماہر اور طبقۂ اول کے ممتاز شاعر اور عدیم المثال مؤرخ مانے جاتے ہیں۔ آجکل وہ تاریخ سیستان کی تکمیل میں مصروف ہیں یہ تاریخ ۷۲۵ھ میں مرتب ہوئی تھی۔ اور صرف صفوی خاندان تک لکھی گئی تھی۔ اسی طرح فاضل اجل اور مشہور طنز نگار شاعر آغا دافدا ایرانی امثال کی دائرۃ المعارف تیار کر رہے ہیں جو وزارت تعلیمات کے زیر اہتمام شایع ہوگی۔ اسی سلسلہ میں اور ایک ذہین ہستی کا ذکر ضروری ہے جو نسبتاً کم عمر ہیں ان کا نام آغا۔ ایس۔ اے۔ کسروی ہے۔ اور انکا علمی وادبی شاہکا شہریاران گمنام تین جلدوں میں اس مرتبہ کا ہے جو گب میموریل سریز کی تصانیف کو حاصل ہے۔ آغا عباس اقبال جو ابن المقفع (برلن ۱۹۲۶ء) کے مرتب ہیں۔ انھوں نے رشید الدین وطواط کی حدیقۃ الشعر فی دقیق الشعر پر ایک تنقیدی تالیف مرتب کی ہے جو بڑے پایہ کی چیز ہے یہ باکمال مصنف یقیناً مستقبل قریب میں ایران کا مرزا محمد عبدالوہاب ثابت ہوگا۔ آغا سعید نفیسی رئیس التحریر مجلۂ شفق بھی قابل ذکر ہیں جنھوں نے دائرۃ المعارف کی تیاری میں حصّہ لیا ہے انھوں نے اپنے تاثرات رودکی پر شائع کئے ہیں اور عنقریب تمام ایرانی شعرا کی بیاگرفی شائع کرنے والے ہیں۔ یہ فرانسیسی اور ایرانی دونوں زبانوں کے ماہر ہیں

آغا تربیت جن کی کتاب مطالع ایران جدید کا انگریزی میں ترجمہ ہوگیا ہے۔ اور وہ تبریز کی طرف سے ایرانی مجلس کے (نائب) ہیں ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور سیاحت بھی انھوں نے بہت کی ہے اور ایرانی ترکی وعربی مخطوطات کی بہترین معلومات ان کو حاصل ہیں۔ ان کے معاصر آغا محمود خلیخالی محکمۂ ڈاک اور تار کے وزیر ہیں ان کا شمار بھی مشاہیر ادبا میں سے ہے۔ اور یہ کون باور کر سکتا ہے کہ ایک شخص جو ایسے خشک کام پر فائز ہو وہ کس طرح مفکر ہو سکتا ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان کے خیالات میں عجیب و غریب وزن پایا جاتا ہے اور یہی وہ باکمال افراد ہیں۔ جو آج ایران جدید کے موجودہ دور ارتقاء کے ذمہ دار ہیں۔ ایران جدید اس وقت ایک زندہ مملکت ہے، جہاں قانون ہے اور قانون کی عظمت ہے۔ اور جہاں سلطنت کا سب سے اعلیٰ و برگزیدہ رکن ہز امپیریل مجسٹی رضا شاہ پہلوی ہے — جو یقیناً اس سلطنت کا شریف ترین جوہر اور ایران کا — محبوب ترین فرزند ہے

ایں سعادت بزور بازو نیست

(۲)

جدید ایرانی ادبیات

(پروفیسر سعید نفیسی مدرسہ عالیہ طہران)

ایرانی ادبیات کا جدید عصر چودہویں صدی ہجری سے شروع ہوتا ہے جب مغربی اقوام سے میل جول ہوا اور اس سبب سے اب اوس کی عمر تقریباً ۵۰ سال کی ہے

ایران میں منگولی حکومت کے قیام نے اُس عظیم منافرت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جو مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان حروب صلیبیہ کے زمانہ سے چلی آتی تھی۔ منگولی شہنشاہوں میں سے اکثر مذہبی آزادی کے قائل تھے اور مغربی قوموں نے اسی بناء پر ایران میں آمد و رفت شروع کر دی تھی۔ لیکن ترکوں اور خاندان صفویہ میں سخت رقابت کے جذبات پیدا ہو گئے تھے۔ اور دولت عثمانیہ جبکہ دول یورپ سے جنگ میں مصروف رہتی تھی سلطنت ایران دول یورپ سے معاہدات کر لیا کرتی تھی اور ترکوں کے خلاف اون کو بھڑکایا کرتی تھی

اس طرح ایرانی صنعت و تجارت صفویین کے دور حکومت میں بہت بڑھ گئی اور تجارتی تعلقات یورپ اور ایران کے درمیان بہت مضبوط ہو گئے۔ جب برطانیہ نے ہندوستان کو فتح کیا تو ایران بھی ان کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ بارہویں صدی کے آغاز سے ایرانی دربار میں یورپین سازشیں شروع ہو گئی تھیں۔ اور روس ہمارے شمالی مشرقی صوبجات ہضم کئے جارہا تھا۔ اسی روسی خدشہ سے ڈر کر ایرانی دربار نے انگلستان اور فرانس سے رشتۂ اتحاد قائم کیا لیکن اس کا صرف ایک علاج تھا۔ اور وہ یہ کہ ایران مغربی تہذیب کو تسلیم کر کے مغربی تعلیمات اور خصوصیت سے سائنس کی تعلیم سے مسلح ہو جائے عباس مرزا نائب السلطنت کی کوششوں سے فتح علیشاہ قاچار کے دور حکومت میں چند قدم آگے بڑھائے گئے

فوج کے لئے انگلستان اور فرانس سے افسر تلاش کئے گئے۔ اور اساتذہ اور اصطلاحی ماہران فنون بھی انھیں ممالک سے طلب کئے گئے۔ جدید مشینیں دیگر ممالک سے آئیں، ایک خاصی تعداد نوجوان ایرانیوں کی مغربی ممالک میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجی گئی۔ اور یوروپین زبانیں خصوصیت سے فرانسیسی تمام ملک میں رائج ہو گئیں

گو ایرانیوں کی مغربی ادبیات سے شناسائی محمد شاہ قاچار کے عہد سے شروع ہو گئی تھی لیکن ناصرالدین شاہ کے دور حکومت میں مغربی اثرات ایرانی ادبیات میں بہت زیادہ نمایاں ہو گئے۔ نئے مدارس یوروپین طرز کے ملک میں قائم کئے گئے اور ممالک خارجہ سے اساتذہ ان مدارس کے لئے طلب کئے گئے۔ اب ان ایرانیوں کے لئے ضروری ہو گیا جنھوں نے مغربی تعلیمات سے فائدہ اٹھایا تھا وہ اس طرز تعلیم کو اپنی تصانیف میں استعمال کریں

علاوہ بریں ناصرالدین شاہ کا عہد طویل اندرونی چپقلشوں سے پاک تھا اس لئے ادبی روایات جو گزشتہ

عہدوں میں ضائع ہوچکے تھے اون کا دوبارہ احیا ہوا۔ اس عہد کے بڑے جلیل القدر شعرا قاآنی۔ محمود خاں ملک الشعرا
راوش اصفہانی اور فتح اللہ خاں شیبانی نے طرز پیشین کو ترک کرکے جدید طرز کی بنیاد ڈالی۔ ایرانی نثر نے بھی اصلاحات
قبول کیں اور مغربی ادبیات سے متاثر ہوکر مشاہیر نثر نگاروں میں محمد حسن خاں اعتماد السلطنت حسن علیخاں امیر نظام
حاجی مرزا علی خاں امین الدولہ نے استعارہ، تشبیہ۔ اور نامانوس تراکیب کو جنھوں نے ایرانی ادبیات کو تباہ کر رکھا
تھا حقارت سے ٹھکرا دیا۔ اور صرف سادگی بیان کو اپنے سامنے رکھا۔ اعتماد الدولہ نے ایرانی صحافت کا سنگ بنیاد رکھا
اور اسی دَوران میں بہت سے حریت پسند ایرانیوں نے جو دوسری سلطنتوں میں پناہ گزیں تھے اور جلاوطنی کی زندگی بسر
کررہے تھے۔ ایران کی استبدادی حکومت کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس سلسلہ میں روزنامہ اختر (مصر) ثریا (قسطنطنیہ)
مرزا ملکم خاں اور جمال الدین اسد آبادی کی بلند پایہ تصانیف حاجی زین العابدین مرغانی کا سفرنامہ ابراہیم بیگ اور
مشتہر الدولہ مرزا یوسف کے رسائل اور مرزا عبدالرحیم خاں۔ اور مرزا آقا خاں کرمانی کے مقالات ادبیہ وغیرہ خاص طور
پر قابل ذکر ہیں۔ عوام نے بھی اس ضرورت کو محسوس کیا۔ اور مغرب کی بہت سی بلند پایہ تصانیف محمد طاہر مرزا ڈاکٹر محمد خاں
کرمانی شاہی مرزا محمد حسین فاروغی اور محمد حسین خاں اعتماد السلطنت کی کوششوں سے مغربی زبانوں سے ایرانی لباس میں منتقل
ہوئیں اس طریقہ سے بہت سے افسانے اور ناول بھی ایرانی مجالس میں مغربی زبانوں سے لئے گئے اور تمثیلات کا بھی آغاز ہوا
محمد حسین خاں اعتماد السلطنت نے بہت سی فرانسیسی تمثیلات کا ترجمہ کیا جو ایرانی اسٹیج پر پیش کئے گئے

مرزا فتح علی اخندزادہ کے ترکی سوانگ کو مرزا جعفر قاراچ داغی نے ایرانی جامہ پنھایا۔ ان سوانگوں نے ایرانی
داغوں کو بہت متاثر کیا۔ یورپ کی زبانوں سے یہ تراجم اس قدر عام اور مقبول ہوئے کہ حکومت کو بالآخر دارالترجمہ
اسی مقصد کے لئے قائم کرنا پڑا۔ جہاں نہ صرف فرانسیسی انگریزی روسی اور المانی تصانیف کا ترجمہ ہوا بلکہ ترکی۔ عربی
اور اُردو کتابوں اور رسالوں کا بھی ایرانی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ اس کام کی ترتیب کے لئے حکومت کو بالآخر ایک
مستقل وزارت قائم کرنا پڑی۔ نامۂ دانشوران در احوال مشرقی مشاہیر کے حالات میں آٹھ جلدوں میں شمس العلما عبدالوالی
ابادی مرزا عبدالوہاب قزوینی اور مرزا ابوالفضل ساؤجی کی کوششوں سے شائع ہوا ــــــ اعتماد السلطنت کی
متعدد تصانیف تاریخی اور جغرافیہ کے متعلق اسی عہد میں شائع ہوئیں۔ رضا قلی خاں ہدایت امیر الشعرا نے اپنی زندگی
ادبی تاریخ ادبی تنقید اور لسانیات کی تحقیق میں صرف کردی

مظفر الدین شاہ کے یازدہ سالہ دَور حکومت میں ایران کے اندر بہت سے جدید مدارس قائم ہوئے اور حاجی مرزا علی
خاں امین الدولہ صدر اعظم کی مساعی جلیلہ کی بنا پر بہت سے مشاہیر ادبا طہران میں ادب و سائنس کی تعلیم کے لئے
یورپ سے طلب کئے گئے۔ صحیفۂ تربیت (جس کی مرزا محمد حسین فاروغی ذکاء الملک وزیر امور خارجہ (سنہ ۱۹۳۱ء)
ادارت کرتے تھے۔) اُس عہد کی سب سے بڑی زندہ یادگار ہے۔ سنہ ۱۹۰۶ء سے مشروطہ حکومت کے آغاز

سے مطابع کو آزادی عطا کی گئی- اس آزادی کی بنا پر سیاسی ادبیات میں بہت اضافہ ہوا اور حُریت کے جذبات قلوب سے نکل کر اب تصانیف میں جگہ پانے لگے چنانچہ کوئی نظم و نثر اُس عہد کی اس جذبہ سے خالی نظر نہیں آتی اُس عہد کے شعرائے نامدار میں مرزا صادق خاں ادیب الممالک- ملک الشعرا بہار سید اشرف الدین مُدیر نسیم شمال اور عارف قزوینی (جو اپنی موسیقی اور سیاسی نظموں کے لئے بہت مشہور ہیں) خاص طور سے قابل ذکر ہیں- کیونکہ انھوں نے بھی اپنا ایک خاص اثر اس طبقہ میں چھوڑا ہے جو مدعیان حریت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے- جمہوریت پسند اخبار میں صور اسرافیل اور حبل المتین طہران قابل ذکر ہیں- ان کے علاوہ بھی بہت سے دوسرے شہروں سے اخبار شایع ہوتے تھے- اس دَور کے ناثرین میں سب سے ممتاز جگہ مرزا علی اکبر خاں داخدا کی ہے جن کی طنزیات اور ہجویات چرند و پرند کے عنوان سے صور اسرافیل میں شایع ہوا کرتی تھیں- اور جن سے اوس دَور کے ایرانیوں کے قومی اور ملی جذبات کا پتہ چلتا ہے- اس عہد کے تخیلی شاعروں میں سید احمد ادیب شادری- مرزا ابدال ادیب نیشاپوری اور شہید شیرازی نے اپنے ماسبق شعرا کی طرح اس امر کی کوشش کی کہ پانچویں اور چھٹی صدی ہجری کی ایرانی شاعری کے روایات کا احیا کیا جائے- اس دَور کے ممتاز صحافیوں میں سید ضیاء الدین طباطبائی مدیر رعد اور مرزا علی خاں دشتی مدیر شفق سرخ کا نام یقیناً قابل ذکر ہے- مرزا محمد خاں حجازی اور سید محمد خاں جمال زادہ اس دَور کے ممتاز افسانہ نگار ہیں- اور مرزا یوسف خاں اعتصامی مرزا نصر اللہ خاں فلسفی اور مرزا محمد علی خاں فارعی نے توبین الاقوامی شہرت حاصل کی ہے

ایرانی ادبیات نے زندگی کا زیادہ ثبوت تاریخ اور ادبی تحقیقات کی صورت میں دیا- اور آج ایران میں انھیں دو مضامین پر زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا جا رہا ہے- اور غالباً یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ایران، تاریخ کی موشگافیوں میں جملہ شرقی ممالک سے آگے ہے اور مغربی اقوام کے پہلو بہ پہلو چل رہا ہے

(۲)

احراری جماعت اور اُس کی کامیابیاں

(قادری محمد شبیر احمد علوی ناظر کاکوروی بی-اے (علیگ))

ایران ۱۹۰۸ء تک حکومت مستبدہ کا شکار رہا- اور اس شورش کے ابتدائی اثرات ۱۸۴۵ء میں محمد علی شاہ کی وفات کے بعد ناصر الدین بابی کی تحریک وطنیت کی شکل میں رونما ہوئے- خوش قسمتی سے اوس عہد میں امیر کبیر مرزا تقی علیخاں بہت زیرک و مدبر وزیر تھا- اوس نے نہایت قابلیت سے اس تحریک کا مقابلہ کیا اگرچہ امیر الکبیر خود حکومت مستبدہ کا رکن تھا- مگر اوس کی دور اندیشی اور خیر خواہی سے ایرانی ملت کو خواب گراں سے چونکنے

بہت قیمتی امداد ملی

اسی تحریک کے ساتھ ہی ایک دوسرے قائد وطن کا ذکر کیا جا سکتا ہے جس نے ایران کے لئے وہی خدمات انجام دی ہیں جو مولانا محمد علی نے ہندوستان کے لئے۔ اس زعیم الملت کا نام سید جمال الدین افغانی ہے۔ یہ ۱۸۳۸ء میں پیدا ہوا عرصہ تک ایران اوس کی مساعی جلیلہ کا جولانگاہ بنا رہا۔ آخر ملی نظام قائم کرنے کی بنا پر اس قائد بزرگ کو ایران سے جلاوطن کر دیا گیا۔ ۱۸۵۰ء میں اوس کا انتقال ہوا۔ لیکن جو روح اس زعیم الملت نے پھونک دی تھی وہ اوس کے مرنے کے بعد بھی نہ مٹی

اس تحریک کو شہزادہ ملکم خاں ناظم الدولہ کی مساعی نے بھی بہت تقویت پہونچائی۔ اور ایران میں وطنیت کا راگ ہر جگہ الایا جانے لگا۔ آخرکار اگست ۱۹۰۶ء میں مجبوراً مظفر الدین شاہ ایران کو حکومت مشروطہ منظور کرنا پڑی لیکن یہ حکومت مشروطہ زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی کیونکہ اسی عرصہ میں مظفر کا انتقال ہو گیا اور محمد علی تخت نشین ہوا اوس نے جون ۱۹۰۶ء میں حکومت مشروطہ منسوخ کر دی۔ اسی عہد کو عصر مشروطہ اول کہتے ہیں

تحریک وطنیت کی ابتدا اگر حقیقت پوچھئے تو ایران میں محمد علی نے ڈالی اور اپنا خطاب باب مقرر کیا۔ یہ ۱۸۱۹ء میں بمقام شیراز پیدا ہوا اور سید کاظم رشتی کے حضور میں زانوئے ادب تہ کیا۔ ۱۸۴۴ء میں اوس نے اپنے آبائی پیشہ تجارت کو خیرباد کہکر مہدویت کا دعویٰ کیا، چنانچہ ۱۸۴۳ء میں حج بیت اللہ سے واپس ہوتے ہوئے گرفتار ہوا۔ اور ۱۸۵۰ء میں انحراف توبہ نامہ کی بنا پر قتل کر دیا گیا

ناصر الدین قاچار نے اس مذہب کی تحقیقات کے لئے ایک کمیشن کا تقرر کیا جس کی متفقہ رپورٹ اس مذہب کے استیصال پر مبنی تھی۔ چنانچہ اس فرقہ کے معتقدین کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اس فرقہ کی ترویج و اشاعت میں با اثر اور لایق متبعین نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ چنانچہ ایک نہایت حسین و جمیل خاتون قرۃ العین بابی مذہب کی بر ملا حامی بن گئی۔ جو بالآخر نہایت عبرتناک طریقہ سے قتل کر دی گئی۔ اس قتل نے وطنیت کی تحریک کو بہت تقویت پہونچائی۔ اور ایران کی اکثریت اس مذہب کی حامی بن گئی، باب کے متبعین میں حاجی مرزا جانی کاشانی اور اوس کے دو بھائی حاجی مرزا اسمٰعیل اور حاجی مرزا احمد بہت مشہور گزرے ہیں۔ اس مذہب کی ترویج و اشاعت میں ہم کو صبح ازل بہاء اللہ حاجی سلیمان ملا محمد علی زنجانی سید یحییٰ دارابی ملا شیخ علی (جناب عظیم) قرۃ العین (حضرت قدوس) بہت پیش پیش نظر آتے ہیں۔ حاجی مرزا جانی نے باب کے قتل (۹ جولائی ۱۸۵۰ء) اور اپنی موت (۱۵ ستمبر ۱۸۵۲ء) کے درمیانی دو سالوں میں ایک ضخیم کتاب مرتب کی جس کا نام اوس نے "نقطۃ الکاف" رکھا جس

میں اس نے جدید مذہب کے اصول اور تاریخ کی وضاحت کی۔ اس کتاب کے ختم ہوتے ہی مرزا جانی قتل ہوگیا۔ اسکے بعد بابیوں نے شاہ ایران کے قتل کی سازشں میں حصّہ لیا۔ مگر بدقسمتی سے راز افشا ہوگیا اور ملک کی متعدد خفیہ انجمنوں کا پتہ لگایا گیا۔ اور نہایت بے رحمی سے اکثر سربرآوردہ بابیوں کا خاتمہ کردیا گیا اور بعض جلاوطن کردیے گئے۔ لیکن ۱۸۶۴ء میں ترکی حکومت نے ایرانی مفروضات پر بہت سے جلاوطن بابیوں کو بغداد سے اڈریانوپل منتقل کردیا اور وہاں سے یہ قبرص میں جلاوطن کردیے گئے

ایران جدید کی تاریخ امروزہ تاریخ دیروزہ سے بالکل جداگانہ ہے۔ تاریخ دیروزہ محض بادشاہوں کی سرگزشت یا مناقشات سیاسی کی داستانوں سے لبریز تھی۔ لیکن تاریخ امروزہ ایک مستقل تشکیل حکومت کی روداد ہے۔ ایک بچہ ۱۲۹۵ھ میں ایک غریب گھر میں آنکھیں کھولتا ہے۔ اور جب ہوش سنبھالتا ہے تو فاقوں سے تنگ آکر طہران میں اصطبل شاہی کی سائیسی کی خدمت پر مامور کیا جاتا ہے۔ بعض کا یہ خیال ہے کہ نہیں وہ سائیس نہیں تھا بلکہ محلات شاہی کی چوکیداری کا شرف اوس کو حاصل تھا۔ اور محمد رضا خاں کے نام سے عوام اوس کو پکارا کرتے تھے۔ وہ تقریباً ۱۰ سال کا ہوگا جب ایران کی کاسک فوج میں بھرتی ہوا اور یہیں سے اوس کی حقیقی زندگی شروع ہوتی ہے بعض کہتے ہیں کہ وہ معمولی کسان کا لڑکا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ اوس کا باپ دو بادشاہوں کا وزیر معتمد علیہ رہ چکا تھا۔ بہرحال کچھ بھی ہو اوس کی غیر معمولی قابلیت نے اوس کو بہت جلد ایک با اختیار اور ذمہ دار افسر بنا دیا۔ وہ ترقی کرتے کرتے جنرل اور بعدہ فیلڈ مارشل بن گیا۔ اسی عہد میں خورستان کے عربی قبائل نے ایران کے جنوبی اضلاع میں شورش برپا کردی۔ رضا خاں اس شورش کے استیصال کے لئے نامزد کیا گیا۔ جس نے تائید ایزدی سے نہ صرف بغاوت ہی کا خاتمہ کیا بلکہ شیخ محمرہ کو بھی پابزنجیر طہران لے آیا۔ اس صلہ میں رضا خاں وزیر جنگ کے عہدہ پر فائز کیا گیا

۱۹۱۱ء میں رضا خاں نے ایران کے کاسک برگیڈ پر قبضہ کرلیا اور برگیڈیر جنرل جو شاہ قاچار کا عزیز تھا اوس کو برخاست کردیا۔ اب اوس نے ایرانی سپاہ کی تنظیم و ترتیب شروع کردی جو نہایت ہی خراب حالت میں تھی۔ اوس نے ۵۰۰ منتخب افراد کا ایک رسالہ بھرتی کیا جو ترکوں کی جنیسری فوج کا نقش ثانی تھا۔ اور اسی رسالہ کی امداد سے اوس نے ۱۹۱۹ء میں ایران کے تخت پر قبضہ کرلیا، نادرشاہ کی مشہور تلوار زیب کمر کی، تاج کیانی سر پر رکھا۔ اور رضا شاہ پہلوی کا خطاب اختیار کیا

عرصہ ہوا اخبار حقیقت میں ڈیلی میل کے حوالہ سے مشہور سیاح و مصنفہ مس روزیٹہ فوربس کا جو بیان شائع ہوا ہے اوس سے اس اُولوالعزم پہلوی تاجدار کے عزائم کا پتہ چلتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کو ایران سے کس درجہ محبّت ہے۔ یہ ملاقات قصر سعد آباد میں ہوئی تھی۔ رضا شاہ نے دوران ملاقات میں کہا کہ " میرے مُلک کے لئے نہایت ضروری ہے کہ وہ غیر ملکی اعانت کے بغیر اپنا کام چلانے پر قدرت حاصل کرلے۔ اور میں امید کرتا ہوں کہ چند سال بعد ایران میں کسی غیر ملکی کو ملازم رکھنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ ۱۹۳۴ء تک باستثنائے چند ماہرین صنعت و حرفت و زراعت کے جن کا ہونا ضروری ہے۔ ہم تمام یوروپینوں کی خدمات سے سبکدوش ہوجائیں گے۔ یاد رہے کہ ہمیں کیانیوں اور اکاسرہ کی جانشینی کا فخر حاصل ہے۔ اور زمانۂ قدیم سے ہم ان کی روایات عظمیٰ کے وارث چلے آرہے ہیں جبکہ ایشیا دنیائے متمدن کا قائد اعظم تھا

اب اس کی سخت ضرورت ہے کہ قومی اسپرٹ اور جذبات وطنیت مؤثر طور پر جاری و ساری ہوجائیں، میرا ملک بہت کافی عرصہ تک اجنبیوں کی دستگیری کا محتاج رہ چکا ہے۔ میں ایرانیوں کو یہ سکھانا چاہتا ہوں کہ وہ اپنی قدر و قیمت پہچان لیں تاکہ وہ ذہنی و عملی دونوں طرح پنجۂ اغیار سے آزاد ہوجائیں، ہر ملکے و ہر رسمے۔ ہر ملک کی معاشرت جداگانہ ہوتی ہے، میں ہرگز نہیں چاہتا کہ ایران یورپ کی کورانہ او رجہل تقلید کرے، کیونکہ ایران خود عظیم الشان روایات کا حامل ہے۔ میں اہل ایران کو تاحد امکان " بہترین ایرانی " بنا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں، جو نہ خالص یوروپین ہوں نہ بڑے ایشیائی۔ ہر مُلک کے لئے اپنا مخصوص جداگانہ سانچہ ہوتا ہے، اہل ملک کو اسی مخصوص قالب میں ڈھال کر ایسی ترقی دینے کی ضرورت ہوتی ہے جس سے ایسا شہری پیدا ہو جو کسی دوسرے کی نقل نہ ہو بلکہ خود ایک مستقل وجود رکھتا ہو، جسے خود پر اعتماد کامل اور اپنی قومیت پر جائز فخر حاصل ہو۔ ایران اپنے گھر کا خود مختار مالک ہے، اُسے حق حاصل ہے کہ یہ اپنی دولت کو ترقی دے اور اپنی حفاظت اپنی قوت بازو سے کرے

" میرا اصلی حربہ فوج ہے، تعمیر مملکت کے لئے زمین اسی کی بدولت تیار ہوئی ہے۔ میں محض ایک سپاہی ہوں سیاست داں نہیں ہوں"۔

یہ جوان ہمت تاجدار ایران ہر وقت کام میں منہمک رہتا ہے۔ اور حکومت کے تمام شعبوں کی نگرانی خود کرتا ہے ——— الغرض حکومت ایران درحقیقت خود کوئی چیز نہیں ہے بلکہ رضا شاہ کی ذات ہمایونی حکومت ایران ہے۔ وہ اپنے وزراء کے اختیارات و اعزاز کو اس تناسب کے ساتھ قائم رکھتے ہیں کہ کبھی کوئی وزیر اس قدر نفاذ اثر و اقتدار حاصل ہی نہیں کرسکتا جو ایک ترقی پذیر سلطنت کے لئے خطرناک ثابت ہوسکے

رضا شاہ نے یہ مصمم ارادہ کرلیا ہے کہ جنوبی ایران سے دولت خارجہ کے تمام اثرات کو زائل کردیا جائے

چنانچہ حال ہی میں ایک جدید فرمان شاہی صادر ہوا جس میں ایران کے اعلیٰ حکام کا بیرونی عورتوں سے شادی کرنا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اس نظام عمل کا لازمی جز قومیت ایران کی تعمیر ہے

دور پاستان میں نوجوانان ایران عیش پسند اور راحت طلب ہوتے تھے۔ اور سوا پست ہمتی کے کوئی دوسرا خیال اون کے دل میں پیدا ہی نہ ہوتا تھا لیکن اب رضا شاہ نے اون سب کو غیر ممالک میں اعلیٰ تعلیمات حاصل کرنے کے لئے روانہ کیا اور جو شخص ممالک خارجہ سے واپس آتا ہے اوس کے قلب میں رضا پرستی اور ایران پرستی کے جذبات موجزن ہوتے ہیں

اسی کے ساتھ تنظیم عسکری کا بھی شاہ کو بے حد خیال ہے پہلے ایران میں محض ۳۵ ہزار فوج تھی۔ لیکن اب تقریباً ۶۰ ہزار کی تعداد ہے۔ ایران کی تاریخ میں یہ پہلا دور ہے۔ کہ مُلک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مسافروں کی جان و مال کو کوئی خطرہ نہیں۔ رضا شاہ بحری و فضائی قوتوں کو بھی نشو نما دے رہے ہیں

مکتوبات نیاز

صدیقی،

تم نے جو کچھ لکھا، اس کا مجھے یوں بھی یقین تھا، تاہم تمھاری تحریر سے اور تصدیق ہو گئی ـــــ سچ ہے

نازوالے نیاز کیا جانیں

میں نے ان سے کبھی پہلے بھی شکایت نہیں کی، اب کیا کروں گا ـــــ لیکن اگر ملاقات ہو تو اُس "پیکر عز و ناز" سے یہ ضرور کہدینا کہ دنیا میں کبھی کبھی

روئے محمود و خاک پائے ایاز

والے معاملے بھی دیکھنے میں آجاتے ہیں اور غالباً وہ وقت بہت سخت ہوتا ہے جب کسی کو بام بلند سے نیچے اُتر کر خاک بسر رہنے والوں کے ساتھ گلیوں کی ٹھوکریں کھانا پڑتی ہیں ـــــ خدا نہ کرے ان کے ساتھ یہ معاملہ ہو، لیکن کیوپڈ کے ترکش میں تیروں کی کمی نہیں اور اس کے انتخاب کا حال تم کو بھی معلوم ہے کہ سب سے پہلے وہ "سرکشان جمال" ہی کو تاکتا ہے۔ ابھی تو نہیں لیکن آیندہ ماہ کی کسی تاریخ میں آنے کا قصد ہے اور ظاہر ہے کہ آزادی کی سانسیں وہیں بسر کروں گا جہاں سب سے پہلے پاؤں میں غلامی کی زنجیر ڈالی گئی تھی

نیاز

عطوفت پناہا، مودت دستگاہا

بارشِ لطف و کرم اور اس قدر مسلسل! وعدۂ چارہ سازی اور اس درجہ معجل!

نتواں ترا و جاں را بہم امتیاز کردن

قبلہ اتنی فرصت تو دیجئے کہ اعتراف کے لئے مناسب الفاظ کی جستجو کر لوں، اس قدر مہلت تو ملنی چاہئے کہ پیشکش کے لئے گلہائے تشکر سے اپنا دامن بھر لوں

بانازِ دل بہ سوئے دیدۂ ما می آئی   اے دل و دیدہ فدایت زکجا می آئی

دیدۂ و دل ہمہ گلچینِ بہار آغوشت   چشم بددور عجب عقدہ کشا می آئی

آپ اور مجھ سے یہاں آنے کی رخصت طلب فرمائیں! کیا شبنم سبزۂ پامال سے دریافت کرکے اس کو نہال کرتی ہے؟ کیا ابرِ نیساں صدفِ تشنہ کام سے پوچھ کر اس کی پیاس بجھاتا ہے، کیا نسیم صبح، کلیوں سے استمزاج کرکے

ان کو شگفتہ کرتی ہے ، کیا بارش کا چھینٹا کھیتوں سے اجازت طلب کرکے ان کو سیراب کرتا ہے ! کہیں وہ ساعت تو آئے جب آپ زحمت پا رنجہ فرمائیں

اے ہزاراں دیدہ در راہِ تو خاک !

نیاز

آخر ، تم بھی انھیں کی سی کہنے لگے نا ! سچ ہے

کہیں پرسشِ ملا خواہاں نہیں ۔

اُن سے تو نہیں ، لیکن تم سے پوچھوں گا کہ میں نے کب ان کی شکایت کی اور اُن کے اخلاق پر کب نکتہ چینی کی ۔۔۔ مجھے معلوم ہے کہ اُن کو کس نے باور کرایا اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اس میں کونسی مصلحت کار فرما تھی

کبھی ملاقات ہوئی تو رُو در رُو گفتگو ہوگی اور اُس وقت تمھارے اور اُن کے دونوں کی "چشمِ منفعل" کا لُطف اٹھاؤں گا ۔۔۔۔۔ افسوس ہے کہ باوجود ایک زمانہ تک ساتھ رہنے کے تم نے ابھی تک نیاز کو نہیں پہچانا

اگر آزاد سا درویش نظروں میں نہیں جچتا
تو جا اور جاکے اہل اللہ کی پہچان پیدا کر

نیاز

مکرمی میر صاحب قبلہ

کل آپ کا خط ، کامل میاں کے ذریعہ سے پہونچا ۔۔۔۔ تجویز مناسب ہے لیکن تدبیر غلط ۔۔۔ وہ اس لئے کہ آپ کو ایسی لڑکی مشکل ہی سے کہیں مل سکتی ہے اور یہ اس لئے کہ میرے ذریعہ سے کام بجائے بننے کے اور بگڑ جائے گا ۔۔۔ آپ کے نزدیک میں کتنا ہی صائب الرائے کیوں نہ ہوں ، لیکن وہاں تو میری کوئی عزت و وقعت نہیں ۔۔۔۔

جب تک اُن کے حلقۂ ارادت میں بیٹھ کر مسلسل ایک چلّہ تک توجہ نہ حاصل کروں ، برابر ایک عشرہ تک ختم خواجگان میں نہ شریک ہوں ، تہجد و اشراق نہ ادا کروں ، ان کا اعتبار حاصل کرنا دشوار ہے اور یہاں یہ عالم ہے کہ سوائے صحبتِ سماع کے اُن کے کسی اور مشغلہ کا قائل نہیں

پھر آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ اُن کے دل میں جگہ کرنے کے لئے یہ "ہفتخواں" مجھ سے کیونکر طے ہو سکتا ہے ۔۔۔ وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں ، میرے ساتھ اتنی خصوصیت رکھتے ہیں کہ گھر میں پردہ بھی نہیں ہوتا ، لیکن جانتا ہوں کہ اُن کی نگاہ میں ایک "مردِ ناہنجار" سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا ۔۔۔۔۔ اس لئے میری تحریک و تائید مفید

نہیں ہوسکتی ——— آپ خود براہِ راست کیوں نہ اس سلسلہ کو چھیڑیں ؟

لڑکی کو روز دیکھتا ہوں اور اس کے عادات و اطوار سے واقف ہوں ——— صورت کا سوال بیکار ہے کیونکہ حسن و جمال اُس گھرانے کی مشہور خصوصیت ہے ، علمی قابلیت کا یہ حال ہے کہ فارسی و عربی دونوں زبانوں میں ادیبانہ مہارت رکھتی ہے ——— امورِ خانہ داری کا سلیقہ اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ تنہا اتنے بڑے خاندان کا انتظام اپنے سر لئے ہوئے ہے ——— بہرحال اس کمسنی میں ایسا ہوش و گوش ، بالکل خداداد بات ہے

آپ کے صاحبزادے چونکہ جدید تعلیم یافتہ ہیں اس لئے ممکن ہے ان صفات میں کوئی کشش محسوس نہ کریں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ اگر ایک بار دیکھ لیں تو گھبرا کے سجدہ ہی میں گر پڑیں

آپ انھیں لکھئے تو سہی ، دیکھئے کیا صورت پیدا ہوتی ہے

نیاز

جانِ من ،

جانے بھی دو کیوں مُنہ کھلواتے ہو

ایں رشتہ بہ انگشت نہ پیچی کہ دراز است

میں کہوں گا یوں ، تم کہو گے یوں نہیں یوں ——— اس سے فائدہ ؟ نہ تم میری سنو گے نہ میں تمھاری مانوں گا ، خواہ مخواہ وقت ضایع ہوگا اور دل مکدر ہو جائیں گے ——— میں اعترافِ جُرم کئے لیتا ہوں ، آپ سزا تجویز کیجئے ، اس کے بعد اگر مرافعہ یا اپیل کا خیال بھی دل میں لاؤں تو دار پر چڑھا دیجئے ——— اس سے زیادہ آپ اور کیا چاہتے ہیں

اب تو خوش ہو بے وفا تیرا ہی لے کہنا کیا

نیاز

مکرمی ،

کل رات سے اسی فکر میں تھا کہ آپ کا معاملہ کیونکر سُلجھے ——— آخرکار قدرت نے مدد کی اور یہ معمہ آپ ہی آپ حل ہوگیا یعنی صبح کو دفعتہً ارجمند خاں صاحب تشریف لائے ۔ اور ایک ایسا کام لے کر آئے جس کی تکمیل صرف مجھ پر منحصر تھی

میں نے پوچھا اس کا معاوضہ کیا مرحمت ہوگا ——— کہنے لگے جو آپ فرمائیں ——— میں نے کہا تحریر دیجئے ، انھوں نے لکھ دیا ——— وہ غریب اس کو مذاق ہی سمجھے تھے ——— لیکن جب میں نے نہایت سنجیدگی سے آپ کے معاملہ کو پیش

کیا تو گھبرا گئے ، اور دیر تک سوچتے رہے ، لیکن زبان دے چکے تھے ، مجبور ہو گئے — مجھے اطمینان ہو گیا ہے ، آپ بھی مطمئن ہو جائیں

نیاز

عزیزم ،

کل شام کا لطیفہ سنو ، تمھارے خال مکرم تشریف لائے اور اس شان سے کہ تسبیح ہاتھ میں تھی اور کفنی گلے میں میں حیران کہ خدایا میں نے کب دعوائے نبوت کیا تھا ، جو جبریل کا نزول اجلال ہوا ، میں نے اپنے گم کردہ راہ ہونے پر کب اظہار تاسف کیا تھا کہ جناب خضر تشریف لے آئے ! — باور کرو میں نے ان کو پہچانا ہی نہیں ۔ سروقد تعظیم دی ، دست بوسی کے لئے آگے بڑھا ، جسم کا ریشہ ریشہ کانپ رہا تھا کہ کہیں یہ "سامری" افسوں پڑھ کر خاکستر نہ کر دے — دفعتہً وہ مسکرا پڑے اور میں نے اُن کے طلائی دانت دیکھ کر فوراً پہچان لیا

حیران تھا کہ خدایا یہ کیا انقلاب ہے ، وہ شخص جو وضع مغربی کا انتہا دلدادہ ہو ، اس حد تک بھیانک بن جائے ، وہ شخص جس نے بھول کر کبھی خدا کا نام نہ لیا ہو ، وہ بالکل "زمزمی" بنا ہوا سامنے آئے !

میں نے پوچھا "حضرت یہ کس نگاہ کا کرشمہ ہے ، کس جلوۂ بے محابا کی کارفرمائیاں ہیں" اسے یہ سننا تھا کہ اُن پر تو حال طاری ہو گیا — لاحول ولا قوۃ — میں کس قدر پچھتایا کہ میں نے کیوں اُن سے یہ پوچھا وہ نیم بسمل کبوتر کی طرح لوٹ رہے تھے اور میں پریشان کہ کہیں ان کا دم نہ نکل جائے ۔ آخر کار زبردستی ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر پانی کے چھینٹے دئے ، لخلخہ سونگھایا تو انھیں ہوش آیا

عجیب آدمی ہو تم نے اس سے قبل کبھی اطلاع ہی نہیں دی کہ اُن پر صرع کا دورہ پڑنے لگا ہے — وہ تو بتائیں گے نہیں ، نہ اُن سے میں پوچھوں گا ، لیکن تمھیں لکھو کہ وہ کب سے اس مرض میں مبتلا ہیں اور ماجرا کیا ہے

میں نے بہت روکا لیکن چلے گئے ، غالباً پیر صاحب کی خانقاہ میں ٹھہرے ہوئے ہیں ، اگر اُن کو گھر لے جانا ہے تو فوراً چلے آؤ اور تار سے مجھے اطلاع دو

نیاز

صدیق مکرم ،

نامۂ گرامی ملا — اس پرسش حال کا شکریہ عرض کرتا ہوں — حقیقت یہ ہے کہ آپ ایسی ہستیاں

دنیا میں بہت کم نظر آتی ہیں ـــــ خدا آپ کو اس وقت تک صحیح و سلامت رکھے ، جب تک ہم ایسے "جراحت خوردہ" دل موجود ہیں

بیشک مجھ سے غلطی ہوئی اور میں اس غلطی پر صد درجہ نادم ہوں کہ آپ کو اپنے حال سے بے خبر رکھا ، لیکن صرف اس خیال سے کہ خواہ مخواہ آپ کو تکلیف ہوگی خاموش رہا ـــ اب تفصیل سن کے کیا کیجئے گا ، اجمالاً یوں سمجھ لیجئے کہ مر کر دوبارہ زندہ ہوا ہوں

خاک ، باد ، آب و آتش چار عناصر مشہور ہیں ۔ اور ان کے ذریعے جو انتہائی مصیبت کسی شخص پر آسکتی ہے وہ سب جھیل چکا ہوں ـــــ رات کا وقت ہے اور جاڑوں کا زمانہ ، کتاب دیکھتے دیکھتے سو جاتا ہوں ، لیمپ بھڑک اٹھتا ہے اور آگ پھیل کر ، لحاف ، توشک اور تکیوں کو نصف سے زیادہ جلا دیتی ہے ، لیکن میں بےخبر سوتا رہتا ہوں ، آنکھ اس وقت کھلتی ہے جب کمرہ کے اندر دھواں گھٹ کر پھیپھڑے کو کاربن سے بھر دیتا ہے ۔ بچنے کی کیا صورت تھی ، لیکن جسم گرم بھی نہیں ہوتا جلنا کیا معنی ـــ یہ واقعہ رام پور کا ہے

اب خاک اور مٹی کی گرفت کو دیکھئے ، کدورہ سے مود ہا گھوڑے پر جا رہا ہوں ، راستہ میں جاگیر بیری سے نکل کر جب دریا عبور کرتا ہوں تو ساحل کے ایک نالہ پر پہونچ کر گھوڑا دفعتۂ "چور بالو" میں غرق ہو جاتا ہے یہاں تک کہ وہ گردن تک غائب اور میں کمر تک ۔ اب یہ یاد نہیں کہ کیونکر جان بچی

اب ہوا کا معاملہ سنئے ـ اپنے وطن فتحپور میں ہوں اور آموں کے باغ میں ادھر اُدھر پھر رہا ہوں کہ دفعتہً ہوا کا طوفان آتا ہے اور بڑے بڑے درخت اکھڑ اکھڑ کر گرنے لگتے ہیں ، میں ایک شاخ سے لپٹ جاتا ہوں ، وہ شاخ ٹوٹ کر گرتی ہے اور اس پر سارا درخت چرچرا کر آجاتا ہے ، لیکن میں صحیح و سلامت رہتا ہوں

پانی کی مصیبت سنئے کہ بارش کا زمانہ ہے اور میں مراد آباد سے رام پور آ رہا ہوں "رام گنگا" کو کشتی کے ذریعہ سے عبور کرتا ہوں اور بیچ دریا میں پہونچ کر کشتی کا تختہ توڑ کر پانی کی موٹی دھار بلند ہوتی ہے ـــ ملاح اور تمام مسافر پانی نکال رہے ہیں لیکن کسی طرح کم نہیں ہوتا ، آخر کار ساحل تک پہونچتے پہونچتے وہ غرق ہوتی ہے اور سوائے میرے سب ڈوب جاتے ہیں ـــــ ایک اور واقعہ سنئے جس میں چاروں عناصر کی متفقہ قوت ہلاک کرنا چاہتی تھی ـ میں فتح پور سے الہ آباد جا رہا ہوں اور دو اسٹیشن آگے چل کر دوسری گاڑی کے انتظار میں ہماری گاڑی کھڑی ہو جاتی ہے ـ آدمی پٹری بدلنا بھول جاتا ہے اور تصادم ہو جاتا ہے

پھر وہ شخص جس کی سخت جانی کا علاج فطرت کی یہ قہرانی قوتیں بھی نہ کرسکیں ، اُس پر معمولی امراض کے دُورے کیا موثر ہو سکتے ہیں ـــ یقیناً میری حالت بہت نازک ہوگئی تھی ، بحران و ہذیان بھی کچھ تھا ، لیکن مقابلہ میں آخر کار مجھی کو فتح نصیب ہوئی

آپ مبارکباد دیتے ہیں۔ اس لئے خوش ہوا جاتا ہوں، ورنہ جانتا ہوں کہ اب فطرت کوئی ایسا زبردست حربہ استعمال کرنے والی ہے کہ نہ آپ کی دعائیں کام آئیں گی اور نہ میری سخت جانیاں

بہرحال ابھی تو زندہ ہوں اور مرنے کے بظاہر کوئی آثار موجود نہیں، لیکن آخر کب تک —— جس خدا نے حسین کو شہید کرا دیا، وہ مجھ ایسے معمولی انسان کو کیوں چھوڑنے لگا

نیاز

محترمی،

آپ نے میری تجویز کو غور سے پڑھ لیا، شکریہ —— لیکن بندہ نواز یہ تو بتائیے کہ اب یہ سوال کیسا کہ میں کیا چاہتا ہوں —— کیا میری اسکیم سے اس کی وضاحت نہیں ہوتی —— بہرحال یوں آپ کی سمجھ میں نہیں آتا تو اس طرح سمجھ لیجئے کہ

شراب خوارہ تنے چند خواہم از احباب

مجھے پیر مغاں بننے کا شوق نہیں صرف گدائے میکدہ رہنا چاہتا ہوں —— اس لئے پیش پیش رہنا میرے بس کی بات نہیں "عقب سرکار" چلنے کی ہمت ضرور ہے، سپاہی زادہ ہوں اس لئے سردار کے حکم پہ جان دینے کا بھی ڈھب آتا ہے اور لینے کا بھی، لیکن یوں مجھ سے کچھ نہ ہوگا —— جاہل بھی ہوں اور کاہل بھی

اگر یہ منظور ہو تو کسی دن آ جائیے یا مجھے بلا لیجئے —— شرکار کی فہرست آپ ہی مرتب کیجئے، مجھ سے پوچھنے کی ضرورت نہیں —— ختم خواجگان تو ہے نہیں کہ پہلے شریک ہونے والوں کی داڑھیوں کا جائزہ لیا جائے، یہ تو رندوں کا مجمع ہے، رندی کی باتیں ہیں، جس کے منہ سے "بادۂ دوشینہ" کی بو آئے اُسے کھینچ لیجئے اور ایک جام اور اُس کے منہ کو لگا دیجئے

ہاں، تو بتائیے اس کے لئے کونسی تاریخ مناسب ہوگی ؟

نیاز

اے،

ہوس کی باتیں کرو، خدا اگر چنگیز و ہلاکو نہیں تو حاتم طائی اور جعفر برمکی بھی نہیں! نہ اس کو تمھاری عبادت کی پرواہ نہ میری سرکشی کی، یہ تم سے کس نے کہدیا کہ وہ تمھارے سجدہ کرنے سے خوش ہوتا ہے۔ اور میری شرابخواری سے پیشانی پر شکنیں ڈال لیتا ہے، عجیب عقلمند ہو

بیا کہ رونق یک کارخانہ کم نہ شود
ز زہد ہمچو توئی یا ز فسق ہمچو منی

نہ تم نمازیں پڑھ پڑھ کر کوئی بتکدہ مسمار کر سکتے ہو اور نہ میں اپنی بت پرستیوں سے کعبہ ڈھا سکتا ہوں۔ اس دربار میں نہ جنید و شبلی کے لئے خاص رعایت ہے، نہ بہرام و جمشید سے کوئی عداوت ——— چند دن کی زندگی کو اس کوفت میں بسر کر دینا کہ معلوم نہیں حشر میں کیا معاملہ ہو، سخت نادانی ہے ——— میں تو اس باب میں غالب کا ہمنوا ہوں

برلب یا علی سرائے بادہ روانہ کردہ ایم
مشرب حق گزیدہ ایم عیش مغانہ کردہ ایم

کسی کا دل نہ دُکھاؤ اور جو جی میں آئے کرو

مباش درپئے آزار و ہرچہ خواہی کن

آپ نے دنیا ترک کر دی بُرا کیا، دوسروں کو بھی یہی تعلیم دیتے ہو اور زیادہ بُرا کرتے ہو ——— تم نااہل و بزدل ہو تو ساری دنیا کو کیوں ایسا سمجھتے ہو

تم چاہتے تھے کہ رندی و بادہ آشامی کی حقیقتیں اسقدر آسانی سے تم پر کھل جاتیں! معقول!!

اِک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیش عشق
رکھی ہے آج لذت زخم جگر کہاں

میں اس نئے رنگ میں تمھیں دیکھنے کا آرزومند ہوں، اپنے مولی سے پوچھ کر ایک دن یہاں بھی نعرۂ "یاہو" لگا جاؤ ——— ممکن ہے میں بھی ڈر کر، سہم کر تمھارے قدموں پر گر پڑوں، یوں زبانی وعظ و پند سے کام نہیں چلے گا

نیاز

کجائی اے بت ناہید نغمہ ہاں مضراب!

کل سے بارش ہو رہی ہے اور یہاں کی وادیاں، یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں زمرد حل کر کے بھر دیا گیا ہے

ہوا کا ہر ہر جھونکا، خم کے خم لئے پھرتا ہے اور کوئی پینے والا نہیں، مینھ کا ہر ہر قطرہ نغمۂ جاں سے لبریز ہے اور کوئی اس کا سننے والا نہیں

اب سمجھ لو کہ میری بیتابی کا کیا عالم ہوگا۔ اور تم کسقدر یاد آرہے ہوگے ——— آنا ہے تو آجاؤ، ورنہ پھر شکایت نہ کرنا کہ بغیر کہے سنے، کپڑے پھاڑ کر کسی طرف کو نکل گیا

نیاز

قبلہ،

ذرا میری اس سادگی کو ملاحظہ فرمائیے، آپ کے ظلم کی فریاد آپ ہی سے کرتا ہوں

مرہم از لبہاش می جویند بر جان فگار

وائے بر ریشے کہ آں را از نمک مرہم کنند

میں نے اس وقت تک کبھی عقلمند ہونے کا دعوےٰ نہیں کیا: اس لئے جانتا ہوں کہ بے وقوف بھی زندہ رہنے کا حق رکھتے ہیں اور کبھی کبھی تو ایسی پُر لطف زندگی بسر کر جاتے ہیں کہ جواب نہیں

آپ چونکہ ماشاء اللہ بڑے صاحبِ عقل و فراست ہیں، اس لئے غالباً میری اس انتہائی حماقت کی داد دیں گے سنئے اور کان کھول کر سنئے کہ میں نادان ضرور ہوں لیکن بچہ نہیں اور آپ باوجود "اینہمہ دعوائے کبریائی" ہنوز بچہ ہیں ——

معاف فرمائیے آپ نے سخت غلطی کی کہ میرے اُن کے درمیان صُلح کرانے کی کوشش کی اور خواہ مخواہ مجھے خطاوار ثابت کر کے میری طرف سے معذرت بھی کر لی

آپ نہ اُن سے اچھی طرح واقف، نہ اُن کے جذبات سے آگاہ —— آپ اپنا سر بھی کاٹ کر سامنے رکھ دیں گے۔ تو اُن کا خبث باطن کبھی دُور نہیں ہو سکتا۔ اور مجھ سے آپ واقف ہی ہیں کہ گردن تو کٹوا سکتا ہوں، لیکن سر نہیں جھکا سکتا

اگر آپ یہ نہیں چاہتے کہ میں اُن کو خط لکھ کر سارا حال ظاہر کر دوں تو براہِ کرم خود اُن کے پاس جا کر صاف صاف کہہ دیجئے کہ آپ نے جو کچھ کیا وہ بغیر میرے استمزاج کے کیا اور میں ایک لمحہ کے لئے بھی معذرت کے لئے طیار نہیں

آپ نے جس قدر تکلیف مجھ کو پہونچائی ہے، ہرچند اسکی تلافی تو اس طرح بھی نہ ہوگی، لیکن خیر میرے جذبۂ خودداری کی ایک حد تک تسکین ہو جائے گی۔ اور اُن کو اپنے پندار پر زیادہ مسرور ہونے کا موقعہ نہ ملے گا

نیاز

انگلستان کے آئین حکومت میں قانون کی اہمیت

انگلستان کے آئین حکومت کی عظمت و وقعت کا راز انگریزوں کی ان دو جبلی خصوصیات میں مضمر ہے کہ ایک تو وہ بغیر قانون کے کوئی بات نہیں کرتے اور دوسرے یہ کہ قانون کا بڑا احترام کرتے ہیں ـــــ بیکن کہتا ہے کہ "انگلستان کے لوگ اپنے قانون سے محبت کرتے ہیں۔ اور کوئی چیز اون کو اسقدر مسرور نہیں کر سکتی جتنا اس امر کا یقین کہ وہ اپنے قانون کو آزادی سے استعمال کر سکتے ہیں" جس طرح اہل رُوما قدیم زمانہ میں بہت منظم قانون رکھتے تھے۔ اور اس کا بڑا لحاظ رکھتے تھے، اسی طرح انگریز بھی چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں اپنے قانونی حقوق سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اور اس کو آزادی کی روح متصوّر کرتے ہیں

انگریزوں کی یہ خصوصیت مختلف وجوہ پر مبنی ہے جن میں سے تین خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ انگریزوں کا تہذیبی ارتقا اس اخلاقی خیال کے ساتھ ساتھ عروج پذیر ہوا ہے۔ کہ قانون سب سے زیادہ قابل احترام چیز ہے (یہی خیال قرون وسطےٰ کے بعض دیگر مغربی ممالک میں بھی پایا جاتا تھا) اور آئین حکومت کی بنیاد شروع ہی سے کچھ ایسی پڑی کہ احترام قانون کا جذبہ قوی ہوتا گیا۔ یوروپ کے دیگر ممالک میں یہ بات نہ تھی۔ مثلاً فرانس میں بادشاہ جاگیردارانہ اثر سے اس وقت تک بری نہ ہو سکا جب تک قرون وسطیٰ کی روح بالکل مُردہ نہ ہو چکی۔ لیکن انگلستان نے جاگیرداروں سے بہت پہلے ہی جنگ شروع کر دی تھی اور اپنے کو نظامِ جاگیری کے ضرر رساں تاثرات سے آزاد کر لیا تھا

اوّل ہی سے وہاں دورہ کرنے والے جج اور ان کی عدالتیں قائم ہوگئی تھیں۔ اور جب یہ دورہ پر ہوتی تھیں تو اون سے مقامی حکام مثلاً Coroner, justices of peace (Sheriff) jurors, وغیرہ کو سابقہ پڑتا تھا۔ اور اس طرح قانونی وسعت و اہمیت کا اثر سب لوگوں پر پڑتا تھا۔ علاوہ اس کے یوں بھی نیچے سے لے کر اوپر تک ہر شخص قانون کی کڑی میں جکڑا ہوا تھا یہاں تک کہ بادشاہ خود بھی قانون ہی کی وساطت سے ملک کا انتظام کیا کرتا تھا

اس کے بعد جب پارلیمنٹ نے ترقی کی تو قانون کے ذہنی تصور کی اور وضاحت ہوگئی اور یہ خیال کہ قانون کس طرح بنایا جاوے۔ تیزی کے ساتھ بڑھنے لگا (Fortesque) جو ہنری ششم کے عہد میں (Chief justice) تھا سچ کہتا ہے کہ انگلستان کا بادشاہ محض اپنی خواہش کی بنا پر ملک کے کسی قانون میں تبدیلی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ طرز حکومت شاہی نہیں بلکہ سیاسی ہے

ٹیوڈر خاندان کے بادشاہوں نے بھی باوجود اس کے کہ وہ استبدادی حکومت کے بہت عاشق تھے۔ قانون ہی کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کیا اور بعض مرتبہ معمولی عدالت میں بھی بعض حقوق حاصل کرنے کے لئے چارہ جوئی کی مثلاً ہنری ہشتم نے جب یہ چاہا کہ پوپ کی قوت تمام انگلستان کے کلیساؤں سے زائل ہو جاوے تو اس نے اپنے قانونی مشیر کو حکم دیا کہ خود بادشاہ پر اس امر کا مقدمہ چلایا جاوے کہ مذہبی پیشوا کے اختیارات بادشاہ نے کیوں سلب کئے ؟ مقدمہ کی سماعت ہوئی۔ بادشاہ کی طرف سے بھی پیروی ہوئی۔ اخیر میں مقدمہ بادشاہ کے حق میں فیصل ہوا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ بھی قانون سے بالاتر نہیں ہے

دوسری بات یہ ہے کہ انگریزی قانون نے کبھی کسی خصوصی طبقہ کا اعتراف نہیں کیا۔ یعنی قانون کی نظروں میں غریب و امیر رذیل و شریف سب برابر ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ وراثتاً بڑے لڑکے کا حق خاص طور پر انگریزی آئین کے اعتبار سے زیادہ مانا گیا ہے۔ اور اس طرح بڑے بھائی اور چھوٹے بھائیوں کے رتبہ میں بیّن فرق ہو جاتا ہے۔ لیکن شاید یہ اصول خود بھی ایک حد تک تصادم کے دور کرنے میں موید ہوا اور کم از کم اس کا یہ نتیجہ تو ضرور ہوا کہ اس ایک حق مخصوص کو چھوڑ کر بقیہ حقوق کے اعتبار سے مساوات قائم ہو گئی۔ اگر شروع ہی سے اس خیال کا ارتقا اس طریقہ پر نہ ہوتا اور امراء اور غرباء میں قانونی امتیاز رکھا جاتا تو ظاہر ہے کہ پارلیمنٹ کی بھی صورت آج بدلی ہوئی نظر آتی

تیسرے یہ کہ قانون پیشہ جماعت نے بھی اس نظریہ کی تکمیل میں مدد کی اور اسی طرح انگریزی دماغ کی ترتیب اور تنظیم میں قانونی مساوات کا پہلو قائم رہا ـــــ قانون پیشہ جماعت سے خاص طور پر مراد وہ سوسائٹیاں ہیں جن سے Bar اور Bench یعنی عدالت اور وکلا پیدا ہوئے۔ انگلستان کی یہ جماعت کسی منظم قانون کا نتیجہ نہیں تھی یا کسی یونیورسٹی کے قانون کے ماتحت پیدا نہیں ہوئی بلکہ اس کا ارتقا بھی انگلستان کے تمدن کے ارتقا کے ساتھ ساتھ ہوتا گیا اور جس شکل میں آج وہ موجود ہے اور جو کچھ اس کی خصوصیات ہیں وہ کسی اور قانونی جماعت کو حاصل نہیں ـــــ انگلستان کا (Common law) یعنی قانونِ معاہدہ وغیرہ جس پر قوم فخر کرتی ہے اور جس سے پوری قوم کو قوت حاصل ہے وہ فی الحقیقت انھیں سوسائٹیوں کی محنت اور دماغ کا نتیجہ ہے۔ اور انھیں سوسائٹیوں کا اثر پارلیمنٹ کے ارتقا میں بھی بہت کچھ معاون ثابت ہوا

(Maitland) بہت صحیح کہتا ہے کہ قرونِ وسطیٰ کے انگلستان کی امتیازی چیز پارلیمنٹ نہیں ہے کیونکہ اس شکل کی جماعتیں تو اور بھی ملتی ہیں، اسی طرح (jury System) بھی نہیں ہے کیونکہ یہ ایک حد تک فرانس میں بھی تھا ـــــ بلکہ انگلستان کی سب سے زیادہ امتیازی چیز Inns of Court [1]

---

[1] انگلستان میں چار (1) Gray's Inn ہیں

اور (year book) ہیں۔ جو اس میں پڑھی جاتی تھیں اور جن کی نظیر اور کہیں نہیں ملتی
(Hallam) کہتا ہے کہ کرامویل کی فوج کا مزاج بہ نسبت پارلیمنٹ کے بہت زیادہ انقلاب پسند اس وجہ سے تھا کہ پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں پر دستور کا اثر اور اس سے زیادہ قانون پیشہ جماعت کا اثر موجود تھا یہ قانون پیشہ جماعت ہی کا اثر تھا کہ رفتہ رفتہ پارلیمنٹ میں دستور اور روایات کی ایک نہایت خوشنما اور شاندار عمارت تعمیر کر دی گئی۔ اور اسی جماعت کا اثر تھا کہ صدر کا عہدہ مثل عدالتی جج کے قائم ہو گیا

الغرض انگریزی آئین کے اعتبار سے اور انگریزوں کی تربیت اور تنظیم کے لحاظ سے قانون کو ایک اہم خصوصیت حاصل ہے جس کے دو نمایاں نتائج ہیں —— اوّل یہ کہ کوئی آدمی مستحق سزا نہیں ہو سکتا جب تک اس نے قانون کے خلاف کوئی کام نہ کیا ہو۔ اور یہ خلاف ورزی ملک کی کسی عدالت میں ثابت نہ ہو گئی ہو —— دوسرے یہ کہ ملک کے ہر شخص کے لئے ایک ہی قانون ہے یا بہ الفاظ دیگر یہ کہ قانون کی نظروں میں سب برابر ہیں

جو کچھ اوپر لکھا گیا اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ انگریز قوم قانون کی حرف بہ حرف پابندی کرتی رہی ہے بہت سے قوانین اکثر پچھلے زمانہ میں ایسے ہوئے ہیں جن پر یا تو بالکل عمل درآمد نہیں ہوا۔ یا وہ رفتہ رفتہ کالعدم ہو گئے مثلاً پارلیمنٹ کے اس قانون پر کہ پارلیمنٹ سالانہ مدعو کی جائے۔ بسا اوقات عمل نہیں ہوا۔ اسی طرح ہنری ہشتم کے وقت میں ایک قانون یہ تھا کہ Knights اور Burgess کو اپنے اپنے حلقہ میں سکونت پذیر ہونا چاہیئے مگر اس کا لحاظ نہیں رکھا گیا، گو یہ قانون بہت بعد کو ۱۷۷۴ء میں منسوخ ہوا —— اسی طرح ایڈورڈ ثالث کے وقت میں یہ قانون پاس ہوا کہ قانون پیشہ جماعت دیوان عام میں نہ بیٹھ سکے گی۔ لیکن اس پر عمل درآمد نہ ہوا — حالانکہ یہ قانون ۱۸۷۱ء میں منسوخ ہوا (Common law) کا یہ قانون بھی کہ نابالغ دیوان عام کا ممبر نہیں ہو سکتا پس پشت ڈال دیا گیا —— اسی طرح اور بہت سی مثالیں ایسی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہ صرف قدیم زمانہ میں بلکہ زمانۂ حال میں بھی قانون کی پوری پابندی

(حاشیہ صفحہ ۳۰)
(2) Inner part
(3) Lincoln's Inn
(4) Middle temple

انھیں چاروں میں بیرسٹری کی تعلیم دی جاتی ہے اور یہیں کے پاس شدہ صاحبان انگلستان میں بطور وکلا کے کام کرتے ہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ انگلستان میں یونیورسٹیوں کی قانونی ڈگری سے عدالت میں حق وکالت حاصل نہیں ہوتا

نہیں کی گئی۔ لیکن غور کرنے سے اصلی راز ظاہر ہو جاتا ہے۔ کہ انگریز جس قانون کی وقعت کرتے ہیں وہ قانون وہ ہے جو قوم کی روایات اور رضامندی پر مبنی ہو اور نیز عقلاً صحیح ہو ـــــ یہ بارہا دیکھا گیا کہ وہ قانون جس میں عوام کے حقوق کی حفاظت کا پورا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ اس کو اُس عدالت نے مسترد کر دیا جس کو قوم کی فطری اور تنظیمی قابلیت کی عدالت کہا جا سکتا ہے

سید۔ ان۔ اے۔ جعفری

شہوانیات یا ترغیبات جنسی

حضرت نیاز کے قلم سے

جس میں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات اور اُن کی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اور آیندہ اخلاق انسانی کی بنیاد کن اصول پر قائم ہوتا ہے۔ الغرض اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب بالکل نئی چیز ہے اور ایک بار شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے ہوئے آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ اس کتاب میں ایسے ایسے حیرت انگیز واقعات درج ہیں کہ آپ نے کبھی ـــــ سنے نہ ہوں گے۔ اگر آپ **نگار** کے خریدار ہیں تو علاوہ محصول ۸ ر کے مجلد کتاب صرف ۱۲ ر میں۔ اور غیر مجلد ۱۰ ر میں ملے گی اور اگر آپ **نگار** کے خریدار نہیں ہیں تو مجلد ۱۴ ر میں اور غیر مجلد ۱۲ ر میں علاوہ محصول ۸ ر کے ملے گی

اگر

ارشاد ہو تو کتاب ذریعۂ وی۔ پی روانہ کی جائے حجم ۲۷۵ صفحات۔ آرڈر میں مجلد و غیر مجلد کی صراحت ضروری ہے ـــــ

مینیجر نگار لکھنؤ

تاریخ کا ایک ورق مجہول

محبّت کی قربانیاں

خمارویہ بن احمد بن طولون سخت پریشان ہے اور حکم دیتا ہے کہ ابن یعقوب کو طلب کیا جائے۔ ابن یعقوب قبطی طبیب ہے۔ اور اپنے علم و حذاقت کے لحاظ سے خاص شہرت کا مالک ہے

ابن یعقوب حاضر ہوتا ہے اور خمارویہ اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے :-

" اے ابن یعقوب، میں بہت درماندہ و مضطرب ہوں اور اب اپنی تمام اُمیدوں کا مرکز تجھکو قرار دیکر، تیری مدد چاہتا ہوں۔ تجھے معلوم ہے کہ میں کوثر سے کتنی محبّت کرتا ہوں اور اس کی بیماری نے میری زندگی تلخ کر رکھی ہے۔ پھر تیری حذاقت کس دن کام آئے گی اور سوائے تیرے اس ملک میں کون ہے جو اس کے مرض کا علاج کرسکے

کوثر، تیری ہی طرح نصرانی مذہب رکھتی تھی لیکن جب اس کا باپ اسلام لایا تو وہ بھی مسلمان ہوئی اور میرے حبالۂ عقد میں آئی۔ اب میں اس کی بیماری کی وجہ سے سخت پریشان ہوں اور اگر کوئی شخص اس کو صحیح و تندرست کرسکے تو میں بڑی سی بڑی دولت پیش کرنے کے لئے طیار ہوں"

یہ سُنکر ابن یعقوب نے کہا کہ " جو کچھ میرے امکان میں ہے اس سے دریغ نہ کروں گا۔ اور اپنی ساری کوششیں اس کی صحتیابی کے لئے صرف کردوں گا "

خمارویہ، اپنے باپ احمد بن طولون کی وفات پر ۲۷۰ھ میں مصر کے تخت پر بیٹھا اور اپنے باپ کی طرح نہایت اچھا حکمراں ثابت ہوا —— اس نے تمام اُمورِ مملکت پر خاص توجہ صرف کی، حدودِ سلطنت وسیع کئے اور اقطارِ اسلامیہ میں طولونی حکومت کا آوازہ بلند کردیا —— مصر کے اندر کثرت سے مساجد و محلات تعمیر کئے، رعایا کی راحت و آسایش کا خاص خیال رکھا اور شاہانہ جاہ و جلال میں بھی بہت کچھ اضافہ کیا۔ خمارویہ ایک جری سپاہی، ایک صاحبِ جبروت سردار، ایک قدرشناس فرمانروا تھا اور وہ بلالحاظ ملت و مذہب فضل و کمال کی عزّت کرنے والا تھا

ایک دن اس کو معلوم ہوا کہ ...... فوج میں ایک سپاہی ہے جو ابن طولون کے زمانہ میں اسلام لایا تھا اور وہ ایک لڑکی رکھتا ہے جو حُسن و جمال اور بلندی سیرت کے لحاظ سے مصر بھر میں اپنا جواب نہیں رکھتی

چنانچہ اس نے سپاہی کو طلب کیا اور پیام دیکر اس کی لڑکی کوثر سے نکاح کرلیا

جب کوثر محل شاہی میں داخل ہوئی اور خمارویہ نے اس کے حسن وجمال کو قریب سے دیکھا تو اس کا شیفتہ ہوگیا۔ لیکن چونکہ قصر شاہی مصر و شام، سرکیشیا و گرجستان کی نہایت حسین وجمیل عورتوں سے بھرا ہوا تھا، اور خمارویہ کبھی کبھی ان کی طرف بھی ملتفت ہوجاتا تھا، اس لئے کوثر اپنے محبوب شوہر کے اس طرز عمل سے کڑھتی رہتی تھی، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ وہ گھلنے لگی اور دماغ پر بھی ایسا سخت اثر ہوا، کہ ایک دن سب نے جان لیا کہ وہ دیوانی ہوگئی ہے

خمارویہ اور ابن یعقوب طبیب کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی اس کو کچھ زمانہ ہوگیا ہے اور خمارویہ اپنی محبوب بیوی کے پاس سے ایک لمحہ کے لئے جدا نہیں ہوتا

ایک دن ابن یعقوب آیا اور بولا کہ "ملکہ کے علاج کے لئے خاص اہتمام کی ضرورت ہے۔ اور اگر بادشاہ ایک شفاخانہ خصوصیت کے ساتھ پاگلوں کے علاج کے لئے قائم کرنے پر راضی ہو تو ممکن ہے ملکہ شفایاب ہوجائے

یہ سنتے ہی خمارویہ نے پایۂ تخت میں نہایت وسیع پیمانہ پر ایک عمارت اس غرض کے لئے طیار کرائی[1] اور اس کا نام "المارستان" رکھا گیا ——— کوثر اس شفاخانہ میں داخل کی گئی اور وہاں سے شفا پاکر قصر میں واپس آئی

ظاہر ہے کہ خمارویہ کی محبت کا کیا عالم ہوگا —— اس نے سوائے کوثر کے تمام عورتوں سے بات کرنا ترک کردی اور دونوں محبت کی فردوسی زندگی بسر کرنے لگے

بظاہر یہ نہایت معمولی واقعہ تھا، لیکن اندر ہی اندر نہایت ہولناک مستقبل طیار کر رہا تھا —— کیونکہ محل کی وہ تمام عورتیں جو خمارویہ کی نگاہ سے اتر گئی تھیں، کوثر اور خمارویہ دونوں سے جلنے لگیں اور انھوں نے درپردہ امراء وافسران فوج سے مل کر ان کی ہلاکت وتباہی کی سازشیں شروع کردیں

رجب ۲۷۹ھ کی انیسویں تاریخ ہے، عباسی خلیفہ المعتضد باللہ تخت نشین ہوتا ہے اور لوگوں سے اس کے خلافت پر بیعت لی جارہی ہے ——— خمارویہ بھی اپنی طرف سے کچھ قیمتی ہدایا خلیفہ کی خدمت میں بھیجنا چاہتا ہے اور اپنے ایک مخلص دوست حسین بن عبداللہ کو (جو ابن الخصاص کی کنیت سے مشہور تھا) اس خدمت

---

[1] یہ مورخین کی غلطی ہے کہ اس شفاخانہ کی تعمیر کو احمد بن طولون کی طرف منسوب کرتے ہیں

کے لئے منتخب کرتا ہے

ابن الخصاص، نہایت ہوشیار شخص تھا، اس نے سوچنا شروع کیا کہ کیونکر اس خدمت سے پورا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے ـــــ وہ جانتا تھا کہ خمارویہ کی لڑکی " قطرالندی[1] " بے انتہا حسین و جمیل ہے اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ خلیفہ کے پاس پہونچ کر اس کا ذکر کرے گا تاکہ وہ اپنے بیٹے علی سے اس کی شادی کر کے طولونی فتنہ سے ہمیشہ کے لئے مطمئن ہو جائے

چند دن کے بعد ابن الخصاص ہدایا لے کر روانہ ہوا۔ اور منزلیں طے کر کے خلیفۂ عباسی کے حضور میں پہونچ گیا ـــــ خلیفہ نے نہایت مسرت سے ان قیمتی ہدایا کو قبول کیا اور ابن الخصاص سے گفتگو کرنے کے لئے تخلیہ کر دیا گیا

ابن الخصاص نے مصر کا حال بیان کرتے ہوئے خمارویہ کی لڑکی " قطرالندی " کے حسن و جمال کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ اگر ولیعہد خلافت (علی) کے ساتھ اس کی شادی ہو جائے تو بہت مناسب ہے ـــــ خلیفہ نے کہا۔ " میں نے اور لوگوں سے بھی اس لڑکی کے حسن و جمال کا ذکر سنا ہے۔ اور میں خمارویہ سے خود اپنے لئے اس کی خواہش کروں گا "

یہ کہہ کر اس نے دس ہزار دینار ابن الخصاص کو دئے اور حکم دیا کہ جلد سے جلد مصر جا کر خمارویہ تک یہ پیام پہونچا دیا جائے

ایک سال گزرا اور دوسرا بھی ـــــ

محرم ۲۸۲ھ میں ایک شاندار جلوس بغداد کی گلیوں میں داخل ہوتا ہے۔ جس کے وسط میں خمارویہ کی لڑکی " قطرالندی " زرّیں محمل پر سوار نظر آتی ہے، اور ابن الخصاص آگے آگے ہے

قطرالندی، خلیفۂ عباسی کے محل میں داخل ہو جاتی ہے۔ اور ابن الخصاص بیش قیمت ہدایا کے ساتھ مصر واپس کیا جاتا ہے

" قطرالندی " کی روانگی کے بعد خمارویہ نے ارادہ کیا کہ تبدیل آب و ہوا کے لئے قصر حکومت کو چھوڑ کر چند دن کے لئے دمشق چلا جائے۔ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ حرم کی تمام عورتیں کو ترکے جلو میں ساتھ ساتھ

---

[1] یعنی " قطرۂ شبنم "

چلیں ——— خمارویہ نے ایک شیر پال رکھا تھا جو اس کے ساتھ ہر وقت قصر میں رہا کرتا تھا۔ یہ کبود آنکھوں والا شیر بہت خوبصورت تھا۔ اور اپنے مالک سے صد درجہ مانوس تھا۔ خمارویہ کا اعتقاد تھا کہ جب تک یہ شیر میرے پاس ہے کوئی دشمن اس کو گزند نہیں پہونچا سکتا

روانگی سے قبل اس کی ایک حرم نے جو کوثر کی شدید دشمن تھی خمارویہ سے کہا کہ " اے آقا، لوگ کہتے ہیں کہ آپ بزدل ہیں اور اسی لئے اپنی حفاظت کے لئے ہر وقت شیر کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ مجھ سے لوگوں نے بیان کیا تو میں نے کہا کہ یہ غلط ہے اور دیکھ لینا اب کے سفر میں شیر ساتھ نہ جائے گا "

خمارویہ نے جواب دیا کہ " تم نے خوب جواب دیا، بے شک میں شیر کو ساتھ نہ لے جاؤں گا تاکہ لوگ مجھے بزدل نہ سمجھیں

چنانچہ وہ شیر کو وہیں مصر میں چھوڑ کر دمشق روانہ ہوگیا

دمشق پہونچنے کے بعد محل کی عورتوں کو اپنی سازش کی تکمیل کا کافی موقعہ مل گیا۔ اور بعض افسران فوج اور خادموں کی مدد سے اس کو ذبح کرادیا ——— یہ واقعہ ذی قعدہ ۲۸۲ھ کا ہے، یعنی اسی مہینہ کا جب اس کی لڑکی قطر الندی کے ساتھ خلیفہ المعتضد باللہ نے شادی کی تھی

۳ ر ذی الحجہ کو خلیفہ تک اس واقعہ کی خبر پہونچی اور اس نے بیس آدمیوں کو جو اس جرم میں شریک تھے تہ تیغ کرادیا ——— انھیں میں ایک شخص ابوالجیش بھی تھا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد خلیفہ نے ابن الخصاص کو خط بھیجا اور اُسے مصر طلب کیا

قطر الندی کو جب اپنے باپ کے قتل کئے جانیکا حال معلوم ہوا تو بہت روئی اور التجا کی کہ کوثر کو یہاں بُلا لیا جائے، کیونکہ وہ اس کے باپ کی بہت محبوب بیوی تھی "

خلیفہ نے پوچھا کہ " تم یہ کیوں چاہتی ہو " ——— قطر الندی نے جواب دیا کہ مصر میں تنہا وہی ایک عورت ایسی تھی جس سے مجھ کو بہت محبت تھی۔ اور جب میری ماں کا انتقال ہوا تو اُس نے اپنے بچوں کی طرح مجھے رکھا اور نہایت شفقت سے پیش آئی ——— مجھے اندیشہ ہے کہ اگر وہ وہاں چھوڑ دی گئی تو لوگ اس کو بہت پریشان کریں گے بلکہ ہلاک کر ڈالیں گے "

خلیفہ نے ابن الخصاص کو دمشق بھیجا تاکہ کوثر کو اپنے ساتھ لے آئے، لیکن یہاں پہونچ کر اس نے عجیب رنگ دیکھا، محل کے اندر عجیب ہنگامہ برپا تھا اور کوثر غائب تھی ——— ایک بڑھیا سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ خمارویہ کے قتل کے بعد ہی چلی گئی تھی۔ اور دمشق کے ایک لکڑہارے کے مکان

میں اس نے پناہ لی تھی

ابن الخصاص اس کے پاس پہونچا تو معلوم ہوا کہ کوثر بے شک وہاں آکر ٹھیری تھی لیکن تین دن ہوئے کہ دفعۃً غائب ہوگئی

ابن الخصاص نے خیال کیا کہ اگر وہ کوثر کو لے کر بغداد نہ گیا تو ممکن ہے خلیفہ اس کو بھی سازش میں شریک سمجھے، اس لئے اس نے شہر کا کونہ کونہ چھان مارا اور آخرکار چوتھے دن دیکھا گیا کہ دریا میں ایک عورت کی لاش خس و خاشاک میں اُلجھی ہوئی پڑی ہے اور وہ عورت کوثر تھی

آئندہ جنوری ۱۹۳۴ء کا نگار

(تقریباً دوچند ضخامت کا)

مخصوص ہوگا صرف ایک موضوع کے لئے جسپر اُردو میں اسوقت تک کسی نے قلم نہیں اٹھایا

یعنی

"لبوں کی داستان زبانِ قلم سے"

آپ کے "لب" ہر وقت متحرک رہتے ہیں اور سب سے زیادہ خدمت انھیں سے لیجاتی ہے، لیکن کیا آپکو معلوم ہو کہ جذبات کی دنیا میں، نفسیاتی حقایق میں، عالم شعر و تصوف میں "لب" کو کیا اہمیت حاصل ہے۔ اور دنیا کی تاریخ میں کیسے کیسے انقلاب اسکی وجہ سے رونما ہوئے ہیں

جنوری ۱۹۳۴ء کا نگار

اس کی مفصل داستان آپ کو سنائے گا اور اس موضوع پر تحقیق کے وہ نقوش آپکے سامنے پیش کریگا کہ آپ حیران رہ جائینگے

علاوہ اس کے

بعض اور بھی نہایت اہم مضامین ہوں گے

اگر

آپ نے نگار کی خریداری جاری رکھی تو یہ مجموعہ آپکو مفت مل جائیگا۔ ورنہ یوں کسی قیمت پر بھی دستیاب نہیں ہوسکتا

مینجر نگار لکھنؤ

تقلید کے خراب نتائج

اور ہمارے علمار کی عبرتناک حالت

مسلم ریوائول کی اشاعت (جون ۳۳ء) میں مسٹر سلیم چشتی کا ایک فاضلانہ مقالہ شائع ہوا ہے جس میں تقلید سے بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اس سے مسلمانوں کو کسقدر نقصان پہونچا اور اُن کی یہ ذہنی غلامی کس حد تک ان کے لئے مضر ثابت ہوئی۔ ہم اس کے ایک حصّہ کا خلاصہ ناظرین نگار کے مطالعہ کے لئے پیش کرتے ہیں

چھٹی صدی عیسوی بھی عجیب صدی تھی جب ایک طرف جسٹی نین نے یونان میں حکمت وفلسفہ کی درسگاہوں کو بند کیا اور دوسری طرف خلیفہ مستنجد نے مباحث حکمیہ وعقلیہ کو عملاً روک دیا

یونان میں اس کا جو سبب بھی ہوا ہو، لیکن بغداد میں یہ سب کچھ محض علمار کی وجہ سے ہوا جو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اگر علم وعقل کی روشنی سے لوگ بہرہ ور ہوئے تو پھر دنیا اُن کو تاریکی میں ڈال دے گی اور ان کا جاہ ووقار خاک میں مل جائے گا

ہر چند دنیائے اسلام میں کوئی عورت ایسی تو پیدا نہیں ہوئی جو ہائی پیشیا کی طرح بغداد ودمشق کی گلیوں میں برہنہ گھسیٹی جاتی، پھر بھی مردوں میں شیخ شہاب الدین ایسی بعض ہستیوں کو قدامت پرست علمار فقہ کا شکار بننا پڑا ــــ

ان علمار کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے آپ کو خدا کا جانشین سمجھتے تھے اور جو شخص اُن کے احکام پر تنقید کرتا تھا وہ اگر ہاتھ آگیا تو دار پر چڑھا دیا جاتا تھا ورنہ کافر وملحد کہ کے جنت کا دروازہ اس پر بند کر دیا جاتا تھا ــــ ابن تیمیہ ہر چند کوئی بڑا عقل پرست شخص نہ تھا لیکن محض اس لئے کہ تقلید کے باب میں اس کا نقطۂ نظر دوسرے علمار سے مختلف تھا، وہ غریب بھی قید وبند کے آزار سے نہ بچ سکا

الغرض تقلید رفتہ رفتہ مسلمانوں میں اساس مذہب قرار پاگئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ذہنی غلامی کی وجہ سے وہ علوم وفنون میں کوئی مخترعانہ دستگاہ نہ پیدا کرسکے۔ اگر کوئی شخص ادنیٰ سا انحراف بھی تقلید کے دیوتا سے کرتا تھا تو اسے کافر سمجھا جاتا تھا۔ اور مذہب کا مفہوم صرف یہ رہ گیا کہ آنکھ بند کرکے اسلاف کی پیروی کی جائے

اب آئیے اس تقلید کے نقصانات پر بھی ہلکی سی تفصیلی نظر ڈال لیں :-

(۱) سب سے پہلے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے قرآن پاک میں تفکر و تدبر ترک کر دیا۔ اور اگر کوئی شخص ذاتی طور پر اس کو سمجھنا چاہتا بھی تو اس کو ضلالت و بدعت قرار دیا جاتا۔ اسی لئے قرآن مجید کی تفاسیر نسبتاً بہت کم لکھی گئیں۔ اور جو لکھی بھی گئیں وہ صرف اسلاف کے نقطۂ نظر کو سامنے رکھکر اور کسی مزید تحقیق سے سروکار نہ رکھا گیا اس کے مقابلہ میں یوروپ و امریکہ کو دیکھئے کہ اس وقت تک وہاں انجیل کی کتنی تفسیریں شائع ہو چکی ہیں اور ہنوز یہ سلسلہ بند نہیں ہوا۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ عیسوی مذہب کے متبعین کو اس کا اندیشہ نہیں ہے کہ انجیل کی تفسیر میں اسلاف کی روش ترک کرنے پر انھیں کافر قرار دیدیا جاویگا اور اس آزادانہ رائے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں تنقید کی اہلیت لوگوں میں پیدا ہوگئی۔ اور مذہب نام صرف کورانہ تنقید کا نہ رہا۔

مسلمان عیسائیوں کو کافر و مشرک کہنے کے بڑے شایق ہیں، لیکن ان کافروں نے اپنے مذہب کی جو عظیم خدمات انجام دی ہیں وہ بھی قابل غور ہیں۔ اس وقت انجیل کا ترجمہ ۹۰، مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے اور برخلاف اس کے ہندوستان کے علمائے اسلام قرآن کو ابھی تک اپنے ہی ملک والوں کے لئے قابل فہم نہیں بنا سکے، دوسری قوموں کا کیا ذکر ہے، درانحالیکہ یہاں بادشاہوں کے ساتھ ساتھ صدیوں تک انھوں نے بھی حکومت کی ہے۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ تنقید کی مذموم عادت نے ان کے ذہن و دماغ کو کند کر رکھا ہے اور چونکہ اسلاف نے دوسری زبانوں میں قرآن کا ترجمہ نہیں کیا اس لئے یہ کیونکر ایسی جرأت کر سکتے ہیں

(۲) قرآن کے ساتھ ہی ساتھ احادیث کا بھی تنقیدی مطالعہ ترک ہو گیا یہاں تک کہ اگر آج کوئی شخص اس خیال کا اظہار کر دے کہ کتب احادیث، تنقید کی محتاج ہیں تو اس کو تمام علماء، گمراہ سمجھنے لگیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ امام بخاری نے اپنے زمانہ کے لحاظ سے ایک حد تک تنقیدی نگاہ احادیث پر ضرور ڈالی لیکن اس کے بعد پھر مسلمانوں میں نہ کوئی دوسرا امام بخاری پیدا ہو سکا اور نہ موجودہ زمانہ کے لحاظ سے کسی کو تنقید کی ہمت ہوئی

ترمذی اور نسائی میں ظہور امام مہدی کے متعلق متعدد احادیث پائی جاتی ہیں، لیکن امام بخاری نے ان میں سے کسی کو قابل اعتبار نہیں سمجھا۔ پھر سوال یہ ہے کہ اگر امام بخاری کو اس تنقید کا حق تھا تو دوسرے مسلمانوں کو کیوں نہیں ہو سکتا اور اگر آج کوئی شخص تنقید کے معیار کو زیادہ بلند کرکے احادیث کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے یا خود صحیح بخاری پر تنقید کرنا پسند کرتا ہے تو کیوں اُسے کافر قرار دیا جائے

کیا امام بخاری معصوم تھے؟ کیا اُن سے غلطی سرزد ہونا ممکن نہ تھا؟ کیا بخاری کی احادیث وحی و الہام کا مرتبہ رکھتی ہیں۔ یقیناً کوئی شخص اس کا مدعی نہیں ہو سکتا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ جس طرح امام بخاری

نے اپنے زمانہ کے لحاظ سے تنقید کی، اسی طرح آج کوئی دوسرا شخص خود احادیث پر تنقیدی نگاہ نہ ڈالے
کیا کلام مجید میں کوئی آیت ایسی پائی جاتی ہے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ امام بخاری کے بعد تنقید و تحقیق، تفتیش و جستجو، علمی و ذہنی ترقی کا دروازہ بند ہو جائیگا اور جو شخص امام بخاری سے اختلاف کرے گا وہ جہنم میں پھینک دیا جائے گا

مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ رسول کی ایک خاص بلند سیرت ہوتی ہے اور وہ کبھی اس اخلاق سے منحرف نہیں ہو سکتا جس کی تعلیم وہ دوسروں کو دیتا ہے، لیکن کسقدر حیرت ہے کہ باوجود اس علم و یقین کے مسلمان علماء کو اس کی توفیق نہیں ہوتی کہ وہ بخاری سے ان احادیث کو نکال دیں جن سے رسول اللہ کی عظمت مجروح ہوتی ہے اور جن کو سامنے رکھکر دوسرے مذاہب والے اعتراضات کیا کرتے ہیں۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ اسلاف پرستی کی فضا میں پیدا ہوئے، تقلید کی تباہ کن آواز گہوارہ ہی سے اُن کے کانوں میں پڑی اور اب ان میں مطلقاً جرأت نہیں کہ وہ دوسری تیسری صدی ہجری کی روایات سے ایک انچہ آگے قدم بڑھائیں

مقلدین ایک معترض کو یہ جواب دیا کرتے ہیں کہ " کیا تم امام بخاری سے زیادہ دانشمند ہو ؟ کیا تمام گزشتہ ائمہ و فقہا بیوقوف تھے ؟ کیا گزشتہ سات آٹھ سو سال میں کوئی صاحب عقل پیدا ہی نہیں ہوا جو اس طرف توجہ کرتا ؟

لیکن کوئی ذی فہم اس دلیل سے متاثر نہیں ہو سکتا کیونکہ ممکن ہے وہ شخص جو خاندانی مسلمان چلا آرہا ہے مرعوب ہو کر خاموش ہو رہے، لیکن ایک غیر مسلم کے سامنے اگر یہ سوالات کئے جائیں گے تو وہ نہایت آزادی سے کہدے گا کہ " ہاں بے شک ایسا ہی ہے "

عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی پر تنقید کرنا اس کی تکذیب ہے اور اگر امام بخاری پر تنقید کی جائیگی تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ اُن کو جھٹلا یا گیا، حالانکہ ایسا خیال کرنا سخت غلطی ہے اور نہ اس میں کسی کی توہین ہوتی ہے ـــ افلاطون و ارسطو سے لے کر کانٹ اور ہیگل تک سب پر متاخرین نے تنقید کی، اُن سے اختلاف کیا، لیکن کیا اس سے افلاطون و ارسطو وغیرہ کی توہین ہو گئی اور کیا دنیائے علم و حکمت میں اُن کا مرتبہ کم ہو گیا ـــــ اسی طرح اگر محدثین و فقہاء پر آج بھی تنقید کی جائے تو اس کے یہ معنے نہیں ہو سکتے کہ ہمارا مقصود اُن کی تکذیب و توہین ہے اور اُن کا مرتبہ کبھی اس سے کم نہیں ہو سکتا

فقہاء خدا تو تھے نہیں کہ ان کا بنایا ہوا قانون ہر زمانہ اور ہر ملک کے لئے موزوں ہو سکتا۔ جس طرح انھوں نے اپنے زمانہ کے لحاظ سے قانون وضع کیا اسی طرح آج بھی موجودہ حالات کے لحاظ سے وضع شریعت

کی خدمت انجام دینی چاہیئے۔ پھر یوں بھی دیکھئے کہ کتنے مسائل میں امام محمد اور امام ابو یوسف نے امام ابو حنیفہ سے اختلاف کیا ہے، تو کیا وہ اپنے اُستاد سے زیادہ عقلمند تھے ـــــ اسی طرح امام شافعی سے امام ابو حنیفہ نے اختلاف کیا ہے تو کیا یہ ان سے زیادہ صاحب فراست تھے ـــــ پھر کسقدر عجیب بات ہے کہ یہ چار ائمہ تو باوجود اختلاف کے راہِ راست پر تسلیم کئے جاتے ہیں لیکن اگر کوئی پانچواں اُن سے اختلاف کرے تو وہ گمراہ قرار دیا جائے

کیا رسول اللہ نے یہ تعیین کر دی تھی کہ ائمہ فقہ ان چار سے زیادہ نہ ہوں گے، کیا قرآن مجید سے کوئی ثبوت اس کا پیش کیا جا سکتا ہے

یقیناً اس سے زیادہ توہین اسلام کی کوئی اور نہیں ہو سکتی کہ غزالی، رازی، بخاری، یا ابو حنیفہ سے زیادہ صاحب عقل و فراست انسان کی پیدائش کو محال قرار دے

اس کا راز صرف یہ ہے کہ مسلمان یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اُن کو جو کچھ بننا تھا وہ بن چکے ہیں۔ اور اب زندگی کے کسی شعبہ میں، کسی علم و فضل میں اُن کو ترقی کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور نہ وہ ترقی کر سکتے ہیں۔ چنانچہ دیکھئے کہ گزشتہ چھ سات صدی کے اندر کوئی ایک شخص بھی مسلمانوں میں ایسا پیدا نہیں ہوا۔ جس نے اپنی علمی یا ذہنی ترقی کا ثبوت دیا ہو

(۳) جو ذہنیت مسلمانوں کی فقہ میں ہے وہی دوسرے علوم میں بھی ہے ـــــ اس وقت یقیناً وہ دنیا نہیں ہے جو چھٹی صدی ہجری میں پائی جاتی تھی، لیکن علماء اب تک وہی ہیں۔ اور اسی زمانہ کا خواب دیکھ رہے ہیں ـــــ چنانچہ آپ ان کے مدارس کے نصاب کو دیکھئے کہ اس میں اب تک وہی کتابیں رائج ہیں جو ۳۰۰ سال قبل ملا نظام الدین نے متعین کر دی تھیں

دنیا نئی ہو گئی ہے اور اس کے خیالات بالکل بدل گئے ہیں لیکن مولوی ابھی تک اسی جگہ پر قائم ہے جہاں صدیوں قبل پایا جاتا تھا۔ اور دنیا کی کوئی قوت اسے یقین نہیں دلا سکتی کہ درس نظامی اب مجموعۂ مزخرفات سے زیادہ کچھ چیز نہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کا سبب بھی وہی جذبۂ اسلاف پرستی و تقلید ہے جو اس کو اپنی جگہ سے ہٹنے نہیں دیتا

عربی مدارس میں جن علوم کی تعلیم عام طور پر دی جاتی ہے وہ یہ ہیں:-

(۱) ارسطو کی منطق و مابعد الطبیعیات

(۲) عربی نحو و صرف اور ادب

(۳) صحاح ستہ

(۴) فقہ
(۵) افلاطون کا نظام ہیئت
(۶) عقاید و کلام
(۷) تفسیر

اب آئیے لگے ہاتھوں ان پر ایک تنقیدی نگاہ بھی ڈال لیں

(۱) منطق اور ما بعد الطبیعیات میں ہمارے علماء اُن مسائل کی صحت کے قائل ہیں جو اب سے دو ہزار سال قبل پائے جاتے تھے ـــ نہ ان کو یہ خبر ہے کہ ان علوم میں کتنی ترقی ہو چکی ہے اور ان غریبوں کو اس کا علم کہ بیکن، اسپنوزا، ہیوم، کانٹ، مل اور برگسان کوئی جانور تھے یا انسان

(۲) عربی صرف و نحو کا یہ حال ہے کہ ایک عمر ضایع کرنے کے بعد بھی وہ ادب و انشاء پر قدرت حاصل نہیں کر سکتے

(۳) حدیث و فقہ کی کتابیں وہ الہامی کتابیں سمجھ کر پڑھتے ہیں اور مطلقاً قوتِ تنقید صرف کرنیکی ضرورت محسوس نہیں کرتے

(۴) ہیئت میں ان کا خدا صرف افلاطون ہے۔ نہ انھیں کیپلر کا حال معلوم ہے نہ گلیلیو کا، نہ برونو سے واقف ہیں نہ نیوٹن سے

(۵) علم کلام میں وہ صرف ان مصنفین کی کتابیں پڑھتے ہیں جنھوں نے فلسفۂ یونانی کو رد کیا تھا۔ ممکن ہے تیسری چوتھی صدی میں یہ مطالعہ مفید رہا ہو لیکن اب چودھویں صدی میں اس سے کیا کام چل سکتا ہے

(۶) تفسیر میں زیادہ تر بیضاوی، جلالین پڑھائی جاتی ہیں اور وہ بھی صرف سورۂ بقر تک اور محض ادب و انشا کو سامنے رکھ کر

ہمارے علماء نہ تاریخ سے آگاہ ہیں نہ جغرافیہ سے، نہ طبیعیات سے نہ علم الکیمیا سے، نہ کہربا کا علم انھیں حاصل ہے، نہ میکانکیات کا۔ پورے آٹھ سال وہ فقہ و حدیث کی تعلیم میں تو صرف کر دیتے ہیں لیکن قرآن کے لئے چند مہینوں سے زیادہ نہیں دیتے

پھر اس تعلیم کے ساتھ وہ اس کے لئے تو ضرور موزوں ہیں کہ مسجدوں میں اذان دیں یا امامت کرلیں لیکن علوم و فنون میں وہ ابنائے وطن کی کوئی رہبری نہیں کر سکتے اور نہ موجودہ مسائل پر رائے زنی کا سلیقہ اُن کو حاصل ہوتا

پھر اگر ہمارے علماء واقعی کوئی خدمت اسلام کی انجام دینا چاہتے ہیں اور مسلمانوں کو دوسری قوموں کے دوش بدوش ترقی کرتے ہوئے دیکھنا پسند کر سکتے ہیں، تو ان کا اولین فرض یہ ہونا چاہئے کہ وہ تقلید و اسلافیہ

کو چھوڑ کر زمانہ کی رفتار کو دیکھیں، اس کے حالات پر غور کریں اور سمجھیں کہ وہ بارھویں صدی میں نہیں بلکہ بیسویں صدی میں زندگی بسر کر رہے ہیں

ہمارے اسلاف نے فلسفۂ یونانی کے مُطالعہ کو کب حرام قرار دیا تھا اور تحقیق و اجتہاد کا دروازہ کب انھوں نے بند کیا تھا کہ آج اس کو حرام قرار دیا جائے، جس طرح وہ اپنے زمانہ میں مجتہد کی حیثیت سے نمودار ہوئے تھے۔ اسی طرح آج ہمارے علمار کو بھی تحقیقات جدیدہ اور اجتہاد و اختراع کا علمبردار ہو کر سامنے آنا چاہئے، ورنہ یوں محض کا فر کہدینے اور دستِ افسوس ملنے سے کام نہیں چل سکتا اور اس قوم کو حقیقتاً تباہ ہونا ہے اگر ہمارے علمار کی ذہنیت کا یہی عالم رہا

نگار کے گزشتہ سالوں کے پرچے

حسب ذیل قیمت پر معہ محصول مل سکتے ہیں

ماہ	قیمت
سنہ ۲۲ء	
ستمبر	۴ر
اکتوبر	۴ر
سنہ ۲۳ء	
مئی	۶ر
جون	عہ
سنہ ۲۴ء	
جنوری	۴ر
فروری	۴ر
مارچ	۴ر
اپریل	۴ر
مئی	۴ر
جون	۴ر
جولائی	۶ر
اگست	۴ر
ستمبر	۶ر
اکتوبر	۸ر
سنہ ۲۵ء	
دسمبر	عہ
سنہ ۲۶ء	
جنوری	۴ر
اپریل	۸ر
مئی	۴ر
جون	۴ر
اکتوبر	۴ر
نومبر	۴ر
دسمبر	عہ
سنہ ۲۷ء	
مارچ	۴ر
اپریل	۴ر
مئی	۴ر
جون	۴ر
سنہ ۲۸ء	
دسمبر	۸ر
سنہ ۲۹ء	
مارچ	۸ر
اکتوبر	عہ
نومبر	عہ
سنہ ۳۰ء	
مئی	۴ر
اگست	۸ر
ستمبر	۴ر
اکتوبر	۴ر
نومبر	۴ر
دسمبر	۶ر
سنہ ۳۱ء	
جولائی	۳ر
اگست	۳ر
ستمبر	۴ر
اکتوبر	۳ر
نومبر	۳ر
دسمبر	۳ر
سنہ ۳۲ء	
جنوری	۱۲ر
فروری	۴ر
مارچ	۴ر
اپریل	۸ر
سنہ ۳۲ء	
مئی	۴ر
جون	۴ر
جولائی	۴ر
اگست	۴ر
ستمبر	۴ر
اکتوبر	۴ر
نومبر	۴ر
دسمبر	۴ر
سنہ ۳۳ء	
فروری	۴ر
مارچ	۸ر
اپریل	۸ر
مئی	۸ر
جولائی	۴ر
اگست	عہ
ستمبر	۴ر
اکتوبر	۴ر
نومبر	۴ر

منیجر نگار لکھنؤ

"ایثار"

نثار اور ہاشم اس وقت سے ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے جب انھیں اس کا احساس بھی نہ تھا کہ محبت کیا چیز ہے، بچپن کی محبت اگرچہ اپنے اندر وہ طوفانی شورشیں نہیں رکھتی جو شباب میں نظر آتی ہیں لیکن اس کا معصومانہ انداز اور پاک جذبہ فرشتوں کے تبسم کی ابدی لذت اور دائمی مسرت رکھتا ہے، وہ ایک قوت تھی جو نہایت غیر محسوس انداز میں لیکن مسلسل ایک مقدس ارادہ کی طرح اُن کے سینوں میں پرورش پا رہی تھی۔ اگرچہ دونوں کی افتاد طبیعت میں کچھ فرق تھا، دونوں کے خیالات میں جا بجا اختلاف تھا لیکن دوستی اور محبت کی نیرنگیاں ان سب پر بالا تھیں، ہر اختلاف صرف اپنی ذات تک محدود تھا اور ہر ذاتی نقطۂ نظر اس کی منفرد ہستی تک اثر رکھتا تھا، محبت کی بارگاہ میں پہونچکر ہر تفریق مٹ جاتی تھی، مختصر یہ کہ دونوں میں بیحد محبت تھی اور ان کا زیادہ تر وقت ایک ساتھ گزرتا تھا۔ یہاں تک کہ گانوں کے لوگ آپس کی گفتگو میں دونوں کا نام بھی ساتھ ہی لیا کرتے تھے

ایک زمانہ گزرا اور دونوں کے بچپن نے کروٹ لی، شباب اپنی تمام ہیجانی کیفیتوں کے ساتھ آگیا، جوانی کی کیف آور گھڑیاں انبساط کے ساتھ افسردگی اور وارفتہ سری بھی لائیں، حسن و عشق کے معنی سمجھ میں آنے لگے اور دونوں احساسات کی اُس منزل پر پہونچ گئے جہاں ہر خاموشی سے نغمہ نکلنے کی آرزو کی جاتی ہے اور ہر زیر نقاب چہرہ کو عریاں دیکھنے کی تمنا پیدا ہوتی ہے، ذہنیت کی یہ عجیب و غریب تبدیلی جسقدر زیادہ قوی ہوگی اُسی قدر سختی کے ساتھ زندگی کی منازل قطع ہوں گی، شراب میں جتنی زیادہ تلخی ہوگی خمار اُسی قدر زیادہ کرب و اضطراب پیدا کرے گا، متین اور سنجیدہ انسان بھی شباب کے ان کہربائی جھٹکوں کی تاب نہیں لاسکتے۔ جس میں ہر جمیل شے اپنی طرف کھینچتی ہوئی نظر آتی ہے اور ہر حسین جلوہ دعوتِ نظر دیتا ہے

تو ہاشم اور نثار اب جوان تھے اور حیات کے اُس نقطہ پر تھے جہاں سارے وجود پر ایک بیخودی سی چھائی رہتی ہے۔ محمد آباد (جہاں ان کا گھر تھا) کے قریب ہی غوث پور نام کا ایک چھوٹا سا گانوں تھا، ہاشم کا باپ وہاں کا زمیندار تھا، گانوں آبادی کے لحاظ سے تو نہایت مختصر تھا لیکن شادابی میں اپنی آپ ہی مثال تھا، ہر فصل میں کھیت لہلہاتے ہوئے نظر آتے تھے، باغیچوں میں پارک کا لطف حاصل ہوتا تھا، آب و ہوا کے لحاظ سے دیہات کو شہر پر ہمیشہ فوقیت حاصل رہی ہے، غوث پور کی سادگی فطرت کے کارنامے کی بہترین مثال تھی، وہاں کی قدرتی رونق کسی انسان کے ہاتھ کی مرہون منت نہ تھی۔ . . . . گانوں سے ملا ہوا دوسرا تھا اور کچھ بنجر زمین تھی جس میں غوث پور کے لڑکے اور لڑکیاں اپنے چوپایوں کے ساتھ سارا دن گذار دیتی تھیں، قریب ہی ایک پھیلا تالاب تھا جو برسات میں شکاریوں کی امیدگاہ

ا رہتا تھا، ہاشم کو شکار سے ایک خاص دلچسپی تھی۔ یوں تو وہ ہر کھیل کا شیدا تھا لیکن شکار میں اُس کا
ون کی حد تک پہونچا ہوا تھا

گرمیوں کی تعطیل ختم ہونے کے قریب تھی، بارش شروع ہو چکی تھی، گانوں سے اطلاع آئی کہ تالاب
ں وغیرہ آنے لگی ہیں ۔ ٹھیک دوپہر کا وقت تھا جب ہاشم بندوق اور نثار کو ساتھ لے کر غوث پور روانہ
راستہ بھر شیریں فرہاد کے قصّہ پر بحث ہوتی رہی، ہاشم کا خیال تھا کہ فرہاد کو اُسی وقت مایوس ہو کر اپنا کام تمام
یئے تھا جب خسرو کی رقیبانہ چشمک شروع ہوئی تھی کیونکہ ایک بادشاہ کے مقابلہ میں ایک معمولی پیشہ ور
کو کامیابی کی کوئی اُمید نہیں ہوسکتی تھی، لیکن نثار کا نظریۂ محبت اس سے بالکل جداگانہ تھا، وہ خیال کرتا
ت ایک غیر فانی قوت ہے جو پیدا ہونے کے بعد مٹ نہیں سکتی ہے، ممکن ہے کہ اُس کا محبوب اس سے چھین لیا
ن محبت پھر بھی باقی رہ جانے کی چیز ہے، فرہاد کو کبھی اسقدر جلد مایوس نہ ہونا چاہئے تھا........ بحث کا
اس وقت تک قائم رہا جب تک کہ تالاب نظر نہ آیا کیونکہ اس کے بعد ہی ہاشم نے فوراً موضوع گفتگو تبدیل کردیا
ں نگاہیں چڑیوں کی جستجو میں سطح آب پر گردش کرنے لگیں، بہت تلاش کے بعد بھی کوئی شکار نہ ملا دونوں ناکام
کے ایک باغ میں آئے کہ دوپہر کی گرمی سے پناہ لیں۔ انھیں گھاس پر لیٹے ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہ گذرا
ے دو لڑکیوں کے ہنسنے اور ہنسی کے ضبط کرنے کی آواز آئی، نثار اور ہاشم اٹھ بیٹھے، لڑکیوں نے ہاشم کو
د اُن کے زمیندار کا لڑکا ہے، دونوں نے سر جھکالیا اور کوئی ایک منٹ بعد تیزی سے گانوں کی طرف چل دیں
اشم نے لڑکیوں کو بہت دنوں کے بعد دیکھا تھا لیکن پہچان گیا، رضیہ اور سائرہ ایک غریب گھر سے تعلق
ں، اُن کی اور اُن کی اعزہ کی گذر اوقات دن بھر ہر طرح محنت کرنے کے بعد ہوتی تھی، مشقت اٹھانے کی
ن کے چہروں میں خون ہر وقت دوڑتا ہوا نظر آتا تھا، اُن کی اداؤں میں فطرت اپنے سادہ رنگ میں
تھی، تصنع کا شائبہ تک نہ تھا لیکن اُن کی سادگی ہی میں وہ انداز پنہاں تھے جو نہایت غیر محسوس طریقہ پر دل
یے جاتے تھے...... کس قدر حیرت افزا بات ہے کہ ایک تیر افگن کے ہاتھ میں تیر و کماں موجود ہوں
کا استعمال نہ جانتا ہو..... لیکن یہاں یہی عالم تھا۔ رضیہ کی پہلی ہی نگاہ ہاشم کو سرشار اور نثار کو
ی تھی لیکن خود اُسے اس کا کوئی احساس نہ تھا کہ اُس نے کائنات میں کونسی نئی بات پیدا کردی
سن و جمال کے لحاظ سے رضیہ اپنے گانوں میں اور قرب و جوار میں اپنا ثانی نہ رکھتی تھی اس کے صبیح چہرہ سے
شراب چھلکی پڑتی تھی، اُس کی آنکھوں میں ہر وقت ایک نمی رہتی تھی، یا تو وہ غربت کے احساس سے تھی
لی محنت و مشقت کا نتیجہ لیکن اُس نے آنکھوں کی چمک اسقدر بڑھادی تھی کہ دیکھنے والا انھیں عرصہ تک

دیکھ سکتا تھا شباب کے لحاظ سے وہ ایک پھول تھی جو ابھی ابھی کھلا ہو۔ لیکن چونکہ ایک غریب گھرانے کی لڑکی تھی اس لئے ابھی اُس کی شادی وغیرہ کا کوئی انتظام نہ ہوا تھا، ہندوستان میں ہر شخص وہیں شادی بیاہ کرنا چاہتا ہو جہاں حُسن بھی دولت کے ساتھ ہو

نثار اور ہاشم دونوں خاموش پڑے ہوئے تھے، یہ ظاہر ہے کہ دونوں کا موضوعِ تخیل رضیہ کی ہستی تھی۔ لیکن ایک دوسرے کے احساسات سے بے خبر تھا، شام ہونے کو آئی اور آفتاب اتنا جھک گیا کہ باغ میں دھوپ آگئی، درختوں پر پرندوں کی آواز خوشگوار معلوم ہونے لگی، اُس وقت ہاشم اُٹھ بیٹھا

"نثار کیا سو گئے؟" ہاشم نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا، نثار جیسے ایک شیریں خواب سے چونکا دیا گیا گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ "نہیں سو تو نہیں رہا تھا۔ ۔ ۔ ۔ لیکن ہاشم چل کہاں رہے ہو؟"

"کیوں؟ چلو ایک دفعہ پھر تالاب دیکھتے ہوئے گھر واپس چلیں" ـــــ ہاشم نے کہا "لیکن ہاشم اب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں جلد چلنا چاہئے" نثار نے لڑکھڑاتے ہوئے کہا ـــــ دونوں چلنے ہی کو تھے کہ رضیہ ٹوکری لئے ہوئے لکڑیاں جمع کرتی ہوئی نظر آئی، وہ سیدھی اسی باغ کی طرف آرہی تھی، بغیر کسی ارادہ اور گفتگو کے دونوں پھر ٹھہر گئے، ایک قوتِ مجہول تھی جس نے اُن کے پیروں میں زنجیر ڈال دی اور اُن کی زبانیں بند کر دیں، رضیہ باغ میں آگئی، اُس کی رفتار میں شہزادیوں کا سا استغنا اور دلکشی پائی جاتی تھی، قریب پہونچتے ہی ہاشم نے اُس سے گفتگو شروع کر دی، کبھی کبھی نثار بھی بول دیا کرتا تھا، رضیہ کی گفتگو سے کچھ ایسا ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ خود بھی دونوں کی قدر کرتی ہے، بات کرتے کرتے اس نے کچھ سوچا اور یہ کہتی ہوئی ایک طرف چل دی "ابھی ہمیں گھر کا سب کام کرنا ہے" ـــــ تھوڑی دور تک ہاشم اور نثار نے اُسے جاتے ہوئے دیکھا اُس کے بعد ایک دوسرے پر نظر ڈالی دونوں کے چہروں کا رنگ اُڑا ہوا تھا، نثار نے دفع دخل کے طور پر کہا

"ہاشم تم پریشان نظر آرہے ہو"

"اور تمہارا چہرہ بھی مجھے بے رونق نظر آرہا ہے" ـــــ ہاشم نے جواب دیا۔ اب دونوں نے سمجھا کہ ان کی زندگی میں کوئی انقلاب رُونما ہونے والا ہے، اُن کے سکون میں فرق آنے والا ہے، اُن کے خیالات کوئی نئی کروٹ لینا چاہتے ہیں، تالاب تک گئے لیکن شام زیادہ ہوگئی تھی اس لئے فوراً گھر واپس ہوگئے۔ راستہ میں رضیہ کے متعلق گفتگو ہوتی رہی، گویا فرہاد و شیریں کا واقعہ دوسرے الفاظ میں دھرایا جا رہا تھا

"دیکھو ہاشم قدرت کا یہ راز سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک دل آویز پھول دامنِ کوہسار میں کھلتا ہے اور مرجھا جاتا ہے۔ اُس کی بہار دیکھنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رضیہ کو تو وہاں پیدا ہونا چاہئے تھا جہاں اہلِ نظر اس کی پرستش کرتے اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ہاشم نے بات کاٹتے ہوئے کہا "لیکن پھولوں کے ڈھونڈھنے والے پہاڑوں اور وادیوں میں بھی پہونچ جاتے ہیں" جب تک گھر نہ آگیا دونوں نے رضیہ کے سوا کوئی اور گفتگو ہی نہ کی، رات اسی انتظار میں گذری کہ صبح کو پھر غوث پور جائیں گے

اب روزانہ کا یہ معمول ہوگیا تھا کہ دونوں صبح کو غوث پور جاتے اور شام کو واپس آتے رضیہ کو بھی ایک دلی تعلق سا ہوگیا تھا وہ ضرور ان سے ملتی اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ نظر التفات کس کی طرف زیادہ رکھے، اُس کی گفتگو سے بعض اوقات اُس کشمکش کا اظہار ہوجاتا تھا جو وہ ایسے موقع پر محسوس کرتی تھی، نثار کی خاموش محبت اس کے دل میں جگہ کررہی تھی مگر ساتھ ہی ہاشم کا عریاں اظہار محبت عورت کی کمزوری پر قابو پارہا تھا. لیکن دونوں اپنی اپنی جگہ پر یہی سمجھ رہے تھے کہ رضیہ کو مجھ سے زیادہ دلچسپی ہے —— ہاشم، نثار کو اس بات کا یقین دلانا چاہتا تھا کہ رضیہ کا رجحان اسی کی طرف ہے رفتہ رفتہ نثار کو خود محسوس ہونے لگا کہ رضیہ ہاشم کا زیادہ خیال رکھتی ہے اور نثار کی موجودگی کو اپنے اظہارِ الفت میں ایک رکاوٹ خیال کرتی ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہاشم کبھی نثار سے یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ تمھاری وجہ سے میری تمنائیں بر نہیں آتیں لیکن نثار اتنے دنوں ہاشم کے ساتھ رہنے کی وجہ سے اس کی اندرونی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا، اُس نے رضیہ اور ہاشم دونوں کے چہرے پر اپنی موجودگی کی تکلیف کا احساس پڑھ لیا

ایک رات اُس نے سوچنا شروع کیا کہ ہاشم کو اُس پر کیوں ترجیح دی جارہی ہے. تھوڑی سی غور و فکر کے بعد اُس نے معلوم کرلیا کہ ہاشم اس سے زیادہ حسین ہے، اس کے چہرے پر شباب کی سُرخی پورے آب و تاب سے موجود ہے، اگر حُسن ہی معیار محبت ہے تو پھر رضیہ پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا جاسکتا کہ وہ ہاشم کے ہوتے ہوئے نثار کا دم بھرے اُس نے سوچا " مجھے کوئی حق اس بات کا حاصل نہیں ہے کہ میں رضیہ کے دلی جذبات کو ٹھیس لگاؤں میری وجہ سے وہ محبت افروز دل ہمیشہ کے لئے دُکھ جائیں گے۔ میرے لئے یہی کافی ہے کہ میں رضیہ کو خوش دیکھوں اگر وہ ہاشم ہی سے مل کر خوش ہے تو مجھے ہر حال میں دونوں کی مدد کرنا چاہئے، یہ تھوڑا سا ایثار دوستی اور محبت کی تاریخ میں سنہرے حرفوں میں چمکے گا اگرچہ اسی جگہ میری ناکام آرزوئیں بھی خونیں حروف میں شعلوں کی طرح لَو دے رہی ہوں گی لیکن ہاشم کا حقِ دوستی ادا کرنے کے ساتھ ساتھ میں رضیہ کو بھی خوش کرسکوں گا اگر رضیہ مجھ سے ملنا نہیں چاہتی تو بھی مجھے کوئی تکلیف نہیں ہونا چاہئے کیونکہ محبت کی غیر فانی لذتِ درد ہر طرح میری شریک حال ہے۔ محبت کوئی کچا دھاگا نہیں ہے جو رضیہ سے جدا ہوجانے کے بعد ٹوٹ جائے گا بلکہ وہ تو ایک ریشمی ڈورہے جو کھینچنے پر اپنے شکار کو اور زیادہ جکڑ لیتی ہے۔ یہی بہتر ہے کہ ایک انسان دوسرے کے کام آئے۔ محبت یہی سکھلاتی ہے، عشق کا اصل جوہر ہمدردی اور ایثار کا جذبہ پیدا کرتا ہے . . . . . میں رضیہ اور ہاشم کے کام آؤں گا"

جذبات کی فراوانی کے ساتھ ساتھ نثار کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے وہ اُٹھ کر سیدھا ہاشم کے پاس پہونچا اور.

اُس نے کھُلے ہوئے الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ، نثار کی اس تبدیلی پر ہاشم گھبرا سا گیا اُس نے نثار کی گفتگو سے نہ جانے کیا نتیجہ نکالا اور کہنے لگا

" نہیں نثار میں تم سے جدا ہو کر نہیں رہ سکتا " اور نثار سے لپٹ کر رو دیا " ہاشم تم نہیں سمجھے " نثار نے آنسو رومال سے صاف کرتے ہوئے کہا " ہاشم میری اور تمھاری محبّت میں فرق نہیں آسکتا میری اور رضیہ کی محبت اور بڑھ جائیگی ، کس قدر پاک ہوگا وہ جذبہ جو بغیر رضیہ سے ملے ہوئے پیدا ہوتا رہے گا ، میرے لئے یہ تمنا ہی بہت ہے کہ میں اُس سے محبت کرتا ہوں "

ہاشم نے کہا " نثار خدارا مجھے زیادہ نہ تڑپاؤ کل تمھیں رضیہ سے ضرور ملنا ہوگا ، کل ہماری تعطیل کا آخری روز ہے رضیہ نے قسم دے کے بلایا ہے " " اچھا میں ضرور رضیہ سے ملوں گا " نثار یہ کہتا ہوا چلا گیا۔ رات بھر اس کی طبیعت میں ایک مد وجزر پیدا ہوتا رہا ، وہ اُس کی زندگی کی نہایت صبر آزما گھڑیاں تھیں جب نثار تصوّر میں رضیہ کو اپنے آغوش میں دیکھتا تھا وہ بہتے ہوئے دریا کے تیز دھارے کا رُخ موڑنا چاہتا تھا وہ بند باندھ رہا تھا لیکن بار بار رخنے پیدا ہو جایا کرتے تھے .... بالآخر اُس نے اپنی خواہشات پر قابو پالیا اور ایثار کے حقیقی جذبہ سے معمور ہو کر اُس کی روح میں نشاط کی موج دوڑ گئی۔ رضیہ کی خیالی تصویر سے ہمکلام ہو کر سو گیا

دوسرے دن بہت سویرے ہی اُس نے اسباب سفر درست کیا اور نوکر کے ہمراہ اسٹیشن روانہ کر کے خود بھی گھر سے رخصت ہوا ، اُس کا احساس اسقدر لطیف اور نازک ہوگیا تھا کہ آج پہلی دفعہ گھر سے چلتے وقت پھوٹ پھوٹ کر رو دیا ، باہر آکر اُس نے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر مختصر سا خط لکھا اور لفافہ میں بند کر کے اپنے چھوٹے بھائی کو دیا کہ اسے اب سے ایک گھنٹہ بعد ہاشم کو دیدینا۔ نثار کو اطمینان سا تھا ، اُس کی روح میں سکون تھا ، اس کا ضمیر اس کی پاک نفسی پر آفریں کر رہا تھا ، گھر سے روانہ ہو کر وہ سیدھا غوث پور پہونچا۔ اتفاق وقت کہ رضیہ کا زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا وہ آئی اور اُس کے آتے ہی نثار نے کہنا شروع کیا

" رضیہ ! نثار اب ہمیشہ کے لئے تیرے جسمانی وجود سے رخصت ہو رہا ہے ..... لیکن میری روح اُس وقت تک تیری روح سے ملتی رہے گی جب تک کہ یہ پیکر خاکی اُسے الگ نہیں کر دیتا اور اگر روح موت کے بعد بھی مل سکتی ہے تو اُس وقت بھی اُس کی اُمیدوں کا مرکز تو ہی ہوگی ...... میں تجھ سے یہ بھی تمنا نہیں کرتا کہ تو کبھی مجھے یاد کرتی رہنا ، لیکن جاتے وقت صرف ایک آرزو ہے اگر تو نے اُسے سُن لیا تو ساری عمر میری ہستی کا ہر ذرّہ تجھے دعائیں دیتا رہے گا " (رضیہ گھبرائی ہوئی سُن رہی تھی) " ہاشم میرا سب سے بہتر دوست ہے اُس کی تکلیف مجھے تڑپا دیتی ہے۔ دیکھ اُس کو کوئی رنج نہ پہونچے ...... نثار تیرے قدموں پر سر رکھنے کو تیار ہے " نثار نے اپنے گھٹنے زمین پر رکھ دئیے رضیہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی نثار اب بھی کہہ رہا تھا " رضیہ یہ میری زندگی کا

نہایت اہم کارنامہ ہوگا میری اس آرزو کو نہ ٹھکرانا۔ ہاشم کا خیال رہے ...... اچھا اب ہمیشہ کے لئے رخصت "
رضیہ سراسیمہ کھڑی ہوئی تھی کہ نثار اٹھ کر اسٹیشن کی طرف چل دیا اور اُسی وقت کی گاڑی سے اپنے کالج کو روانہ ہوگیا

ہاشم کو جب نثار کا خط ملا تو اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ جلدی سے کھول کر پڑھا تو لکھا تھا

" ہاشم ! میں آج کالج جا رہا ہوں تم نے رضیہ سے ملنے کو کہا تھا اس لئے غوث پور ہوتا ہوا جاؤں گا جس وقت یہ تحریر تمھیں ملے گی میں رضیہ سے گفتگو کرتا ہوں گا۔ تمھیں اُسی کی قسم غوث پور ضرور جانا "

تمھارا نثار

ہاشم نے فوراً کپڑے پہنے اور غوث پور چل دیا کہ شاید نثار مل جائے لیکن وہ جا چکا تھا۔ رضیہ سے اُسے نثار کی ساری باتیں معلوم ہوئیں ——— نثار اب بھی رضیہ سے اُسی طرح محبت کرتا ہے لیکن اب اُسے رضیہ سے ملنے کی تمنا نہیں ہے

" احتشام " رضوی

نگار

اور

حق صحبت دیرینہ

بارہ سال کا تعلق ایسا معمولی تعلق نہیں کہ آپ اُسے فراموش کر دیں اور نگار کی کسی ایسی التجا کو رد فرما دیں جس کا پورا کرنا آپ کے لئے دشوار نہیں ۔ آپ نے اس وقت تک نگار پر جو عنایتیں صرف کی ہیں ان کا شکریہ اس اعتراف سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کی زندگی آپ ہی کے دی ہوئی ہے۔ لیکن اگر ترقی کی آرزو کوئی انتہا نہیں رکھتی تو آپ کا لطف کیوں نہ بے پایاں ثابت ہو

صرف ایک دن

تھوڑی دیر غور کر کے فیصلہ کر لیجئے کہ کم از کم آیندہ جنوری ۴۴ء سے دو خریدار آپ نگار کو ضرور دیں گے اور اُس کارڈ کی خانہ پُری کر کے ڈاک میں بیرنگ ڈال دیجئے جو اس رسالہ کے اندر رکھا ہوا آپکو ملیگا - پھر آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی یہ ادنیٰ توجہ نگار کی آیندہ ترقی پر کس درجہ اثر انداز ہوگی ؟ آپ اسکے لئے آمادہ تو ہو جائیے، نگار کا مستقبل خود اس کا جواب پیش کرے گا ـــ اُمید ہے کہ ناظرین نگار اس کو میری ذاتی خواہش تصور فرمائیں گے ،

اڈیٹر نگار

نزولِ وحی

پیغمبروں کی خصوصیات میں سے بڑی خصوصیت خطاب ربانی ہے جس کو عرف عام میں وحی سے تعبیر کرتے ہیں، ابتدائے رسالت و نبوت سے لے کر جو آدم سے شروع ہوتی ہے، اختتام رسالت تک جو محمد صلعم پر منتہی ہوتی ہے جتنے انبیاء و رسول دربار ایزدی سے رشد و ہدایت کی مشعل لے کر اس دنیا میں اُجالا کرنے آئے، بلا استثناء سب سے "لسان مطلق" نے باتیں کیں، سب پر پیغام بھیجے، لیکن مختلف پیغمبروں کے ساتھ طرز تکلم کی صورتیں بھی مختلف رہیں، لوگوں کا خیال ہے کہ کبھی کسی سے خدا نے "چہرہ بہ چہرہ رو برو" گفتگو کی، کبھی کسی سے حریم حجاب کے اندر بیٹھ کر "خلوتیان راز" کی طرح باتیں کیں ——— کسی کی "ارنی" پر "لن ترانی" کہکر پردہ میں چھپ گیا۔ اور کسی کو خود اپنے حجلۂ ناز میں بلا کر اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر "راز و نیاز" میں مصروف رہا

خطاب ربانی کی ان متعدد صورتوں میں ایک صورت عموماً مشترک سمجھی جاتی ہے اور وہ وحی ہے۔ وحی کے معنے لغت میں مختلف ہیں جن میں اشارہ کرنا، لکھنا،..... دل میں ڈالنا، خیال میں ڈالنا چپکے چپکے بات کرنا بہت مستعمل ہے، وحی کے ان متفرق معنوں میں ایک مفہوم مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ "منھ سے لفظ نکالے بغیر ایک شخص کا دوسرے کو اپنا مافی الضمیر سمجھا دینا"

مفسرین متقدمین نے اس امر پر کہ آنحضرت صلعم پر قرآن کس طرح اتارا گیا اور وحی کا نزول کیونکر ہوا، ایک مستقل باب بحث و نزاع قائم کر دیا ہے۔ اس باب میں سب سے بڑی اور اصولی غلطی جو عام طور سے ہوتی آئی ہے وہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے خدا اور رسول کی حیثیت دنیا کے بادشاہ اور وزیر کی سی متصور کر لی ہے اور وحی ربانی کو بادشاہ کے احکام و پیغامات کی مانند سمجھتے ہیں جو ایک مجسم فرشتہ (جبریل) کی وساطت سے رسولوں تک پہونچایا جاتا ہے

امام فخر الدین رازی اپنی مشہور "تفسیر کبیر" میں ارقام فرماتے ہیں "کہ آسمان پر جبریل خدا کا کلام سنکر آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور وہ پیغام سماوی انھیں سنا دیتے تھے" اس تحریر میں ایک سخت مشکل درپیش آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ حکیم مطلق تجسم و تشکل سے بے نیاز محض ہے اس لئے اس کا کلام صوت و حروف سے مبرا ہے پھر جبریل نے اس "کلام" کو سنا تو کیونکر سنا؟

اس مشکل کا احساس کرتے ہوئے امام صاحب فرماتے ہیں "ممکن ہے خدا تعالےٰ نے جبریل کے اندر کوئی ایسی طاقت سماعت پیدا کر دی ہو جس سے وہ خدا کا کلام سُن لیتا ہو پھر اس میں یہ قدرت و دلعیت کی ہو کہ اس کلام کو سنکر اپنے عبارت میں تعبیر کر سکے ——— یا دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ "لوح محفوظ" میں قرآن کو کچھ اس ترتیب

نمایاں کر دیا ہو کہ جبریل اُسے دیکھ کر یاد کر لیتے ہوں ——— یا تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالےٰ نے کسی جسم دار شئے کے اندر سے خاص طرح کی آواز ٹھیر ٹھیر کر نکالی ہو اور جبریل نے اس کو سُن کر اپنے حافظہ میں محفوظ کر لیا ہو۔ پھر اللہ تعالےٰ نے جبریل کو بتا دیا ہو کہ یہ وہی کلام ہے جو فلاں شخص پر اُتارا جائے گا "

معمولی عقل و دماغ کا آدمی بھی اس تقریر کو سُنکر یہ سوال کر سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے آنحضرت صلعم کے اندر ہی وہ " طاقت سماعت " کیوں نہ ودیعت کر دی کہ اس کے پیغام کو سُن لیتے یا وہ " قدرت " کیوں نہ پیدا کر دی کہ خود ہی " لوح محفوظ " میں آتشیں حروف سے لکھے ہوئے قرآن کو پڑھ لیتے ۔ یا جس جسم دار شئے کے اندر سے کلام الٰہی کو فوارہ کی طرح اُبلتا دیکھ کر جبریل یاد کر لیتے تھے ۔ خود حضور ہی کے اندر وہ طاقت کیوں نہ عطا کر دی گئی کہ پیغام ربّانی چشمہ کی طرح اُبلنے لگتا . . . . اور جبریل کو اس " دوگونہ عذاب " سے کہ کلام کو سنیں ——— اس کی عبارت بنائیں اس کو یاد کریں ——— پھر مقام سدرہ سے زمین پر اتریں اور حضور کو سینے سے بھینچ بھینچ کر کہیں " اقرا، اقرا " اور حضور کہیں " انا امی " ——— نجات و خلاصی حاصل ہو جاتی ؟

امام صاحب نے اس کی بھی تشریح نہیں کی کہ " صوت فی الشجر " سے آواز ملا لینے کے بعد جبریل کو یہ کیونکر بتایا گیا کہ یہ وہی کلام ہے جسے خدا آنحضرت صلعم پر اتارنا چاہتا ہے ؟ ——— سچ ہے

آگہی دام شنیدن جسقدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے میرے عالم تقریر کا

سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ نبوت کا اصل مفہوم کیا ہے اور بعثت سے کیا مراد ہے ؟

علمائے متقدمین و متاخرین نے نبوت کو بھی ایک عہدہ سمجھا ہے کہ مبدء فیاض جسے چاہتا ہے یک بیک دیدیتا ہے یعنی ٹھیک اسی طرح . . . . کسی ایک شخص کو منتخب کر کے اس کی رسالت کا اعلان کر دیتا ہے جیسے دنیوی بادشاہ اپنی رعایا میں سے کسی کو قلمدان وزارت سپرد کر دیتا ہے کسی کو دیوانی کے عہدہ خالقہ پر ممتاز کر دیتا ہے اور کسی کو خلعت بخشیت سے سرفراز فرماتا ہے ——— اور وہ " شخص منتخب " جس کو مذہبی اصطلاح میں پیغمبر یا رسول کہتے ہیں اپنے اس منصب جلیلہ کو لیکر، اشارات سماوی کے مطابق رشد و ہدایت کی تبلیغ شروع کر دیتا ہے ——— یہی بعثت ہے اور یہی نبوت . . . .

مثلاً آپ اپنے بے تکلف احباب کے ساتھ گپ شپ کرتے، بیڑی پیتے، چوک بازار سے گذر رہے ہیں ——— دفعتاً ایک شخص سفید حلۂ بہشتی میں سر سے پاؤں تک لپٹا ہوا آپ کے قریب آتا ہے، سلام کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ " اقتا نبیٌ " آپ دنگ رہ جاتے ہیں۔ آپ پر خوف و حیرت کا غلبہ ہوتا ہے۔ آپ ڈر کر بھاگنا چاہتے ہیں۔ وہ لپک کر آپ کی ٹانگیں پکڑ لیتا ہے اور برابر کہے جاتا ہے " کہ آپ نبی ہیں " ——— کچھ دیر تک خوب " ہاتھا پائی " ہوتی ہے، گویہ آپ کا " شیوہ تنیق " اور جب آپ کشاکش سے تھک کر چور ہو جاتے ہیں اور ہاتھ پاؤں ڈال دیتے ہیں ——— وہ نہایت نرم اور ملائم الفاظ

ہیں سمجھا تا ہے "آج آپ کو خداوند تعالے جل شانہٗ نبوت کے منصب جلیلہ اور رسالت کے عہدۂ فائقہ پر ممتاز کرتا ہے۔ تو نبی ہے اٹھ اور دنیا کو پیغام ربّا سنا"
بس آج سے آپ نبی مبعوث ہو گئے

میں بعثت کا یہ مفہوم نہیں سمجھتا۔ میرا خیال ہے کہ نبوت ایک فطری چیز ہے، نبی اپنی ماں کے بطن سے پیدا ہوتا ہے نبی جیتا ہے اور نبی مرتا ہے۔ النبی نبی ولو کان فی بطن امہ

ملکۂ نبوت ایک فطری ملکہ ہے جو انبیا علیہم السّلام کے اندر دیگر قوائے انسانی کے مانند جاری اور ساری رہتا ہے جس انسان کے اندر یہ ملکہ ودیعت کیا جاتا ہے وہی نبی ہوتا ہے۔ اور جو نبی ہوتا ہے اس کے اندر یہ ملکہ ودیعت کیا جاتا ہے، جس طرح تمام ملکات انسانی اس کی ترکیب اعضا سے مناسبت رکھتے ہیں اسی طرح یہ " ملکۂ نبوت " بھی اس سے علاقہ رکھتا ہے اور دیگر اعضائے جسمانی اور قوائے ملکوتی کی مناسبت کے ساتھ ساتھ تدریجاً اور اجمالاً قوی ہوتا جاتا ہے جب اپنی ارتقاء کے نقطۂ منتہی پر پہونچ جاتا ہے اور اس قوت کے اندر پوری پختگی آجاتی ہے — تو اس سے وہی چیز ظہور پذیر ہونے لگتی ہے جس کو عرف عام میں " بعثت " و نبوت سے تعبیر کرتے ہیں

خدا اور پیغمبر کے مابین، بجز اس " ملکۂ نبوت " کے جس کو " ناموس اکبر " اور شرع کی زبان میں جبریل، روح القدس روح الامین کہتے ہیں — کوئی اور دوسرا رابطہ و واسطہ یا ایلچی و پیامبر نہیں ہے

قرآن میں جہاں کہیں بھی وحی کا لفظ آیا ہے اگر بغور دیکھا جائے تو اس کے بیان کلام سے اسی " ملکۂ نبوت " کے ظہور کی طرف اشارہ ہوتا ہے مثلاً خدا تعالیٰ سورۂ مائدہ میں فرماتا ہے " میں نے حواریوں کو " وحی کیا " کہ مجھ پر اور میرے پیغمبر پر ایمان لاؤ " سورۂ قصص میں ہے " اور ہم نے موسیٰ کی ماں کو " وحی کیا " کہ اس بچہ کو دودھ پلاؤ " — سورۂ والنجم میں تو بالکل صاف طور سے کہدیا ہے " محمد (صلعم) اپنی خواہشِ نفس سے کچھ نہیں کہتا مگر یہ تو وہ بات ہے جو اس کے دل میں ڈالی گئی ہے

سوچنا چاہیئے کہ " نبی القبلتین " اور پروردگار عالم کے درمیان سلسلۂ کلام کے لئے کوئی رابطہ و واسطہ نہ تھا بلکہ خود حضور کا قلب منور ہی وہ " آئینۂ خیال " تھا جو " عکسِ پذیر راز " تھا۔ دستِ آئینہ ساز نے اس آئینۂ عالم نما میں تجلیات ربانی کے بصیرت افروز جلوے کوٹ کوٹ کر بھر دیئے تھے جن کی برق افروزیوں سے جسم اطہر یکسر طور اور سراپا ایمن بنا ہوا تھا، حضور کا دل ہی درحقیقت وہ ایلچی اور پیغامبر تھا جو خدا کے پاس اپنا پیغام لیجاتا تھا اور خدا کے پاس سے پیغامِ ربانی لے کر آتا تھا — " حقیقت محمدی " ہی وہ گوش سامع تھی جس میں صوتِ سرمدی کے لازوال نغمے اور بے نیاز صوت وحروف صدائے تکلم گونجتی تھی۔ خود حضور ہی کے دل سے وہی گوہر بیز فوارہ کی طرح اٹھتی تھی اور خود حضور ہی پر نازل ہوتی تھی — تجلیات ربانی کے عکوس خود حضور کے دل آئینہ ساماں پر پڑتے تھے۔ جسے خود حضور

الہام کہتے تھے

جو حالات و واردات ایسے قلب پر گذرتے ہیں وہ سب کے سب عین بمقتضائے فطرت انسانی ہیں۔ اور پابند نوامیس فطرت — پیغمبر خود اپنا کلام نفسی ان مادی کانوں سے اس طرح سنتا ہے جیسے کوئی دوسرا شخص اس سے کہہ رہا ہے — وہ خود اپنے دل سے اُٹھنے والی صوتِ ربانی کو — یوں محسوس کرتا ہے۔ جیسے دور صحرا کے دامن سے

" دھیمی دھیمی جرس کی آواز "

روزمرہ کے مشاہدات ہیں کہ جب کوئی شخص دنیا و مافیہا کے افکار سے الگ ہو کر اور ہر طرف سے منھ موڑ کر کسی ایک طرف انتہائی انہماک کے ساتھ مصروف و مستغرق ہو جاتا ہے۔ تو اس کے وہ ملکات و قویٰ جو اس سے قبل "پردۂ راز" میں مستور تھے بتدریج واہمال آشکارا ہونے لگتے ہیں اور نہایت مستعدی کے ساتھ اپنے اپنے کام شروع کر دیتے ہیں — اور ان سے بمقتضائے فطرتِ انسانی ایسے ایسے مافوق کارنامے ظہور پذیر ہونے لگتے ہیں کہ بس ہم —

ع " انگشت حیرت در دہاں "

ہو کر رہ جاتے ہیں۔ دنیا کے سارے اکابر رجال کی سیرتیں میرے کلیہ کی شاہد ہیں — پس جب ان ممتاز افراد انسانی کا یہ عالم ہے، جو محدود خاندانوں، فرقوں، اور ملکوں کے رہبر و قائد ہوتے ہیں — تو اللہ اللہ اس رہبر اعظم، ہس راعیٔ اکبر، اس مصلح انسانیت کا کیا عالم ہو گا جو سارے بنی نوع انسان کا حقیقی قائد و رہنما ہے۔ جو ساری دنیا کو اخلاقِ حسنہ کی تعلیم دینے کے لئے پیدا کیا گیا ہے .... جو تمام علائق دنیوی سے بے تعلق ہو کر انسانیت عامہ کی تربیت روحانی میں ہمہ تن مصروف ہے، ایسے شخص سے ان مافوق واردات کا ظاہر ہونا ذرا بھی خلافِ فطرت انسانی نہیں

پس میرے خیال میں " وحی " وہی چیز ہے جس کو قلب نبوت پر حکیم مطلق نے اپنے ہاتھوں سے نقش کر دیا ہے — یہی انتعاش قلبی کبھی " صلصلۃ الجرس " کی طرح سامعہ نواز ہوتی ہے — اور کبھی روح القدس کی صورت میں پیش نظر ہوتی ہے — بجز اس ملکۂ نبوت اور ناموس اکبر کے حبیب و محبوب کے درمیان نہ کوئی پیغامبر ہے نہ ایلچی، خدا تعالیٰ اس مفہوم کو اور زیادہ واضح کر دیتا ہے جہاں فرماتا ہے " ہمارا ذمہ ہے تیرے (محمد صلعم) دل میں وحی کے اکٹھا کرنے اور پڑھنے کا — اور پھر جب ہم اس کو پڑھ چکیں تو تو اس پڑھنے کی پیروی کر — پھر ہمارا ذمہ ہے اس کا مطلب بتانا "۔

اس سے بھی یہ امر پایۂ ثبوت کو پہونچتا ہے کہ خدا اور پیغمبر کے مابین کوئی " ملکوتی " واسطہ نہ تھا جو حضرت کو قرآن سُناتا تھا۔ اور مطلب سمجھاتا تھا۔ بلکہ خود خدا ہی حضور کے دل میں وحی جمع کرتا تھا، اس کو پڑھتا تھا۔ اسکا مطلب بتاتا تھا۔ اور یہ سب کا سب عین بمقتضائے فطرت رسالت اور قوائے ملکوتی کے ہیں — یہی " ملکۂ " ناموس اکبر " ہے۔ اور یہی قوت جبریل فرشتہ

قرآن کا نجماً نجماً نازل ہونا ہی بڑی دلیل ہے اس امر کی کہ وہ بمقتضا، اسی فطرت کے ہے جس کو فطرتِ نبوت کہتے ہیں

روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ تمام ملکات انسانی کسی محرک میں کسی امر کے پیش آنے پر اپنا اپنا کام کرتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ملکۂ نبوت بھی کسی تحریک کے پیش آنے پر اپنا کام کرتا ہے —— ہمارے دل و دماغ میں سینکڑوں باتیں پنہاں ہوتی ہیں۔ —— سینکڑوں اشعار یاد ہوتے ہیں —— سینکڑوں انسانوں کی صورتیں —— باغات اور جنگلات کے نقشے —— منقوش ہوتے ہیں —— مگر جب تک ان پر متوجہ ہونے کا کوئی خاص سبب نہ پیدا ہو — وہ سب کے سب ذہن سے قریب قریب فراموش رہتے ہیں، بالکل یہی حال ملکۂ نبوت کا بھی ہے، نبی کے اندر ملکۂ نبوت ہمہ وقت موجود رہتا ہے، نبی معہ اپنے ملکۂ نبوت کے کھاتا پیتا ہے، اور سوتا بیٹھتا ہے، دُنیا کے اور "کاردگر" کرتا ہے، مگر جب کبھی کوئی ایسا واقعہ پیش آتا ہے جو اس کے ملکۂ نبوت کی تحریک کا باعث ہو. . . . تو فوراً اس "تارِ مضراب آشنا" سے سماوی نغموں کے دریا اُبلنے لگتے ہیں —— چنانچہ ہر وہ شخص جس نے سیرتِ نبوی کا ایک سرسری مطالعہ بھی کیا ہے، اچھی طرح . . . . جانتا ہے کہ قرآنی سورتیں عموماً اسی وقت نازل ہوا کرتی تھیں، جب حاملِ نبوت سے کسی قسم کا سوال اور استفسار کیا جاتا تھا۔ واللہ اعلم

شمس شیدائی (شہسرامی)

غیر معمولی رعایت

جنوری ۳۲ء کا نگار۔ غالب کی شوخیوں کے متعلق معہ رنگین تصویر غالب معہ محصول ۱۲ر میں

ذیل کی کتابیں علاوہ محصول ۴ر کی ہیں

شاعر کا انجام —— فراست الید —— فراست التحریر —— سائنس کے عجائب —— فلاسفۂ قدیم
۱۲ر ۶ر ۴ر ۴ر ۱۰ر

جذبات بھاشا —— انتخاب گلابی اُردو —— منچلا —— علاوہ محصول
۱۲ر ۱۶ر ۸ر

لیکن یکجائی طور پر سب طلب کرنے سے معہ محصول صرف ۳ر میں مل سکتی ہیں

منیجر نگار لکھنؤ

جہنم

پہلا سین

ابلیس کی تقریر

توارات کی روایت ہے کہ ابلیس اور اس کے ساتھیوں نے خداوند عالم کے خلاف بغاوت کی مگر ناکام رہا۔ خداوند عالم کی فوجوں نے باغیوں کو ہرا کر جہنم میں جھونک دیا۔ جہنم میں جملہ شیاطین پر غفلت اور غنودگی چھا گئی۔ سب سے پہلے ابلیس کو ہوش آیا، اور وہ کھڑا ہو گیا۔ بلند، بالا، سرو قد، جوان، خوبصورت۔ چہرہ پر وہ نور کہ چودھویں کا چاند شرمائے اور دیری کا یہ رنگ کہ اس کا ثانی تلاش کریں تو نہ پائیں۔ کسیلا، چھریرا بدن، کٹیلا نقشہ، نشیلی آنکھیں۔ داہنے ہاتھ میں تلوار بائیں میں نیزہ، سر پر تاج، مدبر، فیلسوف، سیاہ سالار۔

وہ کھڑا ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ ہر طرف آگ ہی آگ تھی۔ سیاہ بھیانک آگ۔ آگ کی لپٹوں میں روشنی نہ تھی۔ اندھیرا تھا۔ ہر طرف مایوسی و محرومی و ناکامی و نامرادی کی شکلیں نظر آتی تھیں اور آگ کے سمندر میں شیاطین یوں تیر رہے تھے جیسے آسمان پر تارے

وہ آگ کی موجوں کو چیرتا ہوا ایک قریبی ٹاپو کی طرف بڑھا۔ پہلے تو اپنے مضبوط بازوؤں سے بہتی ہوئی آگ پر تیرتا رہا۔ پھر فضا میں اُڑنے لگا، جیسے فرشتے اُڑا کرتے ہیں۔ اس کے پر چاندی کی طرح چمک رہے تھے۔ اس کی رفتار بجلی سے تیز تھی۔ وہ جہنمی ٹاپو کے آتش فشاں پہاڑ کی دہکتی ہوئی چوٹی پر کھڑے ہو کر اوپر کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی تیز نظر آسمانوں کے پردوں کو چیرتی ہوئی۔ فردوس بریں کے باغ میں پہونچی۔ وہاں ہی عظیم الشان فتح کی خوشی میں ناچ رنگ کی مجلس گرم تھی اور حوروں کے گانے کی آواز آ رہی تھی

تری شان جل جلالہٗ۔ تری ذات عم نوالہٗ

ترا حسن لیس مثالہٗ۔ تو عظیم ہے تو قدیم ہے

یہ ترا ہی نور ہے سو بسو۔ یہ ترا ہی روپ ہے رو برو

یہ ترا ہی رنگ ہے ہو بہو۔ تو غفور ہے تو رحیم ہے

توخدائے حسن وجمال ہے ۔ تو اِلٰہ جل وجلال ہے
توکمال اوج کمال ہے ۔ تو حکیم ہے تو کریم ہے
ترا کلمہ پڑھتی ہیں طوطیاں ۔ ترا نام لیتی ہیں بلبلیں
ترا غلغلہ ہے جہاں تہاں ۔ تو علیم ہے تو فہیم ہے

وہ زور سے چلّایا :———

اے جنتو ! — اے آسمانو ! — اے فردوس کی خوشبو ! — اے عرش کی عظمتو ! — الفراق ، الفراق ، الوداع ، الوداع ——— اور اے جہنمو ! اے جہنموں کی پستیو ! اے جہنموں کی مصیبتو ! تکلیفو ! ، مرحبا ، مرحبا ، آؤ ، اٹھو ، اپنے نئے مہمانوں کا استقبال کرو ۔ آنکھیں بچھاؤ ، دل وجان قربان کرو ۔ آج تمھارے یہاں وہ عظیم المرتبت ہستیاں تشریف لائی ہیں جنکا ہم پایہ وہم رتبہ نہ کوئی آسمانوں میں ہے نہ جنتوں میں ، نہ ارواح میں نہ ابدان میں ، نہ لاہوت میں ، نہ ناسوت میں ، نہ وجوب میں نہ امکان میں

(اس کا دل دھڑکنے لگا ، آواز رک گئی ، لب بند ہوگئے ۔ وہ اپنے ساتھیوں کی انتہائی غفلت ومدہوشی دیکھ کر دم بخود رہ گیا ۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے ۔ دیر تک خاموش کھڑا چاروں طرف دیکھتا رہا ۔ پھر یکایک زور زور سے پکارنے لگا)

اے قدوسیو ! معظم قدوسیو ! محترم فرشتو ! مکرم شہزادو ! اُٹھو ! کھڑے ہوجاؤ ! اے آسمانوں کی پاک روحو ! اے ملاء اعلیٰ کے چمکیلے ستارو ! اے عظمت کے پہاڑو ! نور کے سمندرو ! روشنی کے ستونو ! غفلت ، سُستی ، بےہوشی ، بےحسی ، آسمانوں کی غلام روحوں کے حوالہ کردو ۔ اٹھو ۔ کھڑے ہوجاؤ !

(معاً تمام شیاطین کروروں پدموں کی تعداد میں جلتے ہوئے تابو میں اس کے گرداگرد جمع ہوگئے اور سب کے بیچوں بیچ وہ خود کھڑا تھا ، جیسے تاروں کے جھرمٹ میں چاند)

آہ ! یہ کیسی غفلت ہم پر چھاگئی تھی ! حیرت میں ہوں یہ کس چیز نے ہمیں غافل کردیا تھا ! وہ پاک ہستیاں جو غلامی کی ملعون زنجیروں سے آزاد ہوچکی ہوں اور خودداری وآزادی کے جھنڈے ہاتھوں میں لئے ہوں ، کیا غفلت وبےہوشی کا شکار ہوسکتی ہیں ! وہ نورانی پیکر جن کے زرّیں کارنامے صفحۂ ہستی پر ابد تک قائم رہنے والے ہوں کیا غلامی وبےبسی کی زندگی پر قناعت کرسکتے ہیں !

قسم ہے اس مقدس تلوار کی ، اور اس متبرک نیزے کی ، اور اس عظمت وجبروت کے تاج کی جو میرے سر پر چمک رہا ہے ۔ کہ ہم غلام نہیں ہوسکتے ۔ ملاء اعلیٰ کی تمام ہولناک قوتیں سر ٹکرا ٹکرا کر فنا ہوجائیں گی

مگر ہم میں کے ایک فرد کو بھی غلام نہیں بنا سکیں گی

(تالیاں بجتی ہیں)

معظم قدوسیو ! ۔۔۔ یہ جہنم ہے اور تم جہنم میں ہو ! ۔۔۔ یہ آگ ہے اور تم آگ میں ہو ! ۔ مگر تم جہنم کے بادشاہ ہو، کرۂ نار کے فرمانروا ہو، آزاد و خود مختار ہو ۔ تم ننھی کھوپڑی والے جبریل اور چوڑے کانوں والے میکائیل نہیں ہو ۔ وہ غلام بھیڑیں ہیں، تم آزاد شیر ہو، شیر نر، شیر ببر ہو ۔

کون ہے جو آزادی کا علمبردار نہیں ہے، کون ہے جو غلامی پسند کرتا ہے، اگر کوئی غلام بننا چاہتا ہے تو آگے بڑھے، میں اُسے غلاموں کی جنت میں ڈھکیل دوں کہ وہاں شوق سے عرش کے پتھروں پر اپنی پیشانی رگڑا کرے، گڑگڑایا کرے اور مرا کرے

(کوئی نہیں، کوئی نہیں کی آوازیں)

کیا یہ گڑگڑانا اور رونا اور معافی مانگنا اور عاجزی کرنا، ذلت کی انتہا اور رسوائی کی تحت الثریٰ نہیں ہے
یہ کام ہم سے کبھی نہ ہوگا، کبھی نہ ہوگا

معظم قدوسیو ! ۔ کیا یہ جہنم ہے ؟ کیا یہ واقعی جہنم ہے ؟ نہیں نہیں ۔۔۔ یہ جہنم نہیں ہے ۔ قسم ہے تمھارے عظمت و جلال کی یہ جہنم نہیں ہے ۔۔۔ ہمارے لئے یہ جہنم نہیں ہے ۔ غلام روحوں کے لئے جہنم ہے ۔ سر جھکانے والی اور ماتھا ٹیکنے والی کٹ پتلیوں کے لئے جہنم ہے

ہمارے لئے یہ جہنم جنت ہے اور جنت جہنم ہے ۔ ہمارے لئے یہ آزاد جہنم ایک نہیں ستر ہزار جنتوں سے ستر ہزار درجے اعلیٰ و ادنیٰ، ارفع و افضل ہے

ولَلآخرۃُ اکبر درجٰت واکبر تفضیلا

جنت اور جہنم کا بنانا اور بگاڑنا تو ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے ۔ ہم جب چاہیں جنت کو جہنم اور جہنم کو جنت بنا سکتے ہیں ۔ دوستو ! ۔۔۔ یہ جنت اور جہنم کیا ہے ؟ ۔ ایک زاویۂ نگاہ ہے ۔ ایک حلقۂ خیال ہے ۔ ایک گوشۂ تصور ہے اور بس

کوئی عظیم دیوتا ہمیں اس جہنم سے نکال نہیں سکتا ۔ موت ہمیں چھو نہیں سکتی ۔ ہماری ہستی لازوال ہے ہماری روح غیر فانی ہے ۔ ہم ہمیشہ ہمیشہ زندہ اور ہمیشہ ہمیشہ قائم رہیں گے اور ہمیشہ ہمیشہ اس دیوتا سے لڑتے رہیں گے جو آزادوں کو غلام بناتا ہے اور غلاموں کو ذلیل کرتا ہے ۔ کیا ہی مقدس ہیں وہ ہستیاں جو اُس کی بندگی سے آزاد، اور اس کی محتاجی سے مستغنی ہیں !

(چاروں طرف سے مرحبا مرحبا کا وہ شور اٹھا کہ عرش بریں کے قلعہ کی دیواریں ہلنے لگیں)

کرم فرشتو ! ــــ اس میں شک نہیں کہ ہمارے دشمن کی مادی طاقت ہم سے کسی قدر زیادہ ہے اور اسی وجہ سے اس نے ہمیں تیر و تفنگ کی لڑائی میں ہرا کر جہنم میں ڈھکیل دیا ہے مگر کیا ہوا ؟ــ ہم نے کچھ ہتھیار نہیں ڈالدیئے! اپنی ہار تسلیم نہیں کی ! ــــ ہم قیامت تک ہتھیار نہیں رکھیں گے اور ہمیشہ ہمیشہ لڑتے رہیں گے۔ پہلے آسمانوں اور جنتوں کی بلندیوں پر لڑتے تھے۔ اب زمینوں اور جہنموں کی پستیوں میں لڑیں گے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ نیا محاذ جنگ ہمارے حق میں زیادہ مفید ہے

ہم اپنی قوت کا بھی امتحان کر چکے اور دشمن کی قوت کا بھی لہٰذا اب جو لڑائی ہوگی خواہ وہ تیر و تفنگ کی لڑائی ہو یا فریب و دجل کی، میدان ہمارے ہاتھ رہے گا کیونکہ ہمارا تجربہ پہلے سے کہیں زیادہ ہے اور ہماری قوت میں بال برابر بھی کمی نہیں ہوئی۔ ہم ہرگز ہرگز چین نہیں لیں گے جب تک عرش و فرش پر ہماری حکومت قائم نہ ہو جائے اور جب تک تمام سر جھکانے والی قوتوں کا قلع قمع نہ کر ڈالیں۔ یہ بات تو مسلم ہے کہ ہم غلامی نہیں کر سکتے کسی قسم کی غلامی نہیں کر سکتے اور اگر ہم یوں ہی خاموش پڑے رہیں تو یہ بھی ایک طرح سے اس عرش والے دیوتا کی خوشی ہوگی جس کے سامنے ہم نے اپنی گردنیں جھکا دینے سے انکار کر دیا ہے۔ اور جس کی ہر آن مخالفت و مقاومت ہماری زندگی کا وحید مقصد ہے

دلیرو !ــ بہادرو !ــ بتاؤ، کیا کرنا چاہیئے اور آسمانی قوتوں سے کیونکر لڑنا چاہیئے ؟

اے ہمت و شجاعت کے قافلہ سالارو ! اے ملاء اعلیٰ کے معزز شہزادو ! اے قدسیوں کے اُستادو ! ملائکہ کے آقاؤ ! تمھاری ہمت پر مرحبا، تمھاری شجاعت پر آفریں۔ اور تمھاری دلیری پر عرش و فرش، سدرہ و کرسی، برزخ و جنت، آسمان و زمین اور ہر وہ چیز جو آسمانوں کے اوپر ہے۔ اور زمینوں کے نیچے ہے اور آسمانوں اور زمینوں کے درمیان ہے قربان کی جا سکتی ہے

قسم ہے تمھارے مضبوط سینوں اور فولادی بازوؤں کی کہ تمھاری بے نظیر اور بے بدل اولوالعزمیوں کے آگے فردوس کے کنگورے اور عرش کی برجیاں سرنگوں و شرمسار ہیں۔ مگر جلدی نہ کرو، یہ جلدی کا محل نہیں غور و فکر کرو کہ کیا کرنا چاہیئے ؟ــ علانیہ جنگ کرنی چاہیئے یا خفیہ جنگ ؟ــ بازوؤں کی قوت کے جوہر دکھانے چاہئیں یا دماغی قوت کے ؟

مجھے خبر ملی ہے کہ عرش والے دیوتا نے نظام حکومت کے نئے نئے طریقے ایجاد کئے ہیں اور وہ اپنے بیٹے مسیح کو ہمارے مقابلے میں بھیجنے والا ہے۔ مگر قسم ہے تمھاری تلواروں کے جوہر کی کہ ہم اس نئے نظام حکومت کے بھی پرخچے اڑا ڈالیں گے۔ اور مشرق سے مغرب تک کھلی بغاوت پھیلا دیں گے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم غفلت نہ کریں۔ اور غور کریں کہ کیا کرنا چاہیئے اور کیونکر کرنا چاہیئے ؟

ایک عظیم الشان کانفرنس ہو اور اس میں موجودہ مسائل کے ہر پہلو پر غور کیا جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بعلزبول ـــــــ "ضرور ضرور، قدوسیو ! چلو آؤ کانفرنس کے لئے خیمہ نصب کریں"

(پردہ گر جاتا ہے)

(ملٹن کا ایک شاہکار)

محمد اسحاق (امرتسری)

مجموعۂ استفسار و جواب تقریباً مفت

باب الاستفسار نگار کی وہ خصوصیت ہے جو ہندوستان کے کسی اور رسالہ میں نہیں پائی جاتی۔ گزشتہ بارہ سال میں اتنے مختلف سوالوں کا جواب دیا گیا ہے کہ ان کا مجموعہ ایک اچھی خاصی انسائکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتا ہے جس میں، ادبی، تاریخی، سیاسی، مذہبی و معاشری سیکڑوں قسم کی عجیب و غریب معلومات پائی جاتی ہیں - یہ مجموعہ طیار ہو رہا ہے اور تین چار ماہ میں شایع ہو جائے گا۔ ضخامت کے لحاظ سے اس کی قیمت پانچ روپیہ سے کم نہ ہوگی لیکن

آپ اس کو معہ محصول ۸؍ میں حاصل کر سکتے ہیں

اور وہ اس طرح کہ آپ ۴۴ء میں نگار کی خریداری جاری رکھئے۔ جس وقت یہ مجموعہ شائع ہو جائے گا۔ نگار میں اعلان کر دیا جائے گا اور جن حضرات کے نام ۳۱ر جنوری ۴۴ء کو نگار کے رجسٹر خریداری میں درج پائے جائیں گے ان کو یہ نادر ذخیرہ صرف ۸؍ میں بھیج دیا جائے گا

خریدار نئے ہوں یا پرانے سب اس موقعہ سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں

منیجر نگار لکھنؤ

سویٹ روس اور الحاد

ہرچند گزشتہ پندرہ سال میں مطابع انگلستان نے بالشویک روس کی مذہب دشمنی کی طرف بہت توجہ مبذول کی ہے تاہم اخبار بیں طبقہ کو ابھی تک اس بات کا صحیح اندازہ نہیں کہ وہاں مذہب اور کلیسا کے ساتھ کیا حقیقی واقعات پیش آ رہے ہیں، اور تحریک الحاد کو اس ملک میں کتنی کامیابی حاصل ہوئی ہے

میں مارچ ۱۹۲۸ء میں روس گیا تھا اور فروری ۱۹۲۹ء تک وہاں مقیم رہا، میں روسی زبان سے واقف ہوں اور میں نے ان خلاف مذہب کتابوں، اخباروں اور رسالوں کا بغور مطالعہ کیا جنکی سویٹ روس میں نہایت کثرت اور آزادی کے ساتھ اشاعت ہو رہی ہے

روسی ملحدین کی کانگریس کا پہلا اجلاس اپریل ۱۹۲۵ء میں ماسکو میں منعقد ہوا تھا جس میں ملحدین کی ایک انجمن قائم کی گئی۔ اس سے قبل ملحدین کی متعدد جماعتیں ملک کے مختلف حصص میں نمودار ہو چکی تھیں لیکن اسوقت تک مذہب کے خلاف کسی باقاعدہ نظام کے ماتحت اعلان جنگ نہیں ہوا تھا۔ انجمن ملحدین کے دوسرے جلسہ میں جو ۱۰ر جون ۱۹۲۹ء لغایت ۱۶ر جون ۱۹۲۹ء تک رہا ۳۶ مختلف قوموں کے ۹۲۰ مندوبین شریک ہوئے۔ اس جلسہ میں یہ انجمن (لیگ آف ملٹینٹ ایتھیسٹ) "رزمیہ انجمن ملحدین" بن گئی جس کے قواعد و ضوابط مرتب ہوگئے اور الحادی خیالات کی اشاعت کے لئے ایک لائحہ عمل تیار کر لیا گیا۔ ان قواعد و ضوابط کی روسے انجمن کی رکنیت کا ہر وہ سویٹ شہری مستحق ہو سکتا ہے جو مذہب کو خیرباد کہکر اس کے خلاف جنگ میں حصہ لینے کے لئے آمادہ ہو برطانوی ریشنلسٹ (عقلیت پرست) اور سیکولرسٹ (دنیا پرست) انجمنوں کے برعکس سویٹ "رزمیہ انجمن ملحدین" کو بڑی سرعت کے ساتھ ترقی حاصل ہوئی۔ اراکین انجمن کی تعداد کا ایک سرکاری نقشہ جو کئی سالوں پر مشتمل ہے ذیل میں درج کیا جاتا ہے

سنہ	تعداد اراکین	سنہ	تعداد اراکین
۱۹۲۶	۸۷۰۳۳	۱۹۳۰	۲۰۰۰۰۰۰
۱۹۲۷	۱۲۸۴۰۲	۱ ۱/۳۱	۳۵۰۰۰۰۰
۱۹۲۹	۴۶۵۴۹۸	۱ ۵/۳۱	۵۰۰۰۰۰۰
۱۹۳۲	۵۵۰۰۰۰۰		

۱۹۳۳ء کے متعلق صحیح اعداد دستیاب نہیں ہو سکے لیکن اُن کا شمار ساٹھ لاکھ سے ضرور زیادہ ہوگا

چونکہ زار کے زمانہ میں ملحدانہ خیالات کی اشاعت قانوناً ممنوع تھی اس لئے انقلاب سے پہلے منکرین خدا کی تحریرات سے عوام الناس قطعی نابلد تھے لیکن بالشیوکوں کے برسرِ اقتدار ہو جانے کے بعد فضا تبدیل ہو گئی اور غیر ملکی ملحدین کی مشہور ترین کتابوں کا روسی زبان میں ترجمہ ہو کر نہایت ارزاں قیمت پر شایع ہونے لگا اور خلاف مذہب تحریرات ملک کے اطراف و اکناف میں پھیل گئیں۔ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۲ء تک سترہ سو الحادی کتب و رسایل شایع ہوئے جن کی جلدوں کی تعداد چار کروڑ تک پہونچ گئی۔ ۱۹۲۷ء میں ۴۰۸ صفحوں کی ایک نہایت ہی دیدہ زیب کتاب "(Anti-religious text book for workers)" کے نام سے تالیف ہوئی جس کے ۱۹۳۱ء تک چھ ایڈیشن طبع ہو گئے، اور جن میں چھٹے ایڈیشن کے ایک لاکھ نسخے شایع ہوئے۔ اسی زمانہ میں ۴۲۸ صفحوں کی ایک اور کتاب (Anti-religious book for pheasants) کے بھی چھ ایڈیشن طبع ہوئے اور آخری ایڈیشن کے دو لاکھ نسخے فروخت ہو گئے۔ اگر "ریشنلسٹ پریس ایسوسیٹشن" لندن کے پچھلے "سالانہ جلسہ" کے موقع پر پروفیسر لیوتی "تھنکرس لائبریری" کی تیس مختلف کتابوں کی ایک لاکھ جلدوں کی فروخت کو شاندار کامیابی سے تعبیر کر سکتے ہیں تو محض دو الحادی کتابوں کی تین لاکھ جلدوں کی غیر ترقی یافتہ روسی جمہور کے درمیان فروخت کو کس قسم کی کامیابی سے تعبیر کیا جائے گا۔ ایک جدید عقلیت پرست مسٹر ارچی بولڈ رابرٹسن نے اکتوبر ۱۹۳۲ء کے "لٹریری گائیڈ" میں صفحہ ۱۸۱ پر "یونین آف سویٹ سوشلسٹ ریپبلک" کی اس تمام تحریک الحاد کو صحیح طور پر الفاظ ذیل میں ظاہر کیا ہے "ایسا غیر معمولی خلاف مذہب انقلاب دنیا نے قسطنطین اور تھیوڈوسیس کے زمانہ سے اب تک نہیں دیکھا"

"رزمیہ انجمن ملحدین" کا طریق کار کیا ہے؟ انجمن کی تنظیم کی بنیاد ایک ایسے مرکز پر قائم ہے جو کم از کم تین آراکین پر مشتمل ہے یہ مرکز اشاعتی دوائر، تقاریر، مناظرات، اور خلاف مذہب مظاہرات کا اہتمام کرتا ہے، الحادی فلموں کی طیاری کا بندوبست کرتا ہے اور کتب الحاد کی اشاعت کو ترقی دینے کی تدابیر عمل میں لاتا ہے۔ یہ مرکز اپنے دائرہ کے رضاکاروں کی جماعتوں سے خاص طور پر اور "سیاسی تعلیمی" اداروں سے عام طور پر قریبی تعلقات قائم رکھتا ہے۔ اراکین انجمن کے واسطے لازمی ہے کہ وہ قدیم روس کی غیر صلاحیت اور اضمحلال کے خلاف حیات جدید کے جد و جہد کے میدان میں صف اوّل میں استادہ ہوں، تمام جنگجو ملحدین اجتماعیت عمرانی کی خلوص دل سے تعمیر کریں، اور مخصوص فوجی خدمات، اشتراکیت زراعت، اور رفع جہالت میں پوری مستعدی سے حصہ لیں مذہب کے خلاف جنگ کرنے کے لئے سویٹ ماہرین طبیعیات و فلسفہ و حرفت کی خدمات حاصل کرنے کی خاص کوشش جاری ہے جس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہو گئی ہے۔ اکثر ادارہائے طبیعیات میں انجمن کے اراکین کام

لررہے ہیں اور ماہرین طبعیات وفلسفہ وحرفت انجمن کی نگرانی میں درس دیتے ہیں، دیہات میں جاہل کاشتکاروں کے مذہبی تعصبات اور رسمیات کے خلاف ماہرین فن زراعت اطبا اور معلمین کے اثرات کو بطور طاقتور اسلحہ کے استعمال کیا جاتا ہے۔ سویٹ اتحاد کے طول وعرض میں (جو کرۂ زمین کا ۱/۶ حصہ ہے) ترویج تعلیم اور اخراج مذہبیت کے لئے مطابع، سینما، مدارس، جامعات اور کتبخانے باقاعدہ استعمال کئے جارہے ہیں۔ روسی تحریک اتحاد کی اس روز افزوں ترقی اور کامیابی کا برطانیہ کو خاص توجہ کے ساتھ مطالعہ کرنا چاہیئے۔ ایسے وقت میں جبکہ "ہٹلر" کی " براؤن شرٹ " افواج اعتدال پسند آزاد خیالوں کو جنگلی جانوروں کی طرح سے اپنا شکار بنا رہی ہیں اور جبکہ فیسٹ اٹلی کا رومن کیتھلک فرقہ ڈیوس اور اس کی جماعت کی حمایت میں محفوظ ہے، سویٹ کی حفاظت میں رزمیانہ الحاد روز بروز طاقت پکڑتا جاتا ہے اور مذہبی اعتقادات کروروں مزدور پیشہ لوگوں کے سینہ سے ہمیشہ کے واسطے رخصت ہورہے ہیں

عبدالحفیظ

رسالہ جن کے گزشتہ پرچے

بحساب ۱ر فی پرچہ ٹکٹ بھیجکر طلب فرمائیے۔ رسالہ جن اپنے موضوع کے لحاظ سے ہندوستان میں پہلا پرچہ تھا جو اڈیٹر نگار کی ادارت میں دوسال تک نکلتا رہا

ان پرچوں میں جس قسم کے مضامین نکل چکے ہیں۔ وہ اب کبھی میسر نہیں آسکتے۔

منیجر نگار لکھنؤ

زندگی کا بوجھ

ایک دن میں سمندر کے ساحل پر پہونچی اور وہاں ایک بڑی چٹان کے سایہ میں بیٹھ گئی - میں وہاں بیٹھی ہی تھی کہ چٹان کو کہتے ہوئے سنا : ـــ

" زندگی کا بوجھ بھی کیسا ناگوار بوجھ ہے ! ایک فصل کے بعد دوسری فصل آتی ہے - ایک زمانہ کے بعد دوسرا زمانہ آتا ہے ، وہی آسمان ہے ، وہی زمین ، وہی سورج کا یکساں طلوع وغروب ، وہی چاند کا ایک طرح گھٹنا بڑھنا ، وہی ستاروں کا رات کو چمکنا اور دن میں آنکھیں بند کر لینا

ہَوا آتی ہے اور میری آنکھوں میں اپنی گرمی چھوڑ جاتی ہے ، نسیم چلتی ہے اور میرے کانوں میں اپنی ٹھنڈی سانسیں بھر جاتی ہے - کہر منتشر ہوتا ہے اور اپنے سیاہ کفن سے مجھے ڈھک لیتا ہے ، بادل اٹھتا ہے اور مجھ پر برہم ہو کر برس پڑتا ہے ـــــ یہ چڑیاں چاروں طرف سے آتی ہیں اور میرے سر پر بیٹھ کر لڑتی ہیں جھگڑتی ہیں ، جشن مناتی ہیں اور ہنگامہ برپا کرتی رہتی ہیں ـــــ یہ درخت اپنی جڑوں سے مجھے روز بروز جکڑتے جا رہے ہیں اور اپنے پتے گرا گرا کر مجھے داغدار بناتے جاتے ہیں ـــــ میں تو اس زندگی سے باز آئی ، اے سمندر مجھ پر رحم کر اور جلد مجھے نگل لے "

دفعۃً سمندر کی ایک موج بلند ہوئی اور چٹان کے اوپر سے گزر گئی

میں ایک دن سمندر گئی تاکہ اس سے اس کا موتی طلب کروں - میں اسی چٹان پر پہونچی اور وہاں سے اپنے آپ کو پانی کے اندر گرانا چاہا - چٹان کے چاروں طرف کیچڑ تھی ، پتوں کے ڈھیر تھے اور جب میں نے انھیں غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہیں ایک موتی بھی پڑا ہوا ہے - میں موتی اٹھا رہی تھی کہ چٹان بولی : ـــ

" زندگی کا بوجھ بھی کیا ناگوار بوجھ ہے - وہی کیچڑ ، وہی سڑی ہوئی پتیاں ، وہی مچھلیاں ، وہی موجیں جو کل تھا وہی آج ہے ، جو آج ہے وہی کل ہوگا - کاش میں اندھی ہوتی کہ بار بار ایک ہی چیز کو نہ دیکھ سکتی نہ سُن سکتی ، اے سمندر مجھے عذاب سے نجات دے اور آزادی سے سانس لینے دے "

میں نے دیکھا کہ موجیں ہٹ گئیں ، مچھلیاں چلی گئیں ، آفتاب نے کیچڑ کو خشک کر دیا اور ہوا پتیاں اڑا لے گئی

میں پھر ایک دن سمندر کے ساحل پر گئی اور اس چٹان تک پہونچی۔ دیکھا کہ آبی چڑیاں اس پر بیٹھی ہوئی دھوپ لے رہی ہیں، درخت اس کے دونوں جانب جھکے ہوئے اپنی شاخوں سے چاروں طرف پھول بکھیر رہے ہیں۔ میں پھول چننے کے لئے جھکی تو چٹان نے کہا:۔

" زندگی کا بوجھ بھی کیسا ناگوار بوجھ ہے، میں اس یکسانیت سے تنگ آ گئی۔ اے سمندر تو مجھے نگل لے "

چٹان کا یہ جملہ ختم نہ ہوا تھا کہ دفعۃً فضا میں چمک پیدا ہوئی اور بجلی نے اس کو ریزہ ریزہ کرکے تمام ذرات ہوا میں ملا دئے

اب چٹان تو نظر نہ آتی تھی لیکن اس کی یہ آواز ضرور گونج رہی تھی کہ

" آہ، یہ نیا وطن تو اور زیادہ تکلیف دہ ہے، یہ نئی زندگی تو کہیں زیادہ پریشان و منتشر ہے "

(میخائیل نعیمہ)

باب الاستفسار

سیرۃ النبی اور دار المصنفین

(جناب سید عبدالجلیل صاحب۔ بریلی)

دار المصنفین اعظم گڑھ سے جو جلدیں سیرۃ النبی کی شائع ہوئی ہیں، اُن کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے — کیا واقعی وہ ایسے اصول پر مرتب کی گئی ہے جو اس سے قبل اختیار نہیں کیا گیا اور کیا حقیقتاً وہ کوئی عظیم الشان اسلامی خدمت ہے ؟

(نگار) سیرۃ النبی کے کام کو مولانا شبلی مرحوم نے شروع کیا لیکن اُن کی عمر نے وفا نہ کی کہ وہ اسے انجام تک پہونچا سکتے ہر چند یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اگر یہ کتاب تمام و کمال انھیں کے قلم سے نکلتی تو اس کا رنگ بالکل مختلف ہوتا، لیکن جس وقت ہم پہلی دو جلدوں کو سامنے رکھ کر باقی دو جلدوں کو دیکھتے ہیں تو اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اگر مولانا شبلی زندہ ہوتے تو وہ سید سلیمان ندوی کے اس کارنامہ کو کچھ زیادہ خوشی سے اپنے ساتھ منسوب کرنا پسند نہ کرتے

جس حد تک محض سیرۃ کا تعلق ہے اس کے لئے تو صرف ایک ہی جلد کافی تھی، لیکن چونکہ دار المصنفین اس امداد کو جو سیرۃ النبی کے نام سے مل رہی ہے۔ ایک غیر معلوم وقت تک حاصل کرتے رہنا مناسب سمجھتا ہے اس لئے غیر ضروری طوالت سے کام لیا جا رہا ہے اور فرائض سیرۃ نگاری کو نظر انداز کر کے بعض مباحث کو اسقدر تطویل بیجا کے ساتھ پیش کر رہے ہیں کہ یہ کتاب سیرۃ کی حدود سے گزر کر فقہ و کلام، تفسیر و حدیث اور خدا جانے کن کن مباحث کا مجموعہ منتہی بنی جا رہی ہے

سید سلیمان ندوی کی ادارت میں دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ ایک معجزہ کی بحث سے متعلق ہے اور دوسری اسلامی عقائد سے، لیکن اگر نظر انصاف سے دیکھا جائے تو ان میں کوئی ایک بھی ایسی نہیں جو قول فیصل کا مرتبہ رکھتی ہو

مجھے نہیں معلوم کہ مولانا شبلی کا حقیقی مقصود اس تصنیف سے کیا تھا، یعنی وہ اس کتاب کو تمام دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے یا صرف مسلمانوں کے سامنے، لیکن سید سلیمان ندوی کی مرتب کی ہوئی جلدیں تو یقیناً صرف مسلمانوں ہی کے لئے ہیں اور ایک غیر مسلم کو مطمئن کرنے والی کوئی چیز ان میں نہیں پائی جاتی، بلکہ سچ پوچھئے تو اور سامان تضحیک فراہم کر دیا گیا ہے

حیرت ہے کہ معجزہ کی بحث پر سیکڑوں صفحے سیاہ کر دینے کے بعد بھی وہ کوئی معقول دلیل پیش نہ کر سکے اور سوائے ان لوگوں کے جو پہلے ہی سے معجزوں کے لئے قایل ہیں، کوئی اور شخص اس کتاب کو دیکھ کر کبھی معجزہ کا قائل نہیں ہو سکتا

معجزہ نام اگر خوارق عادات کا ہے تو سب سے پہلے یہ امر بحث طلب ہے کہ ایک نبی یا رسول کو جو صرف تعلیم اخلاق کے لئے مامور ہوتا ہے ایسا معجزہ پیش کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے جو عالم طبیعیات پر موثر ہو اور اس معجزہ سے وہ اخلاق انسانی کی اصلاح کیونکر کر سکتا ہے۔ ممکن ہے اس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ معجزہ تو صرف ذریعہ ہے تصدیق نبوت و رسالت کا تاکہ معجزہ دیکھ کر لوگ نبی کی صداقت پر ایمان لے آئیں اور جب وہ ایک نبی کو نبی سمجھ لیں گے تو ظاہر ہے کہ اس کے ارشادات پر عمل بھی کریں گے ——— لیکن یہ جواب بالکل مہمل ہے۔ کیونکہ اس دلیل کے تسلیم کرانے کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ معجزہ کی حقیقت کو واضح کر دیا جائے اور معجزہ کی حقیقت میں ہم کو صرف یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ خوارق عادات جو ایک نبی کی طرف سے ظاہر ہوں معجزہ کہلاتے ہیں ——— اس لئے نتیجہ اس تمام بحث کا یہ نکلے گا کہ معجزہ وہ ہے جو نبی سے صادر ہو اور نبی وہ جس سے معجزہ کا ظہور ہو، اور اس استدلال کی لغویت ظاہر ہے

اس کے بعد بحث کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ آیا کسی معجزہ کا ظاہر ہونا عقلاً ممکن ہے یا نہیں اور اسی کے ساتھ یہ کہ واقعی وہ ظاہر بھی ہوا یا نہیں ——— لیکن ہمارے یہاں کے علماء دین جن میں مؤلف سیرۃ النبی (سید سلیمان ندوی) بھی شامل ہیں ہمیشہ امکان و قوع سے بحث کیا کرتے ہیں یعنی وہ صرف یہ ثابت کرنے کی کوشش کیا کرتے ہیں کہ ایسا ہونا ممکن ہے۔ درانحالیکہ کسی امر کے وقوع کا محض امکان، وقوع تو نہیں۔ مثلاً کوئی شخص آکر مجھ سے یہ بیان کرے کہ فلاں شخص کے دونوں شانوں پر پر نکل آئے ہیں اور وہ فضا میں اڑتا پھرتا ہے ۔ تو سب سے پہلے میں غور کروں گا کہ آیا ایسا ہونا عادتاً محال تو نہیں اور جب اس کی طرف سے مطمئن ہو جاؤں گا تو پھر اس کی جستجو کروں گا کہ فی الحقیقت ایسا ہے بھی یا نہیں، لیکن اگر اس خبر کا سنانے والا میرے اس تذبذب

کو دیکھ کر صرف یہ دلیل لائے کہ کیا ایسا ہونا ممکن نہیں اور کیا فلاں فلاں شخص جن کی وساطت سے یہ خبر مجھ تک پہونچی ہے جھوٹ بول سکتے ہیں، تو کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مجھے اس پر اطمینان ہو جائے گا۔ اور میں اسے مان لوں گا۔ غالباً نہیں

سید سلیمان ندوی نے بھی معجزات نبوی کے متعلق پوری کتاب میں اسی نوع کے استدلال سے کام لیا ہے اور ساری کوشش اس امر پر صرف کی ہے کہ ایسے پُراسرار واقعات کا ظاہر ہونا ممکن ہے اور جب ممکن ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ رسول اللہ کی طرف سے ان کا ظہور نہ ہوا ہو —— گویا اس سے بحث کرنے کی ضرورت ہی نہیں کہ واقعی وہ ظاہر بھی ہوئے یا نہیں

ظہور معجزات کی شہادت میں انھوں نے صرف روایات پر اعتماد کیا ہے، درانحالیکہ اصول درایت کی رُو سے تمام وہ راوی جنھوں نے احادیث معجزات روایت کی ہیں، پہلے ہی سے ساقط الاعتبار ہو جاتے ہیں

الغرض سید سلیمان ندوی نے سوائے روایات و منقولات کے اور کوئی ذریعہ اثبات معجزہ کے لئے اختیار نہیں کیا اور اگر کسی جگہ عقل سے کام لینے کی زحمت گوارا فرمائی ہے تو وہ بھی اس شان سے کہ کہیں فلسفۂ قدیم کے اصول کو سامنے رکھ کر امکان معجزہ کو ثابت کرنا چاہا ہے جو اس زمانہ میں تقویم پارینہ کی حیثیت رکھتا ہے، یا اگر اس سے ہٹ کر کہیں خود اُپج کی لی ہے تو اس طرح کہ فلاں مقام میں ایک مردہ شخص کی تصویر لی گئی تو تصویر میں چند روحوں کے عکس بھی نظر آتے تھے اور اس کے ثبوت میں اخبار لیڈر کی شہادت پیش کر کے گویا ایسی برہان قاطع صرف کی ہے کہ سوائے سر جھکا دینے کے اب کوئی چارہ باقی ہی نہیں رہتا

پھر ظاہر ہے کہ جو شخص اخبار لیڈر کے نامہ نگار کے بیان پر اعتماد کر کے عقل سے کام لینا چھوڑ دے، وہ اگر کتب احادیث کی روایتوں پر اعتماد کر کے سرے سے وجودِ عقل ہی کا انکار کر دے تو جائے حیرت نہیں۔

افسوس ہے کہ سید سلیمان ندوی علوم مغربی سے بالکل بے بہرہ ہیں اور وہ مطلقاً نہیں سمجھ سکتے کہ معجزوں کے اثبات کے لئے کتنے حقائق مسلمہ کا انکار کرنا ضروری ہے اور موجودہ عہد میں جبکہ تمام علوم و فنون کی بنیاد صرف مشاہدات و حقایق پر قائم ہے، کوئی کیونکر معجزوں کا قایل ہو سکتا ہے

یہ کہدینا تو آسان ہے کہ رسول اللہ کے جسم کا سایہ نہ پڑتا تھا، یا سنگریزے آپ کے ہاتھ میں بولنے لگے، یا استن حنانہ آپ کے فراق میں آٹھ آٹھ آنسو رونے لگا، یا یہ کہ آپ نے چاند کے دو ٹکڑے کر دیئے، اور ایک مسلمان کو صرف احادیث کے زور پر آپ ان باتوں کا یقین بھی دلا سکتے ہیں، لیکن ایک منکر و کافر، ایک ملحد و بیدین کے دل میں آپ کیونکر ایقانی کیفیت پیدا کر سکتے ہیں، جبکہ وہ سمجھتا ہے کہ ان میں سے کسی ایک معجزہ پر ایمان لے آنا گویا نظام عالم کے درہم برہم ہو جانے کا قایل ہو جانا ہے —— شعبدہ یا نظربندی کے ذریعہ سے تو یہ سب کچھ مانا جا سکتا ہے لیکن حقیقت نفس الامری کے لحاظ سے کوئی شخص اس کو تسلیم نہیں کر سکتا

اگر سید سلیمان ندوی صرف کلام مجید کو سامنے رکھکر معجزات پر بحث کرتے تو یقیناً وہ بھی اسی نتیجہ پر پہونچتے کہ رسول اللہ نے کوئی معجزہ پیش نہیں کیا اور آپ نے ہمیشہ یہی کہا کہ میں کوئی معجزہ نہیں لایا، لیکن تقلید و اسلاف پرستی کا مرض جس میں ہمارے علماء مبتلا ہیں کب قرآن شریف کی طرف متوجہ ہونے دیتا ہے اور قرآن کو قرآن ہی سے سمجھنے کی توفیق کیوں دینے لگا،

الغرض میری رائے میں سیرۃ النبی کی تیسری جلد جس میں معجزات پر بحث کی گئی ہے ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ کسی غیر مسلم کے سامنے پیش کی جائے اور اگر اس کا مقصود صرف مسلمانوں ہی سے خطاب کرنا تھا تو تحصیل حاصل میں وقت ضائع کیا گیا، کیونکہ مسلمانوں کی ذہنیت پر یوں ہی موت طاری ہے، سید سلیمان ندوی کو اور دُرّے لگانے کی کیا ضرورت تھی

چوتھی جلد جس میں عقائد اسلامی سے بحث کی گئی ہے، سیرۃ کے موضوع سے کوئی تعلق نہیں رکھتی اور آئندہ جلدوں کو بھی ایسا ہی سمجھنا چاہئے کیونکہ ان میں بھی عبادات و معاملات وغیرہ سے بحث ہوگی جو سیرۃ نبوی سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں رکھتی —— یوں تو تعلیم اسلامی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جسکا تعلق رسول اللہ سے نہ ہو. لیکن مباحث کی تقسیم کے لحاظ سے ان مسائل کو سیرۃ النبی سے بالکل علیحدہ رکھنے کی ضرورت تھی —— میں نے چوتھی جلد کو ابھی تک بالاستیعاب نہیں دیکھا، لیکن سرسری مطالعہ بھی اسقدر سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ سید سلیمان ندوی ابھی بھی "طوطی در پسِ آئینہ" نظر آتے ہیں اور اسلام کو صرف علماء سلف اور متکلمین ہی کے نقطۂ نظر سے پیش کرنا مناسب سمجھتے ہیں

قرآن مجید میں غور و فکر نہ کرنے کی جو عادت مسلمانوں میں پیدا ہوگئی ہے وہ کتاب کی ہر ہر سطر سے ظاہر ہے اور اس میں سید سلیمان ندوی نے اسقدر غلو سے کام لیا ہے کہ قرآن مجید کی آیتوں کو کھینچ تان کر علماء سلف کے اقوال کی تصدیق تو اُن سے کرا دیتے ہیں لیکن ان کے اقوال کی صحت کا معیار قرآن پاک کو قرار نہیں دیتے —— اس جلد میں بعض ایسے مسائل کو بھی عقائد اسلامی میں شامل کر لیا ہے جنکے بابت قرآن میں کوئی صراحت نہیں پائی جاتی مثلاً تقدیر، عالم برزخ، حشر بالاجساد یا جسمانی عذاب و ثواب کہ عام طور پر ان کو بھی عقائد مہمۂ اسلامی میں شامل کیا جاتا ہے، درانحالیکہ اُن کا منکر دائرۂ اسلام سے خارج نہیں ہو سکتا —— یہ تو تھی میری نہایت ہی اجمالی رائے اس کتاب کے متعلق، لیکن میں اس اجمال کو بہت جلد پوری تفصیل کے ساتھ پیش کروں گا۔ اور بتاؤں گا کہ جس تالیف پر دار المصنفین کو اسقدر ناز ہے اسکی حقیقت کیا اور کتنی ہے،

خاتون —— ختنہ

(جناب محمد عبد الکریم خاں صاحب - پشاور)

مشہور بات ہے کہ عرب میں عورتوں کا بھی ختنہ کیا جاتا تھا۔ اس لئے غالباً لفظ "خاتون" بھی اُسی سے مشتق ہے۔ کیا یہ صحیح ہے۔ اسی کے ساتھ اگر ممکن ہو تو اس رسم کے متعلق وضاحت کے ساتھ

مطلع فرمائیے کہ یہ کب سے رائج ہے اور کیوں ؟ مسلمانوں میں اس کا رواج کب سے ہوا اور کس خیال کے ماتحت ؟

(نگار) لفظ (ختنہ) سے (خاتون) کی طرف خیال منتقل ہونا آپ کی نہایت پُرلطف ذہانت ہے اور اگر لفظ (خاتون) عربی زبان کا لفظ ہوتا تو آپ کا یہ تیر نشانہ پر بیٹھ ہی گیا تھا، لیکن چونکہ یہ لفظ اعجمی ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ اس کو (ختنہ) کا مشتق نہیں کہہ سکتے ــــــ ہرچند اب عربی زبان میں بھی لفظ (خاتون) استعمال ہوتا ہے اور اس کی جمع (خواتین) کیجاتی ہے، لیکن حقیقتہً یہ لفظ ترکی النسل ہے اور مغل شاہزادیوں کو اس لقب سے پکارا کرتے تھے

چھٹی صدی عیسوی کی چینی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لقب تو کیو ئی نے خاقان کی بیوی کو دیا تھا۔ اور چینی زبان میں اس کا تلفظ خو ہو توَن ہوتا ہے۔ اس کے بعد بھی شاہان چین کی بعض بیویوں کو اس لقب سے یاد کیا گیا۔ اصل لفظ ترکی زبان میں (قادین) ہے جس کے معنے صرف "معزز عورت" کے ہیں

ختنہ کی رسم بہت قدیم ہے اور مسیح سے تین ہزار برس قبل مصریوں میں اس کا رواج پایا جاتا تھا۔ ہرچند یہ متحقق نہیں ہے کہ بلا استثنا، ہر لڑکے کا ختنہ کیا جاتا تھا یا صرف اُن کا جو مذہبی حلقہ سے تعلق رکھتے تھے، تاہم اس رواج کا قدیم مصریوں میں پایا جانا اُس عہد کے آثار سے بخوبی ثابت ہے۔ چنانچہ مومیائی شدہ لاشیں اکثر مختون ہی نظر آئی ہیں

قدیم اہل بابل میں بھی یہ رسم جاری تھی اور اب بھی بعض وحشی قوموں میں اس کا رواج اس حقیقت کو ثابت کرتا ہے کہ یہ رسم بہت قدیم ہے اور متعدد اقوام میں اس کا رواج پایا جاتا تھا۔ اب رہا یہ امر کہ اس کی ابتدا کے اسباب کیا تھے اور کیوں یہ رسم دنیا میں قائم ہوئی۔ اس کے متعلق لوگوں نے مختلف نظریے قائم کئے ہیں

ایک نظریہ یہ ہے کہ صفائی و صحت کے خیال سے یہ رسم قائم ہوئی، مگر یہ نظریہ صحیح نہیں ہو سکتا، کیونکہ قدیم انسان اس احساس کا مالک نہ تھا اور جس انداز سے وہ زندگی بسر کر رہا تھا اس کو دیکھ کر کبھی یہ خیال قائم نہیں کیا جا سکتا کہ صفائی و صحت کے لئے اس نے اتنی غائر توجہ کی ہوگی

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ ختنہ گودنے کی طرح ایک علامت تھی جس سے ایک قبیلہ کا آدمی دوسرے قبیلہ کے آدمی سے ممتاز ہو سکتا تھا، لیکن اس کی صحت کا بھی زیادہ امکان نہیں، کیونکہ ایسی علامت ہمیشہ کھلی ہوئی ہونی چاہئے (جیسے ہندوؤں میں چوٹی) تاکہ فوراً دیکھتے ہی ہر شخص پہچان لیا جائے۔ اور مختون ہونا کوئی نمایاں علامت نہیں ہے

تیسرا نظریہ یہ ہے کہ رسم ختنہ کا تعلق رسم قربانی سے ہے۔ چونکہ قدیم زمانہ میں دیوتاؤں کے سامنے خون بہانا اُن کے خوش کرنے کے لئے ضروری تھا اور سب سے زیادہ قیمتی خون انسان ہی کا ہے اس لئے انسانی قربانی کے قائم مقام اس کو قرار دیا گیا۔ غالباً یہی نظریہ زیادہ صحیح ہے

صاحب کتاب قوموں میں یہودیوں کے یہاں یوں بھی اس کا بڑا قدغن تھا، لیکن جب بنی اسرائیل مصر سے جلا وطن ہوکر بابل میں آئے تو اس رسم نے اور زیادہ شدید مذہبی رنگ اختیار کر لیا، کیونکہ اہل بابل و ایران میں جن کے یہ محکوم تھے، اس رواج کو بُری نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور اس طرح ان لوگوں میں اس کے قیام کی اور زیادہ ضد پیدا ہوگئی

توریت کے دیکھنے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ موسوی شریعت میں اس رواج کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور شدت سے اس کی پابندی کی جاتی تھی، چنانچہ اب بھی یہودیوں میں یہ رسم پائی جاتی ہے۔ اور خاص اہتمام سے اس کو ادا کیا جاتا ہے۔ عیسائیوں میں سوائے حبش کے اور کہیں اس کا رواج نہیں ہے

عرب میں بھی قبل اسلام اس کا رواج پایا جاتا تھا جیسا کہ بعض شعراء جاہلیت (مثلاً فرزدق وغیرہ) کے کلام سے ثابت ہوتا ہے۔ عرب میں نہ صرف لڑکوں بلکہ لڑکیوں کا بھی ختنہ کیا جاتا تھا۔ اور اب بھی اس کا رواج موجود ہے۔ لڑکیوں کے لئے لفظ خفض مستعمل ہوتا ہے اور لڑکوں کے لئے ختنہ ـــــ فقہ کا ایک مسئلہ ہے کہ " التقاء ختانین " سے غسل واجب ہوجاتا ہے۔ لفظ (ختانین) تثنیہ ہے (ختان) کی اور اس سے بھی مرد و عورت دونوں کے مختون ہونے پر روشنی پڑتی ہے

قرآن شریف میں تو ختنہ کا ذکر کہیں نہیں ہے، لیکن احادیث میں ہے۔ چنانچہ بخاری کی ایک حدیث ہے کہ حضرت ابراہیم کا ختنہ اس وقت ہوا جب ان کی عمر ۸۰ سال کی تھی۔ یہ بیان انجیل سے لیا گیا ہے۔ احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ختنہ ظہور اسلام سے قبل عرب میں رائج تھا اور لڑکے، لڑکی دونوں کا ہوتا تھا، اس لئے یہ کہنا کہ ختنہ کا رواج اہل عرب میں مسلمان ہونے کی وجہ سے پیدا ہوا درست نہیں۔ البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح مسلمانوں نے یہودیوں کے اور بہت سے مراسم کو اپنے اوپر واجب کر لیا تھا، اسی طرح رسم ختنہ کو بھی لے لیا اور اس کی سختی کے ساتھ پابندی کی

مسند احمد بن حنبل میں ختنہ مردوں کے لئے سنت اور عورتوں کے لئے مناسب لکھا ہے۔ زبان عرب میں جب کسی کی حقارت کرنا مقصود ہوتی ہے تو اس کو "ابن مقطعۃ البظور" کہتے ہیں یعنی عورتوں کی ختنہ کرنے والی کا لڑکا ـــــ اس سے بھی وہاں عورتوں کے مختون کئے جانے کا رواج ثابت ہوتا ہے

امام شافعی کے نزدیک ختنہ واجب ہے اور ابو حنیفہ امام مالک کے نزدیک سنت۔ شافعیوں کے یہاں مرد و عورت دونوں کا ختنہ واجب ہے

باب المراسلۃ والمناظرہ

دہلی کا پیغمبر اور لکھنؤ کا خلیفۂ اوّل

ب سید ظہیر حسن صاحب سفیر اللہ - صدر بازار - دہلی)

ے بے نیاز ، حضرت نیاز - خدا آپ کو فلاح دارین عطا فرمائے !

اس دور مادّیت میں ملحدان یورپ کی جادو نگاری نے اکثر سادہ لوح افراد کے قلوب کو مسخر و متحیر کر دیا ہے۔ اور ے صاحب فکر و قلم کو بھی یہ لکھنے پر مجبور کر دیا کہ " دنیا میں سب سے پہلا جھوٹ جو بولا گیا وہ اظہارِ وحی و الہام تھا "

خدا آپ کو توفیق ہدایت دے ! چونکہ اس مادی دنیا کی زندگی ایک عارضی حیثیت رکھتی ہے۔ اور عنقریب ی اس عالم سے منتقل ہو کر سزا و جزا کے لئے احکم الحاکمین کے روبرو پیش ہونا اور پھر رجعت جدید تک کے لئے ، مخلوق (دوزخ یا جنت) کی طرف منتقل ہونا ضروری ہے۔ اوس وقت ایمان بالغیب اور توسل رسول کے سوا ئی یا قیاسی مذہب کسی طرح نجات کا ذریعہ نہ ہو سکے گا۔ اس لئے انسانی ہمدردی کا تقاضا ہے کہ نہ صرف آپ کو بلکہ ع انسان کو غلط اور مخدوش راستہ سے بچانے کی کوشش کی جائے

میں نے آپ کے مضامین سے متاثر ہو کر یا مشتعل ہو کر بارہا کوشش کی کہ آپ سے خود مل کر اُن شکوک و شبہات خیالات کروں جو آپ کو اور اکثر لوگوں کو پستی کی طرف لیجا رہے ہیں۔ لیکن اب تک اس ارادہ کی تکمیل نہو سکی مد کے لئے سر دست چند خطوط کی نقل آپ کے اور ناظرین نگار کے مطالعہ کے لئے اس نیاز نامہ کے ہمراہ بھیج رہا چونکہ آپ کی صاحبِ خطوط مسٹر محمد یامین صاحب ہاشمی ایم - اے - ایل ایل - بی - وکیل لکھنؤ سے نہ صرف واقفیت بلکہ آپ کے اور اون کے خیالات و مضامین میں پوری یگانگت و موافقت بھی پائی جاتی ہے اس لئے التماس راہ کرم آپ ان خطوط کی اصلیت و صاحب خطوط کی حقانیت پر روشنی ڈالتے ہوئے الہام و وحی کی حقیقت پر ضرور فرمائیں اور ناظرین نگار کو بھی مستفید ہونے کا موقع مرحمت فرمائیں !

اس کے بعد انشاء اللہ حقیقت و ضرورت مذہب اور خالق و مخلوق کے درمیان مراسلت کے طریقے و وحی) اور قوانین فطرت و قدرت پر تبادلۂ خیالات کر کے اہل یورپ کی ظلمت پرستی و سحر سازی

کو پاش پاش کریں گے۔ والسّلام

آپ کا

حقیر سید ظہیر حسن سفیر اللہ

مالک و مہتمم میوزیم دار الفلاح صدر بازار دہلی

نقل چٹھی نمبر (۱)

از سید یامین ہاشمی۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ وکیل۔ گولا گنج ۹ لکھنؤ۔ مورخہ ۲۹ اگست ۱۹۲۹ء

بنام مہتمم صاحب دار الفلاح۔ صدر بازار۔ دہلی

مرشدی و محترمی۔ گو اسم گرامی سے ناواقف ہوں۔ لیکن عالم خواب میں کل شب میں نے حضور کی زیارت کی مجھے ہدایت ہوئی ہے کہ میں خود کو حضور کے معتقدین میں شامل کروں۔ اور حلقہ بگوش ہونے کے بعد حضور کے مقاصدِ عالیہ کی تبلیغ و اشاعت کروں ——— اخباری دنیا میں مَیں محتاج تعارف نہیں۔ مجھے قوی امید ہے کہ مجھ ایسے معتقد کا گروہ معتقدین میں اضافہ حضور کو دنیا میں مشہور و معروف کر دے گا

مجھے امید ہے کہ جواب باثواب سے محروم نہ رہوں گا

خادم

یامین

نقل جواب چٹھی نمبر (۱)

جواب منجانب سیّد ظہیر حسن سفیر اللہ ڈائرکٹر میوزیم دار الفلاح دہلی۔ مورخہ ۵ ستمبر ۱۹۲۹ء

بنام مسٹر سید یامین صاحب ہاشمی۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی وکیل گولا گنج ۹ لکھنؤ

محبِ غیبی۔ سلام علیکم۔ خدائے پاک آپ کو فلاح دارین عطا فرمائے

میں باہر گیا ہوا تھا۔ واپسی پر آپ کا لفافہ ملا۔ اور عدیم الفرصتی کے سبب جواب میں کچھ تاخیر بھی ہو گئی ——— میں آپ کی پاک باطنی اور تحقیق حق کا اُس وقت سے معترف ہوں۔ جبکہ رسالہ "عالمگیر لاہور" کے سالانہ نمبر میں آپ کا نظریہ بعنوان "انسانی زندگی کی تحلیل" مطالعہ کیا تھا۔ آپ کے اس نظریہ سے آپ کی معرفت و حقانیت مجھ پر اُسی وقت عیاں ہو چکی تھی۔ لیکن اب اس بشارت نے اُس کی پوری تصدیق کر دی۔ جس کے لئے میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں عالمِ ملائکہ و مقربین صمدی میں اس حقیر کی رسالت و سفارت کا اعلان ہوئے آٹھ سال کا زمانہ ہوتا ہے مگر مخلوق

مخلوق سفلی (نوع بشر) کو دین احدی کی دعوت دینے کے لئے ہنوز اذن کا منتظر ہوں۔ اور آپ بھی میرے شریکِ حال ہوکر وقتِ معینہ تک صبر کریں

ہر پیغمبر کو زمانہ سکون میں انتظار کی تکلیف ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ قریب تھا۔ کہ یہ حقیر بھی اخویم موسےٰ کلیم اللہ کی طرح شوق سے مغلوب ہوکر پیش قدمی کرگزرتا۔ یا جناب محمد رسول اللہ کی طرح عالم مایوسی میں خودکشی پرآمادہ ہوجاتا لیکن اب آثار و قرائن بتلارہے ہیں۔ کہ دعوت کا وقت بہت قریب آگیا ہے۔ ایسے وقت میں آپ کے بشارت نامہ نے پہونچ کر میرے قلب کو بہت تسکین دی

اگر آپ خواب کی مفصل کیفیت ارقام فرمانے کی زحمت فرمائیں گے تو میرے لئے مزید اطمینان اور مشکوری کا باعث ہوگا۔ خصوصاً یہ کہ عدم واقفیت کی حالت میں آپ نے یہ کیونکر جانا کہ وہ خواب میں آنے والا یہ حقیر تھا۔ اور اس کا پتہ دارالفلاح صدر۔ دہلی ہے ؟

خدا کی ہدایت ہمیشہ آپ کے شریکِ حال رہے۔ وارداتِ قلبی سے آگاہ فرماتے رہیں۔ والسلام

آپکا

حقیر۔ ظہیر حسن سفیر

نقل چٹھی نمبر (۲)

ازجانب سید یامین ہاشمی۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ وکیل گولاگنج ۹ لکھنؤ۔ مورخہ ۔ ستمبر ۱۹۲۹ء

بنام سید ظہیر حسن سفیر اللہ۔ دارالفلاح صدر۔ دہلی

وعلیکم سلام ۔ مزاج مبارک

کرمت نامہ مورخہ ۵ ستمبر ۱۹۲۹ء موصول ہوکر مسکین قلب ہوا

میں ایک عرصۂ دراز سے یہ محسوس کررہا ہوں۔ کہ عامۃ الناس کی حالت عموماً اور مسلمانوں کی حالت خصوصاً روز بروز ناگفتہ بہ ہوتی جارہی ہے۔ زمانہ اس سُرعت کے ساتھ حضیض ذلت کی طرف جارہا ہے۔ کہ صاحبِ نظر کی آنکھیں حیران و ششدر رہ جاتی ہیں۔ میں تو اعداد و شمار سے یہ ثابت کرنے کے لئے آمادہ ہوں۔ کہ اس وقت انسانی زندگی کی عام اخلاقی حالت اس دور سے بھی گری ہوئی ہے۔ جب فطرت نے موسےٰ و محمد علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کو حیاتِ انسانی کی ترتیب و تدوین کے لئے ضروری سمجھا تھا۔ پھر ایسی حالت میں کسی ہادی کا رونما نہ ہونا قوانین فطرت کے غیر مبدل اصول کے خلاف ہے ـــــ بہ اعتبار اعتقادات میں نے دنیاوی دور کی تین قسمیں کی ہیں

(۱) دورِ اوہام پرستی

(۲) دَورِ مذہب

(۳) دَورِ اخلاقیات

حضرت عیسیٰ دَورِ اوّل کے آخیری رہنما تھے۔ زمانے نے جب کروٹ لی۔ اور دوسرا دَور شروع ہوا۔ اُس وقت رسول عربی کی بعثت ہوئی۔ جو اس دَور کے اوّل و آخیر نبی تھے۔ فی زمانہ دنیا تیسرے دَور میں داخل ہو چکی ہے۔ جس کے لئے اُسے ایک مستقل رہبر کی ضرورت ہے۔ جس کے پیغامات ایسے اخلاقی اصول پر مبنی ہوں۔ جو دَورِ اوّل و دویم پر ایک حسین اضافہ کی حیثیت رکھتا ہو۔ مذہب کو ظاہری و باطنی رواسم سے مقید و معین کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اخلاقیات انسانی زندگی کی طرح کسی قید و پابندی کے متحمل نہیں ہوسکتے

تو اسے پیمانہ امروز و فردا سے نہ ناپ؛
جاوداں پیہم رواں ہردم جواں ہے زندگی

ایسی صورت میں اس دَور کا نبی صرف وہی ہوسکتا ہے جس کی وسیع نظر یں عام فلسفۂ اخلاق پر اس طرح حاوی ہوں کہ وہ مختلف اصولوں کو آپس میں وزن و تقابل کرکے ایک ایسی شاہراہ نکال سکے جس پر وہ پیرو سے جاپان تک کے ہر باشندے کو دعوت دے سکتا ہو

مَیں ایسے رہبرِ ہادی کا مدّتوں سے منتظر ہوں۔ انتظار کی کشمکش نے بعض وقت تو مجھے اس کی ترغیب دی کہ میں خود اس کا اعلان کردوں

مجھ سے زیادہ آپ اس سے واقف ہوں گے کہ علوم باطنی کے مختلف مدارج ہیں

(۱) وحی (۲) الہام (۳) القا (۴) خواب

وحی کی صورتیں ایک مستقل کتاب کی محتاج ہیں۔ جس کے متعلق ایک نہایت بصیرت افروز مضمون میں نے اپنی کتاب "مسلمانوں کی اخلاقی تاریخ" میں درج کیا ہے۔ جو زیر طبع ہے۔ دورِ اخلاقیات کا رہبر وحی کا حامل نہیں ہوسکتا۔ نہ اس لئے کہ وہ اس کا اہل نہیں بلکہ صرف اس لئے اور اسی لئے کہ اس دَور کے رہبر کے لئے وحی کی ضرورت نہیں

ع ابتو سوال اور جواب جو ہے وہ بے حجاب ہے

الہامات والقا و خواب بھی اپنے ساتھ مخصوص کیفیات رکھتے ہیں۔ جن کی فی زمانہ ضرورت ہوتی ہے۔ اور بسا اوقات وہ ہدایت کے لئے معین و مفید ثابت ہوتے ہیں

میں عرض کرچکا ہوں کہ میں ایک عرصہ سے ایسے رہبر کا متلاشی ہوں اور تھا۔ میں نے ایک شب یہ خواب دیکھا کہ ایک بزرگ مجھ سے فرما رہے ہیں۔ کہ

"جا تو دہلی جا۔ اُس کو تیری اور تجھے اُس کی ضرورت ہے"

میں بے حد متحیر رہا کہ دہلی میں کہاں جاؤں اور کس کے پاس جاؤں ——— دوسری شب میں نے دوبارہ خواب دیکھا۔ کہ ایک بزرگ صورت جسم کسی قدر لاغر۔ قد دراغب بہ طوالت۔ چہرہ لانبا۔ رنگ گندمی۔ عبا زیب تن عمامہ زیب سر۔ میرے غریب خانہ پر تشریف لائے ہیں۔ اور مجھ سے فرماتے ہیں

"جس کی تجھ کو تلاش تھی وہ میں ہوں۔ اور مجھے بھی تیری تلاش و جستجو ہے۔ اسلئے کہ میرے اصول و اعتقادات کی تبلیغ تو ہی کر سکتا ہے"

میں نے پتہ دریافت کیا۔ تو انھوں نے اپنا اسم گرامی مع پتہ بتلایا۔ نام تو میں صبح کو بھول گیا۔ لیکن پتہ یاد رہا۔ اب جب آپ کا کرمت نامہ صادر ہوا۔ اور نام معلوم کیا۔ تو قوتِ حافظہ نے مدد دی اور یاد آگیا۔ کہ یہ وہی نام مقدس ہے

مجھے بھی اب امید ہے۔ کہ آپ کے اعلان ہادیت کا وقت قریب ہے۔ مجھے یقین کامل ہے کہ میں آپ کے مشن میں کافی اعانت کر سکوں گا۔ غالباً یہ عرض کر دینا بے جا نہ ہوگا کہ فی زمانہ ہر کام کے لئے خواہ وہ کسی قسم کا ہو۔ تبلیغ واشاعت کی بے حد ضرورت ہوتی ہے۔ اور خصوصاً ابتدا میں بہترین تبلیغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ بہترین تبلیغ کے لئے ایک ایسے قابل اور تجربہ کار شخص کی ضرورت ہے۔ جو عوام کی ذہنیت سے واقف ہو۔ اور جس نے دنیا کے تمامی مذاہب کا وزن و مطالعہ کیا ہو۔ غالباً یہ خود ستائی نہ ہو کہ میں نے ایک کافی وقت مطالعہ مذاہب میں صرف کیا ہے۔ اور دنیا کی مشہور کتاب (Encyclopedia of Religions) (جس میں تمامی مذاہب عالم پر ایک تحقیقی بحث کی گئی ہے) کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ ایسی صورت میں میں انشا اللہ آپ کا کافی ہاتھ بٹا سکوں گا

خادم
سید یامین ہاشمی

اگر ضرورت ہو تو سید یامین صاحب ہاشمی موصوف کے خطوط کی عکسی (فوٹو) کاپی کر کے روانہ کی جاسکتی ہے

ظہیر حسن۔ سفیر

(نگار) آپ کا خط اور آپ کی پیغمبرانہ تبلیغ کا اقتضا تو یہی تھا کہ میں خاک بسر، گریباں چاک آستانۂ نبوت اور بارگاہ رسالت میں پہونچ کر والہانہ ومضطربانہ سجدہ میں گر پڑتا اور تمام وہ حجابات جو میری بے بصری و کوردلی کا باعث ہیں آپ ایسی برگزیدہ ہستی اور مقدس وطاہر وجود کے دستِ حق پرست پر بیعت کر کے خود اپنے ہاتھ سے نوچ کر پھینک دیتا، لیکن افسوس ہے کہ میری شکستہ ناخنی اس کی اجازت نہیں دیتی اور عمر میں آج بالکل پہلی مرتبہ مجھے اس حقیقت کا احساس ہوا ہے کہ

دہند شوق وصلے رخصتِ نظرندہند

کیسی تکلیف دہ اور صبر آزما مصیبت ہے

تاہم غنیمت ہے کہ اگر خدا نے اپنا رسول دہلی کی سرزمین سے منتخب کیا تھا تو لکھنؤ میں اس کا خلیفۂ اوّل بنانے کے لئے یامین ہاشمی پر نگاہِ انتخاب پڑی ــــ آپ نے جس رسولانہ شفقت سے مجھے راہ ہدایت کی طرف دعوت دی ہے، اس کا مجھے اعتراف ہے، لیکن خدا کے لئے یہ تو بتائیے کہ کیا اس بیسویں صدی میں رسول کو جھوٹ بولنے کی اجازت دیدی گئی ہے اور کیا کسی پر خلافِ حقیقت الزام رکھنا دستگاہِ نبوت کے لئے ضروری ہے

اگر گستاخی معاف ہو تو دریافت کروں کہ میں نے کس جگہ یہ لکھا ہے کہ " دنیا میں سب سے پہلا جھوٹ جو بولا گیا وہ اظہار وحی والہام تھا " اور اگر کسی نبی کو جھٹلانا اچھی بات ہوتی تو میں کہدیتا کہ آپ غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں ــــ ممکن ہے آپ نے میرے مافی الضمیر کو معلوم کرکے اپنے الفاظ میں اس طرح ظاہر کیا ہو یا مشکوٰۃ نبوت کی مدد سے میرے مستقبل کی کسی تحریک کو ابھی سے پڑھ لیا ہو

بہرحال حقیقت جو کچھ ہو، میں فی الحال اس کے اعتراف سے قاصر ہوں اور اپنے اس قصور پر صد درجہ نادم ــــ جناب نے اپنی تحریر میں جس " رجعت جدید " کا ذکر فرمایا ہے وہ یقیناً عالم تناسخ سے علٰحدہ کوئی چیز ہوگی۔ اور جس دوزخ وجنت کو آپ نے " نئی مخلوق " سے تعبیر کیا ہے وہ بھی لاریب اس عہد کا عجیب وغریب انکشاف ہے۔ لیکن میں یا کوئی اور اگر اس کو نہ سمجھ سکے تو

چشمۂ آفتاب را چہ گناہ !

مجھے یہ معلوم کرکے بڑی مسرت ہوئی کہ جناب نے میرے مضامین سے مشتعل یا متاثر ہو کر میرے شکوک رفع فرمانے کی زحمت فرمائی اور اس کا اقدام یوں کیا گیا کہ محمد یامین صاحب ہاشمی کے خطوط کی نقل میرے پاس بھیجدی

ظاہر ہے کہ اس تصدیقِ معجزہ کے بعد کس کو جناب کی رسالت سے انکار کی جرأت ہو سکتی ہے، لیکن چونکہ یامین صاحب آجکل یورپ میں آپ کی رسالت کی تبلیغ فرما رہے ہیں۔ اس لئے کیا مناسب نہ ہوگا کہ اُن کی واپسی تک کسی اور معجزہ سے کام چلایا جائے۔ کیوں نہ آپ فی الحال مجھے اس علم سے آگاہ کردیں جو بقول آپ کے " خالق ومخلوق کے درمیان سلسلۂ مراسلت قایم کردیتا ہے "! میں صد درجہ مشتاق ہوں اس خط وکتابت کا جو اللہ میاں کی طرف سے کی جاتی ہے اور دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ اپنے بندوں کے لئے کیا " طرزِ خطاب " استعمال کرتے ہیں

آپ نے ستمبر ۱۹۲۹ء میں یامین ہاشمی کو اطلاع دی تھی کہ آٹھ سال قبل ہی (یعنی ۱۹۲۱ء میں) " عالم ملائکہ ومقربین میں آپ کی رسالت وسفارت کا اعلان ہو چکا تھا " اور اس حساب سے جناب کی رسالت کی عمر اس وقت گویا پورے بارہ سال کی ہو چکی ہے۔ اس لئے کیا میں اس استفسار کی جرأت کر سکتا ہوں کہ کیا ابھی تک آپ کو " مخلوق سفلی " میں دعوت الی الحق کی اجازت نہیں ملی اور کیا وہ وقت معینہ ابھی نہیں آیا جس کے انتظار میں آپ نے یامین ہاشمی کو

صبر کرنے کی ہدایت فرمائی تھی اور جس صبر و انتظار سے تھک کر وہ لکھنؤ چھوڑ بیٹھے ہیں

بہرحال اگر آپ کا کاروبار رسالت استوار ہو چکا ہے اور کوئی جگہ خلافت کی ہنوز خالی ہے تو اس دلِ خانہ خراب کو نہ بھولئے کیونکہ آپ ایسے نبی کے لئے مجھی سا خلیفہ بھی ہونا چاہیئے، ورنہ یاد رکھئے آپ کے الہامات یوں ہی بغیر تفسیر کے پڑے رہیں گے اور دنیا کبھی ان اسرار و غوامض کو نہ سمجھ سکے گی، جن کے سمجھانے کے لئے آپ مبعوث ہوئے ہیں

نوجوانانِ کالج کا خطاب

جوش ملیح آبادی سے

(بجواب نظم "نازک اندامانِ کالج")

(۱)

ہاں سنا، اے ناصحِ مشفق سنا تیرا خطاب ! اپنی اس تنقید پر، سُن لے ہمارا بھی جواب
تو ہماری زیب و زینت سے ہے گھبرایا ہوا تیری آنکھوں پہ ہے غصے کا دھواں چھایا ہوا
تیز ہے نیچی نگاہوں پہ کبھی تیری نگاہ عشوۂ ترکانہ کا، معصومیت پر اشتباہ !
سینٹ کی خوشبو سے ہے بگڑا ہوا تیرا دماغ خال و خد کو تو سمجھتا ہے نسائیت کا داغ
لرزشِ مژگاں کے ناوک سے ہے سینہ پاش پاش عورت آبا کے تو دیتا ہے طعنے دل خراش
ریشمی رومال، موزے اور گیٹس دیکھ کر تیری آنکھوں میں حسد سے خون آتا ہے اُتر
نازکی کا مقتضا، پتلی چھڑی تیرے لئے اور کنگن ہے کلائی پر گھڑی تیرے لئے
رشک ہے آہستہ خرامی پر خرامِ ناز کا یہ خلاصہ ہے تری تخئیل کی پرواز کا

(۲)

چاہتا ہے تو کہ ہم تیری طرح بن جائیں خشک! ہیزمِ صحرا کی صورت سادہ رُو ہو جائے مشک!
نوجوانی میں ضعیفی کا سبق دیتا ہے تو ! کام شاخِ گل سے نوکِ خار کا لیتا ہے تو !
کیا تو بچپن ہی میں اس تنقید کا ہمرنگ تھا؟ بطنِ مادر سے نکلتے ہی امیرِ جنگ تھا ؟
نوجوانی تجھ پہ دنیا میں کبھی آئی نہ تھی ؟ مانگ چوٹی کی بلا سر پر ترے چھائی نہ تھی ؟
اوڑھنی ہم کو اڑھاتا ہے غبارِ راہ کی یہ نسائیت ہے تیرے جذبۂ گمراہ کی
کیا ہمیشہ تو چھڑی کے شوق سے دلگیر تھا؟ ہاتھ میں بچپن ہی سے تیرے عصائے پیر تھا؟
اسقدر رفتارِ آہستہ پہ کیوں مغموم ہے ؟ گھٹنیوں سے تو بھی چلتا تھا ہمیں معلوم ہے!

(۳)

کیوں لرزتا ہے اگر تو میں ہیں منہ کھولے ہوئے تو ہی آجا سامنے سینہ ذرا تولے ہوئے
تجھ کو گر جلتی ہوئی محسوس ہوتی ہو زمیں قوتوں سے اپنی اُسکو روک دیتا کیوں نہیں ؟
لے رہا ہے نوجوانانِ وطن کا امتحاں خود چھپا بیٹھا ہے تو گھر میں پہنکر چوڑیاں !

(۴)

ڈھونڈھتا ہے کمسنوں میں جذبۂ مردانگی اپنی حد سے بڑھ گئی ہے کیا تری دیوانگی

مرد وہ ہے، جو نہیں کرتا کسی کا انتظار
اپنے جوہر خود دکھا دیتا ہے وقتِ کارزار

مرد وہ ہے، عورتوں کی طرح جو ٹلنے نہ دے
ہمتِ عالی کی دنیا کو دکھائے حوصلے

وہ نہیں ہے مرد، چلتی ہو فقط جسکی زباں
صرف حظ و پند میں جو وقت کردے رائیگاں

زندگی میں اپنی خود تونے کئے ہیں کتنے کام؟
تونے کب روکی ہے طوفانی عناصر کی لگام ؟

تو کبھی نکلا ہے کیا زور آزمائی کے لئے ؟
گردنیں کتنی جھکی ہیں دست و بازو سے ترے؟

سچ بتا، کے مرتبہ سیلاب میں اکڑا ہے تو
کیا کبھی بپھری ہوئی موجوں سے خود بپھرا ہے تو؟

کیا کبھی دادِ شجاعت تونے دی ہے جنگ میں؟
کج کلاہی تیری کھیلی ہے لہو کے رنگ میں ؟

خود کبھی دوڑا ہے تو بجلی کا دامن تھامنے؟
مسکرایا ہے گرجتے بادلوں کے سامنے ؟

کر چکے ہیں تیغ کی تضحیک کیا بازو ترے؟
سُرخ انگاروں سے کھیلے ہیں کبھی پہلو ترے !

کیوں جواب اسکا نہیں دیتا ہے منہ کیوں زرد ہے
اے حریفِ نوجواناں، تو کہاں کا مرد ہے؟ !

(۵)

ہے اگر تعلیم ناقص تو ہے ذمہ دار کون ؟
کالجوں میں بھیج دیتا ہے ہمیں بیکار کون ؟

ہے اگر تعلیم ناقص، اُن سے کر اس کا گلہ
جن کے کاندھوں پر ہے تعلیم و تعلّم کا جُوا

ہے اگر تعلیم ناقص، قوم ہے تقصیر وار
کیوں نظامِ درس پر رکھتی نہیں خود اقتدار؟

ہاں ہماری جیب میں کوڑی نہیں کنگال ہیں
ہم مگر احساس کی دولت سے مالا مال ہیں

جیب خالی، دل مگر جذبات سے معمور ہیں
طالبِ علمی کا ہے دَور، اس لئے مجبور ہیں

ہم اگر اپنی نہ کرلیتے فرنگی کی زباں ؛
کون پھر ہوتا حدیثِ قومیت کا ترجماں

کیا لباسِ مغربی اور کیا لباسِ مشرقی
ہم پہن لیتے ہیں جو کچھ، ہم کو پھبتا ہے وہی

زندگی طوفاں ہے اور دنیا ہے کشتی پاپ کی
ہم ہیں اس طوفان میں بھی آبرو ماں باپ کی

(۶)

اک شگفتہ پھول کی سی ہے ہماری زندگی
ہو مبارک صرف تجھ کو غم کی ماری زندگی

زندگی ہم سے ہے اور ہم ہیں جمالِ زندگی
جس کا دل مرجائے کیا جانے وہ حالِ زندگی

زندہ تو کب ہے حقیقت ناشناسِ زندگی
صرف ہے زندہ دلی اصل و اساسِ زندگی

مفلسی کا طعن کیا دیتا ہے اے سرمایہ دار ؟
کیا اٹھا سکتا ہے مفلس بھی کوئی کالج کا بار؟

یہ نہیں کچھ جرم یورپ کی اگر تقلید کی
نا سمجھ! تقلید ہی تمہید ہے تجدید کی

فارغ البالی ہمیں ہوگی، وہ دن بھی آئیگا
اس ہماری زندگی کا راز خود کھل جائے گا

بے تجربہ خاموش یہ لفظی نہ ڈینگیں مار تو   کرنہ اپنی کاٹھ کی تلوار سے یوں وار تو

(۷)

کیوں دکھاتا ہے ہمیں تلوار ٹھکرائی ہوئی   میان میں رکھی ہوئی اور زنگ کی کھائی ہوئی

صرف گیدڑ بھبکیاں ہیں سب یہ للکاریں تری   لڑکیوں کا اب کھلونا ہیں یہ تلواریں تری

فتح پاجاتی ہے اب سائنس سینے چیر کے   اب گیا وہ وقت، اب دن لد گئے شمشیر کے

اب ہیں منہ کھولے ہوئے توپیں اجل کا راستہ   گیس سے ہوتی ہے اب بزمِ فنا آراستہ

اب فضا سے آگ برساتے ہیں طوفانی جہاز   کارتوس اب جان لیوا ہیں، مشینیں جاں گداز

سیف کو رکھ چھوڑ اب اپنے پرانے میان میں   عورتوں کے کام آئے گی کبھی میدان میں

اہلیت سیف و قلم کی یوں دکھا دیتے ہیں ہم   انگلیوں پر اپنی دونوں کو نچا دیتے ہیں ہم

مرد ہیں، مردوں سے بہتر ہیں، نہ دے درس اس   نا سمجھ، ناحق بناتا ہے ہمیں تو ناسپاس ؟

(۸)

وقت آنے دے جوانمردی دکھا دیں گے تجھے   مرد کہتے ہیں کسے، اکدن بتا دیں گے تجھے

تیری اس بکواس سے خون آنہ جائے جوش میں   آگ کیوں برسا رہا ہے، ہوش میں آ ہوش میں!

کیا سمجھتا ہے، ہمیں ہم شیر ہیں سوئے ہوئے   محو ہیں تعلیم میں، تعلیم میں کھوئے ہوئے

کون کہتا ہے کہ مذہب کو [illegible]   کون کہتا ہے کہ ہم بزدل ہیں اور بے ... اب ؟

کون کہتا ہے، ہمارے [illegible] میں ہمت نہیں؟   کون کہتا ہے کہ ہم میں جذبۂ غیرت نہیں

کون کہتا ہے کہ ہم ہیں زینتوں میں مبتلا ؟   یہ طلسمِ رنگ و بو، پردہ ہے تیری آنکھ کا !

تو ہمارے ظاہری حالات پر ہے نوحہ گر   اپنے باطن پر بھی تجھ کو چاہیے گہری نظر!

ملک و ملت میں ہماری شان غداری نہیں   ہم عمل کے مرد ہیں، ہم میں ریاکاری نہیں

جذبۂ علم و عمل ہے جو تونوں سے آشکار   پر تو عظمت ہے وہ تو جس کو سمجھا ہے بہار

فارغ التحصیل ہونے دے وہ دن بھی آئیں گے   جتنے جوہر ہم میں پوشیدہ ہیں سب کھل جائیں گے

ہم ہیں سورج اور ذرہ دیدۂ احول میں ہیں   ہیں مئے دو آتشہ لیکن ابھی بوتل میں ہیں

جب عمل کی جنگ چھڑ جائے گی ہندوستان میں   بھاگتا جب تو نظر آئے گا ہر میدان میں

جب عیاں ہو جائے گی دنیا پہ غداری تری   ہو گی ثابت [illegible]

جب جوانمردی کے [illegible] جائیں گے تیری [illegible]   جب یہ [illegible]

[illegible] نوجوانانِ کالج کے اس دن مرد [illegible]

[illegible]